ماہنامہ ھدایت کی خصوصی پیشکش

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

افکار و آثار

مرتب

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

ناظم شعبۂ دینیات، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

ناشر

الھدایہ اسلامک ریسرچ سینٹر

جامعۃ الھدایہ، وادیٔ ہدایت، رام گڑھ روڈ، جے پور۔۳۰۳۰۱۲ (راجستھان)

www.abulhasanalinadwi.org

نام کتاب : مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ: افکار و آثار

مرتب : ڈاکٹر محمد مسعود عالم قاسمی

زیرِ اہتمام : مولانا محمد فضل الرحیم مجددی

صفحات : ۴۸۸

بار اول : جولائی ۲۰۰۰ء

تعداد : دو ہزار

کمپوزنگ : محمد جعفر قاسمی، محمد عمران قاسمی

مطبع :

قیمت : ۱۲۵؍ روپے

ناشر : الہدایہ اسلامک ریسرچ سینٹر

جامعۃ الہدایہ، جے پور (راجستھان)

خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ 'ہدایت' ۱۶۱۷؍ کھیجڑے کا راستہ

نزد اندرا بازار، جے پور۔ ۳۰۲۰۰۱ (راجستھان)

فون پر رابطہ کے لیے : (0141) 319935, 312386

فیکس : (0141) 311247

www.abulhasanalinadwi.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے

—
اقبال

www.abulhasanalinadwi.org

فہرست مضامین

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

افکار و آثار

صفحہ

۱	عرض مرتب		
۲	مقدمہ	مولانا فضل الرحیم مجددی ، امیر جامعۃ الہدایہ	
۳	آئینہ حیات		۱۳

رہنما مقالات

۴	وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان	ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی	۲۲
۵	فکری و علمی خدمات	مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی	۳۱
۶	نئی نسل کے معمار	مولانا سید نظام الدین	۴۷

دینی علوم

۷	قرآن فہمی	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۵۵
۸	علم حدیث	مولانا ابو سحبان روح القدس ندوی	۷۸
۹	سیرت نگاری	ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی	۱۱۲
۱۰	فقہی ذوق و مسلک	مولانا عتیق احمد قاسمی	۱۲۸
۱۱	نظریۂ تزکیہ و سلوک	مولانا عبدالکریم پاریکھ	۱۴۱
۱۲	تصوف	ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی	۵۳

افکار

۱۳	ذہنی و فکری تشکیل	ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی	۱۵۸

www.abulhasanalinadwi.org

۱۴	افکار عالی	مولانا محمد رضوان القاسمی	۱۷۶
۱۵	نوجوانوں کی فکری تربیت	مولانا محمد سلمان الحسینی ندوی	۱۹۶
۱۶	دیار مغرب میں داعی اسلام	پروفیسر عبدالرحیم قدوائی	۲۱۳

آثار

۱۷	تدریسی خدمات	محمد شاہد ندوی بارہ بنکوی	۲۲۲
۱۸	سوانح نگاری	ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی	۲۴۱
۱۹	عالم عرب پر اثرات	مولانا محمد لئیق ندوی	۲۴۶
۲۰	مولانا علی میاں اور مولانا غلام رسول مہر۔ کی تصانیف سید احمد شہید کا موازنہ	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	۲۶۵

دینی و ملی تحریکات

۲۱	دینی و ملی قیادت	مولانا ولی رحمانی	۲۸۶
۲۲	دینی تعلیمی کونسل	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	۲۹۷
۲۳	ہندوستان کی دینی تحریکیں	جناب عبدالمجید خاں	۳۰۵
۲۴	تحریک پیام انسانیت	مولانا عبیداقبال عاصم	۳۱۹

جامعات

۲۵	ندوۃ العلماء لکھنؤ	مولانا محمد رابع حسنی ندوی	۳۳۰
۲۶	دارالعلوم دیوبند	مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی	۳۳۸
۲۷	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	پروفیسر نفیس احمد	۳۴۵
۲۸	جامعۃ الہدایہ جے پور	مولانا محمد ضیاء الرحیم مجددی	۳۶۱

www.abulhasanalinadwi.org

ادبیات

۲۹	عربی زبان وادب میں مقام	مولانا سعید الاعظمی ندوی	۳۸۱
۳۰	اسلوب نگارش	ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی	۳۹۷
۳۱	ادب اسلامی کا انکشاف اور اس کی سرپرستی	ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی	۴۰۹
۳۲	نصابی ادبیات	ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی	۴۱۵
۳۳	کلام اقبال کی بازآفرینی	پروفیسر ابوالکلام قاسمی	۴۲۹

احوال

۳۴	اخلاق وعادات	مولانا برہان الدین سنبھلی	۴۴۱
۳۵	کاروان زندگی کی روشنی میں	ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی	۴۴۷
۳۶	مریض کی حیثیت سے	ڈاکٹر کرنل محسن جلیل شمسی	۴۵۷
۳۷	جوار رحمت میں	ڈاکٹر شیخ محمود محمد الصیام	۴۶۴

سمینار

۳۸	رپورٹ مولانا علی میاں سمینار	مولانا عبید اقبال عاصم	۴۶۹
۳۹	تجاویز سمینار	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر محسن عثمانی	۴۸۳
۴۰	تاریخ وفات	جناب مجیب احمد صدیقی	۴۸۶

www.abulhasanalinadwi.org

عرض مرتب

مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کے انتقال پر ہندوستان اور اس کے باہر بڑے پیانہ پر تعزیتی جلسے منعقد ہوئے، مضامین لکھے گئے، رسالوں کے نمبر نکلے، سیمنار منعقد ہوئے۔ مولانا کی شخصیت ایسی ہمہ جہت اور دل آویز تھی کہ ان کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا اور ان کی حیات وخدمات کے مختلف گوشوں پر علمی کام کا سلسلہ جاری رہے گا۔

مولانا محمد فضل الرحیم مجددی صاحب، امیر جامعۃ الہدایۃ جے پور نے یہ فیصلہ کیا کہ ماہنامہ ہدایت کا خاص نمبر مولانا علی میاںؒ پر نکالا جائے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ملک کے علماء اور دانشوروں سے رابطہ قائم کیا، راقم کو بھی ازراہِ عنایت خط لکھا، راقم نے جواب میں اس نکتہ پر ان کی توجہ مبذول کرائی کہ ایسے مواقع پر بہت سے اہل علم اپنے مطبوعہ مضامین ارسال کردیتے ہیں اور موضوع کا پابند نہ کرنے پر تأثراتی مضامین کثرت سے آجاتے ہیں اور علمی مضامین کم آتے ہیں جس سے کسی شخصیت کا علمی وفکری مقام واضح نہیں ہوتا ان کو یہ مشورہ دیا کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مولانا علی میاںؒ کی شخصیت پر سیمنار کا خاکہ راقم نے بنایا ہے اور مشاہیر اہل علم کو مولانا علی میاںؒ کی علمی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر متعین عنوانات کے تحت مضامین لکھنے کی اور سیمنار میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ سیمنار میں جو مقالات پڑھے جائیں ان کو دیکھ لیا جائے اور پھر جو پہلو تشنہ رہ جائیں ان پر مزید مضامین فراہم کیے جائیں تو ایک معقول علمی دستاویز تیار ہو جائے گا۔ اور مولانا علی میاںؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کی بہتر شکل ہوگی۔ مولانا محمد فضل الرحیم مجددی صاحب نے سیمنار کے مجوزہ عنوانات کو غور سے دیکھنے کے بعد فرمایا کہ الحمد للہ یہ بہت جامع ہے اور میری خواہش کے عین مطابق ہے ۲۵، ۲۶؍ مارچ کو مولانا علی میاںؒ سیمینار پُر وقار انداز میں منعقد ہوا۔ مولانا مجددی صاحب سفر حج کی وجہ سے سیمنار میں شریک تو نہ ہو سکے مگر

www.abulhasanalinadwi.org

حرمین شریفین سے دعاؤں اور نیک تمناؤں کے تحفے ارسال کرتے رہے۔ واپسی پر انہوں نے مضامین کو مرتب کرنے اور جلد طبع کرنے پر زور دیا اس سلسلہ میں جناب امین الدین شجاع الدین صاحب کو علی گڑھ بھیجا۔ ایک مرتبہ صابر صاحب بھی تشریف لائے۔ مولانا مجددی فون پر رابطہ قائم کرتے رہے اور جن مضامین کی ضرورت باقی تھی ان کو فراہم کیا۔ مثلاً اسلامی ادب پر ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی مد ظلہ کا مضمون جو انہوں نے مکہ مکرمہ سے ارسال فرمایا، اسی طرح ان کی ایماء پر شروع میں "آئینہ حیات" کا اضافہ کیا گیا وغیرہ اور اب یہ مرقع اللہ کے فضل سے زیور طباعت سے آراستہ ہو رہا ہے۔

مولانا علی میاںؒ کی زندگی کے بعض اور بھی پہلو ہیں جن پر مضامین لکھنے کی ضرورت تھی مگر ہماری کوشش کے باوجود مقررہ وقت تک یہ مضامین دستیاب نہ ہو سکے آئندہ اضافہ کی گنجائش باقی رہے گی۔ میں تمام مقالہ نگار حضرات کا ان کے علمی تعاون کے لئے شکر گزار ہوں خاص طور پر مولانا محمد فضل الرحیم مجددی صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کو چھاپنے کا اہتمام فرمایا ہے اور اپنے مشوروں اور دعاؤں سے لحہ لحہ نوازتے رہے اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ اپنے ساتھیوں میں مولانا عبید اقبال عاصم، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، حافظ محمد شاہد خاں مولانا اشفاق احمد اور حافظ شمشاد عالم کا مشکور ہوں کہ مضامین کی فراہمی، کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کے دشوار مرحلوں میں ان کا تعاون ہمیں حاصل رہا۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتا ہوں کہ وہ ہمارے کاموں میں اخلاص عطا فرمائے اور مولانا علی میاںؒ کی شخصیت کی طرح اس محنت کو مقبول بنائے۔

محمد سعود عالم قاسمی

ناظم دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۵ر صفر المظفر ۱۴۲۱ھ

www.abulhasanalinadwi.org

مقدمہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات حسرتِ آیات عالم اسلام اور بالخصوص ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے ایک عظیم خسارہ ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہندوستان میں امت مسلمہ اغیار کی سازشوں کا شکار تھی، اس پر ہر چہار جانب سے حملے ہو رہے تھے، دینی جماعتیں، تعلیمی ادارے، مذہبی مقامات، مسلم پرسنل لاء کوئی بھی ایسی فتنہ انگیزیوں سے محفوظ نہیں تھے اور آئے دن نت نئے فتنے برپا کیے جا رہے تھے، ایسے وقت میں حضرت مولانا علی میاںؒ کی ذات امت مسلمہ کے لیے ایک بہت بڑا سہارا تھی۔ آپ نے آزمائش کے ہر ایسے موقع پر عزیمت واستقامت کا مظاہرہ کیا اور دشمنوں کی سازشوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ دوسری جانب امت مسلمہ کی بھی صحیح رہنمائی کی یہی وجہ ہے حضرت مولاناؒ کی وفات پر امت کے ہر طبقہ کی جانب سے شدید رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔ وفات کے فوراً بعد متعدد مقامات پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئیں، دعاء اور ایصال ثواب کی مجلسیں منعقد کی گئیں، تعزیتی جلسے کیے گئے، مختلف رسائل ومجلات نے خصوصی شمارے شائع کئے اور علمی مجالس اور سیناروں کا انعقاد ہوا۔ چار ساڑھے چار ماہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود آپ کی عظیم خدمات کے اعتراف کا یہ سلسلہ برابر جاری وساری ہے۔

حضرت مولاناؒ کی حیات وخدمات پر ۲۵، ۲۶ مارچ ۲۰۰۰ء کو جناب ڈاکٹر محمد سعود عالم صاحب قاسمی، ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی تحریک وسرپرستی اور شعبۂ دینیات کے زیرِ اہتمام ایک سمینار منعقد ہوا۔ اس سمینار میں شرکت کے لیے مجھے بھی دعوت دی گئی تھی لیکن سفر حج کی وجہ سے میں اس

www.abulhasanalinadwi.org

پروگرام میں شرکت نہ کرسکا۔ الحمد للہ یہ سیمینار بہت کامیاب رہا اور اس میں مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والی مقتدر علمی شخصیات نے شرکت فرمائی اور حضرت مولاناؒ کی حیات و خدمات کے متنوع پہلوؤں پر معیاری مقالات پیش کیے گئے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کو جامعۃ الھدایۃ، جے پور کے بانی راقم السطور کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ محمد عبد الرحیم صاحب مجددیؒ سے خصوصی تعلق تھا، دونوں کے درمیان محبت و مودّت اور اخلاص کے تعلقات بہت گہرے تھے، دونوں بزرگ شخصیتیں ایک دوسرے کا انتہائی احترام کرتی تھیں، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے جب دینی اور عصری دونوں علوم کی بیک وقت تعلیم کے لیے جامعۃ الھدایۃ قایم کیا تو اسکی مرکزی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے خصوصی طور پر حضرت مولانا علی میاںؒ کو مدعو کیا اس کے بعد تقریباً دس سال تک جامعہ کی عمارتیں تعمیر ہونے کے بعد جب تعلیمی سلسلہ شروع کرنے کے لیے جشنِ افتتاح کا مبارک موقع آیا تو اسکے افتتاحی اجلاس کے لیے بھی حضرت شاہ صاحبؒ نے حضرت مولانا علی میاںؒ کو مدعو کیا تاکہ ایک جامع و متوازن شخصیت کے مبارک ہاتھوں سے ہی ایک جامع اور متوازن نظامِ تعلیم کی عظیم درسگاہ اور تجربہ گاہ کی بنیاد پڑے۔ یہ محض ایک جامعہ کا افتتاح نہ تھا بلکہ دینی تعلیم و تربیت کی دنیا میں ایک تحریک کی ابتداء اور ایک مشن کا آغاز تھا۔ برسوں سے "قدیم صالح وجدید نافع" کی جو صدا لگائی جارہی تھی اور دینی و عصری علوم کے حسین امتزاج کا جو خواب دیکھا جارہا تھا، جامعہ کا وجود اس کی عملی شکل اور اسکی تعبیر تھا۔ یہ کام جس قدر اہم اور ناگزیر اور وقت کے تقاضوں کے عین مطابق تھا اسی قدر مشکل و نازک بھی تھا۔ یہ کارِ شیشہ و آہن تھا۔ مگر حضرت شاہ صاحبؒ بھی مرد آہن تھے، اللہ کے نام کے ساتھ جو سوچا

اسی کے فضل سے اسے پورا کر دکھایا، وہ علم و عشق کے امتزاج تھے۔ چنانچہ اسکی بدولت انہوں نے دشت و کوہسار آباد کر دیئے اور جنگل میں منگل کا سماں پیدا کر دیا۔ دینی اور عصری و تکنیکی علوم و فنون کو جامعہ کے نصاب میں اس خوبصورتی سے سمویا کہ دینی علوم کا تفوق و امتیاز بھی بر قرار رہا جو اس کے پڑھنے والے میں خدا اعتمادی پیدا کرے اور عصری و فنی تعلیم کی بدولت خود اعتمادی پیدا ہو۔

جامعہ میں تعلیم کا آغاز ہونے کے بعد بھی حضرت مولاناؒ نے قدم قدم پر عملی تعاون فرمایا اور جامعہ کی ترقی کے لیے اپنی قیمتی مشوروں اور ہدایتوں سے نوازتے رہے۔ ۱۹۸۷ء میں رابطہ ادب اسلامی کا مذاکرۂ علمی حضرت مولاناؒ کی سربراہی میں جامعہ میں منعقد ہوا اور اکتوبر ۱۹۹۳ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تاریخ ساز اجلاس کی میزبانی کا بھی جامعہ کو شرف حاصل ہوا۔ غرض حضرت مولانا علی میاںؒ کو جامعہ اور اسکے بانی حضرت مولانا شاہ محمد عبد الرحیم صاحبؒ سے جو خصوصی تعلق تھا اسکا وقتاً فوقتاً مظاہرہ ہوتا رہتا تھا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی وفات سے جہاں پورا عالمِ اسلام اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمان متاثر ہوئے، وہیں وابستگانِ جامعہ کا بھی اس سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا، ارادہ تھا کہ جامعۃ الھدایہ کی جانب سے بھی حضرت مولاناؒ کی خدمات کے تعارف و تذکرہ کا کوئی پروگرام ہو، چنانچہ جب میں نے ناظم دینیات مولانا سعود عالم صاحب قاسمی کو پیشکش کی کہ ان کے سمینار میں پیش کردہ مقالات کا مجموعہ جامعہ الھدایہ کے ترجمان ماہنامہ 'ہدایت' کے خصوصی شمارے کی صورت میں شائع کر دیا جائے تو ازراہِ نوازش انہوں نے اس پیشکش کو قبول فرما کر اس کارِ خیر میں شامل ہونے کی سعادت بخشی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس مجموعۂ مقالات میں حضرت مولانا علی میاںؒ کی مختلف الجہات خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے، مختلف دینی علوم میں ان کا حصہ، افکار، تصانیف، دینی، ملی تحریکات سے وابستگی، مختلف تعلیمی اداروں سے ربط و تعلق، احوال و اثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مقالات ملک کے معروف علماء و فضلاء، دانشوروں اور اہل قلم نے تحریر کیے ہیں، امید ہے کہ ان کے ذریعہ حضرت مولاناؒ کے افکار و آثار کا خوبصورت انداز میں تعارف ہو سکے گا۔

ناسپاسی ہوگی اگر ہم خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر سعود عالم قاسمی کا شکریہ نہ ادا کریں۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی جانب سے حضرت مولاناؒ پر منعقدہ سمینار اپنی نوعیت کا منفرد و ممتاز سمینار ثابت ہوا جس میں موصوف کی دلچسپی اور لگن کو بڑا دخل ہے۔ اس سمینار کے مقالات کی اشاعت کے لیے ہماری پیشکش کو انہوں نے جس خوشدلی سے قبول کیا اسکے لیے بھی ہم انکے شکر گزار ہیں، پھر اس کی ترتیب و تدوین میں ان کی جانب سے جس دلچسپی اور فکر مندی کا مظاہرہ ہوا اس پر "مفکر اسلام نمبر" اور اسکے صفحات گواہ ہیں۔ جامعہ کے مختلف علمی و تعلیمی کاموں میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا عملی تعاون ہمیں حاصل ہوتا رہا ہے، رب کریم انکو جزائے خیر عطا فرمائے۔

'مفکر اسلام نمبر' کی خصوصی پیشکش قارئین کی خدمت میں پیش ہے، دعاء ہے کہ رب کریم اسے مفید و مقبول بنائے اور حضرت مفکر اسلام کے افکار سے ہم اپنی زندگی کی گزرگاہوں میں شمعیں روشن کر سکیں۔

محمد فضل الرحیم مجددی

امیر جامعۃ الہدایہ، جے پور

۲۰ر صفر المظفر ۱۴۲۱ھ

www.abulhasanalinadwi.org

آئینہ حیات

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

(الف)

عائلی زندگی۔

ولادت :	۶ / محرم ۱۳۳۳ھ مطابق نومبر ۱۹۱۴ء بمقام تکیہ کلاں ضلع رائے بریلی اترپردیش
والد کا نام :	مولانا عبدالحئی بن فخر الدین۔ مصنف نزہۃ الخواطر
رسم بسم اللہ :	۱۹۲۱ء (سات سال کی عمر میں) والدہ محترمہ سے
والد محترم کا انتقال :	۱۳۴۱ھ ۱۹۲۳ء جب کہ آپ کی عمر صرف نو سال تھی والد کی وفات کے بعد بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی نے سرپرستی کی۔
والدہ کا انتقال :	۱۳۸۸ھ ۱۹۶۸ء (والدہ کا نام خیر النساء تھا)

(ب)

تعلیمی ودعوتی زندگی:

ابتدائی تعلیم :	والدہ محترمہ اور شیخ عزیز الرحمان و شیخ محمود علی سے
عربی کی ابتداء :	۱۹۲۴ء علامہ خلیل بن محمد انصاری الیمانی سے بعدہ، علامہ تقی الدین ہلالی سے
لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ	۱۹۲۷ء
ندوہ میں داخلہ :	۱۹۲۹ء

www.abulhasanalinadwi.org

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ :	۱۹۳۲ء (حدیث شریف ن تکمیل کی غرض سے اور مولانا حسین احمد مدنیؒ سے خصوصی استفادہ
لاہور	۱۹۶۲ء مولانا احمد علی لاہوریؒ سے تفسیر قرآن کی تعلیم لور مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی سے حدیث کی تعلیم
تدریس ندوۃ العلماء :	اگست ۱۹۳۴ء
بیعت :	۱۹۳۹ء مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے
رکن مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ	۱۹۴۵ء
نائب معتمد	۱۹۵۱ء
معتمد ندوۃ العلماء لکھنؤ	۱۹۵۴ء
ناظم اعلیٰ " "	۱۹۶۱ء
مجلس تحقیقات ونشریات	۱۹۵۹ء
اسلام کا قیام :	
جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پہلا	۱۹۴۲ء (بہ عنوان مذہب وتمدن)
دعوتی خطاب جامعہ	
اسلامیہ مدینہ منورہ میں	۱۹۶۲ء
دعوتی خطاب :	
کلیۃ الشریعہ ریاض یونیورسٹی	
کے نصاب کا جائزہ	۱۹۶۸ء

(ج)

قومی وملی زندگی۔

جماعت اسلامی سے وابستگی :	۱۹۴۰ء میں جماعت اسلامی کے رکن بنائے گئے اور لکھنؤ یونٹ کے امیر مقرر ہوئے بعد میں علیحدگی اختیار کرلی لیکن ہمدردانہ ومخلصانہ تعاون جاری رہا

www.abulhasanalinadwi.org

تبلیغی جماعت سے تعلق :	۱۹۴۰ء کے آس پاس مولانا الیاس صاحبؒ بانی تبلیغی جماعت کی تحریک سے متاثر ہو کر تبلیغی جماعت سے وابستہ ہو گئے اور اس کے لئے عملی محنت کی
انجمن تعلیمات دین۔	۱۹۴۳ء مسلم بچوں کی تعلیمی و تربیتی اصلاح کی خاطر ابتدا سے ہی اسکے مضبوط رکن اور صدر منتخب ہوئے
تحریک پیام انسانیت :	۱۹۴۸ء۔ اسلام کا پیغام عام کرنے اور مسلموں و غیر مسلموں میں اتحاد کی غرض سے پیام انسانیت کی بنیاد ڈالی جس نے ۱۹۷۴ء میں باقاعدہ تنظیمی شکل اختیار کر لی اور آپ اس کے صدر منتخب ہوئے۔
مسلم مجلس مشاورت :	۱۹۶۴ء مسلم مسائل پر غور و خوض کرنے اور مسلم رہنماؤں کو متحد کرنے کے لئے مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی جس کے آپ تاسیسی رکن رہے۔
صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ :	۱۹۸۳ء حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے انتقال کے بعد اس باوقار عہدے کے لئے متفقہ طور پر آپ کا انتخاب عمل میں آیا
شاہ بانو کیس	۱۹۸۶ء سپریم کورٹ کے نان نفقہ سے متعلق شاہ بانو کیس میں متنازعہ فیصلہ کے خلاف آپ کی زیر قیادت مسلم پرسنل لاء بورڈ نے تحریک چلائی جس کے آگے مرکزی حکومت کو مجبور ہو کر اس فیصلہ کو واپس لینا پڑا۔
سرکاری اسکولوں میں مشرکانہ ترانہ	۱۹۹۸ء وندے ماترم اور دوسرے غیر مذہبی اسلام مخالف رسومات کو یوپی کے سرکاری سکولوں میں جبریہ داخل کرنے کی مولانا نے

www.abulhasanalinadwi.org

مخالفت کی اور حکومت اسے واپس لینے پر مجبور ہو گئی۔

تعلیمی ادارے: بے شمار دینی وعصری تعلیم گاہوں کا سنگ بنیاد رکھا اور ان کے قیام واستحکام میں تعاون کیا۔

(د)

چند اہم اسفار

سفر لاہور: ۱۹۲۹ء شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ سے ملاقات کی غرض سے

سفر بمبئی: ۱۹۳۵ء ہندوستان کے قانون ساز ڈاکٹر بی آر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے

سفر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۶ء

سفر برائے واقفیت مراکزدین: ۱۹۳۹ء ہندوستان اور موجودہ پاکستان کے مختلف شہروں کا سفر

پہلا سفر حج: ۱۹۴۷ء

" مصر وفلسطین: ۱۹۵۱ء اس سفر میں مسجد اقصیٰ کی زیارت اور اس میں نماز پڑھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔

پہلا سفر ترکی: ۱۹۵۶ء

" " شام: ۱۹۶۰ء

www.abulhasanalinadwi.org

کویت :	۱۹۶۲ء
یوروپ :	۱۹۶۳ء
پاکستان :	۱۹۶۴ء (پاکستان بننے کے بعد)
رابطہ کے وفد کے رکن کی حیثیت سے :	۱۹۷۳ء رابطہ عالم اسلام کے خصوصی مشن کے تحت ایران، اعراق، افغانستان اور لبنان کا سفر
پہلا سفر مغرب اقصی :	۱۹۷۶ء
پہلا سفر امریکہ :	۱۹۷۷ء
سری لنکا :	۱۹۸۳ء
بنگلہ دیش :	۱۹۸۴ء
بلجیم :	۱۹۸۵ء
سفر ملیشیا :	۱۹۸۷ء
سفر تاشقند و سمرقند :	۱۹۹۳ء

(علاوہ ازیں دنیا کے بیشتر ملکوں کے اسفار)

(۵)

اردو تصانیف

اسماء حسنٰی	المرتضٰی
اقوام عالم کے درمیان امت مسلمہ کا حقیقی وزن :	ارکان اربعہ
انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر
اسلامی مزاج کی تشکیل میں حدیث کا بنیادی کردار	اسلامیت اور مغربی مستشرقین اور مسلمان مصنفین

www.abulhasanalinadwi.org

انسانیت کے محسن اعظم	آئندہ نسلوں کے اسلام کی ضمانت اور ایمان کی حفاظت
اسلام مکمل دین اور مستقل تہذیب	ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل
امت مسلمہ کا فرض منصبی	امت اسلامیہ کا مستقبل خلیجی جنگ کے بعد
انسانیت کی رہنمائی میں اسلام کا عظیم کردار	اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں
اسلام اور مغرب :	بصائر
پیام انسانیت :	پندرہویں صدی ہجری ایک تاریخی جائزہ
پرانے چراغ (۳ جلدیں)	پاجا سراغ زندگی
تاریخ دعوت و عزیمت (۵ جلدیں)	تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک
تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب	تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ
تحفۂ دکن	تحفۂ انسانیت (حدیث مالوہ)
تحفۂ مشرق	تحفۂ کشمیر
تحفۂ دین و دانش	ترکی کی مجاہد ملت اسلامی
تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم کا مقدمہ	تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات
جب ایمان کی بہار آئی	حیات مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی
حجازِ مقدس اور جزیرۃ العرب	حالات کا نیا رخ اور علماء دین کی ذمہ داریاں
خلفائے اربعہ	دریائے کابل سے دریائے یرموک تک
دستورِ حیات	دین حق اور دعوت اسلام
دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں	دینی عربی مدارس کا تعلیمی و تربیتی کردار
سیرت سید احمد شہید	(پہلی تصنیف جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی)

www.abulhasanalinadwi.org

سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری

سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری

سیرت نبوی دعاؤں کے آئینہ میں

سیرتِ نبوی اور عصرِ حاضرین میں اس کی معنویت وافادیت

شرق اوسط کی ڈائری

صحبتے بااہل دل

عالم عربی کا المیہ

عالم عربی کے لئے سب سے بڑا خطرہ

عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب :

عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح

فیصلہ کن محاذ اور مرکزی میدان عمل

فسادات اور ہندوستانی مسلمان

قادیانیت

قادیانیت کا ظہور

قادیانیت تحلیل و تجزیہ

قرآن کا مطالبہ

کاروان زندگی (۷ جلدیں)

کاروان ایمان وعزیمت

کاروان مدینہ

کل مسلمان اور مکمل اسلام

لسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق

مذہب و تمدن

مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش

مسلمانان ہند کے لئے صحیح راہِ عمل

مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں

معرکۂ ایمان ومادیت

مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں

مقامِ انسانیت

مغرب اقصی مراکش میں

مسلم پرسنل لاء کی صحیح نوعیت واہمیت

مطالعہ قرآن اور اس کے اصول ومبادی

محسن عالم

منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین

نبی رحمت

نبی خاتم ودین کامل

نبوت کا اصل کارنامہ

نشان راہ

نقوش اقبال

نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں

نیا طوفان اور اس کا مقابلہ

www.abulhasanalinadwi.org

یوروپ، امریکہ اور اسرائیل :

عربی میں تقریباً سو کتابیں، انگریزی زبان میں پچاس سے زائد کتب کے تراجم ہوئے نیز ہندی، ترکی، فرانسیسی، بنگلہ، اندلسی وغیرہ زبانوں میں ترجمے ہوئے۔

(و)

اعزازات

ناظم اعلیٰ	ندوۃ العلماء لکھنؤ
صدر	رابطہ الادب الاسلامی العالمی
صدر	آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ
صدر	مرکز دراسات اسلامیہ، آکسفورڈ
صدر	دینی تعلیمی کونسل
صدر	دارالمصنفین اعظم گڑھ
رکن	رابطہ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ
رکن	مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
رکن	مجمع اللغۃ العربیۃ (دمشق)
رکن	مجمع اللغۃ العربیۃ (قاہرہ)
رکن	مجمع اللغۃ العربیۃ (اردن)
رکن	مجلس عالمی دعوتِ اسلامی (قاہرہ)
رکن	مجلس شوریٰ اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد (پاکستان)
رکن	مجلس شوری دارالعلوم دیوبند

علاوہ ازیں سینکڑوں معروف وغیر معروف اداروں کے صدر و سرپرست وغیرہ

www.abulhasanalinadwi.org

(ز)

ایوارڈز

شاہ فیصل ایوارڈ	۱۹۸۰ء ریاض (سعودی عرب)
عظیم اسلامی شخصیت ایوارڈ	۱۹۹۹ء (دبئی)
اعزازی ڈاکٹریٹ	۱۹۸۱ء کشمیر یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی
سلطان برونائی (ایوارڈ)	۱۹۹۹ء آکسفورڈ اسلامک سینٹر
وفات :	۱۹۹۹ء کی آخری تاریخ ۳۱ دسمبر مطابق ۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ بروز جمعہ بوقت بارہ بجے دن روزہ کی حالت میں، نماز کی تیاری میں بحالت وضوء قبلہ رو، سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتے ہوئے۔

www.abulhasanalinadwi.org

خطبہ استقبالیہ

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی
ناظم دینیات، اے ایم یو علی گڑھ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ولادت ۱۹۱۴ / ۱۳۳۳، وفات ۱۹۹۹ / ۱۴۲۰ھ، کا انتقال عالم اسلام کے لئے بالعموم اور ملت اسلامیہ ہند کے لئے بالخصوص ایک بڑا حادثہ ہے۔ مولانا کی قد آور شخصیت کے گذر جانے سے ہماری دینی و ملی قیادت میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے اور اہل علم قحط الرجال کا شکوہ کرنے لگے ہیں۔ بقول مختار مسعود!

"قحط میں موت ارزاں ہوتی ہے اور قحط الرجال میں زندگی، مرگ انبوہ کا جشن ہو تو قحط، حیات بے مصرف کا ماتم ہو تو قحط الرجال، ایک عالم موت کا ناحق زحمت کا دوسرا زندگی کی ناحق تہمت کا۔ ایک سماں حشر کا دوسرا محض حشرات الارض کا۔ زندگی کے تعاقب میں رہنے والے قحط سے زیادہ قحط الرجال کا غم کھاتے ہیں"[۱] کچھ یہی غم مولانا کے گذرنے سے اہل علم کو لاحق ہے، کسی شاعر نے کہا ہے۔

اپنی تاریخ کا ہر لفظ یہ بتلاتا ہے
ایک بجھتا ہے دیا دوسرا جل جاتا ہے
لیکن اس بار بجھا ہے وہ چراغ محفل
دور تک صرف اندھیرا ہی نظر آتا ہے

۱۔ آواز دوست ص ۹۴ لاہور

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا یوں تو جوار رحمت میں چلے گئے مگر اپنی خدمات کے حوالہ سے زندہ رہیں گے اور ہمارے دلوں میں ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو

در سینہائے مردم عارف مزار ما

مولانا علی میاں ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے، جسمیں علم و عمل کا توازن، فکر و فن کا رچاؤ، تقریر و تحریر کی خوبی، دین و ادب کی لذت، روحانیت اور سیاست کے اقدار عالیہ، اخلاق اور آئین کی پاسداری اور خلوت و جلوت کی ہم آہنگی خوبصورتی کے ساتھ جمع ہو گئی تھی۔

ہندوستان میں ایسے علماء دانشور اور قائدین کی کمی نہیں جن میں یہ خوبیاں متفرق طور پر مل جائیں، مگر ایسے حضرات کم ملیں گے جن میں یہ سارے محاسن یکجا موجود ہوں۔ ونڈل بانڈ نے یونانی فلسفی افلاطون کے متعلق کہا تھا

"اس کی شخصیت کے نظری اور علمی پہلو دونوں آکر جمالیاتی کمال میں مل گئے ہیں۔ مصلح اور مفکر کا تضاد آرٹسٹ کی ذات میں غائب ہو گیا ہے"[1]

کچھ یہی بات مولانا علی میاں کی شخصیت پر بھی صادق آتی ہے۔ کاروان زندگی کا مطالعہ کیجئے تو مولانا قدیم صالح اور جدید نافع اور علم و عمل کا مجسمہ معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا کے ذوق علم اور جوش عمل میں شروع ہی سے ایک طرح کی کشاکش موجود تھی اور انہوں نے ان دونوں قوتوں کو تناسب اور توازن کے ساتھ جزو زندگی بنالیا تھا۔ ایک طرف ان کی گوناں گوں انتظامی مصروفیات، دعوتی اسفار، ملی اور اصلاحی جدو جہد اور تعمیری کاموں کی ہماہمی کو دیکھئے جو منزل تک پہنچنے سے پہلے آرام تصور حرام کر دیتی ہے اور دوسری طرف ان کے فکر کی تازگی عزم کی پختگی اور تصنیف و تالیف کی گراں مائیگی کو دیکھئے جو اس بات کا صاف اعلان ہے کہ مولانا بصیرت اور محنت کے ساتھ علم

[1] ریاست ص ۸ اردو ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین، دہلی

وعمل اور مذہب اور معاشرہ کے تقاضوں میں انصاف کرتے ہیں اور شخصی زندگی کی تشکیل میں دونوں پہلوؤں کو شیر و شکر کی طرح جمع کر لیتے ہیں۔

مولانا کی مصروف زندگی کا روشن پہلوان کی تصنیفی خدمات ہیں۔ جن کی بدولت وہ زندہ و جاوید رہیں گے۔ مولانا نے اردو میں اپنی پہلی کتاب سیرت سید احمد شہید لکھ کر ہندوستان کی اولین اسلامی تحریک کے سالار کے کارناموں کو برصغیر ہندوپاک کے مسلمانوں کے سامنے رکھ کر اسلامی زندگی کی ایک روشن شاہ راہ دیکھائی تو عربی میں پہلی باقاعدہ کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین لکھ کر عالم عرب کو اسلامی عظمت رفتہ کی بازیابی کا سبق دیا۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش لکھ کر مسلم حکمرانوں کو مغرب کے بڑھتے ہوئے منفی اثرات سے آگاہ کیا اور ان کے سدباب کی راہیں سمجھائیں۔ تاریخ دعوت و عزیمت لکھ کر اسلاف کی دعوتی واصلاحی زندگی پر پڑی ہوئی گرد کو صاف کیا، پرانے چراغ لکھ کر معاصر علماء اور دانشوروں کی سرگذشت حیات کے بہت سے گوشے روشن کئے اور کاروان حیات لکھ کر خود اپنی علمی اور دعوتی زندگی کے نشیب و فراز سے پردہ اٹھایا۔ مطالعہ قرآن اور اس کے اصول و مبادی لکھ کر کتاب اللہ سے استفادہ کی راہ آسان کی۔ منصب نبوت، کاروان مدینہ اور السیرۃ النبویہ لکھ کر تعلیمات نبوی کو اپنانے اور سیرت رسولؐ کو ماڈل بنانے کی دعوت دی، تو قصص النبین، القراۃ الرشیدہ اور مختارات لکھ کر نوخیز ذہنوں کو قرآن و سنت کی زبان اور مزاج سے روشناس کرایا۔ تزکیہ واحسان یا تصوف و سلوک لکھکر تزکیہ نفس کا احساس دلایا۔ دستور حیات لکھکر پاکیزہ عقیدہ کی دعوت دی اور ارکان اربعہ کے ذریعہ اسلامی عبادات کے اسرار و حکم دلنشیں کرائے۔ نحو التربیۃ الاسلامیۃ الحرہ لکھکر عرب ممالک کے کالج و یونیورسٹی کے نصاب اور نظام تعلیم کو درست کرنے کی دعوت دی، علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں لکھ کر ہندستانی یونیورسٹی کے طلباء اساتذہ کو مقاصد تعلیم پاکیزہ بنانے پر زور دیا۔ اور مدارس عربیہ کے طلباء اور علوم نبوت کے حاملین کو پاجاسراغ زندگی کی موثر تلقین کی۔ ہندوستانی مسلمان

www.abulhasanalinadwi.org

ایک جائزہ اور ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں لکھکر مسلمانوں کے سیاسی اور اخلاقی کوائف کا تاریخی جائزہ لیا تو ہماری سیرت کے کمزور پہلو اور مسلمانان ہند سے صاف صاف باتیں لکھکر ان کی اخلاقی کمزوریوں کی نشاندہی بھی کی اور تلافی کی راہ دکھائی۔ اسلام مکمل دین مستقل تہذیب لکھکر عصر حاضر کیلئے اسلام کو ناگزیر ثابت کیا تو صورتان متضادتان عند اہل السنۃ واہل الشیعۃ اور قادیانیت لکھکر اسلام کو بے آمیز رکھنے کی پرزور وکالت کی۔ روائع اقبال لکھکر شاعر مشرق علامہ اقبال کو عربوں میں متعارف کرایا تو مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی، مولانا عبدالقادر رائے پوری، مولانا عبدالحیٔ اور مولانا زکریاؒ کی سوانح عمریاں لکھکر ان علماء کی زندگی کو قابل تقلید بنایا۔ اس طرح اسلام کے مختلف موضوعات پر عربی اور اردو میں چھوٹی اور بڑی تقریباً ۱۰۰ کتابیں لکھیں جو آنے والی نسلوں کیلئے سرمایہ افتخار ہیں۔

مولانا کی شخصیت کا تابناک پہلو عالم اسلام میں ربط باہم کی جدوجہد اور ہندوستان کی نمائندگی کی شعوری کوشش ہے جو ان کی پوری زندگی پر محیط ہے عربی زبان وادب کا ذوق جو ابتدائی عمر میں حاصل ہوا آخر تک ان کی عالمی شناخت کا ذریعہ بنا بقول خود!

"میرا آب وگل ہندوستان کی سرزمین سے ہے مجھے اس کا اعتراف بھی ہے، اس پر فخر بھی، لیکن میں نے اردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا اور مجھے اقبال کے الفاظ میں یہ دعوی کرنے کا حق ہے

میرا ساز گرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا میری عربی رہی[1]

چنانچہ کبھی تو ہندوستان آنے والے عرب نمائندوں کو "الی ممثلی البلاد الاسلامیہ" کے عنوان سے انکا فرض یاد دلایا تو کبھی مصر پہنچ کر اس کی مغرب گزیدہ سوسائٹی کو اسمعی یا مصر کے عنوان سے پکارا اور مصری حکمران جمال عبدالناصر

---

[1] کاروان زندگی ۲/ ۳۴۷

www.abulhasanalinadwi.org

کے عرب قومیت کے نعرہ کو عالمی اسلامی اخوت اور علم وایمان کے منافی قرار دیا، کبھی سیریا جا کر اسے اسمعی یا سوریہ اور حاجتنا الی الایمان من جدید کے خطاب سے ایمان واسلام کو از سر نو تازہ کرنے کی دعوت دی تو کبھی کویت پہنچ کر اسمعی یا زہرۃ الصحرا کے ذریعہ پٹرول کی دولت پر ایمان کی دولت کی عظمت کا راز بتایا کبھی کبھی خلیجی ممالک میں خلیج بین الاسلام والمسلمین کو پاٹنے کی دعوت دی تو کبھی ترکی پہنچ کر مشرق ومغرب کے دروازہ کو اسلام کے لئے کھلا رکھنے کی تلقین کی کبھی سعودی عرب کے سربراہوں کو بین الجبایۃ والہدایۃ اور بین العالم وجزیرۃ العرب کے عنوان سے دعوت محمدی ﷺ کا علم اٹھانے اور دنیا سے توحیدی تعلق قائم کرنے کا مشورہ دیا تو کبھی ان کو کیف ینظر المسلمو ن الحجاز" کے عنوان سے حرمین کے بارے میں بیرون عرب کے مسلمانوں کے احساسات سے واقف کرایا۔ کبھی ردۃ ولا ابا بکر لہا کے عنوان سے عالم عرب میں بڑھتی ہوئی مغربی بے راہ روی پر روک لگانے کی دعوت دی تو کبھی شاہ فیصل کو مکہ ومدینہ کو مثالی اسلامی شہر بنانے پر اکسایا۔ کبھی والی اردن کو مسجد اقصی کے پناہ گزینوں کے مسائل سے آگاہ کیا تو کبھی امیر کویت کو غیر مسلم عبادت گاہوں کے مخفی خطرات سے روشناس کیا۔

کبھی دمشق یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے نوجوانوں میں فکر وعمل کی جوت جگائی اور کبھی مدینہ یونیورسٹی کے طلباء کو کردار رسول ﷺ کو اپنانے کا سبق دیا۔ کبھی بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو لسانی اور تہذیبی جاہلیت سے نکلنے کا مشورہ دیا تو کبھی پاکستان کے مسلمانوں سے اسلام کے لئے قربانی دینے کا مطالبہ کیا۔ کبھی لندن یونیورسٹی میں مشرق ومغرب کے درمیان ربط وتعلق کے امکانات پر روشنی ڈالی اور مرکز اسلامیات کی داغ بیل ڈالی۔ تو کبھی امریکہ پہنچ کر اخلاق باختہ سوسائٹی کو کردار کی صاف صاف باتیں بتائیں۔ غرض کہ دنیا کے سارے انسان ان کے آفاقی پیغام کے مخاطب اور پورا عالم ان کی جولان گاہ ہے وہ اقبال کے اس شعر کی تعبیر ہیں۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر

قدرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کی سحر کر

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور مشکلات سے ان کو اس حد تک دل چسپی اور وابستگی رہی ہے کہ وہ اپنے موروثی، تصنیفی اور تدریسی مزاج اور ماحول کے ساتھ سیاسی رہنمائی کو بھی ہم آہنگ کر لیتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد ہندی مسلمانوں کو جن سیاسی، سماجی اور ذہنی اضطراب وانتشار سے گذرنا پڑا ان کے اثرات کو کم کرنے اور مسلمانوں کو حوصلہ دینے کے لئے مولانا نے اگست ۱۹۴۸ء ندوۃ العلماء میں ملی ومشاورتی اجتماع منعقد کیا اور نشانِ راہ دیکھایا۔ کلکتہ، راوڑکیلا اور جمشید پور کے فساد کے بعد اس حد تک مضطرب ہوئے کہ جے پرکاش نارائن اور ونوبا بھاوے سے گاندھی جی کا رول ادا کرنے کی گذارش کی اور اس کے لئے طویل سفر کیا۔ مگر بھاوے جی کو گاؤ کشی پر پابندی لگانے سے دلچسپی تھی مردم کشی پر پابندی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور اسی جذبہ سے مولانا نے ہندوستانی سیاست پر مسلمانوں کی اثراندازی کے لئے قائدین ملت کے ساتھ[1] مسلم مجلس مشاورت کے قیام کو ضروری سمجھا اور کوشش کی بقول خود!

> "ایک ایسی ملت ملک کی سیاسیات اور جمہوری طریقہ سے اثرانداز ہونے سے کیسے کنارہ کشی اختیار کر سکتی ہے جس کے دین کا دائرہ اور تصور پوری زندگی پر محیط ہے وہ مذہب بندہ اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے کے مسیحی تصور پر یقین نہیں رکھتی"[2]

مسلمانوں کے معاشرتی حقوق اور عائلی قوانین کی حفاظت کے لئے مسلم پرسنل لا بورڈ کو قائم کرنے والے علماء امت کے شانہ بشانہ رہے اور بورڈ کے دوسرے صدر منتخب ہوئے۔

مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے انتظام اور ان کو مشرکانہ ماحول نیز حکومت کی تعلیمی پالیسی کے مضر اثرات سے بچانے کے لئے مسلسل فکرمند اور کوشاں رہے، قاضی عدیل

---

[1] مولانا محمد مسلم ایڈیٹر دعوت، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، مفتی عتیق الرحمان عثمانی اور مولانا منظور نعمانی [2] کاروان زندگی ۲/۸۶

www.abulhasanalinadwi.org

عباسی (علیگ) مرحوم کی برپا کردہ دینی تعلیمی کونسل منعقدہ ۱۹۵۹ء کے تاعمر صدر نشین رہے، حکومت اتر پردیش کے وندے ماترم، بھوج منتر اور دیگر مشرکانہ اعمال کو اسکولوں میں لازم کرنے کے خلاف احتجاجی پروگراموں کی سرپرستی کی اور اعلان کیا کہ ہم اسلامی اصولوں اور اسلام کے مسلک زندگی کے معاملہ میں کسی قسم کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ جس کا نہ صرف ملت نے اثر قبول کیا بلکہ حکومت کو بھی اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

مسلمانوں کی دینی و فلاحی انجمنوں اور اداروں کی سرپرستی کی، دینی مدارس کی رہنمائی کی اور متوازن نظام تعلیم کے رجحان کو فروغ دیا، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی سربراہی کی اسے ہندستان ہی نہیں عالم اسلام میں پروقار اسلامی مرکز کی حیثیت سے متعارف کرایا اور اس کی سیکڑوں شاخوں کے قیام کے ذریعہ اسے سلسلۃ الذہب بنادیا۔

رابطہ عالم اسلامی میں ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کی تو رابطہ ادب اسلامی قائم کر کے ہم عصر ادیبوں، دانشوروں اور فن کاروں کو بازاری ادب کا سوداگر بننے کے بجائے تعمیری ادب کا پیامبر بننے کے راہ دکھائی یعنی بقول حضرت حفیظ میرٹھی مرحوم!

رعنائی افکار وخیالات کا مطلب
عریانی افکار وخیالات نہیں ہے

برادران وطن کو آخرت اور انسانیت کا درس دینے کے لئے ہندو مسلم مخلوط اجتماعات منعقد کئے، تقریریں کیں، مقام انسانیت سے روشناس کرایا اور پیام انسانیت کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی جس کے آخر تک وہ روح رواں رہے۔ مولانا کی ان خدمات کا اعتراف ہندوستان اور عالم اسلام نے اعزازات اور ایوارڈ کی شکل میں کیا ہے۔

مولانا محترم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم دار العلوم دیوبند، مدینہ یونیورسٹی اور المجمع العلمی دمشق کی شوریٰ کے معزز رکن رہے تو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

www.abulhasanalinadwi.org

کو بھی اپنی فیض رسانی سے محروم نہیں کیابلکہ ان کے بقول۔

"دارالعلوم دیوبند سے سوائے ایک دوبار کے سفروں کے کوئی رابطہ نہیں رہااس سے زیادہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ربط رہاجہاں باربار طلباء کی یونین میں تقریر کرنے کا اتفاق ہوا، شعبہ اسلامیات اور شعبہ فلسفہ کی طرف سے بھی خطبات کاانتظام کیا گیا"۔[1]

مولانا علی میاں اس یونیورسٹی میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں تشریف لائے اور یونیورسٹی کے ناظم دینیات مولاناابوبکر شیث جونپوریؒ کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔[1] قابل ذکربات یہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کے بعد شعبہ دینیات کے کورس برائے بی اے بی ایس سی کی باقاعدہ کتاب مولانا علی میاں ہی نے لکھی اور علی گڑھ کادوسرا سفر اس سلسلہ میں ۱۹۳۸ء میں کیا، دفتر ناظم دینیات ایس ایس ہال میں دوماہ تک ان کا قیام رہا، جوبقول ان کے "مسلم یونیورسٹی کے احاطہ میں شاید یہ میراطویل ترین قیام ہو"۔[2] یونیورسٹی کے اقلیتی کردار پر حکومت نے ۱۹۷۲ء میں شب خوں مارا تو اولڈبوائز نے دہلی میں (۱۹۷۳ءمیں) "آل انڈیا کنونشن منعقد کیاجس کاافتتاح مولانا ہی نے فرمایا، وہ اس یونیورسٹی میں آخری مرتبہ ۲۶ /اپریل ۱۹۹۸ء کوریاستی دینی تعلیمی کنونشن میں بیماری کے باوجود تشریف لائے اور اپنا صدارتی خطبہ دیاجس کے بعد حکومت نے وندے ماترم کاسرکلر واپس لیا۔[3]

وائس چانسلر صاحب نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیااور یادگار پمفلٹ شائع کیا۔ چنانچہ یونیورسٹی کا یہ حق تھاکہ مولانا کے وصال کے بعد ان کی حیات وخدمات پر سمینار منعقد کرے اور متعدد علمی پروگرام کرے یکم جنوری ۲۰۰۰ء کے پہلے تعزیتی جلسہ، میں جوناظم دینیات کے آفس میں منعقد ہوادیگر تجاویز کے ساتھ ایک سمینار کے انعقاد کی تجویز منظور کی گئی۔ تاکہ ہم اپنے رہنما کے علمی کارناموں سے واقف ہوں ان

---

[1] کاروان زندگی ۱/۱۴۱ [2] ایضاً ص ۱۸۲،۱۸۴ [3] اس اجلاس میں پروفیسر نفیس احمد ڈاکٹراشتیاق حسین قریشیؒ وائس چانسلر جناب محمودالرحمان صاحب اورراقم الحروف کے خطابات ہوئے تھے۔

سے استفادہ کریں اور نئی نسل تک پہونچائیں، آج کا سیمنار اسی تجویز کی عملی شکل ہے۔

میں شکر گذار ہوں وائس چانسلر صاحب کا کہ انہوں نے شرکاء سیمنار کو یونیورسٹی کا مہمان بنایا اور سیمنار کے انعقاد کے لئے حوصلہ افزاء تعاون کیا خوشی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے مولانا علی میاں چیر کے قیام کا اعلان کیا ہے دعا گو ہوں کہ یہ اعلان جلد عملی شکل اختیار کرے نیز مولانا علی میاں کے نام مجوزہ سیرت اکیڈمی معنون کی جائے تو بڑا کار خیر ہوگا۔

مولانا آزاد لائبریری کے لائبریرین پروفیسر نورالحسن صاحب کا میں مشکور ہوں کہ انہوں نے مولانا علی میاں کی کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا ہمیں امید ہے کہ لائبریری میں ایک گوشہ یا گلشن بھی مولانا کے نام پر قائم ہوگا بیرونی اور مقامی شرکاء سیمنار کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے دست تعاون بڑھایا جامعہ ہدایت جے پور کے مہتمم مولانا محمد فضل رحیم مجددی صاحب کا جو سفر حج کے باعث شریک سیمنار تو نہ ہو سکے مگر سیمنار کے مقالات اور مباحث کو طبع کرنے کا انتظام فرمایا اور حرمین شریفین سے دعاؤں اور مشوروں سے نوازتے رہے۔ اور اپنے ان رفقاء کار کا جنہوں نے محنت واخلاص کے ساتھ سیمنار کو عملی شکل دینے کی کوشش کی دست بدعا ہوں کہ اللہ ہماری لغزشوں کو معاف کرے اور اخلاص ولگن کی توفیق دے میں ایک بار پھر آپ تمام حضرات کا تہدل سے خیر مقدم کرتا ہوں اپنی طرف سے، یونیورسٹی کی طرف سے اور یونیورسٹی برادری کی طرف سے۔

وبا اللہ التوفیق والھدایہ

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

کی

فکری و علمی خدمات

مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی
صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاءبورڈ

محترم حضرات! آج ہم اس عظیم شخصیت کی علمی، فکری، ادبی تصنیفی، تحقیقی، ملی وسماجی، دینی وروحانی خدمات پر روشنی ڈالنے کے لئے جمع ہوئے ہیں، جس نے تقریباً ایک صدی پر محیط اپنی خاص زبان، اسلوب، حسن تدبیر وحکمت سے نہ صرف ملت اسلامیہ، ہندیہ کے درمیان رشد وہدایت کا چراغ روشن رکھا بلکہ اپنے داعیانہ اور مجاہدانہ کردار سے ہندوستان میں اسلامی تشخص کے خلاف جاری مسلسل ثقافتی، تہذیبی یلغار کے سایہ میں اسلامی پرچم بلند رکھا۔

آج ہم جس عظیم دانشور، مفکر ومؤرخ، مرشدور ہنما، مجدد وامام، عالم وداعی مفسر وادیب کی خدمات، اثرات اور کارناموں کو اجاگر کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں، یہ ہم سب کا فرض بھی ہے اور ہم پر قرض بھی، وہ شخصیت حضرت مولانا علی میاں کی ذات گرامی ہے میں ناظم دینیات جناب ڈاکٹر سعود عالم قاسمی صاحب کو اس مجلس کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

حضرات! مخدومی ۔ ۔ لحسن علی ندویؒ کی فکری و نظریاتی، تربیتی و تنظیمی جدو جہد کا مرکزی محور امت اسلامیہ رہی بلکہ اس سے بھی آگے وسیع تر انسانیت اور انسانی آبادی کی صلاح و فلاح کی فکر رہی۔ ان کی پوری زندگی بھر کی محنتوں کا نچوڑ یہی ہے کہ امت اسلامیہ کا رشتہ و تعلق اپنے نبیؐ اور اپنی کتاب سے کیسے مربوط و مضبوط ہو، اسوہ ابراہیمی پر وہ کیسے چلے اسی کے لئے وہ نقشہ بناتے اور کام کرتے ان کا ذہن امت کے مسائل، مشکلات و مصائب کے بارے میں ہر آن سوچتا رہتا، اُمت کی اصلاح کے طریقوں اور امت کی طاقت و قوت کے حصول کے لئے نسخوں کی دریافت، امت کی کامیابی اور ترقی کی شکلوں پر غور، امت کے سامنے سچی اور صاف باتیں پیش کرنے کے اسلوب کی تلاش ان کا روز و شب کا معمول تھا، ان کی نظر ہر لحہ دنیا کے نقشہ پر پھیلی امت اسلامیہ پر لگی رہتی اور وہ ہر اٹھنے اور ہر ابھرنے والے خطرات سے امت کو خبردار کرتے اور دلنشیں پیرائے میں رہنمائی کرتے۔ ان کی فکر میں نظر آنے والی وسعت و جامعیت اور حرکیت بلاشبہ کسی مصلح اور مجدد ہی کی شان ہو سکتی ہے دنیا کے عظیم الشان علمی فقہی تاریخی اسلامی سرمایہ پر انکی جس قدر گہری نظر تھی اس کی مثال علماء میں بہت مشکل سے ملے گی، وہ ایسے صاحب نظر، صاحب فکر، بیدار مغز، عالی ہمت متقی انسان تھے جن کے سوز و گداز، محبت و تڑپ، خلوص و ذکر الٰہی اور محبت رسول کی مثالیں بے شمار ہیں۔ ان کے علمی کارناموں پر ایک نظر ڈالنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑے مرتبہ اور شان والے خدا ترس عالم باعمل تھے۔

ان کی تحریریں خواہ کسی زبان میں ہوں امت کے لئے ایک قیمتی ذخیرہ، نعمت اور توشہ ہیں۔ میں نے مولانا کے وسعت افکار، کثرت مضامین، ندرت بیان، حسن بلاغت، لطافت زبان و اسلوب، حرکیت خیالات پر روشنی ڈالنے کی غرض سے خود ان کی تحریروں سے چند خاص اقتباسات منتخب کئے ہیں۔ جو انسان کی حقیقت، امت مسلمہ، مسلم حکمراں، مفاہیم جہاد کی وسعت، جدید تعلیم یافتہ طبقہ، سر سید احمد خاں، اسلامی حکومت، علماء کی ذمہ داریاں، کرنے کے کام، امت کی قیادت کرنے والوں کی خصوصیات

www.abulhasanalinadwi.org

جیسے اہم موضوعات پر مشتمل ہے۔ جس میں اہل علم کو مولانا کی ہمہ گیر جامع فکر کا عکس و نقش نظر آئے گا۔

فلک کو کیا خبر یہ خاکداں کس کا نشیمن ہے
غرض انجم سے ہے کس کے شبستاں کی نگہبانی

کائنات میں انسان کے وجود، انسان کی قوت و طاقت اور حیثیت، انسان کی ضرورت کے موضوع پر فلاسفہ اور علماء نے تحریریں لکھی ہیں اور انسان کیا ہے کے موضوع پر وقیع تحریریں کتب خانوں میں محفوظ ہیں، مفکر اسلام مولانا علی میاںؒ حضرت انسان کے وجود اور کائنات میں اس کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"انسان نہ صرف عقل محض ہے، نہ مجبور محض، جو کسی قانون اور طاقت کے سامنے بے دست وپا ہو، نہ وہ ایسا مشینی پرزہ ہے جو کسی خاص قانون اور پہلے سے مقرر کردہ نقشہ کے مطابق ایک دائرہ میں گردش کرتا رہتا ہے، وہ عقل بھی ہے دل بھی، ایمان بھی ہے، اور وجدان بھی، اطاعت بھی ہے، اور محبت بھی، اور اسی میں اس کی عظمت و شرافت، اس کی طاقت و عبقریت، ذہانت و دقیقہ رسی، امتیاز و برتری اور ایثار و قربانی کا راز پوشیدہ ہے، اسی کی بدولت اس نے دشوار سے دشوار مسئلہ پر قابو پایا، محیر العقول کارنامے انجام دیئے، خارق عادت باتیں اس سے صادر ہوئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی کی وجہ سے وہ "امانت" اس کے حوالہ کی گئی جس سے آسمان زمین اور پہاڑ سب معذرت کر چکے تھے، اس شہپر کی مدد سے اس نے ان بلندیوں پر اپنا نشیمن بنایا جہاں مقرب فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں، حیوانات، نباتات اور جمادات کا کیا ذکر ہے"؟

"اس انسان کا اپنے رب کے ساتھ رشتہ محض قانونی اور عقلی رشتہ نہیں جس کا دائرہ صرف واجبات ادا کرنے، احکام کی تعمیل کرنے ٹیکس دینے اور اس کے بدلہ میں کچھ حقوق حاصل کرنے تک محدود ہو، یہ محبت اور پاکیزہ جذبات کا بھی رشتہ ہے، یہ ایسا رشتہ ہے جس پر ذوق و شوق اور عشق و قربانی، اور دل سوزی و بے قراری کا غلبہ ہونا چاہئے، اور یہ عنصر اس رشتہ میں اس طرح جاری و ساری ہونا چاہئے کہ کوئی عمل اس کے

www.abulhasanalinadwi.org

اثر سے خالی نہ رہنے پائے، دین اس سے منع نہیں کرتا بلکہ اس کی دعوت دیتا ہے، اس جذبہ کو غذا پہونچاتا اور اس کو مزید قوت بخشتا ہے"۔

انسانی فطرت وطبیعت ومزاج انسانی صلاحیت وقبول اور اس کے احساسات وجذبات اس کی نفسیاتی وعقلی اور قلبی صلاحیتوں کے تجزیہ کے موضوع پر اصحاب علم، ماہیرین علوم انسانی نے خوب خوب روشنی ڈالی ہے لیکن مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ نے ایک نئے زاویہ سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"یہ وسیع کائنات اسرار ورموز اور عجائب وغرائب سے اس طرح بھری ہوئی ہے کہ اس کا حسن وجمال عقلوں کو مبہوت بنادیتا اور دہشت وحیرت میں مبتلا کردیتا ہے"۔

"لیکن اگر انسانی فطرت کے اسرار وعجائب، اس کے امکانات اور مخفی صلاحیتوں، قلب انسانی کی گہرائی اور گیرائی، فکر انسانی کی بلند پروازی اور ذہنی افق کی وسعت، روح انسانی کے سوز وگداز، اس کی لامتناہی امیدوں اور آرزوں، اس کی بلند پروازی اور ذہنی افق کی وسعت، روح انسانی کے سوز وگداز، اس کی لامتناہی امیدوں اور آرزوں، اس کی بلند ہمتی وعالی نظری (جس کی کوئی انتہا نہیں اور جو فتوحات، لذتوں اور مسرتوں، ملک وحکومت اور خوشحالی وآسودگی کی کسی مقدار پر قانع نہیں ہوتی) اس کی متنوع اور متناقض، بے شمار اور لامحدود صلاحیتوں کا دنیا کے اسرار وعجائب سے مقابلہ کیا جائے تو یہ وسیع کائنات اس کے سامنے سمندر کے آگے ایک قطرہ صحرا کے مقابل ایک ذرہ کی طرح معلوم ہوگی اور اپنی پوری وسعت کے ساتھ قلب انسانی کی وسعت اور گہرائی میں اس طرح گم ہوجائے گی جیسے ایک چھوٹی سی کنکری ایک بحر بیکراں میں گم ہوجاتی ہے، اس کے مضبوط اور غیر متزلزل ایمان کے آگے پہاڑ ہیچ ہوجائیں اس کی محبت کے بھڑکتے ہوئے جذبات کے تند شعلوں کے سامنے آگ سرد اور خاکستر نظر آئے اور خوف خدا یا کسی ناتواں پر ترس کھانے یا گناہوں سے ندامت پر نکلے ہوئے آنسو کے ایک قطرہ کو دیکھ کر سمندر پانی پانی ہوجائے اور اپنی تنگ ظرف کا ماتم کرے، انسانی سیرت کا جمال، اس کے اخلاق کا حسن اور اس کے جذبات کی لطافت اگر آشکار

www.abulhasanalinadwi.org

ہو جائے تو اس عالم کی تمام رنگینیوں اور دلفریبیوں پر پانی پھیر دے اور حسن کائنات کو مات دے دے، انسان کی ذات اس کائنات میں گوہر مقصود اور بیت الغزل کی حیثیت رکھتی ہے اور خلاق عالم کی نشانیوں میں سب سے بڑی نشانی ہے، جسے اس نے بہترین صورت مکمل سیرت، اور عمدہ ترین ساخت عطا کی ہے"۔

"انسان اگر اپنے آپ کو پہچان لے اور اپنی قیمت طلب کرے تو یہ دنیا اس کے دام لگانے سے عاجز ہو جائے، اور اگر اس کی ذات وسعت اختیار کر لے اور اپنے عزم وہمت کی عنان ڈھیلی چھوڑ دے اور اپنی فطرت کو اس کے بہاؤ پر ڈال دے تو یہ دنیا اس کے لئے تنگ ہو جائے اور سمٹ کر اس کے لئے بے روشنی اور ہوا کا پنجرا ثابت ہو"

گھٹے اگر تو بس ایک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سمانہ سکے

"فطرت انسانی کی گہرائیوں کو نہ ناپا جا سکتا ہے نہ اس کی تہ تک پہنچا جا سکتا ہے نہ اس کے اسرار کا احاطہ ہو سکتا ہے، نہ اس کی ماہیت وحقیقت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے اس کی حیرت انگیز اور اعجاز نما صلاحیتیں، اس کا علم وحلم، اس کی شرافت وکریم النفسی، اس کی شفقت ومحبت، اس کا رحم وکرم، اس کے شعور کی لطافت اس کے احساس کی نزاکت، اس کا زہد وایثار، اس کی خودداری وانکساری، معرفت الٰہی کی استعداد اور فنافی اللہ ہونے کا ذوق، بنی نوع انسان کی خدمت کا شوق اور پیچیدہ، مشکل اور نئے نئے علوم وفنون کی لگن، یہ سب ایسی چیزیں ہیں، جن کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی اور ذہین ترین لوگوں کا دماغ چکرا جاتا ہے"۔

مذہب وشریعت نے انسانی ضروریات کا لحاظ رکھا ہے یا نہیں؟ اس اہم موضوع پر مذہب پر اعتراضات کرنے والوں کا جائزہ لیتے ہوئے مفکر اسلام نے دین کی حیویت وحرکیت کے موضوع پر اپنے قلم سے ایک خاص نقطہ کی طرف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

"جو دین کا شارع ہے، وہ انسان کا خالق بھی ہے، وہ انسان کی ضروریات، اس

www.abulhasanalinadwi.org

کی فطرت اور اس کی طاقت و کمزوری سے واقف ہے۔ اس لئے تشریع الٰہی اور شریعت سماوی میں ان سب چیزوں کی رعایت ہے، مگر جب انسان خود شارع بن جائے گا تو اس کا لحاظ نہیں رکھ سکتا"۔

موجودہ دور میں اسلام کے تصور جہاد اور نظام جہاد پر بہت ساری کی تحریرین لکھی جاتی رہی ہیں حضرت مولانا نے اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک متوازن راہ کی طرف اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں۔

"جہاد صرف جنگ و قتال ہی پر منحصر نہیں ہے، بلکہ ہر وہ کوشش جو اعلاء کلمۃ اللہ اور دین کے غلبہ کی خاطر کی جائے جہاد ہے، سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ ظالم حکمراں کے سامنے حق و انصاف کی بات کہی جائے"۔

تمام مسلمان ایک امت ہیں، رنگ و نسل خطہ و علاقہ وحدت امت کی راہ میں حائل نہیں ہیں اس موضوع پر مولانا موجودہ عہد میں امت کو خاص سبق یاد لاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں کے لئے بالکل اس کی گنجائش نہیں ہے کہ اپنے دینی بھائیوں اور کمزور مظلوم مسلمانوں کے حالات سے چشم پوشی اختیار کرلیں، اور تغافل برتیں جو دنیا کے کسی گوشہ میں ظلم و بربریت، ذلت واہانت، تعذیب وایذا رسانی، اور طرح طرح کے سفاکانہ اور بہیمانہ مظالم کے نشانہ بنائے جارہے ہوں، اور ان کا قصور صرف اتنا ہو کہ وہ مسلمان ہیں، مسلمانوں کی یہ مجموعی ذمہ داری ہے کہ اس صورت حال کو تبدیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں، اور ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑنے والے ان مجرموں کو کم سے کم اپنی ناپسندیدگی، نفرت، اور شدید بے چینی کا احساس دلائیں، کیوں کہ صحیح حدیث میں آپ کا ارشاد گرامی ہے" :

"تم مومنوں کو اپنی آپس کی شفقت، الفت و محبت اور ہمدردی میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے کہ جس کا ایک عضو اگر تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو سارے اعضاء بے خوابی اور بخار میں اس کا ساتھ دیتے ہیں"۔

www.abulhasanalinadwi.org

"مسلمانوں کے حالات کی جو شخص فکر نہ کرے، وہ ان میں سے نہیں"۔

مولانا نے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی تعمیر کرنے والی شخصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو شاندار اسلوب میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ:

"سر سید احمد خاں ایسی طاقتور شخصیت کے مالک تھے جس سے زیادہ طاقتور شخصیت اس دور کے قائدین میں کسی کی نظر نہیں آتی، انھوں نے ایک بڑے وسیع محاذ پر جنگ جاری رکھی، جس تحریک کی انھوں نے قیادت کی اس کو ایسی کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی نئی نسل کو اتنا متاثر کیا جتنا کسی دوسری تحریک نے نہیں کیا تھا، سر سید احمد خاں کی طاقتور شخصیت کے اثر کا ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں دائرہ بہت وسیع ہے، انھوں نے ادب وزبان، طریق فکر واسالیب بیان سب کو کم وبیش متاثر کیا، اور ایک ایسے ادبی وفکری دبستان کی بنیاد ڈالی جس کے اندر بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں"۔

"اس عظیم تعلیمی تحریک نے جس کی قیادت سر سید احمد خاںؒ نے پوری نصف صدی تک خلوص اور قابلیت کے ساتھ کی تھی، بعض ناقابل انکار نتائج پیدا کیے، اس نے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں اس تعلیمی اور اقتصادی خلا کو بڑی حد تک پر کیا جو انگریزی اقتدار اور انقلاب حکومت کے بعد پیدا ہو گیا تھا، ایک حد تک اس نے مسلمانوں سے مایوسی اور بد دلی بھی کم کی، اس ادارہ میں بعض بڑے لائق نوجوان، صاحب فکر، صحافی، اہل قلم اور ایسے لیڈر پیدا ہوئے جنھوں نے بعد میں تحریک خلافت اور تحریک آزادی ہند کی پر زور رہنمائی کی"۔

علوم اسلامیہ کی تشکیل جدید اور فقہ اسلامی کی تدوین نو اور تعبیر جدید نیز اجتماعی اجتہاد جیسے اہم مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"عالم اسلام میں ایک ایسی طاقتور عالمگیر علمی تحریک کی کمی برابر محسوس کی جارہی ہے، جو جدید طبقہ کا اسلام کے علمی ذخیرہ سے رشتہ ورابطہ قائم کر سکے، اسلامی علوم میں

www.abulhasanalinadwi.org

نئی روح پھونک سکے اور اس حقیقت کو ثابت کر سکے کہ اسلامی قانون اور فقہ نہایت وسیع اور ترقی پذیر قانون ہے، اور وہ ایسے ابدی اصولوں پر قائم ہے جو کبھی فرسودہ اور از کار رفتہ نہیں ہو سکتے، جس میں زندگی کے تغیرات و ترقیات کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے، اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی و انسانی قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہیں، یہی عصر حاضر کا وہ ضروری کام ہے، جو اسلامی ملکوں اور موجودہ اسلامی معاشرہ کو ذہنی و معاشرتی ارتداد سے بچا سکتا ہے، اور مغرب زدگی اور تجدد کے اس تیز دھارے کو روک سکتا ہے، جو عالم اسلام میں اس وقت اپنی پوری طغیانی پر ہے"۔

جدید عصری علوم کے ماہرین و فارغین کی کارکردگی اور ان کے تعمیری کردار کو سراہتے ہوئے مولانا جدید و قدیم کے خلیج کو پاٹنے کے لئے اور جدید تعلیمی نظام میں تیار ہونے والے افراد کی خصوصی تربیت اور ان سے استفادہ کی شکلوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو اپنی مخصوص عصری تربیت اور جدید صلاحیتوں کی بنیاد پر قیادت و رہنمائی کے منصب پر فائز ہے اپنی ان تمام کمزوریوں کے اور مزاج کے باوجود، جو مغربی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے، سلامت فہم اور قبول حق کی استعداد و صلاحیت سے محروم نہیں، بلکہ عام طور پر وہ قوت فیصلہ، قوت عمل اور حقیقت پسندی میں بعض دوسرے طبقوں سے بھی ممتاز ہے، اس طبقہ کے بہت سے افراد جب کسی بات کو صحیح اور حق سمجھ لیتے ہیں تو بڑے جوش اور انہماک کے ساتھ اس کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اس طبقہ میں بکثرت ایسے افراد پائے جاتے ہیں جن کو اسلام سے گہرا تعلق اور سچا عشق ہے، اس طبقہ سے اسلام کو بعض بڑے صحیح الخیال، عمیق النظر مفکر، اسلام کے شیدائی اور سرفروش مجاہد حاصل ہوئے، بہت سے دینی دعوتوں اور اسلامی تحریکات کو اسی طبقہ سے پرجوش داعی، اور باعمل سپاہی ملے، مشرق وسطی میں سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ، اور شیخ حسن البنا کو اور ہندوستان میں تحریک خلافت سے لیکر عصر حاضر کی تمام دینی تحریکات کے قائدین کو اسی طبقہ میں سے اپنے بہترین

www.abulhasanalinadwi.org

کار کن ہاتھ آئے اب بھی اگر دین کے داعی بے لوث اور مخلصانہ طریقہ پر اس کو دین سے مانوس کرنیکی کوشش کریں، ان کے ذہن کی ان شکنوں کو دور کر دیں جو مغرب کی مخصوص مزاج کی تعلیم نے ڈال دی ہیں، اور ایمان کی اس چنگاری کو متحرک کرنے میں کامیاب ہو جائیں، جو اب بھی ان کے دل و دماغ کے اندر دبی ہوئی ہے تو اب بھی اس طبقہ میں اقبال و محمد علی جیسے صاحب فکر و صاحب عمل افراد پیدا ہو سکتے ہیں، یہ دین کے داعی کے لئے ایک ایسا حیرت انگیز لیکن مسرت بخش انکشاف ہو گا کہ اس کی زبان سے بے اختیار نکلے گا کہ "۔

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

دعوت دین کی ضرورت اور تقاضے کے اہم ترین موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"ہم مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم نے پیغمبروں کے کام اور پیغام کی بڑی ناقدری کی، تم مجرم ہو، تم دراصل سرمایہ کو چھوڑ کر ذلیل سرمایہ داروں کے ایجنٹ بن گئے تم نے بھی تاجرانہ ذہنیت اپنالی اور بیوپاری بن گئے، تمہاری حیثیت بیوپاری اور ملازم کی نہیں تھی، تم یہاں داعی کی حیثیت سے آئے تھے، تم نے داعیانہ حیثیت اور اپنے آنے کا مقصد کھو دیا تم دعوت و محبت کے پیام کے ساتھ جیتے تو عزت سے جیتے اور کامیاب و بامراد جیتے رہتے، اب تمہاری فلاح اس میں ہے کہ اب تم اپنی کھوئی ہوئی حیثیت اختیار کرو، دنیا کی فلاح اس میں ہے کہ وہ پیغمبروں کے پیام کی قدر کرے، سیاسی پارٹیاں اور مختلف جماعتیں قیادت کی جنگ او غلبہ واقتدار کی کشمکش چھوڑ کر زندگی کے اس بگڑے ہوئے نقشہ کو بنانے کی کوشش کریں اور اپنے متعلقین اور دوستوں کے بجائے ساری انسانیت کی فکر کریں کہ اس کے سدھار کے بغیر کسی کو چین اور امن حاصل نہیں ہو سکتا"۔

مغرب سے مرعوبیت پر سخت تنقید کرتے ہوئے وہ اسلامی قیادت، مسلم مفکرین اور امت کو یوں مخاطب کرتے ہیں کہ :

www.abulhasanalinadwi.org

''ہم علم مغرب سے لیتے ہیں زندگی کا معیار مغرب سے لیتے ہیں، یہاں تک کہ ہم دینی نظریات اور دینی تحقیقات بھی مغرب سے لیتے ہیں۔ اس وقت علوم اسلامیہ میں بھی انہی مغربی یونیورسٹیوں کی نظر دیکھی جاتی ہے، مستشرقین کا لوہا نہ صرف مغرب میں بلکہ مشرق میں بھی مانا جاتا ہے، اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ مستشرقین جو کچھ کہہ دیں وہ حرف آخر ہے، اور اس پر کسی تبصرہ کا کوئی جواز نہیں، یہ وہ صورت حال ہے، جس سے اس وقت کوئی اسلامی ملک مستثنی نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حقیقی آزادی سے فائدہ اٹھانے کا ملکوں اور قوموں کو ابھی تک موقع نہیں مل سکا، ان کے دماغوں پر مغرب کے تفوق، مغرب کے نظریات اور زندگی کے مغربی نقطۂ نظر کا اتنا بڑا بوجھ رکھا ہوا ہے کہ اس بوجھ کے نیچے یہ قومیں دبی بلکہ کچلی جا رہی ہیں''۔

مسلم دنیا کے حکمرانوں پر تنقید کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں :۔

''ان ملکوں کی زمام قیادت یعنی ان کی باگ ڈور جن کے ہاتھ میں ہے وہ مغربی نظریات پر پورا پورا عقیدہ رکھتے ہیں گو ان کا نام مسلمانوں کا ہے ان کی رگوں میں مسلمانوں کا خون ہے وہ بہت اچھے اور قابل فخر خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو اسلام سے انکار بھی نہیں، لیکن ان کا ذہن ان کا عقیدہ بالکل مغربی سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے''۔

''جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہے، وہ زندگی کا بالکل ایک دوسرا نقطۂ نظر رکھتے ہیں، انکا عقیدہ بہت سی اسلامی حقیقتوں پر سے متزلزل ہو چکا ہے''۔

تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلام خس و خاشاک

علماء طلباء اور وارثین علوم نبوت کے تضادات پر تنقید کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں :

''نبوت محمدیؐ سے صرف علوم و احکام لینا اور کیفیات و اوصاف کو ترک کر دینا ناقص وراثت ہے، اور ناکمل نیابت، دنیا میں جن لوگوں نے نبوت کی نیابت کی اور

www.abulhasanalinadwi.org

اسلام کی امانت ہم تک پہونچائی، وہ صرف ایک حصہ کے امین نہ تھے، وہ دونوں دولتوں سے مالامال تھے، اب بھی اسلام کی دعوت، اور اسلامی انقلاب صرف پہلے حصہ سے برپا نہیں کیا جاسکتا، آپ کو جن اسلاف کی طرف نسبت کا شرف حاصل ہے، وہ بھی ان دونوں خصوصیتوں کے جامع تھے، آپ اگر حقیقی نیابت کے منصب بلند پر سرفراز ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو اس جامعیت کی کوشش کرنی پڑے گی، اس کے بغیر علم وفن کی صناعی کاغذی پھول ہیں، جن میں نہ خوشبو نہ تازگی، آج دنیا کے بازار میں کاغذی اور ولایتی پھولوں کی کمی نہیں، ہم اور آپ اس میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کرسکتے، یہاں تو نبوت کے باغ کے شاداب پھول چاہئیں، جو شام جاں کو معطر کردیں اور جن کے سامنے دنیا کے پھول شرما جائیں"۔

مدارس سے فارغ ہونے والے بے صلاحیت و بے اثر اور سماج سے بے تعلق زمانہ کی ضرورت وزبان اور وقت کے فکر ورجحان سے نابلد اور ناواقف گروہ کی عدم فعالیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں
نہ گرمی افکار، نہ اندیشہ افکار

"ہمارے مدارس سے جس تعداد میں لوگ فارغ ہوکر نکلتے ہیں کبھی اس تعداد میں نہیں نکلتے تھے، لیکن زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈال رہے ہیں۔ پہلے اسی ملک میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ یا سید علی ہمدانی کشمیریؒ جیسا ایک فقیر آتا اور پورے کے پورے ملک کو اپنے قلب کی حرارت اور اپنے ایمان کے نور سے بھر دیتا، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے حکومت مغلیہ میں انقلاب برپا کردیا، انہیں کی خاموش مساعی کا نتیجہ ہے کہ ہم اکبر کے تخت پر اورنگ زیب جیسے فقیہ و متشرع بادشاہ کو دیکھتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس طویل وعریض ملک کا رجحان بدل دیا، اور پورے نظام فکر اور نظام تعلیم پر گہرا اثر ڈالا، مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ایک عام مایوسی اور پسپائی کے دور میں اتنا بڑا اسلامی قلعہ تعمیر کردیا، اور علوم شریعت کو ایک نئی زندگی بخش دی، ابھی پچھلے

www.abulhasanalinadwi.org

عرصہ میں مولانا محمد الیاسؒ نے ایمان اور دینی وجد جہد کی ایک نئی روح پھونک دی"۔

"آج ہمارے فضلاء اس روح سے خالی، ان کیفیات سے عاری اور اس قوت سے محروم ہیں، جو لوگوں کو نئے سرے سے سوچنے اور بدل جانے پر مجبور کر دیتی تھی، زمانہ بڑا حقیقت شناس ہے، وہ صرف بلندی کے سامنے جھکتا ہے، دماغ بلند دماغ کے سامنے جھکتے ہیں، اور خالی اور سرد دل معمور اور گرم دل کا لوہا مانتے ہیں، ہمارے مدارس میں دماغی انحطاط بھی روز افزوں ہے اور قلبی افسردگی بھی روبہ ترقی"۔

علماء اسلام کو حالات کی سنگینی اور وقت کے چیلنج سے باخبر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"علماء اسلام کی ذہانت اور جذبہ خدمت نے کبھی کسی منزل پر قیام اور کسی لکیر کا فقیر بننا گوارا نہیں کیا، انھوں نے علم کے چلتے پھرتے قافلہ کا ساتھ دیا، ان کا ہاتھ زمانہ کی نبض سے کبھی جدا نہیں ہوا، ان کی نگاہ زندگی کے بدلتے ہوئے تیوروں سے کبھی ہٹی نہیں، انھوں نے اسلام کی خدمت کے لیے جس زمانہ میں جس چیز طرز اور جس اسلوب کی ضرورت سمجھی، بلا تکلف اختیار کر لیا، انھوں نے اسلام سے وفاداری اور دین کی خدمت گذاری کا عہد کیا تھا، انھوں نے کسی مدرسہ فکر کسی مکتب خیال اور کسی انداز فکر سے وابستگی کی قسم نہیں کھائی تھی، ہندوستان و مصر میں جب اسلام پر تمدن و تہذیب اور تاریخ وادب کی راہ سے حملے شروع ہوئے اور مغربی مصنفین اور مستشرقین نے اسلام کی مستند شخصیتوں اور اس کے معیاری عہد پر اعتراضات کئے اور اسلام کے خدوخال کو بگاڑ کر بدنما شکل میں پیش کیا تو طبقہ علماء ہی میں سے ایسے اہل قلم اور ادیب و مصنف آگے بڑھے جنھوں نے ان مضامین پر ایسی کتابیں لکھیں جو نہ صرف اسلامیات بلکہ اردو ادب میں بھی یادگار ہیں، اور جنھوں نے جدید تعلیم یافتہ اصحاب میں سے ہزاروں کو نیا اطمینان اور دماغی سکون عطا کیا، اور نہ صرف ان کا تذبذب دور ہوا بلکہ اسلام سے شیفتگی پیدا ہو گئی"۔

موجودہ ہندوستانی قیادت اور اس کے خطرناک فکری رجحان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور اسلام کے ناقابل تبدیل اور ناقابل تنسیخ اصولوں کو بیان کرتے ہوئے

www.abulhasanalinadwi.org

کہتے ہیں۔

"اس وقت جو ذہن ہندوستان کی قیادت کر رہا ہے وہ ہر اس چیز سے بھڑکتا ہے جو کسی قسم کا امتیاز اور تشخص پیدا کرتی ہے"۔

"لیکن ہمارے دین کے حدود معین ہیں، ہمارے دین کے اس "اکال الامم" سرزمین میں اپنی جداگانہ شکل وصورت کے ساتھ باقی رہنے کا راز اسی میں مضمر ہے کہ اس میں آریائی مذاہب کی طرف اطلاقیت، یا تعینات سے گریز، اور رقت وسیالیت نہیں ہے، جس نے ہمہ اوست کے عقیدہ یا وحدۃ ادیان کے فلسفہ کو جنم دیا، ہمارے یہاں کفر وایمان شرک وتوحید، ضلالت وہدایت اور حلال وحرام کے درمیان واضح طریقہ پر خط کھینچا ہوا ہے"۔

مولانا نے نفع ونقصان، بقاء وفناء کے فلسفہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک عجیب نکتہ کی طرف اشارہ کیا اور امت کو یہ بتانا چاہا کہ پوری انسانیت کے لئے اگر وہ نفع پہونچانے والے کام، پیام اور نظام چلاتی اور دیتی ہے تب تو وہ اس نافعیت کی بنیاد پر باقی رہ سکتی ہے کیونکہ اللہ ایک سنت ہے فرماتے ہیں:

"اللہ تعالی کا جو نظام اس کائنات میں جاری وساری ہے، جو ہمیں قرآن مجید اور تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، وہ بقائے انفع کا قانون ہے، یوں تو اس وقت دنیا نے جس قانون کو تسلیم کیا، وہ بقائے اصلح کا قانون ہے، لیکن حقیقت میں قرآن مجید سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے، وہ بقائے انفع "کا قانون، صاف صاف قرآن مجید میں ہے جس چیز میں کوئی نافعیت نہیں جس چیز میں کوئی پیام نہیں ہے، جو چیز کوئی اہم خدمت انجام نہیں دے رہی ہے، جس پر انسان کی بقاء اور نشو ونما اور انسان کی راحت اور ترقی کا کوئی انحصار نہیں ہے، اس کو قرآن مجید نے "زبد" کے لفظ سے ادا کیا ہے، جو بہت ہی جامع اور نہایت وسیع اور عمیق لفظ ہے، اور معانی سے لبریز ہے "زبد" پھین کو کہتے ہیں، یعنی دریا کا وہ جھاگ جو اپنے اندر کوئی ہستی نہیں رکھتا، جس کے اندر ثبات واستقامت کی کوئی صلاحیت نہیں، وہ دریا کے جوش کی ایک نمود ہے، دریا کے جوش کا ایک خارجی

www.abulhasanalinadwi.org

ظہور ہے، اس کے اندر کوئی استقرار نہیں، کوئی صلابت نہیں، بس ایک پھولی ہوئی سی چیز ہے، جس کے اندر ہوا بھر گئی ہے، یا یہ کہئے کہ نیچے کا جو میل کچیل تھا، وہ اوپر آگیا ہے، اس کے اندر انسانوں کو فائدہ پہنچانے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے، وہ اوپر اوپر بہہ جائے گا، یا کنارہ پر جا کر کہیں کسی چیز سے اٹک جائے گا اور باقی نہیں رہے گا، اس لئے کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا کہ "زبد" کی سمائی ہو، اگر دریاؤں کا جھاگ اور پانی کا پھین اس طرح باقی رہنے لگے تو جن کو باقی رہنا چاہئے ان کے لئے مشکل ہو جائے، لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ ٹھہر جاتی ہے"۔

"زمانہ جس زبان کو سمجھتا ہے وہ نفع کی زبان ہے، وہ زندگی کے استحقاق کی زبان ہے جیسا کہ اقبال نے کہا ہے، ایک جد و جہد ہے، زندگی کوئی خیرات نہیں، زندگی تو خود حاصل کی جاتی ہے، آپ اس کا استحقاق پیدا کر لیجئے تو دنیا آپ کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی، جرمنی کو دو دو ہولناک جنگوں کے بعد بھی اس لئے باقی رکھا گیا کہ اس نے اپنی صلاحیت کا ثبوت دیا، اس کو ہمیشہ کیلئے کوئی ختم نہیں کر سکا، بہت سی قومیں دنیا میں ہیں جو بالکل ختم ہو گئیں، لیکن بہت سی قومیں ایسی ہیں جو بار بار شکست کھانے کے بعد بھی باقی ہیں، مسلمانوں نے تاتاریوں سے شکست کھائی تھی، لیکن چونکہ ان کے اندر "ما ینفع الناس" کا مادہ تھا، وہ ایک پیام رکھتے تھے، وہ ایک زندہ دعوت رکھتے تھے، اسلئے تاتاریوں کو ان کے سامنے جھکنا پڑا، وہ تاتاریوں کے سامنے جھکے، ان کی تلوار کے سامنے جھکے، لیکن تاتاریوں کی تلوار کو، دلوں کو، اور دماغوں کو ان کی نافعیت کے سامنے، اور ان کے پیام کے سامنے جھکنا پڑا"۔

اسلام کی برتری اور روحانی قوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اسلام جس کو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے، وہ آج بھی دنیا کی عظیم ترین روحانی طاقت ہے، اور آج اس کے ساتھ ایک عظیم الشان امت ہے، آج بھی وہ ایک

تہذیب رکھتا ہے، اور بہت سی سلطنتوں اور قوموں کا مذہب ہے، نبوت محمدی کا آفتاب آج بھی بلند اور روشن ہے اور تاریخ کے کسی دور میں بھی وہ گہن میں نہیں آیا"

شرعی حکومت اور اسلامی خلافت کے قیام کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے بہت واضح الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"رسول اللہ ﷺ کا دنیا میں ایک بہت بڑا کام اور آپؐ کی بعثت کا ایک اہم مقصد انسانوں پر اللہ کی حکومت و شریعت کا قائم کرنا، زمین میں آسمانی نظام سیاست واخلاق و معاشرت کا جاری کرنا تھا، شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل بھی نہیں ہو سکتا، اسلام کے نظام عمل کا ایک مستقل حصہ ایسا ہے، جو حکومت پر موقوف ہے، حکومت کے بغیر قرآن مجید کا ایک پورا حصہ ناقابل عمل رہ جاتا ہے، خود اسلام کی حفاظت بھی قوت کے بغیر ممکن نہیں، مثال کے طور پر اسلام کا پورا نظام مالی و دیوانی و فوجداری معطل ہو جاتا ہے، اسی لئے قرآن غلبہ و عزت کے حصول پر زور دیتا ہے، اور اسی لئے خلافت اسلامی بہت اہم اور مقدس چیز سمجھی گئی، اور اس کو اکابر صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی تجہیز و تکفین پر مقدم رکھا، جسے بہت سے کوتاہ نظر نہیں سمجھتے اور اسی کی حفاظت کے لئے حضرت حسینؓ نے اپنی قربانی پیش کی تاکہ اس کا مقصد ضائع نہ ہو اور وہ نااہل ہاتھوں میں جانے نہ پائے"۔

"اہل علم جانتے ہیں کہ امر و نہی کے لفظ میں اقتدار اور تحکم کی شان ہے یہ نہیں فرمایا کہ وہ بھلائی اختیار کرنے کے لئے درخواست و عرض کریں گے، پس امر و نہی کے لئے سیاسی اقتدار اور مادی قوت کی ضرورت ہے اور امت کا فریضہ ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے۔ ظاہر ہے کہ تغیر بالید (ہاتھ سے بدل دینے اور عملی اصلاح) کے لئے قوت و اختیار کی ضرورت ہے، زبان سے روکنے کے لئے بھی کچھ قوت اور آزادی کی ضرورت ہے"۔

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟ خاص طور پر قوم رسول ہاشمی کی قیادت و سیادت کے موضوع پر دینی قائد اور رہنما کے اوصاف و خصوصیات اور

www.abulhasanalinadwi.org

صلاحیتوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"جماعتی کام کی ذمہ داری، ایک بڑی دینی تحریک کی قیادت، مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کی امامت و امارت جس میں مختلف المذاق افراد، مختلف صلاحیتوں اور استعدادوں کے اشخاص ہوں، بڑی وسیع اور متنوع صلاحیتوں کی طالب ہے، اس کیلئے ایسا شخص موزوں ہو سکتا ہے، جو بیدار مغز، عالی دماغ فراخ حوصلہ، کشادہ قلب، عالی ظرف متحمل، سلیم الفہم، متوازن دماغ اور جوہر شناس ہو جس میں مختلف شعبوں اور کارخانوں کے چلانے اور مختلف عناصر اور متضاد طبائع کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت ہو، جو اپنے مقاصد اور دین کی ترقی و عروج کے لئے ہر صلاحیت اور ہر جوہر اور ہر کمال کی قدر کرنے والا ہر استعداد اور ہر سطح کے آدمی کی تربیت و ترقی کی قابلیت رکھتا ہو اور اس کے جوہر کو چمکا سکتا ہو، کسی سطح اور کسی استعداد کا آدمی اس کے پاس آکر اپنے کو بیکار اور اپنی زندگی کو ضائع سمجھنے پر مجبور نہ ہو، اور کوئی صاحب ہنر اور صاحب کمال اس کے پاس پہنچ کر اپنے ہنر اور اپنے کمال پر متاسف اور نادم نہ ہو، وہ مختلف باغوں اور مختلف خوشبو کے پھولوں سے ایک ایسا انسانی گلدستہ تیار کر سکتا ہو جس کے سب پھول ایک مقصد کے رشتے سے جڑے اور محبت کے دھاگے سے بندھے ہوئے ہوں اور ان کی مجموعی خوشبو سے مجلس معطر ہو، شعبوں کی کثرت، رفقاء کا اختلاف ذوق اور ان کی صلاحیتوں اور استعداد کا نشیب و فراز اس کی طبیعت میں انتشار نہ پید کر سکے۔ وہ ایک کی قدردانی کے لئے دوسرے کی دل شکنی اور ناقدری ضروری نہ سمجھے بلکہ ہر ایک سمجھے "انہ اکرم علیہ من صاحبہ" (وہ سب سے زیادہ مقرب اور عزیز ہے) وہ انسانی فطرت سے کشمکش اور زور آزمائی نہ کرے، بلکہ اس کی رعایت اور احترام کرتے ہوئے مشترک مقصد کے لئے اسکے ملکات اور صلاحیتوں کی پرورش کرے اور ان کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنائے"۔

آخر میں میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اتحاد امت، بقاء امت، تحفظ امت کے لئے کوششیں کرنے اور صحیح خطوط پر کام کرنے اور باہم اشتراک و تعاون کرنے کی توفیق بخشے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں نئی نسل کے معمار

مولانا سید محمد نظام الدین
سکریٹری جنرل آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایسے نقوش چھوڑ کر گئے ہیں جو تا قیامت زندہ و جاوید رہیں گے انکی حیات، خدمات، کارناموں اوران کے علمی کمالات پر گفتگو جاری رہیگی مولانا محمد سعود عالم قاسمی صاحب نے بڑی جامعیت کے ساتھ اپنے خطبہ استقبالیہ میں حضرت مولانا کی شخصیت اوران کے کارناموں پر روشنی ڈالی شیخ الجامعہ صاحب نے بھی اپنے انداز میں مولانا کے ساتھ اپنے اور اپنے خاندانی تعلق کو بیان فرمایا اور خصوصیت کے ساتھ ہمارے ڈاکٹر محسن عثمانی صاحب کا خطبہ آپنے سنا جنہوں نے بڑے اچھے پر کشش اور دلچسپ انداز میں مولانا کی زندگی پر روشنی ڈالی جو ادبی نثر کا نمونہ تھا ڈاکٹر جلیل شمسی صاحب نے مولانا کی صبر و استقامت پڑ روشنی ڈالی میں کچھ باتیں مولانا کی مردم سازی سے متعلق عرض کروں گا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ کا اجلاس بمبئی میں ہونے والا تھا اور وہ انتخابی اجلاس تھا جس میں صدر اور دوسرے عہدیداروں کا انتخاب ہونے والا تھا مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ

یہ مضمون مولانا علی میاں سمینار ۲۵ رمارچ ۲۰۰۰ ایم یو کے صدارتی خطبہ پر مشتمل ہے

www.abulhasanalinadwi.org

میری حالت ایسی ہے کہ بستر سے اٹھ کر چل نہیں سکتا میری خواہش اور میرا ارادہ ہے کہ اسمیں شرکت کروں مگر وعدہ کرو کہ میری زندگی میں ہی صدر کا انتخاب کرلو گے میری زبان سے بے ساختہ یہ بات نکلی کہ حضرت ادب کا مقام ہے شاعری آپ کے سامنے مناسب نہیں ہے مگر میں کہتا ہوں۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

یہ بات میں نے ان کے سامنے عرض کی تھی اور آج آپ کے سامنے عرض کررہا ہوں کہ مولانا ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے اور انہوں نے کردار سازی کا بھی بڑا کام کیا بہت ہی کم لوگ ہیں جو خود کام کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں سے کام لینا جانتے ہیں۔اور آدمی بنانا جانتے ہیں کردار سازی اور جماعت سازی مولانا کی امتیازی صفت تھی میں انکی خدمت میں جب جاتا تھا کبھی کبھی مسلم پرسنل لا بورڈ کے مسئلہ کی ضرورت سے یا مجلس شوری ندوۃ العلماء کے اجلاس کے موقع پر تو میں دیکھتا تھا کہ رات کے کھانے کے بعد ندوۃ العلماء میں تخصص کی جماعت کے ذہین طلباء کی ایک بڑی تعداد نماز پڑھ کر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتی تھی اور ان کے سامنے تقریباً آدھ گھنٹہ تک یا پینتالیس منٹ تک رہ کر مولانا کی گفتگو سنتی یہ طریقہ تھا دراصل مردم سازی کا یعنی آدمی کیسے بنایا جائے۔

مولانا فرماتے تھے کہ ہمارے ملک میں سب کچھ بنایا جاتا ہے ہر طریقہ کا سامان تیار کیا جاتا ہے لیکن یہاں آدمی بنانے کی کوشش نہیں کی جاتی ہمارا ملک عمارتی ساز و سامان سے مادی دولت سے خوب آراستہ ہے اور اتنا بڑا ملک ہے کہ اس کے کسی حصے کو مال و دولت چاہیے غلہ چاہیے سرو سامان یہاں تک کہ ہتھیار وغیرہ سب کچھ مل جائے گا لیکن کسی زمانے میں بھی یہاں کے لوگوں میں جو اخلاقی انحطاط آرہا ہے اگر اس کا احساس ہو گیا اور ان کو انسانی اخلاق کی اور شرافت کی ضرورت پڑی تو اس کا خزانہ صرف مسلمانوں کے پاس ہے اور کسی کے پاس نہیں وہ مسلمانوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلایا کرتے تھے کہ یہ بہترین وقت ہے کہ تم اس ملک کو اخلاقی انحطاط سے نکالنے کی کوشش کرو یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔

الحمد للہ مولانا نے اپنی زندگی میں ایک ایسی جماعت پیدا کی ہے جس سے ان کا ادارہ

www.abulhasanalinadwi.org

ندوۃ العلماء برگ و بار لاتا رہیگا۔ ابھی ہم وہاں گئے تھے ہمیں اطمینان ہوا کہ حضرت مولانا کی حیات میں جس طرح وہاں کے لوگ مستعدی کے ساتھ کام کرتے تھے اس سے زیادہ مستعدی کے ساتھ وہ اپنے کاموں میں مصروف ہیں ایسا نہیں کہ انہوں نے مولانا کے غم میں اپنا کام چھوڑ دیا ہو بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر وقت مولانا کی ہدایت اور ان کا پیغام ان کی نگاہوں کے سامنے ہے اور وہ انکی رہنمائی اور انکی موجودگی میں کام کر رہے ہیں۔

دوسری خصوصیت یہ تھی مولانا کے اندر کہ اللہ نے ان کو جامعیت عطا فرمائی تھی جامعیت اس معنی میں کہ جیسے ان کے مخاطب ہوتے ویسی ہی بات وہ انکے مطابق کرتے اور اس کی وجہ قرآن وسنت کا وسیع مطالعہ تھا۔

قرآن سے شغف اور قرآن سے تعلق مولانا کو بہت تھا حضور ﷺ کی عظمت اور محبت قلب میں جاگزیں تھی اور اس پر ان کا عمل بہت تھا۔ حضرت مولانا کے ساتھ ایک دفعہ سفر ہوا لکھنؤ سے پٹنہ اور پٹنہ سے رانچی مجھ سے ڈاکٹر احمد عبدالحی نے کہا کہ مولانا علی میاں آرہے ہیں ہمارے پٹنہ میڈیکل کالج میں سیرت کا جلسہ ہے ہم چاہتے ہیں کہ مولانا کا اس میں خطاب ہو میں نے کہا کہ آپ کے یہاں سیرت کے جلسے متعدد دیکھ چکا ہوں وہاں ایک تقریر ہوتی ہے اس کے بعد سلام ہوتا ہے ویسے بھی مولانا کی رائے نہیں۔ ہم نے مولانا کے سامنے پروگرام رکھا کوئی شرط نہیں لگائی ہم نے کہا صرف ایک بات ہے کہ جن لوگوں نے آج تک آپکی بات نہیں سنی وہ آپکی بات سن لیں گے مولانا نے اسے منظور کرلیا اعلان ہوگیا۔ جب مولانا کے نام کا اعلان ہوا تو جیسا کہ ابھی ہمارے محترم فرمارہے تھے کہ کہیں بھی پروگرام ہوتا جگہ ناکافی ہوجاتی اتنا بڑا میڈیکل کالج کا ہال تھا وہ بالکل ناکافی ہوگیا اور تمام گیلریاں بھی بھر گئیں اور باہر مردوں عورتوں کا بہت بڑا مجمع ہوگیا۔ مولانا نے پینتالیس منٹ تقریر کی اور انکی تقریر کے وقت بالکل سناٹا چھا گیا نہایت غور سے سب سن رہے تھے اور مجمع ایسا تھا کہ تقریباً ساٹھ ستر فیصد تو غیر مسلم حضرات تھے جن میں اساتذہ اور طلباء دونوں تھے اور تیس یا چالیس فیصد مسلمان طلباء واساتذہ کی تعداد تھی اس کے بعد وہاں سپرنٹینڈینٹ میڈیکل کالج نے تقریر کی اور اس میں انہوں نے کہا کہ میں نے پہلی بار حضرت محمد ﷺ

www.abulhasanalinadwi.org

کے بارے میں اسلام کے بارے اور سیرت رسول کے بارے میں یہ باتیں سنیں مولانا محترم کی زبان سے سن کر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام پوری دنیا میں پھیلنے کا مستحق ہے۔

جناب محمد ﷺ جو اسلام کے پیغمبر ہیں ان کی زندگی میں ساری دنیا مین زبردست روحانی اور اخلاقی انقلاب آیا یہ باتیں ہم کو آج پہلی بار معلوم ہوئیں ہیں لیکن وہ کہنے کا انداز وہاں کے مجمع کے مطابق اصل چیز تھی۔

......مولانا علی میاں کی زبان و ادب پر ذرا غور کیجئے ادب کہتے ہیں جہاں پر جس طریقہ کی بات کہنی چاہئے اسی طرح سے کہہ دینا اسی کا نام ادب ہے جس طرح سے کہنا چاہئے اسکا سلیقہ آ گیا تو سمجھئے کہ وہ ادب کی دلیل ہے۔ اس تقریر میں مولانا کا یہ پہلو بھی دیکھنے کو ملا مولانا علم وادب کے جامع تھے۔

حضرت مولانا کو انسانیت کے موضوع سے بڑی ہمدردی اور دلچسپی رہی کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں خود قرآن کہتا ہے "شاید آپ اپنے آپ کو اس غم میں ہلاک کرلیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کو اس بات کا زبردست احساس تھا کہ مسلمانوں کو اور ہم لوگوں کو جو داعی کی حیثیت رکھتے ہیں پوری انسانیت کی بھلائی کیلئے کام کرنا چاہئے، پوری انسانیت کے فروغ کیلئے اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور اعلیٰ صفات کیلئے جو مٹتی جارہی ہیں کام کرنا چاہئے، جہاں پر انہیں ابھرنا چاہئے تھا وہیں سے صفات مٹتی جارہی ہیں یعنی تعلیم گاہوں سے تعلیم یافتہ مجلسوں سے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم لوگوں کو انسانیت کا صحیح پیغام دیں اسکے لئے مولانا نے پیام انسانیت کی تحریک شروع کی اس کا ایک بڑا اجلاس پٹنہ میں بھی ہوا میں نے اس کے اثرات دیکھے آپ اگر کوئی بات عام طور پر لوگوں کو کہنا چاہتے ہیں اور کہنے کا سلیقہ جانتے ہیں آپ جذباتی نہیں ہیں بلکہ سنجیدہ ہوکر اور یہ کہ ہمت کے ساتھ حالات کا پوری طرح مطالعہ کر کے کہنا چاہتے ہیں تو دنیا آپکی بات سننے کو تیار ہے پیام انسانیت کے اس جلسہ میں مولانا نے تقریر کی اور بہت سے غیر مسلموں نے بھی تقریر کی اور سب کو اس پر متفق ہونا پڑا کہ انسانی معاشرہ کو بڑی اصلاحات کی ضرورت ہے اور اس کا ایک زمانہ تک اثر رہا اور اخبارات میں

www.abulhasanalinadwi.org

بھی اس کا بڑا چرچا رہا۔

ایک طرف ہم مسلم پرسنل لا کو باہر کے حملوں سے بچانا چاہتے ہیں کبھی کسی قانون ساز ادارہ کی طرف سے، کسی عدالت کی طرف سے لیکن اگر مسلمان پرسنل لاء پر سختی سے کار بند ہوتے۔ اگر خود شریعت اسلامی پر عمل پیرا ہوتے تو کون انکو مجبور کرتا، اگر مسلمانوں میں تلک کی رسم پڑگئی ہے اور شادیاں مہنگی ہوتی ہیں وہاں فضول خرچیاں ہوتی ہیں یا ناانصافی ہوتی ہے اگر طلاق بے جا کی کثرت ہوتی ہے اور سماج میں اونچ نیچ پائی جاتی ہے اور بہت سے مسائل میں مسلمان الجھے ہوئے ہیں تو پھر کس طرح باہر کے دشمن کا مقابلہ کیا جاسکے گا باہر کے دشمن کا مقابلہ پھر بھی آسان ہے اگر گھر کے اندر دشمنی کا سامان پیدا ہورہا ہے تو اس کا مقابلہ آسان نہیں۔ مولانا علی میاں اس موضوع پر بڑے منفرد انداز میں بات کرتے تھے اور مشہور آیت قرآن پاک کی یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ (اے لوگو اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ) کی روشنی میں کہتے تھے یہ نہیں کہ ہمارا اسلام مسجد تک ہے یا رمضان تک ہے حج تک ہے یا نجی مجلسوں کے اندر تک محدود ہے بلکہ بازاروں میں بھی شادی بیاہ میں بھی باہر کے معاملات آپس کے تعلقات خواہ اپنوں سے ہوں یا غیروں سے وہاں تمہارے اسلام کی خوبی نظر آئے تب جاکر کہا جائے گا کہ تم نے اسلام کو اپنی زندگی میں داخل کرلیا ورنہ تم اندر ہوگے اور اسلام باہر ہی کھڑا رہیگا۔

مولانا کو اس بات کی بہت زیادہ فکر تھی کہ آنے والی نسلوں کی حفاظت کس طرح کی جائے اسکے لئے ایک تو ندوہ جیسے ادارے قائم ہوں جو ہندوستان میں بہت بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں پھر دیہاتوں میں جو مسلمان آباد ہیں ان کے بچوں میں دینی تعلیم کیسے پھیلے اور دینی تعلیم کو فروغ کیسے دیا جائے یہ اور اس طرح کی باتیں ادھر ادھر سے آتی رہتی ہیں، نصاب تعلیم کو بدلنے کی باتیں بھی آتی رہتی ہیں یا تعلیم کے نظام پر مشرکانہ رسوم کے اثر انداز ہونے کی اس کو کیسے بند کیا جائے اسکے لئے وہ قرآن کی آیت پڑھا کرتے تھے کہ جس وقت حضرت یعقوبؑ نے کہا ما تعبدون من بعدی ۔ اے میرے بیٹو! میرے بعد کس کی عبادت کروگے تو ان کی اولاد نے کہا نعبد الٰھک و الٰہ آبائک ہم آپکے معبود اور آپکے آباء

www.abulhasanalinadwi.org

واجداد کے معبود کی عبادت کریں گے یعنی ایک خدا کی عبادت کریں گے۔ کہتے تھے آج ہم کو اپنی نسلوں سے عہد لینا ہے یہ عہد کر کے جائیں کہ اپنی اولاد کو توحید پر زندہ رکھیں گے جناب محمد ﷺ کی ذات رحمۃ اللعالمین ہے اور آج یہ امت خیر امت ہے لیکن یہ کتنی بڑی بات ہے کہ دنیا کے کام انسانوں کے فائدے کیلئے ہم برپا کے گئے اس لئے ہمیں نئی نسلوں کی تعمیر و تہذیب کیلئے اپنے آپ کو آمادہ کرنا ہوگا۔

مولانا ایک خاص بات یہ کہتے تھے کہ ہمارا وجود بھی اللہ کی امانت ہے ہم صرف عیش حاصل کرنے کیلئے دنیا میں نہیں آئے ہیں بلکہ ہم راستہ دکھانے کیلئے آئے ہیں ان لوگوں کو جو لوگ بھٹک رہے ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق کی مدد کرو جو گناہوں میں مبتلا ہیں ان کے گناہوں سے نفرت کرو لیکن جن حضرات کی اصلاح کی ضرورت ہے ان سے ہمدردی کا معاملہ کرو نفرت نہیں۔ برائیاں اس وقت ختم ہوں گی جبکہ ان کی اصلاح بھی ہو اسلیئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اصلاح کا نبوی طریقہ اپنائیں حضرت مولانا کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ آئندہ آنے والی نسل کو دین پر متحد رکھنے کیلئے ضروری اقدام کرنا چاہئے وہ اس بات کیلئے بہت زیادہ فکر مند تھے کہ مسلمانوں کو کلمۂ واحدہ پر متحد ہونا چاہئے یہاں مسلکی اور فروعی اختلافات، دیوبندی بریلوی شیعہ سنی حنفی اور اہل حدیث کے موجود ہیں یہ اختلافات گہرے ہو گئے ہیں ایک دوسرے کو اسلام سے خارج کر دینا اور ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کرنا اسلامی کام نہیں وہ اپنی زندگی میں کہتے تھے کہ اگر تمہیں زندہ رہنا ہے اور اپنی آواز ملک کے جمہوری ایوانوں تک پہنچانی ہے تو اپنی آواز اتحاد سے پہنچاؤ اس آواز کو طاقت تبھی پہنچے گی جب آپ لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر ایک رہو گے کلمہ ایک رسول ایک کتاب ایک تو پھر آپس میں تفریق کیوں ہے اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے و اعتصموا بحبل الله جميعا تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ بہر حال آج مولانا ہمارے درمیان نہیں ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ۔

ہر شے میں کچھ تہی دامنی سی ہے
کیا چیز تھی جو آپ کے جاتے چلی گئی

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں کی شخصیت ایک واضح شخصیت تھی اس شخصیت نے آپ کے سامنے سب کچھ واضح کر کے پیش کیا۔ بہت سے لوگ اپنے کمالات اپنے اوقات اپنے کارنامے چھپائے ہوئے چلے جاتے ہیں کوئی نہیں جانتا کہ انہوں نے سفینوں میں کیا لکھا اور ان کے سینوں نے کیا محفوظ کیا لیکن مولانا سب کچھ آسان کر گئے۔

مولانا کو میں نے ہمیشہ ثابت قدم دیکھا اور ایسے مسائل میں جو مسلمانوں کیلئے فیصلہ کن مسائل رہے۔ خواہ وہ تنظیم ائمہ مساجد کا مسئلہ ہو جس میں لوگوں نے مطالبہ کیا تھا کہ سرکار ائمہ کو تنخواہ دے، آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ کے اجلاس احمد آباد میں اس پر گفتگو ہو رہی تھی مولانا خاموش تھے آخر میں مولانا نے ایک بات کہی کہ یہ تو ہماری غیرت کے خلاف ہے کہ ہم ائمہ مساجد کی تنخواہ کیلئے سرکار سے مطالبہ کریں جبکہ ہم اپنے مدارس کیلئے حکومت سے مطالبہ نہیں کرتے اور اپنے مذہبی معاملات کیلئے نہیں کرتے تو اپنی سب سے بڑی عبادت گاہ جو مسجد ہے اس کیلئے ہم حکومت سے مطالبہ کریں اگر ہم خود اپنے ائمہ کا اعزاز نہیں کر سکتے ان کی ضرورت کے مطابق ہم انہیں تنخواہ نہیں دے سکتے تو ہماری کمزوری ہے۔

اسی طرح جب وندے ماترم کا مسئلہ آیا تو مولانا کا موقف سخت ہو گیا، کسی بات پر جذباتی ہونے کے ہرگز وہ عادی نہیں تھے کبھی میں نے انہیں جذباتی ہوتے نہیں دیکھا حتی کہ بابری مسجد کی شہادت کے مسئلہ پر بھی جبکہ دنیا سڑک پر آجانا چاہتی تھی میں نے مولانا کو بہت ہی ٹھنڈا پایا ہم لوگوں نے صبر دلانے کی کوشش کی لیکن جب یہ مسئلہ آیا کہ حکومت یوپی وندے ماترم کو لازمی ترانہ قرار دینا چاہتی ہے تو مولانا نے بڑی اہم بات کہی مولانا نے کہا کہ اگر واقعی حکومت نے اس ترانے کو لازمی قرار دیا تو ہم اپنے بچوں کو ان اسکولوں سے اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہ بات اس شخص نے کہی جسکے بڑوں نے انگریزوں کے دباؤ کو قبول نہیں کیا کیوں کہ انگریز بھی ہمارے مذہبی تشخص کو مٹانا چاہتے تھے اگر اسی طرح تعلیم گاہوں میں کوئی تبدیلی آتی ہے اور ہمارے مذہبی تشخص کو مٹایا جاتا ہے تو وہ دن ہندوستان کے خلاف ہوگا، جمہوریت کے خلاف ہوگا بلکہ انسانی حقوق کے خلاف ہوگا، مولانا نے بڑی جرأت مندی کے ساتھ ان رہنماؤں سے جو مولانا سے ملنے آتے تھے کھل کر ان سے گفتگو

کر کے اچھا مشورہ ان کو دیتے یہ آواز دل کی آواز ہوتی تھی غرض کہ مولانا نے مشکل اوقات میں بھی ہمارے لئے بہت رہنمائی کی اور جہاں تک کہ میں نے دیکھا مشکل حالات میں بھی مولانا صبر اعتدال اور وقار کا دامن نہیں چھوڑتے تھے ۔ جب کوئی مشکل آتی تو مولانا خاموش رہتے اور مسکراتے اور کہتے کہ ذرا انتظار کیجئے حالات ٹھیک ہو جائیں گے یہ حالات نئے نہیں ہیں ہوتا آیا ہے اور یہ شعر پڑھتے ۔

میری کشتی کو طوفان حوادث کا گلہ کیوں
کہ ہر موج بلا سے اک نیا ساحل چمکتا ہے

اس ملک میں کردار کشی کا بھی سامنا کرنا پڑا اور اس میں مولانا کو بڑے مشکل اور ناگوار حالات سے گذرنا پڑا۔ لوگ تو ایسے موقعوں پر بے قابو ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملک بھر میں ہمارے لئے کانفرنسیں ہوں ہنگامے ہوں مگر مولانا نے اسکو پسند نہیں کیا مولانا کو جو بھی کچھ کہنا تھا وہ حکومت کے ذمہ داروں سے کہا تھا اور آخر میں انہیں اپنی کارروائیوں پر شرمندہ ہونا پڑا۔

ان سب حالات وواقعات سے مولانا گذرے مگر جوش واشتعال، ہنگامہ اور شورش وغیرہ کو پسند نہیں کیا صبر واستقامت حکمت اور تدبیروں کے ساتھ ان سب کا مقابلہ کیا مولانا علی میاں پر منعقد ہونے والے اس سیمینار میں بڑی اچھی باتیں مولانا کے تعلق سے آئیں اور انکی زندگی کے علمی اور عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی بہت سی باتیں وقت کی کمی کے باعث میں نہیں عرض کر رہا ہوں میں ناظم دینیات اور آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے مدعو کیا میری باتیں سنیں اور صدارت کا اعزاز بخشا ۔ اللہ قبول فرمائے (آمین)

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی قرآن فہمی

محمد رضی الاسلام ندوی
ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ایک موقع پر اپنے استاد علامہ سید سلیمان ندویؒ سے متعلق فرمایا تھا:

"لوگ سید صاحب کو مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں، متکلم کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن میرے نزدیک فہم قرآن میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ مجھے ہندوستان ہی نہیں بلکہ تحتی بر اعظم میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس کا مطالعۂ قرآن اتنا وسیع اور عمیق ہو اور اس غائر مطالعہ کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان وادب اور بلاغت اور اعجاز قرآنی کا مطالعہ ان کا بہت وسیع وعمیق تھا" [۱]

ٹھیک یہی بات خود مولانا ابوالحسن علی ندوی پر بھی صادق آتی ہے۔ مولانا کی مشہور تصنیفات انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، تاریخ دعوت وعزیمت، سیرت سید احمد شہید، جب ایمان کی بہار آئی، المرتضی، تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، حیات عبدالحی، ذکر خیر، سوانح حیات حضرت مولانا

(۱) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قرآنی افادات، جمع وترتیب، احمد حقانی، ناشر محمد الحسنی ٹرسٹ رائے بریلی، طبع اول ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء ص ۳۰-۳۱۔ اسی قسم کے تاثرات مولانا نے پرانے چراغ حصہ اول اور بزم سلیمان بھوپال ستمبر ۱۹۸۵ء میں اپنے خطبۂ صدارت میں بھی ظاہر کیے ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

عبدالقادر رائے پوری، سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، سوانح محبوب الہی حضرت نظام الدین اولیاء، صحبتے با اہل دل وغیرہ نے اگرچہ ان کی پہچان ایک مورخ اور سوانح نگار کی بنائی ہے لیکن قرآنیات کے میدان میں ان کی خدمات بھی کم اہم نہیں ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی تمام تصنیفات پر خواہ وہ کسی موضوع سے متعلق ہوں، قرآن کا رنگ غالب ہے۔اس کی صراحت ایک موقع پر خود مولانا نے کی ہے:

''میں قرآن مجید کا ادنی طالب علم ہوں، اسکے بعد جو کچھ بھی اللہ نے توفیق دی اس میں قرآن مجید کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآن کردم

جن لوگوں نے میری ناچیز تحریریں اور تصنیفات دیکھی ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ میری تحریروں کا تانا بانا قرآن مجید ہی سے تیار ہوتا ہے، میں نے سب سے زیادہ قرآن سے مدد لی ہے اور پھر تاریخ سے اور میں تاریخ کو قرآن مجید ہی کی تفسیر سمجھتا ہوں'' (۲)

اس مقالہ میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآن سے مولانا کے ربط و تعلق اور شغف کو واضح کیا جائے اور ان کی قرآن فہمی کے کچھ نمونے پیش کیے جائیں۔

تربیت

قرآن سے شغف مولانا کو اپنی والدہ ماجدہ سے ورثہ میں ملا۔ وہ قرآن مجید کی پابندی سے تلاوت کرنے اور سورتیں حفظ کرنے کی تاکید کرتی رہتی تھیں۔انہوں نے مولانا کو بچپن ہی میں قرآن کی بڑی بڑی سورتیں یاد کرادی تھیں (۳) چالیس سال کی عمر کے بعد مولانا کو پورا قرآن حفظ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی (۴)

اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ مولانا کا تلاوت قرآن کا معمول زندگی کے آخری لمحے تک رہا۔وصال کے دن بھی آپ نے قرآن شریف کی تلاوت کی اور سورۂ یٰسین پڑھتے ہوئے

---

(۲) قرآنی افادات ص ۳۱-۳۲ (۳) کاروان زندگی، ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ اسلام لکھنؤ جلد اول ص ۴۶، مولانا نے اپنی والدہ کی سوانح پر ایک کتاب ''ذکر خیر'' کے نام سے تصنیف کی ہے، اس میں ان کے انداز تربیت پر تفصیل سے لکھا ہے (مولانا کی والدہ کا نام خیر النساء تھا) (۴) روایت ڈاکٹر رضوان علی ندوی، پروفیسر خورشید احمد کے مضمون پر استدراک شائع شدہ ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور مارچ ۲۰۰۰ء ص ۸۳

www.abulhasanalinadwi.org

جان آفریں کے سپرد کی ۵

قرآن کے اساتذہ

مولانا کو قرآن کی تعلیم اپنے عہد کے اساطین علم سے حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس سے ان کی صلاحیتوں کو جلا ملی اور وہ قرآن میں غور و تدبر کی نئی نئی جہتوں سے روشناس ہوئے۔ اس سلسلے میں آپ کے سب سے پہلے استاد شیخ خلیل بن محمد یمانی تھے جو خلیل عرب کے نام سے مشہور ہیں۔ عموماً لوگ انہیں عربی زبان وادب کے استاد کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن خود مولانا نے صراحت کی ہے کہ زبان وادب کی تعلیم سے قبل انہوں نے ان سے قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی اور ان سے قرآن کی کچھ سورتیں (خاص طور سے وہ سورتیں جن میں توحید کا مضمون بیان ہوا ہے) پڑھی تھیں ۶ دوسرے استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے استاد تفسیر خواجہ عبدالحی فاروقی تھے۔ مولانا کے خاندان سے ان کے قریبی روابط تھے لکھنؤ تشریف لاتے تو مولانا کے گھر ٹھہرتے ۷ ۱۹۲۸ء میں ایک مرتبہ وہ تشریف لائے تو مولانا کے برادر معظم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے کہنے پر انہوں نے مولانا کو آخری پارہ کی کچھ سورتیں پڑھائیں ۸

تفسیر میں مولانا کے خاص استاد مدرسہ قاسم العلوم لاہور کے شیخ التفسیر مولانا احمد علی تھے۔ ان سے قرآن پڑھنے کے لیے طلبہ دور دور سے حاضر ہوتے تھے۔ انہوں نے مدارس عربیہ کے فارغین کے لیے خصوصی نظم کر رکھا تھا۔ یہ علماء کلاس کہلاتی تھی۔ اس کا سلسلہ آخر شعبان سے وسط ذی قعدہ تک جاری رہتا تھا۔ اس مدت میں پورا قرآن پڑھایا جاتا تھا۔ آخر میں باقاعدہ امتحان لیا جاتا تھا اور سند دی جاتی تھی۔ مولانا احمد علی کا طریقہ تدریس بھی نرالا تھا۔ طالب علم کو ہر رکوع کا خلاصہ اور اس کا ماخذ یاد کرنا پڑتا تھا اور نیا درس شروع ہونے سے پہلے پچھلے درس کا امتحان ہوتا تھا۔ جس طالب علم کی جس رکوع کی باری آجائے اس کو اس کا خلاصہ مولانا عبیداللہ سندھی کے مقرر کیے ہوئے الفاظ میں اور اس کا

---

(۵) روایت مولوی سید بلال حسنی ندوی، مضمون "مرد مومن کا آخری سفر" ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک پاکستان جنوری فروری ۲۰۰۰ء (۶) قرآنی افادات ص ۲۸-۲۹، شیخ خلیل عرب کے بارے میں تفصیل سے جاننے کیلئے ملاحظہ کیجئے پرانے چراغ حصہ اول (۷) کاروان زندگی اول ص ۱۰۰ (۸) کاروان زندگی اول ص ۱۳۲

www.abulhasanalinadwi.org

قرآنی ماخذ سنانا پڑتا تھا ۸ مولانا نے ان سے استفادہ کے لیے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان دو مرتبہ لاہور کا سفر کیا۔ ۱۹۳۰ میں جب تشریف لے گئے تو اتفاق سے وہ زمانہ مولانا احمد علی کے منظم درس کا نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے خصوصی طور پر وقت دیا اور سورۂ بقرہ کا ابتدائی حصہ پڑھایا۔ ۹ دسمبر ۱۹۳۲ء میں مولانا نے پھر لاہور کے لیے رخت سفر باندھا اور مولانا کے درس میں باضابطہ شرکت کی۔ پورے قرآن کا درس مکمل ہونے کے بعد مارچ ۱۹۳۳ء میں تمام طلبہ کا امتحان ہوا۔ مولانا کو سب سے زیادہ نمبر ملے۔۱۰

ان کے علاوہ قرآنیات میں مولانا نے جن شخصیات سے فیض اٹھایا اور استفادہ کیا ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا حسین احمد مدنی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

تعلیم و تدریس

تعلیم سے فراغت کے بعد اگلا مرحلہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کا تھا۔ خوش قسمتی سے کچھ ہی عرصہ بعد اگست ۱۹۳۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد مولانا کا تقرر ہوگیا۔ اس طرح آئندہ زندگی میں بھی تعلیم و تعلّم سے وابستہ رہنے اور خاص طور پر علوم قرآن کے میدان میں خدمات انجام دینے کا سنہری موقع ملا۔ تدریس کے لیے تفسیر اور ادب عربی کے مضامین مولانا کے سپرد ہوئے۔ اس عرصہ میں مولانا نے تفسیر کی امہات الکتب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور طلبہ کو مطمئن کرنے کے لیے قدیم تفاسیر کے ساتھ جدید تفاسیر سے بھی استفادہ کیا۔ اس زمانے کی محنت کا مولانا نے یوں تذکرہ کیا ہے:

''میں کتب خانہ سے تفسیر کی قدیم بڑی کتابیں اور اہم اور بنیادی مآخذ لے آیا۔ ان میں سے بعض تفسیریں مثلاً کشاف، معالم التنزیل بغوی و مدارک تقریباً لفظاً لفظاً پڑھیں، جدید تفاسیر میں سے تفسیر المنار، پھر مولانا آزاد کی ترجمان القرآن سے پورا استفادہ کیا، تدریس اور طلباء کے سوالات کے جواب میں علامہ آلوسی کی روح المعانی سے سب سے زیادہ مدد ملی''۱۱

---

(۹) کاروان زندگی ص ۱۲۷ (۱۰) حوالہ سابق ص ۱۳۲ (۱۱) کاروان زندگی اول ص ۱۴۷

www.abulhasanalinadwi.org

تدریس کا یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا، بعد میں انتظامی ذمہ داریاں متعلق ہوجانے کی وجہ سے اس میں توقف آگیا۔

دروس قرآن

قرآن کی تدریس کے علاوہ مولانا نے مختلف اوقات میں باضابطہ تسلسل کے ساتھ درس قرآن دیا ہے۔ سب سے پہلے اس کا اہتمام "ادارۂ تعلیمات اسلام" کے تحت ہوا، یہ ادارہ لکھنؤ میں ۱۹۴۳ء میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی دینی تربیت کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی اس کے روح رواں تھے۔ اس میں بعد نماز مغرب جمعہ کے دن قرآن کے درس کا اور ہفتہ کے دن حدیث کے درس کا انتظام کیا گیا۔ اس کی ذمہ داری مولانا نے لی۔ درس کا یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء کے بعد تک جاری رہا اور اس کی مرجعیت بڑھتی رہی۔ اس میں شہر کے با اثر افراد اور مسلمان افسران شریک ہوتے تھے، بعد میں ۱۹۵۱ء میں جب مولانا عبدالسلام قدوائی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استاد و ناظم دینیات ہوکر چلے گئے اور مولانا بھی مشرق وسطی کے طویل دورے پر تشریف لے گئے تو درس کا یہ سلسلہ موقوف ہوگیا اور ادارۂ تعلیمات اسلام کی سرگرمیاں بھی برائے نام رہ گئیں [۱۲]۔

مشرق وسطی کے سفر سے واپسی پر مولانا نے درس کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا ، یہ درس اب تبلیغی جماعت کے مرکز میں ہونے لگا جو کچہری روڈ پر قائم ہوا تھا، حاضری میں بھی مزید ترقی ہوئی یہاں تک کہ مائک لگانے کا انتظام کیا گیا، یہ سلسلہ بھی برسوں چلتا رہا اور ترقی کرتا رہا [۱۳]۔

عمر کے آخری سالوں میں درس قرآن کی یہ مبارک مجلس پھر آراستہ ہوئی، مولانا رمضان المبارک کا مہینہ اپنے گھر دائرہ شاہ علم اللہ میں گزارنے کا اہتمام کرتے تھے، ان کے ساتھ ان کے مریدین و منتسبین کی ایک بڑی تعداد بھی وہاں رہ کر ذکر و عبادت میں مشغول رہتی تھی ، ان لوگوں کی خواہش اور اصرار پر ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۲ء سے مولانا نے

---

(۱۲) حوالہ سابق ص ۴۷۴ (۱۳) حوالہ سابق ص ۴۷۵

www.abulhasanalinadwi.org

تفسیری دروس کا سلسلہ شروع کیا جو تقریباً چھ سال باقاعدگی سے جاری رہا، ۱۴۱۸ھ میں خرابیٔ صحت اور مسلسل ضعف کی وجہ سے اس میں ناغے ہوئے اور ۱۴۱۹ء میں مسلسل علالت اور بڑھتی ہوئی کمزوری کی وجہ سے بالکل منقطع ہوگیا، اس عرصے میں کئی پاروں کا درس ہو چکا تھا اور اسے ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے قلم بند بھی کرلیا گیا ہے۔۱۴

تصانیف

مولانا علی میاں کی تقریریں ہوں یا تحریریں سب کا سرچشمہ قرآن مجید ہے، مولانا خود فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے جو کچھ لکھنے پڑھنے کی توفیق دی اور اپنے مطالعہ کا حاصل پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دیا وہ سب قرآن مجید ہی کا فیضان ہے" ۱۵ مولانا اپنی تحریروں میں بکثرت قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہیں اور موقع و موضوع کی مناسبت سے ان کی دل نشیں اور مطابق حال تفسیر و تشریح کرتے ہیں، البتہ مولانا کی درج ذیل تصانیف کو خاص طور پر قرآنیات کے زمرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے:

ا۔ معرکۂ ایمان و مادّیت

یہ کتاب سورۂ کہف کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ خود مولانا کے الفاظ میں "اسے مفسرین کے مخصوص طریقہ پر نہیں لکھا گیا ہے بلکہ صرف تاثرات اور واردات کا مرقع اور سورہ کہف کا ایک عمومی اور اصولی جائزہ ہے" ۱۶ ابتداء میں اسے ایک مقالہ کی شکل میں مولانا نے اس وقت تیار کیا تھا جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد تفسیر تھے، اس کی اشاعت ۱۹۴۶ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ماہنامہ ترجمان القرآن حیدرآباد میں ہوئی، کچھ عرصہ کے بعد اسی موضوع پر مولانا مناظر احسن گیلانی کا ایک طویل مقالہ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں شائع ہوا تو مولانا کو اس سورہ پر دوبارہ غور کرنے اور اس کے معانی و مضامین پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی تحریک ملی، مولانا نے یہ کتاب عربی زبان میں الصراع بین الایمان

(۱۴) سعید مرتضیٰ ندوی، مولانا علی میاں کے رسالہ "رمضان۔ مومن صادق کی حیات نو" مکتبہ حرا لکھنؤ پر مقدمہ ص ۶ نیز عبداللہ حسنی ندوی تعارف برقرآنی افادات ص ۱۹۔۲۰ (۱۵) قرآنی افادات ص ۷۷ (۱۶) معرکۂ ایمان و مادیت، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ طبع ۱۹۷۲ء ص ۶

www.abulhasanalinadwi.org

و المادية کے عنوان سے تیار کی اور دارالقلم کویت سے اس کی اشاعت ہوئی، دارالمختار الاسلامی نے اسے تأملات فی سورۃ الکھف کے نام سے شائع کیا ہے، اس کا اردو ترجمہ مولانا محمد الحسنیؒ نے معرکۂ ایمان و مادیت کے نام سے کیا۔

۲۔ مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی

یہ کتاب بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے زمانہ تدریس کی یادگار ہے، دوران تدریس مولانا نے محسوس کیا کہ طلبہ کو قرآن کے مقاصد اور مضامین سے آشنا بنانے اور ان میں اس سے استفادہ کی صلاحیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے انہوں نے کلاس میں ایک سلسلۂ مضامین لکھوانا شروع کیا۔

۱۹۴۰ء میں جب الندوہ کا سہ بارہ اجراء عمل میں آیا تو ان میں سے بعض مضامین اس میں شائع ہوئے۔ طویل عرصہ کے بعد ان مضامین پر نظر ثانی کے ساتھ چند مضامین کا اضافہ کر کے ۱۹۸۱ء میں "مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی" کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس کتاب میں اعجاز قرآن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور قرآن مجید سے استفادہ کے شرائط اور موانع کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کا عربی ترجمہ المدخل الی الدراسات القرآنیۃ کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۳۔ ارکان اربعہ کتاب وسنت کی روشنی میں

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کے دوران مولانا نے طلبہ کو جن مضامین کا املا کرانے کا منصوبہ بنایا تھا ان میں بنیادی عقائد، توحید ورسالت، معاد اور ارکان اربعہ بھی تھے۔ مگر اس کی تکمیل نہ ہوسکی[۱۷]۔ اس کے کافی عرصہ کے بعد ایک موقع پر مشہور اخوانی رہنما ڈاکٹر سعید رمضان (جو جنیوا سے عربی مجلّہ المسلمون نکال رہے تھے) کی فرمائش پر حج کے حقیقی اور شرعی مقاصد، اس کی روح اور اس کے اہم پہلوؤں پر تین مقالے اور روزہ کے مقاصد پر دو مقالے مولانا نے عربی زبان میں تحریر کیے، یہ مقالے المسلمون میں شائع ہوئے، اس موقع پر مولانا کے ذہن میں آیا کہ رمضان اور حج کے ان مقالات کے

(۱۷) کاروان زندگی اول ص ۲۰۰

www.abulhasanalinadwi.org

ساتھ نماز اور زکوۃ کا حصہ بھی شامل کردیا جائے، اس طرح اس کتاب کی پوری تصویر سامنے آئی، اس کی تالیف کے وقت المسلمون کے ان مضامین میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا۱۸

اس کتاب میں ارکان اربعہ کی روح، حقیقت، مقاصد اور طریقہ کے بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور ائمہ اسلام کی تصانیف اور معاصر اہل علم کی تحریروں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

۴۔ منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین

یہ کتاب ان لکچرس پر مشتمل ہے جو مولانا نے وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۳ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں دیے تھے، مولانا نے لکھا ہے کہ بیشتر لکچرز رمضان ۱۳۸۲ھ میں انہوں نے رائے بریلی میں اپنے آبائی گاؤں دائرہ شاہ علم اللہ میں تحریر کئے تھے ۱۹ یہ قرآن کریم کے مطالعہ اور غور وتدبر پر مبنی ہیں، ان میں نبوت کی ضرورت، انبیاء کی خصوصیات اور امتیازات، ان کے فرائض منصبی، خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی عظمت اور آپ کے ہمہ گیر اثرات پر قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

قرآن کے مطالعہ وفہم کا صحیح طریقہ

مولانا کی تقریروں اور تحریروں میں قرآن کریم کے مطالعہ کے صحیح طریقہ کی طرف رہنمائی ملتی ہے۲۰ مولانا اظہار خیال کرتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والے پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنی کتاب سمجھے۔ وہ یہ پیش نظر رکھے کہ قرآن براہ راست اس سے مخاطب ہے تبھی وہ قرآن سے صحیح طریقہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایک موقع پر فرماتے ہیں:

''قرآن مجید کو اپنی ذاتی کتاب سمجھا جائے، یہ کتاب ہدایت ہے، یہ کتاب ابدی ہے، یہ کتاب آسمانی ہے، لیکن میری ذاتی کتاب بھی ہے، میرا ذاتی ہدایت نامہ بھی ہے،

(۱۸) ارکان اربعہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، مقدمہ (۱۹) ''منصب نبوت'' کا مقدمہ (۲۰) مولانا علی میاں کی تقریروں اور تحریروں (جن میں قرآنی آیات کی تفسیر وتشریح کی گئی ہے) کے اقتباسات کا ایک مجموعہ ''قرآنی افادات'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے، اس پر خود مولانا علی میاں کی تائید وتوثیق موجود ہے اس لیے اس مقالہ میں مولانا کی تحریروں کے حوالے اسی کتاب سے دیے گئے ہیں

www.abulhasanalinadwi.org

اس میں میری ذاتی کمزوریاں بیان کی گئی ہیں، میرے ذاتی امراض کی نشان دہی کی گئی ہے ،قرآن مجید میں ہرآدمی اپنے کو تلاش کرسکتا ہے۔ یہ جب ہوگا جب کہ آپ اس کو زندہ کتاب سمجھیں یا اپنی کتاب سمجھیں اور آپ میں اپنی اصلاح کا جذبہ ہو،لوگوں کی اصلاح تو بعد میں ہوگی، پہلے اپنی اصلاح ہوجائے''۲۱

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

''قرآن مجید کے فہم کا اصل دروازہ جب کھلتا ہے جب آدمی بغیر کسی انسانی حجاب کے اس کلام کے ذریعہ صاحب کلام سے ہم کلام ہو۔اس کا راستہ قرآن مجید کی بکثرت تلاوت ہے اور نوافل یا بندگان خدا کی صحبت جو اس کتاب سے حقیقی لذت آشنا اور حقیقت شناس ہیں اور جن کے رگ و پے میں یہ کلام بس گیا ہے۔ضرورت اس کی ہے کہ پڑھنے والا اس کتاب سے براہ راست تعارف وانس حاصل کرے اور اس کو ایسا محسوس ہو کہ وہ براہ راست مخاطب ہے''۲۲

اس کی تائید میں مولانا سورۂ انبیاء کی آیت لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ کِتَابًا فِیْهِ ذِکْرُکُمْ (۱۰) پیش کرتے ہیں۔بعض مفسرین اس آیت میں ''ذکر'' سے مراد عزت وشرف اور بعض موعظت ،نصیحت اور یاددہانی لیتے ہیں ۔مولانا علی میاں نے اسے 'تذکرہ' کے معنی میں لیا ہے،ایک موقع پراس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ قرآن ایک صاف شفاف،سچا وفادار و دیانت دار آئینہ ہے جس میں ہر شخص اپنے خدوخال دیکھ سکتا ہے، معاشرہ میں اپنا مقام پہچان سکتا ہے اور خدا کے نزدیک اپنا مرتبہ معلوم کرسکتا ہے کیونکہ قرآن انسانوں کے اخلاق وصفات بیان کرتا ہے اور اس میں انسانیت کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طرح کے نمونہ کی تصویریں موجود ہیں'' ۲۳

مولانا ایک موقع پر مطالعۂ قرآن کے اپنے طریقے کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''میں نے قرآن مجید کو اس نظر سے پڑھا کہ وہ ایک زندہ کتاب اور ایک بولتا ہوا

---

(۲۱)افادات ص۴۰ (۲۲)ایضاً ص۵۷ (۲۳)افادات ص۵۶۱

www.abulhasanalinadwi.org

مرقع یا آئینہ ہے جس میں افراد بھی اپنے اپنے چہرے دیکھ سکتے ہیں، قومیں بھی اپنی صورتیں دیکھ سکتی ہیں اور قوموں، سلطنتوں، تمدنوں کی ترقیات وعروج کے انجام بھی اس کتاب میں دیکھے جاسکتے ہیں''۲۴؎

اسالیب قرآن کی وضاحت

مولانا عربی زبان وادب کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اسالیب، تعبیرات، بلاغت ونحواور الفاظ کے مواقع استعمال پر آپ کی گہری نظر تھی، آپ جا بجا قرآنی آیات کی تشریح وتفسیر کرتے ہوئے اسالیب قرآن کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ قرآن کا اعجاز نمایاں ہوجاتا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(۱) آیت اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّالَہٗ لَحَافِظُوْنَ (الحجر-۹) کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جہاں تک میری معلومات ہیں اور تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ الذکر سے مراد قرآن مجید ہے......اللہ تعالیٰ جس شاہانہ، شہنشاہانہ انداز میں، جیسے شاہی فرمان ہوتے ہیں، جمع کے صیغے کے ساتھ فرماتا ہے ''ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''

جو حضرات عربی داں ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس مضمون کو ادا کرنے کے لئے کتنے طریقے ہوسکتے ہیں۔ قرآن مجید میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ بالکل الگ ہے، اس میں کئی طریقوں سے اس بات کو کہا گیا ہے۔ بڑی تاکید اور بڑی شدومد کے ساتھ کہا گیا ہے کہ ہم ضرور اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔۔۔ میں عربی زبان کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں تاکید کی کئی چیزیں جمع کردی ہیں انا لہ لحافظون اسم فاعل کا صیغہ ہے، پھر انا کے ساتھ لہ کو مقدم کرنا۔ انا لحافظون کے بجائے انا لہ لحافظون یہ سب طریقے علم بلاغت سے تعلق رکھتے ہیں، علم نحو سے تعلق رکھتے ہیں ۲۵؎

---

(۲۴) ایضاً ص ۴۳۱ (۲۵) افادات ص ۳۰۱

www.abulhasanalinadwi.org

(۲) سورۂ النحل کی آیت ہے: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (۹۷) اس میں تاکید اور تنکیر سے حاصل ہونے والے فوائد پر مولانا نے یوں روشنی ڈالی ہے:

"اس میں دنیا کی زندگی بھی آجاتی ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس میں صرف آخرت ہی کی بشارت دی گئی ہے، جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں نکرہ کا لفظ ہے الحیاۃ الطیبۃ نہیں کہا گیا ہے۔ فلنحیینہ لام کے ساتھ کہا۔ جب کہنا ہوتا ہے عربی میں "ایسا ضرور کریں گے" تو اس کو لنفعلنّ، لنذہبنّ، لنعلمنّ کے وزن پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اس میں شک کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن ہمیں اطمینان دلانے کے لئے (یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے)"[۲۶]

(۳) سورۂ النجم میں ہے: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (۳۹-۴۰) مفسرین نے عموماً اس سے یہ مراد لیا ہے کہ ایسا آخرت میں ہوگا (۲۶ الف) مولانا اس کا اطلاق دنیا ہی پر کرتے ہیں اور "سوف" کی معنویت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ یہاں "سوف" کا لفظ استعمال ہوا جو عام طور پر بعید کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر جلدی تمہیں نتائج نظر نہ آئیں تو مایوس نہ ہونا "سوف یری" وہ نظر آئے گا"[۲۷]

مفردات قرآنی کی لغوی تشریح

قرآنیات کے میدان میں مولانا کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ الفاظ قرآنی کی لغوی و لسانی تشریح کر کے قرآن کا اعجاز آشکارا کرتے ہیں۔ دیگر ہم معنی یا قریب المعنی الفاظ چھوڑ کر قرآن نے یہی لفظ کیوں اختیار کیا ہے؟ اس لفظ میں کتنی گہرائی اور وسعت

---

(۲۶) ایضاً ص ۲۱۸-۲۱۹ (۲۶ الف) مثلاً ملاحظہ کیجئے تفسیر کبیر رازی، المطبعۃ العامرۃ مصر ۱۳۰۸ھ ۷/۴۳۸، تفسیر ابن کثیر المکتبۃ التجاریۃ الکبری مصر ۱۹۳۷ء ۴/۲۵۸، تفسیر قرطبی الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب مصر ۱۹۸۷ء ۱۷/۱۱۵، روح المعانی آلوسی: ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر ۲۷/۶۷ (۲۷) افادات ص ۴۸۱

www.abulhasanalinadwi.org

ہے؟اس لفظ کا مفہوم دوسری زبان میں کس حد تک اور کیسے ادا کیا جا سکتا ہے؟ ان باتوں کی وضاحت مولانا بہت تفصیل سے کرتے ہیں جس سے آیات قرآنی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے ۔اس امتیازی خصوصیت کو نمایاں کرنے کے لئے چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) سورۂ بقرہ کی آیت: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (۲۰۸) اس میں تین الفاظ سلم ، کافة ، اور خطوات کی تشریح مولانا نے بہت تفصیل سے کی ہے۔فرماتے ہیں:

"بظاہر ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ في السلم کے بجائے في الاسلام کہا جاتا یعنی اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ مگر نہیں یہاں "سلم" میں داخل ہونے کو کہا گیا۔یعنی خدا کے ساتھ تمہارا معاملہ فرماں بردارانہ،مطیعانہ،مصلحانہ،اور مکمل ہونا چاہیے، عقائد میں بھی ،فرائض وعبادات میں بھی ،طرز معاشرت اور طریقۂ زندگی میں بھی ......

"اسلام" کا لفظ "سلم" ہی سے نکلا ہے۔عربی زبان ولغت کے لحاظ سے اسلام کے معنی ہیں اپنے کو حوالہ کردیا،سرنیڈر کردیا اور اپنی ہر چیز سے دست بردار ہو گیا۔ کافة کا تعلق دونوں سے ہے۔داخل ہونے والوں سے بھی اور جس دائرہ میں داخل ہو رہے ہیں اس سے بھی ہے۔

یہاں خطوة (واحد) نہیں استعمال کیا گیا بلکہ خطوات الشیطان جمع کا صیغہ لایا گیا،معلوم ہوا کہ اس شیطان کے بہت سے نقش قدم ہیں،اس میں وسعت آ گئی خواہ اعتقادی چیزیں ہوں،خواہ اخلاقی چیزیں ہوں یا تہذیبی،خواہ سیاسی چیزیں ہوں سب،اس میں شامل ہیں" [۲۸]

(۲) سورۂ توبہ کی آیت فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ (۱۲۲) میں لفظ "تفقہ" کی جامعیت ومعنویت پر مولانا یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"تفقہ بہت جامع لفظ ہے اس میں احکام ومسائل،ان کی حکمتیں،مواقع استعمال، ان کی تطبیق کے مواقع،خطاب کے طریقے سب اس کے اندر آجاتے ہیں، تفقہ کا لفظ ایسا اللہ تعالی نے استعمال کیا ہے کہ اس سے جامع لفظ ہو ہی نہیں سکتا۔عربی زبان میں "سمجھنے"

www.abulhasanalinadwi.org

کے لیے بیسیوں لفظ ہو سکتے ہیں فهم ، معرفة، تعقل ، لیکن تفقہ کا لفظ خاص معنی رکھتا ہے اس کے معنی ہیں دین میں گہری سمجھ حاصل کرنا، دین کے ذخیرہ پر عمیقانہ نظر رکھنا، زمانہ کی ضرورت کو سمجھنا اور بدلے ہوئے زمانہ اور دائمی دین کے درمیان رشتہ پیدا کر سکنا'' ۲۹

معنی کی تعیین

عربی زبان کے بہت سے الفاظ اردو میں مستعمل ہیں لیکن اردو میں ان کے وہ معانی نہیں ہیں جن میں ان کا عربی میں استعمال ہوتا ہے۔ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہونے کی وجہ سے ان کے مفہوم میں فرق ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ان کو اپنے صحیح مفہوم و معنی میں سمجھنا مشکل ہو گیا ہے اور ان میں وہ زور و قوت باقی نہیں رہی جو اصل زبان میں تھی۔ یہی معاملہ قرآن کریم کے ان الفاظ کا بھی ہے جو اردو زبان میں مستعمل ہیں کہ ان کا وہ مفہوم لوگوں کے ذہنوں میں نہیں ہوتا جس مفہوم میں قرآن میں ان کا استعمال ہوا ہے ۔مولانا ایسے الفاظ کی بہت تفصیل سے تشریح کرتے ہیں اور ان کا حقیقی مفہوم واضح کرتے ہیں۔چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(ا) قرآن میں لفظ ''جاهلية'' کا استعمال متعدد مواقع پر ہوا ہے۳۰ مولانا اس کے معنی کی تعیین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جاہلیت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف جاہلیت عربیہ مراد ہے اور جاہلیت عربیہ سے مراد ہے بت پرستی کا دور، دختر کشی کا دور، شراب نوشی کا دور اور رہزنی کا دور ان کے سامنے صرف یہ آتا ہے، لیکن معاشرت، طرز معیشت، طرز زندگی، فیصلے کرنے کے معیار و اصول اور رغبات اور نفرتیں، یہ چیزیں جاہلیت کے تصور کے ساتھ ذہن میں نہیں آتیں حالانکہ جاہلیت ان سب پر مشتمل ہے......اس سے مراد وہ دور ہے جو نبوت کی روشنی اور ہدایت سے محروم رہا ہے، چاہے وہ یورپ ہو یا ساسانی مملکت ہو، چاہے وہ ہندوستان ہو، چاہے وہ عرب ہو''۳۱

---

(۲۹) افادات ص ۲۵۹ (۳۰) آل عمران-۱۵۴، المائدہ-۵۰، الاحزاب ۳۳، الفتح ۲۶

(۲) قرآن میں لفظ ''تقویٰ'' اور اس کے مشتقات کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ مولانا اس کے رائج مفہوم اور حقیقی مفہوم دونوں پر روشنی ڈالتے ہیں:

''ہمارے یہاں متقی کے معنی میں بڑا عبادت گزار، راتوں کو بہت کم سوتا ہو، اور نہ سوتا ہو تو اور زیادہ متقی ہے، اور نہ کھاتا ہو اور اگر وہ مسلسل عبادت کرتا ہو تو اور بڑا متقی ہے، اور کثرت سے نماز پڑھتا ہو، نماز میں اس کا دل لگتا ہو، جب دیکھو نماز پڑھ رہا ہے تو اور بڑا متقی ہے، اور ذرا ذرا سی چیز میں شبہ سے بچتا ہو متقی ہے، لیکن عربی میں جہاں سے یہ لفظ آیا ہے تقویٰ کے معنی زیادہ عبادت گزار اور زیادہ شب بیدار کے نہیں ہیں، عربی زبان میں تقویٰ ایک مستقل صفت کا نام ہے، تقویٰ عبادت کا نام نہیں تقویٰ ایک مزاج ہے، تقویٰ ایک ملکہ ہے، تقویٰ ایک طبیعت ہے''۳۲؎

(۳) لفظ ''صبر'' کی تشریح میں مولانا فرماتے ہیں:

''جب کوئی لفظ کسی زبان میں جاتا ہے اور لمبا سفر طے کر کے کسی زمانہ میں پہنچتا ہے تو اس کے معنی میں کچھ فرق آ جاتا ہے یا معنی محدود ہو جاتے ہیں، صبر بھی انہی لفظوں میں سے ہے، صبر کے معنی یہ ہو گئے کہ اگر کوئی صدمہ پڑ جائے، کوئی حادثہ پیش آ جائے، کوئی ناانصافی ہو، کوئی تکلیف ہو تو زیادہ روؤ دھوؤ نہیں، زیادہ شکایت نہ کرو، لیکن عربی میں ''صبر'' کے معنی اس سے بہت وسیع ہیں، صبر کے معنی ہیں جم جانا، پختہ رہنا، اور مقابلہ کرنا اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، اپنے اصولوں کو نہ چھوڑنا''۳۳؎

الفاظ قرآن کا ترجمہ

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ دشوار کام ہے۔ بسا اوقات دوسری زبان میں جو مفہوم کئی جملوں سے ادا ہوتا ہے اس کے لیے قرآن کا ایک لفظ کافی ہوتا ہے۔ مولانا نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس پہلو کی طرف بھی رہنمائی کی ہے۔ مثلاً لفظ ''توفیق'' کی وسعت و جامعیت پر مولانا نے یوں روشنی ڈالی ہے:

''توفیق وہ چیز ہے جس کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ توفیق کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا

---

(۳۱) افادات ص ۵۰۶-۵۰۷ (۳۲) ایضاً ص ۱۷۷ (۳۳) ایضاً ص ۱۴۲

www.abulhasanalinadwi.org

رحمت کا ارادہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کا اس کے دل میں یہ خیال اور جذبہ ڈال دینا کہ یہ کام کرنا ہے، کہ تمام رکاوٹوں اور موانع کو ہٹا دینا ہے اور پھر اللہ تبارک تعالیٰ کا یہ فیصلہ کرنا کہ یہ کام ہو...... ان سب کے مجموعے کا نام توفیق ہے۔ اتنی لمبی جو ہم نے عبارت بیان کی وہ عربی کے، قرآن مجید کے ایک لفظ میں آ گیا ہے، اس کا نام ہے ''توفیق'' ۳۴

مفردات قرآنی کے سلسلے میں مولانا جا بجا اظہار خیال کرتے ہیں کہ ان کا صحیح ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہو سکتا، ساتھ ہی مفہوم ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں :

(۱) سورۂ مائدہ کی ایک آیت ہے: جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِلنَّاسِ (۹۷) اس میں "قیاماً للناس" کا ترجمہ مترجمین قرآن نے مختلف کیا ہے۔ چند ترجمے ملاحظہ ہوں:

- قیام کا باعث لوگوں کے لئے (شیخ الہند مولانا محمود حسن)
- لوگوں کے قائم رہنے کا سبب (مولانا اشرف علی تھانوی)
- لوگوں کے لیے (امن و جمعیت کے) قیام کا ذریعہ (مولانا ابوالکلام آزاد)
- لوگوں کے لیے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)
- لوگوں کے لیے مرکز (مولانا امین احسن اصلاحی)

مولانا علی میاں فرماتے ہیں:

''میں اس کے باوجود کہ عربی اردو دونوں سے واقف ہوں اور دونوں کا ذوق رکھتا ہوں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ قیاماً للناس کا صحیح ترجمہ نہیں کر سکتا، میں نے جو اردو کے تراجم دیکھے ہیں میں اس سے بھی مطمئن نہیں ہوں کہ قیاماً للناس کا اردو میں صحیح ترجمہ ہوا۔ لیکن اس کا مفہوم ادا کرتا ہوں کہ ''اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو لوگوں کی زندگی کا دارومدار بنایا ہے'' ۳۵

(۲) سورۂ حج میں ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۴۱)

---

(۳۴) افادات ص ۱۸۴ (۳۵) ایضاً ص ۴۲۸

www.abulhasanalinadwi.org

اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ کے مختلف ترجمے ملاحظہ ہوں:

۔تو وہ قائم رکھیں نماز (شیخ الہند)

۔تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں (تھانوی)

۔تو وہ نماز (کا نظم) قائم کریں (آزاد)

۔تو وہ نماز قائم کریں گے (مودودی)

۔تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے (اصلاحی)

مولانا علی میاں اس کا یہ ترجمہ کرتے ہیں "تو نماز کو برپا کریں گے" پھر فرماتے ہیں
"میں اس کا ترجمہ یہ نہیں کرتا کہ نماز پڑھیں گے، لفظ صلوۃ نہیں ہے بلکہ "اقاموا الصلوۃ" ہے یعنی نماز کو زندگی کا جزء اور اس کا لازمہ بنادیں گے، اس کا انتظام واہتمام کریں گے، اس کے لیے جس فضا کے تیار کرنے کی ضرورت ہے، جتنے علم کی ضرورت ہے، جن جگہوں کی ضرورت ہے (جن کو مساجد کہتے ہیں) ان سب کا اہتمام کریں گے، اقاموا الصلوۃ کے لفظ میں یہ سب چیزیں آجاتی ہیں" ۳۶

(۳) سورۂ نساء کی ایک آیت ہے: لَا خَیۡرَ فِی کَثِیۡرٍ مِّنۡ نَّجۡوَاھُمۡ اِلَّا مَنۡ اَمَرَ بِصَدَقَۃٍ اَوۡ مَعۡرُوۡفٍ (۱۱۴) لفظ "معروف" کی تشریح میں مولانا فرماتے ہیں:
"معروف بھی قرآن مجید کا ایک ایسا لفظ ہے کہ اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا، یعنی معقول ومستحسن بات، جو چیز عرف میں داخل ہے اور جس کو فطرت سلیم رکھنے والے سب بالاتفاق اچھا کہتے ہیں" ۳۷

(۴) سورۂ ہود میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کے سامنے دعوت پیش کی تو اس نے کہا یَا صَالِحُ قَدۡ کُنۡتَ فِیۡنَا مَرۡجُوًّا قَبۡلَ ھٰذَا (۶۲) مولانا اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں "صالح تم تو ہماری امیدوں کا مرکز تھے" پھر فرماتے ہیں:
"مــرجـوا کا تقریباً وہی مفہوم ہے جو انگریزی میں لفظ PROMISING کا ہے جو کسی ایسے ہونہار طالب علم یا نوجوان کے لیے بولا جاتا ہے جس کا مستقبل درخشاں نظر

---

(۳۶) افادات ص ۳۵۴ (۳۷) ایضاً ص ۲۳۷

www.abulhasanalinadwi.org

آتا ہے''۳۸؎

بعض مقامات پر مولانا نے الفاظ قرآن کے ترجمے کے طور پر جو الفاظ استعمال کیے ہیں انہیں ''ترجمہ'' تو نہیں کہا جا سکتا البتہ مفہوم کی وضاحت اور اس کی صحیح تصویر کشی کی کوشش ضرور قرار دیا جا سکتا ہے، اسے ترجمہ کے بجائے ''ترجمانی'' کہنا زیادہ مناسب ہوگا مثلاً:

(۱) سورۂ مائدہ میں ہے یَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ (۸) ''قوامين لله'' کے بعض ترجمے ملاحظہ ہوں:

۔کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے	(شیخ الہند)
۔اللہ تعالیٰ کے لیے پوری پابندی کرنے والے	(تھانوی)
۔خدا (کی سچائی) کے لیے مضبوطی سے قائم رہنے والے	(آزاد)
۔اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے	(مودودی)
۔عدل کے علم بردار بنو اللہ کے لیے	(اصلاحی)

مولانا علی میاں قوامين لله کا ترجمہ ''خدائی فوج دار'' کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

''ہماری زبان اور محاورہ میں ''خدائی فوج دار'' ایک طنز کا لفظ ہے کہ آپ خدائی فوج دار ہیں لیکن قوامين لله کا مفہوم تقریباً خدائی فوج داری کا ہے، مبالغہ کے اس صیغہ ''قوامين'' سے خدائی فوج داری کی شان ظاہر ہوتی ہے، اگر قائمين لله کہا جاتا تو شاید یہ بات نہ پیدا ہوتی کوئی پوچھے نہ پوچھے، کوئی بلائے نہ بلائے، کوئی کہے نہ کہے آپ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں آپ ہر جگہ پہنچ رہے ہیں''

(۲) سورۂ نمل میں اللہ تعالیٰ مشرکین کے بارے میں فرماتا ہے: بَلِ ادَّارَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِنْهَا بَلْ هُمْ مِنْهَا عَمُونَ (۶۶) ادّارك اصل میں تدارك ہے جو ادغام سے ادارك ہو گیا ہے، تدارك القوم کے معنی ہیں لوگوں کا ایک دوسرے سے مل جانا، یہیں سے اس میں اختلاط اور گڈمڈ ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا، چند مترجمین قرآن کے ترجمے ملاحظہ ہوں:

---

(۳۹) افادات ص ۳۶۵

www.abulhasanalinadwi.org

۔بلکہ تھک کر گر گیا ان کا فکر آخرت کے بارے میں (شیخ الہند)
۔بلکہ آخرت کے بارے میں ان کا علم نیست ہو گیا (تھانوی)
۔بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان لوگوں سے گم ہو گیا ہے (مودودی)
۔بلکہ آخرت کے باب میں ان کا علم الجھا ہوا ہے (اصلاحی)

اب مولانا علی میاں کا دلچسپ ترجمہ اور تشریح ملاحظہ کیجئے، فرماتے ہیں:

''قرآن کی بلاغت اور قرآن کے اعجاز سے معذرت کے ساتھ میں بل ادارك علمهم فی الآخـــرة کا ترجمہ کرتا ہوں کہ ''ان کا علم پنکچر ہو گیا ہے آخرت کے بارے میں'' اور مجھے مغرب کی صورت حال اور اس کے علمی و اختراعی سفر کی اس سے بہتر تشبیہ نظر نہیں آتی کہ جیسے کوئی کار چل رہی ہو اور اچانک اس میں کوئی نقص پیدا ہو جائے کہ اس کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں، اس کے لئے پنکچر سے بہتر کوئی لفظ نہیں'' [۴۰]

الفاظ کا صوتی آہنگ

مولانا مفردات قرآنی کی تشریح کرتے ہوئے ان کے صوتی آہنگ کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ الفاظ قرآن کے حروف ہی سے نہیں بلکہ ان سے نکلنے والی آواز سے بھی اس کا جلال نمایاں ہوتا ہے، فرماتے ہیں،

''لسانیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جیسے اشیاء اور خارجی موجودات کا درجہ حرارت TEMPERATURE ہوتا ہے ویسے ہی الفاظ کا بھی ایک ٹمپریچر ہوتا ہے اور جیسے اجسام کا ایک سائز ہوتا ہے الفاظ کا بھی ایک سائز ہوتا ہے'' [۴۱]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''کہیں صوتی طور پر بھی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ جلال اور جو تاثر ہے وہ ظاہر کرے یعنی حرفی بناوٹ کافی نہیں ہوتی بلکہ صوت کی بھی اس میں ضرورت ہوتی ہے'' [۴۲]

مثال کے طور پر سورۂ اعراف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے گزرے جو اپنے بتوں کے سامنے جھکے

(۴۰) افادات م، ۴۴۶-۴۴۷ (۴۱) ایضاً ص ۱۷۲ (۴۲) ایضاً ص ۵۲۰

www.abulhasanalinadwi.org

ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل نے بے اختیار کہا کہ ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود تجویز کر دیجئے جو آنکھوں سے نظر آتا ہو جیسے ان کے پاس ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے ان کی سخت سرزنش کرتے ہوئے فرمایا: اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ، اِنَّ هٰؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ (۱۳۹) اس کی تشریح میں مولانا فرماتے ہیں:

''یہاں مُتَبَّرٌ کا جو لفظ ہے کوئی دوسرا لفظ اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اس میں جو تشدید ہے اور اس میں جو زور پیدا ہوا ہے وہ اِنَّ هؤلاء هالك ، ان هؤلاء فاسد ، ان هؤلاء فان میں نہیں ہو سکتا، غصہ سا معلوم ہو رہا ہے۔ اِنَّ هٰؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ ، اسے اس پر جھاڑو پھر جانے والی ہے۔ جھاڑو کا لفظ ہم قصداً لائے کہ اس میں بھی ثقیل حروف ہیں اور کسی حد تک وہ صوتی طور پر بھی (ہم آہنگ ہے)''۴۳

عصری انداز تفسیر

بعض آیات کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے مولانا ان کا بہت وسیع مفہوم بیان کرتے ہیں۔ عموماً قدیم مفسرین اتنے توسع کے قائل نہیں ہیں۔ قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ہر زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے الفاظ میں اتنی لچک ہے کہ وہ عصری تعبیرات کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ اس بنا پر بعض آیات قرآنی کی تشریح میں مولانا کی عصری تعبیرات قابل قبول ہو سکتی ہیں مثلاً:

(۱) سورۂ انفال میں ہے: وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (۲۶)

قدیم مفسرین نے ''طیبات'' سے مراد اموال غنیمت لیا ہے۴۴ بعض مفسرین نے اسے اور وسعت دی ہے تو رزقکم من الطیبات کا مطلب یہ بتایا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں کھانے پینے کی چیزیں عطا کیں''۴۵ لیکن مولانا علی میاں اسے عمومیت کی آخری حد تک

---

(۴۳) ایضاً ص ۵۲۰ (۴۴) مثلاً ملاحظہ کیجئے تفسیر طبری طبع جدید دار المعارف مصر ۱۹۶۹ء، ۱۳/ ۴۷۷، تفسیر قرطبی ۷/ ۳۹۴، کشاف زمخشری، مصطفیٰ البابی الحلب واولادہ مصر ۱۹۷۲ء ۲/ ۱۵۳، تفسیر کبیر ۴/ ۴۷۴ (۴۵) مثلاً تفسیر ابن کثیر ۳/ ۳۰۰ اور اردو مفسرین نے بھی عموماً روزی کے معنی میں لیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

پہنچادیتے ہیں۔فرماتے ہیں:

''طیبات کا لفظ عام ہے،سلطنت سے لےکر مطلق العنان و بااختیار سلطنت تک اور سلطنت کے دنوں میں جو عزت ہوتی ہے، جو اعزازات و اختیارات حاصل ہوتے ہیں، جو قانون سازی کی طاقت ،آزادی و خود مختاری اور برتری حاصل ہوتی ہے، یہ سب "طیبات" میں آتا ہے''[۴۶]

(۲) سورۂ بقرہ میں ہے: اَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ، قَالَ اَنّٰى يُحْيِي هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ......الاية (۲۵۹)

اس آیت میں ایک پیغمبر کا واقعہ مذکور ہے جو ایک ویران بستی سے گزرے تو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں سوال کیا کہ یہ ویران بستی کیونکر آباد ہوسکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے سو سال کے لیے ان پر موت طاری کردی، پھر جب وہ بیدار ہوئے تو ان کا گدھا جس پر وہ سواری کررہے تھے گل سڑ کر پنجر بن چکا تھا، مگر ان کا زاد راہ (کھانا) جوں کا توں تھا۔عموماً مفسرین نے اس آیت میں حیات اور موت کو جسمانی اور مادی معنی میں لیا ہے، لیکن مولانا علی میاں انہیں معنوی اور روحانی معنی میں لیتے ہیں۔

فرماتے ہیں:

''میرے خیال میں یہاں صرف جسمانی و مادی زندگی کی واپسی ہی کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس میں معنوی و روحانی زندگی، باطنی نشأۃ ثانیہ اور اس تاریخی کردار کی واپسی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جسے کسی امت و معاشرہ یا قوم و ملک نے انجام دیا ہے اور اس پیغام کی تازہ کاری اور حیات آفرینی کی طرف بھی لطیف اشارہ ہے جس کی یہ امت حامل تھی''[۴۷]

چند ملاحظات

مولانا نے آیات کی تفسیر و تشریح کا جو نہج اپنایا ہے اس سے قرآن کے مطالعہ و فہم اور غور و تدبر میں بڑی مدد ملتی ہے، اگرچہ ضروری نہیں کہ مولانا کی تمام تحقیقات سے اتفاق

---

(۴۶) افادات ص ۱۱۳-۱۱۴ (۴۷) افادات ص ۵۲۹

www.abulhasanalinadwi.org

کرلیا جائے، نبی معصوم کے علاوہ کوئی ذات ایسی نہیں جس کی ہر بات کو قبول کرنا لازم ہو۔ راقم سطور کو بھی مولانا کی بعض تحقیقات سے اتفاق نہیں ہے، چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) مولانا اپنی تحریک ''پیام انسانیت'' کے پلیٹ فارم سے کی جانے والی تقریروں میں عموماً یہ آیت پڑھتے تھے: فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ (ہود ۱۱۶)

مولانا "فساد فی الارض" کو اس کے سادہ سے مفہوم میں لے کر اسے صرف ''اخلاقی بگاڑ'' تک محدود کردیتے تھے، مثلاً ایک تقریر میں یہ آیت پڑھنے کے بعد فرماتے ہیں:

''قرآن مجید نے ینھون عن الشرك نہیں کہا اور نہ ینھون عن المعصية کہا بلکہ ینھون عن الفساد فی الارض کا لفظ استعمال کیا ہے، یہ چند آدمی ہوتے ہیں جو ہتھیلیوں پر سر رکھ کے آجاتے ہیں اور زمانہ کی کلائی موڑ دیتے ہیں، دعوت وعزیمت کی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ اخلاقی بگاڑ کو دور کرنے کے لیے ستر اور اسی فیصد لوگ میدان میں آئے ہیں'' ۴۸

راقم کا خیال ہے کہ ''فساد'' کو شرک اور معصیت سے الگ کرکے صرف ''اخلاقی بگاڑ'' کے معنی میں لینا اس کی وسعت و جامعیت کو محدود کردینا ہے، مفسرین نے اس میں شرک، کفر اور جملہ معاصی کو شامل کیا ہے، چند تصریحات ملاحظہ ہوں:

۔ینھون اھل المعاصی عن معاصیھم واھل الکفر عن کفرھم بہ (طبری) ۴۹

۔ان الفساد ھو الکفر و العمل بالمعصية (طبری) ۵۰

۔و الا فساد فی الارض العمل فیھا بما نھی اللہ جل ثناؤہ عنه و تضییع ما امر اللہ بحفظه (طبری) ۵۱

۔ان المراد بالفساد فی الارض اظھار معصية اللہ تعالی

(عن ابن عباس و حسن البصری و قتادة و السدی) (رازی) ۵۲

(۴۸) ایضاً ص ۳۵۱ (۴۹) تفسیر طبری ۱۹۶۹ء، ۱۵/ ۵۲۷ (۵۱) ایضاً ۱/ ۲۸۹ (۵۲) تفسیر کبیر ۱/ ۲۰۰

www.abulhasanalinadwi.org

۔ الفساد الشرك وهو اعظم الفساد (قتادہ والسدی) (قرطبی)۵۳

۔ ینهون عما كان يقع بينهم من الشرور و المنكرات و الفساد فی الارض (ابن کثیر)۵۴

۔ الفساد الكفر وما اقترن به من المعاصی (آلوسی بحوالہ البحر المحیط)۵۵

(۲) آیت اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم ۹۶) کی تشریح کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں :

''مفسرین نے تو اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرے گا لیکن صحیح تفسیر اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے محبت دلوں میں پیدا فرمائے گا'' ۵۶

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا آیت بالا کی تفسیر میں منفرد ہیں اور انہوں نے دیگر مفسرین سے مختلف ایک نئی تفسیر کی ہے حالانکہ تمام مفسرین نے وہی تفسیر کی ہے جسے مولانا نے صحیح قرار دیا ہے چند تصریحات ملاحظہ ہوں:

۔ سیجعل لهم الرحمن وداً فی الدنیا فی صدور عباده المومنین (طبری)۵۷

۔ یغرس لهم فی قلوب عباده الصالحين محبة و موده (ابن کثیر)۵۸

۔ ای حباً فی قلوب عباده (قرطبی)۵۹

۔ والمعنى سيحدث لهم في القلوب مودة (زمخشری)۶۰

رازی نے بھی زمخشری کے مثل نقل کیا ہے اور اسے جمہور کا قول بتایا ہے ۶۱

(۳) سورۂ مائدہ میں ہے: اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵۰) اسکے تحت مولانا لفظ ''حکم'' کی تشریح میں فرماتے ہیں:

''عربی زبان سے ایک خصوصی تعلق رکھنے والے انسان کی حیثیت سے اور عربی ذخیرہ کی چھان بین کرنے والے طالب علم کی حیثیت سے بھی میں کہتا ہوں کہ حکم کا لفظ

---

(۵۳) تفسیر قرطبی ۱۴/ ۴۰ (۵۴) تفسیر ابن کثیر ۲/ ۴۶۴ (۵۵) روح المعانی ۱۲/ ۱۶۱ (۵۶) افادات ص ۴۷۶

(۵۷) تفسیر طبری طبع قدیم المطبعۃ المیمنۃ مصر ۱۳۳۱ھ ج ۱۶، ۸۷/ (۵۸) تفسیر ابن کثیر ۳/ ۱۳۹ (۵۹) تفسیر قرطبی ۱۱/ ۱۶۰ (۶۰) الکشاف ۲/ ۵۲۷ (۶۱) تفسیر کبیر ۵/ ۵۷۹

www.abulhasanalinadwi.org

قرآن مجید میں بڑا وسیع اور بلیغ ہے، حکم کے معنی صرف قانونی فیصلہ کے نہیں ترجیح واختیار کے بھی ہیں، کسی چیز کو ترجیح دینا اور کسی چیز کو اختیار کرنا، یہ بھی حکم میں شامل ہے، حکم کا لفظ ان سب معانی پر حاوی ہے"۶۲؎

آیت زیر بحث سے ہٹ کر ممکن ہے مولانا کی یہ تحقیق صحیح ہو لیکن اس آیت میں لفظ ''حکم'' یقینی طور پر فیصلہ کے معنی میں ہے، اس آیت سے قبل کی آٹھ آیات (۴۲-۴۹) میں اس مادہ کے مختلف صیغے بارہ مرتبہ آئے ہیں...... فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ ...... يُحَكِّمُونَكَ ...... يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ...... مَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ ...... وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ ...... حُكْمُ اللّٰهِ ...... ان تمام مقامات پر حکم فیصلہ کے معنی میں ہے، یہود ونصاریٰ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس اپنے تنازعات لے کر آتے تھے، اس امید میں کہ ممکن ہے آپؐ کے فیصلے ان کی خواہشات کے مطابق ہوں، اللہ تعالیٰ اس پر اپنے رسول کو مخاطب کر کے ان یہود ونصاریٰ کی سرزنش کر رہا ہے کہ ان کے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے تو پھر وہ اسی کی روشنی میں اپنے فیصلے کیوں نہیں کرتے؟ اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے فرماتا ہے کہ تمہیں اختیار ہے، چاہے ان کے معاملے میں فیصلہ کرو یا نہ کرو، لیکن اگر فیصلہ کرو تو انصاف کو ملحوظ رکھو۔ اسی سیاق میں یہ آیت بھی ہے أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ اس لیے اس میں بھی لفظ حکم کو فیصلہ کے معنی میں لینا چاہیے۔

خاتمہ

مولانا علی میاں کی ان قرآنی تحقیقات وافکار کو دیکھ کر خواہش ہوتی ہے کہ کاش انہوں نے پورے قرآن کی تفسیر لکھی ہوتی، اگر ایسا ہوتا تو یہ ان کا ایک بے مثال کارنامہ ہوتا اور امت کو بھی اس سے بیش بہا فائدہ پہنچتا۔ مولانا کے برادرزادہ مولانا عبداللہ حسنی ندوی بیان کرتے ہیں کہ مولانا کے متعلقین نے ان سے بارہا اس خواہش کا اظہار کیا لیکن وہ خود کو اس پر آمادہ نہ کر سکے۶۳؎

(۶۲) افادات ص ۵۰۵ (۶۳) تعارف بر قرآنی افادات

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں
اور
علم حدیث

ابو سحبان روح القدس ندوی
استاد حدیث۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا علی میاں کے خانوادہ کی علمی خصوصیات میں حدیث شریف سے شغف اور مدرسہ ولی اللہی سے وابستگی ہے، صاحب "نزھۃ الخواطر" کے بیان کے مطابق سید ابو سعید بن محمد ضیاء بن آیۃ اللہ بن علم اللہ الحسنی (ت ۱۱۹۳ھ) نے شاہ ولی اللہ سے اکتسابِ فیض کیا، شاہ صاحب کی وفات کے بعد محمد عاشق بن عبداللہ الپھلتی (ت ۱۱۸۷ھ) کے حلقہ درس میں شامل ہوئے، مدینہ طیبہ میں ابو الحسن السندی (ت ۱۱۸۷ھ) سے امام بغوی کی "المصابیح" کا درس لیا۔(۱)

تیرھویں صدی ہجری کے نابغہ روزگار میں سید قطب الھدیٰ بن محمد واضح (ت ۱۲۲۶ھ) نے شاہ عبدالعزیزؒ سے فقہ وحدیث کا علم حاصل کیا، اور ان کے ذخیرہ کتب سے اہم کتابیں نقل کیں، صحیح بخاری اور جامع ترمذی پر ان کے حواشی ہیں۔(۲)

اس عصر کے فضلاء میں اسحاق بن محمد عرفان (ت ۱۲۳۴ھ) شاہ عبدالقادر کے حلقہ تلمذ میں شامل ہوئے، اور

www.abulhasanalinadwi.org

شاہ عبدالعزیز سے سند حدیث لی۔(۳)

اس عہد کے علماء میں ایک اور فاضل مولانا علی میاں کے پردادا سید عبدالعلی بن علی محمد النصیر آبادی (ت ۱۲۶۹ھ) نے محمد علی رامپوری المحدث (ت ۱۲۵۸ھ) سے حدیث پڑھی۔(۴)

چودھویں صدی کے مشاہیر میں مولانا علی میاں کے دادا "مہر جہانتاب" کے مؤلف علامہ سید فخر الدین بن عبدالعلی (ت ۱۳۲۶ھ) مولانا محمد نعیم بن عبدالحکیم الانصاری (ت ۱۳۱۸ھ) کے حلقہ درس میں شریک ہوئے، اور "مشکاۃ المصابیح"، تفسیر جلالین ان سے پڑھی، سید خواجہ احمد بن محمد یٰسین النصیر آبادی (ت ۱۲۸۹ھ) نے اپنی تمام مرویات و مقروئات کی سند دی، شاہ یعقوب بن محمد افضل دہلوی (ت ۱۲۸۲ھ) نواسۂ شاہ عبدالعزیز اور مولانا سخاوت علی جونپوری (ت ۱۲۷۴ھ) نے انہیں اجازت حدیث عطا فرمائی۔(۵)

مولانا علی میاں کے والد علامہ سید عبدالحئی بن فخر الدین حسنی (ت ۱۳۴۱ھ) نے حدیث کی بیشتر کتابیں شیخ حسین بن محسن الانصاری الیمانی (ت ۱۳۲۷ھ) سے پڑھیں، علاوہ ازیں مولانا عبدالحی کو مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی (ت ۱۳۱۳ھ) قاضی محمد بن عبدالعزیز مچھلی شہری (ت ۱۳۲۰ھ) میاں سید نذیر حسین (ت ۱۳۲۰ھ) مولانا رشید احمد گنگوہی (ت ۱۳۲۳ھ) قاری عبدالرحمٰن پانی پتی (ت ۱۳۱۴ھ) سے اجازت حاصل ہے۔(۶)

مولانا علی میاں کے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (ت ۱۳۸۰ھ) نے مولانا انور شاہ کشمیری (ت ۱۳۵۲ھ) اور مولانا محمود حسن دیوبندی (ت ۱۳۳۹ھ) سے کتب صحاح و سنن پڑھی، اور

www.abulhasanalinadwi.org

شیخ حسین یمانی سے لکھنؤ میں "کتاب الاولیات" للشیخ سعید سنبل پڑھی اور ان سے سند حدیث بھی لی۔ (۷)

مولانا علی میاں کی بہن امۃ اللہ تسنیم (ت ۱۳۹۶ھ) نے امام نووی کی شہرہ آفاق کتاب "ریاض الصالحین" کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا، جو "زاد سفر" کے نام سے مشہور و متداول ہے، اور علامہ سید سلیمان ندوی کے مقدمہ اور مولانا محمد منظور نعمانی کے تعارف سے آراستہ ہے۔

اس خانوادہ کے گوہر نایاب مولانا سید ابوالخیر برق حسنی (ت ۱۳۹۰ھ)۔ مولانا علی میاں کے ماموں زاد بھائی۔ کو حفظ حدیث سے بڑا شغف تھا صحیح مسلم اور مؤطا کی ہزاروں حدیثیں مع سند انھیں یاد تھیں، شرح و تطبیق احادیث سے بھی ذوق رکھتے تھے، "مشکلات الحدیث" کے نام سے انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی، وہ حدیث میں مولانا عبدالرحمان بن محمد یعقوب بستوی کے شاگرد ہیں، اور ان کے اثر سے مسلک اہل حدیث اختیار کر لیا تھا۔ (۸)

اس سلسلۃ الذھب کی آخری کڑی سادات حسنی اور خانوادہ شاہ علم اللہ کے وارث و امین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (۱۳۳۳۔۱۴۲۰ھ) کی ذات گرامی ہے۔

مولانا کی تعلیمی سرگزشت خود ان ہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

"میں نے ایک ایک فن کی تعلیم علیحدہ علیحدہ تحصیل کی، اور مخلوط نصاب پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا، ہمارے صاحب نظر اور صاحب ذوق استاد خلیل عرب صاحب نے سب سے پہلے عربی ادب کی تکمیل کرائی، چنانچہ عربی زبان کی ابتدائی ریڈر المطالعۃ العربیہ سے نہج البلاغۃ، حماسہ، اور دلائل الاعجاز تک تین سال

www.abulhasanalinadwi.org

کاملاً عربی ادب اور اس کے متعلقات ہی پڑھتا رہا۔

ادب کے نصاب کی تکمیل کے بعد جو شیخ خلیل عرب کا طبع زاد اور خود ایجاد تھا، مجھے خوش قسمتی سے علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کی صحبت میسر آئی جو عربیت اور نحو وصرف میں عصر حاضر کے یگانہ اشخاص میں سے تھے، ان کو امام فن کہنا بجا ہوگا، ادب کے بعد میں نے کچھ فقہ کی تعلیم حاصل کی، اور دو سال دار العلوم ندوۃ العلماء میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے درس میں حدیث کی تکمیل کی، اس زمانہ میں کچھ تفسیر بیضاوی کا حصہ مولانا سے پڑھا، کچھ عرصہ کے لئے میں نے لاہور جاکر مولانا احمد علی صاحب کے تفسیر کے درس میں شرکت کی، اس درس پر قرآن مجید سے سیاسی نکات کے استنباط کا ذوق غالب تھا، اس طرز سے مجھ کو زیادہ مناسبت نہیں ہوئی"۔(۹)

مولانا اپنے مطالعہ حدیث کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"میں جب اپنے استاد شیخ خلیل عرب سے ادب کی کتابیں پڑھتا تھا اس وقت انہوں نے ادب کے نصاب کے علاوہ دو اور سبق شروع کرا رکھے تھے، ایک قرآن مجید کی چند سورتیں جن میں سورہ زمر خاص اہمیت رکھتی تھی، دوسرے مسلم کی کتاب الجہاد، یہ میرا حدیث سے پہلا تعارف ہے۔"(۱۰)

مولانا کی کتب حدیث سے واقفیت اور مطالعہ کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے لکھتے ہیں:

"اپنے گاؤں میں اصلاح ووعظ کے سلسلہ میں حافظ منذری کی "کتاب الترغیب والترهیب" کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی، اس کو بار بار پڑھ کر سنایا، اسی زمانہ میں محمد بن نصر

www.abulhasanalinadwi.org

المروزی کی کتاب "قیام اللیل" دیکھنے کا اتفاق ہوا"۔(۱۱)

"اسی زمانہ میں اپنے ضلع کے مشہور مردم خیز قصبہ سلون جانا ہوا جہاں شاہ حلیم عطا صاحب کا کتب خانہ دیکھنے کا موقع ملا اس کتب خانہ سے بعض علماء و محدثین کی تصنیفات کا شوق پیدا ہوا، جس میں علامہ ابن جوزی اور حافظ ابن رجب حنبلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں"۔(۱۲)

مولانا کی حدیث کی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں شروع ہوا، فرماتے ہیں:

"میری مکرر خوش قسمتی تھی کہ حدیث میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب جیسا متبحر استاد نصیب ہوا، جو مولانا غلام احمد صاحب لاہوری، مولانا لطف اللہ صاحب کوئلی، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور شیخ الاسلام شیخ حسین یمنی کے شاگرد اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مجاز تھے"۔(۱۳)

"اور حدیث براہ راست میاں نذیر حسین سے پڑھی تھی"۔(۱۴)

مولانا علی میاں نے ایک ایک فن کی تعلیم علیحدہ علیحدہ حاصل کی، فرماتے ہیں: "یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ حدیث کی تعلیم شروع ہوئی تو کوئی دوسرا فن اور موضوع مزاحم نہ تھا صرف حدیث کے اسباق تھے" (۱۵) "میرا قیام اکثر مولانا کے ساتھ رہتا اور میں ان کے کتب خانہ کا مہتمم اور ان کے مسودات کا ناقل اور مرتب بھی تھا، اور ان کے حکم سے رجال کی کتابوں سے مواد بھی فراہم کرتا، اس سے مجھے بڑا علمی فائدہ پہونچا، اور مجھے علمی ترقی کا میدان ہاتھ آگیا" (۱۶) "میں نے مولانا سے دار العلوم میں صحیحین (بخاری و مسلم) اور ابوداؤد، ترمذی حرفاً حرفاً پڑھی۔ میری حدیث کی تعلیم

www.abulhasanalinadwi.org

سر تاپا ان کی شفقت اور مہارت فن کی رہین منت ہے"۔(۱۷)

مولانا حیدر حسن خاں کے طرز تدریس پر مولانا علی میاں روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"تدریس حدیث کا طرز خالص محدثانہ و محققانہ تھا، محدثین یمن کی خصوصیات کا حامل اور شیخ حسین کے درس کا عکس" (۱۸) "یمنی علماء کی کتابوں سے استفادہ بھی پورا تھا، خاص طور پر الامیر محمد بن اسمٰعیل الصنعانی اور سید محمد بن ابراہیم بن الوزیر، علامہ مقبلی، اور علامہ شوکانی کی کتابیں برابر مطالعہ میں رہتیں اور ان کا حوالہ دیتے، علمائے احناف میں سے بھی ان کتابوں کا حوالہ دیتے جن کا پایہ حدیث میں مسلم ہے، اور جنھوں نے مذہب حنفی کے اثبات میں احادیث ہی سے زیادہ تر کام لیا ہے، مثلاً امام طحاوی، علامہ زیلعی، اور ابن الترکمانی، اور ابن ہمام" (۱۹) "اصول حدیث کے بعض نوادر ان کے خاص ماخذ تھے، جن میں "تنقیح الأنظار" اور "توضیح الأفکار" کے قلمی متن و شرح کے مسودات خاص طور پر قابل ذکر ہیں"۔(۲۰)

"صرف شروح پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اونچے سے اونچے ماخذ طلبہ کے سامنے پیش کر دیتے تھے، مثلاً صحیح بخاری میں اگر کوئی اختلافی مسئلہ آجاتا تو صرف فتح الباری اور عینی ہی پر بس نہیں ہوتی، بلکہ امام شافعی کے نقطہ نظر کو سمجھانے کے لئے ان کی "کتاب الام" پڑھاتے، امام مالک کے دلائل کے لئے "مدونہ" اور اسکی شروح پیش کرتے۔" (۲۱) "نکات اور توجہات کی طرف زیادہ میلان نہیں تھا، بلکہ اندازِ بحث بالکل محدثانہ ہوتا تھا" (۲۲) "اسماء الرجال کی کتابوں پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی، یہاں بھی متقدین کی تصانیف کی فکر

www.abulhasanalinadwi.org

میں رہتے تھے، میزان الاعتدال، تہذیب التہذیب، تذکرۃ الحفاظ اور لسان المیزان کے اقوال تنقیدی نظر سے پڑھتے تھے، اور متقدین کی کتابوں میں ان کی سند تلاش کرتے تھے "(۲۳)"حدیث صحیح کا جواب حدیث صحیح سے اور نقد حدیث کے مسلمہ اصول و مجتہدانہ مباحث سے دیتے تھے، ان کا درس عملی تھا، جس میں طالب علم استاد کے ساتھ شریک عمل ہوتے تھے، مولانا طلبہ ہی سے کتابوں کے نقول، مذاہب کے دلائل، رجال پر نقد و جرح کی بحثیں نکلواتے تھے اور کبھی کبھی مرتب کراتے تھے اور بعض مرتبہ بعض کتابوں کی شرح کا کام شروع کراتے تھے، اس طرح تدریس و تالیف کا سلیقہ سکھاتے تھے"۔(۲۴)

"بعض اوقات مسائل کی تحقیق کے سلسلہ میں قرآن و حدیث کے ایسے الفاظ آجاتے تھے جن کا مفہوم متعین کرنے میں اہل زبان مختلف الخیال ہیں، ایسے مواقع پر علمائے معانی و بیان اور ائمہ لغت کی اہم تصانیف کھلتیں، کلام عرب سے استشہاد ہوتا اور الفاظ کی حیثیت اور مختلف زبانوں میں ان کے استعمال کی تاریخ پر نظر ڈالی جاتی، اور بڑی کدو کاوش کے بعد رائے قائم کی جاتی" (۲۵) "مولانا کے درس کی ایک برکت یہ تھی کہ فن حدیث سے مناسبت اور اس کی بنیادی کتابوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی" (۲۶)"میں نے یہ طریقہ درس کہیں اور نہیں دیکھا اور میرے خیال میں علمی حیثیت سے اس سے زیادہ مفید اور ترقی یافتہ طریقہ درس نہیں ہے"۔(۲۷)

مولانا علی میاں کے علم حدیث میں استفادہ کے سلسلہ میں ان کے قیام دیوبند اور مولانا حسین احمد مدنی کے حلقہ درس میں

www.abulhasanalinadwi.org

شرکت کا تذکرہ اگر نہ کیا جائے تو علمی امانت کا حق ادا نہ ہوگا، بلکہ یہاں تو اس کا ذکر کرنا یوں بھی ضروری ہو گیا کہ مولانا حسین احمد اور مولانا حیدر حسن دونوں کے طریقہ درس کا کیا انداز تھا؟ اور مولانا علی میاں نے ان میں سے کس کا اثر قبول کیا؟ اور ان کے نزدیک کس کا طریقہ درس مفید اور ترقی یافتہ ہے؟ یہاں بغیر کسی کم و کاست مولانا علی میاں کے دیوبند میں قیام اور مولانا حسین احمد کے درس میں شرکت انہیں کی زبانی پیش خدمت ہے، مولانا فرماتے ہیں:

"۱۹۳۲ء میں مولانا مدنی کی کسی تشریف آوری کے موقع پر بھائی صاحب نے مجھے مولانا مدنی کی خدمت میں پیش کیا، میں نے اپنے کچھ حالات عرض کیے، مولانا نے بھائی صاحب کو مشورہ دیا کہ مجھے ان کے پاس دیوبند بھیج دیا جائے، تعلیمی سال جو تمام مدارس عربیہ میں شوال سے شروع ہوتا ہے نصف سے زیادہ ہو چکا تھا اور میرے بارے میں مولانا کا منشاء باقاعدہ طالب علم بننے کا تھا بھی نہیں، صرف کچھ دن ساتھ رہنے کا تھا، میں ربیع الاول یا ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ (جولائی، اگست ۱۹۳۲ء) کو دیوبند حاضر ہوا، اس وقت تعلیم اور درس حدیث اپنے نقطہ عروج پر تھا، مولانا کے یہاں بخاری اور ترمذی ہوتی تھی، میں نے اس میں باقاعدہ شرکت شروع کر دی"۔ (۲۸)

مولانا مدنی کے طریقہ درس کا حال خود مولانا علی میاں کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

"ایک مسئلہ پر بعض اوقات تین تین چار چار دن مسلسل (۶۰ منٹ کے تعلیمی گھنٹہ میں) تقریر جاری رہتی، اور مسئلہ کا مالہ وماعلیہ ائمہ کے اختلاف و مذاہب، اور ان کے دلائل وماخذ، متن و اسناد ورجال کی بحثیں برجستہ، اس سب پر مولانا کا مخصوص دلکش لہجہ

www.abulhasanalinadwi.org

اور دار الحدیث کی روحانی و پر سکینت فضا ابھی تک آنکھوں میں ہے، اور گویا اس وقت بھی بالسند المتصل إلی أمیر المؤمنین فی الحدیث ..... کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے، درمیان میں طلبہ کے سوالات کا (جن میں غیر متعلق بھی ہوتے) تحمل کیساتھ جواب دیتے، آخر سال میں درس کی مصروفیت اتنی بڑھ جاتی کہ عصر کے بعد بھی درس، عشاء کے بعد بھی دیر رات تک درس، صبح کی نماز کے بعد بھی درس، اچھے اچھے مستعد طالب علموں کی ہمت جواب دے جاتی، لیکن مولانا کی مستعدی، نشاط اور قوت میں فرق نہ آتا"۔(۲۹)

مولانا علی میاں نے مولانا حسین احمد کے درس حدیث میں شرکت کے علاوہ قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کے سمجھنے میں بھی استفادہ کیا، مولانا فرماتے ہیں:

"درس حدیث کے علاوہ جس سے مولانا کی قوت تدریس اور شان محدثیت کا اظہار ہوتا تھا، اور پوری فضا پر نورانیت اور سکینت کا سایہ معلوم ہوتا تھا، میں نے مولانا سے قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کے سمجھنے کے لیے خصوصی وقت مانگا، مولانا نے مجھے جمعہ جمعہ وقت دیا، جس پر مولانا کے اس وقت کے سیاسی دوروں کی وجہ سے اکثر ناغے ہوجاتے تھے، پھر بھی استفادہ کا موقع ملا، اور مولانا کے تدبر قرآن کا اندازہ ہوا"۔(۳۰)

تعلیمی سال کے اختتام پر مولانا علی میاں دیوبند سے واپس آجاتے ہیں فرماتے ہیں:

"جب دار العلوم میں امتحانات کی تیاری شروع ہوئی اور کتابیں ختم کے قریب پہونچیں تو میں دیوبند سے واپس آگیا"۔(۳۱)

اب میں اس سلسلہ کو مولانا علی میاں کی ایک عبارت پر جس میں

www.abulhasanalinadwi.org

دیوبند کے طریقہ درس پر مولانا کا زبردست ریمارک ہے ختم کرتا ہوں اور نتیجہ بحث قاری کے ذمہ چھوڑتا ہوں، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"دیوبند کے قیام میں میرے لئے دل بستگی کا واحد ذریعہ مولانا (مدنی) کی ذات گرامی تھی، میری ذہنی وتعلیمی پرداخت اس انداز سے ہوئی تھی کہ میرے لئے وہاں کی درسی ومدرسی ماحول میں دلچسپی کا کم سامان تھا، لیکن مولانا کی ایک نگاہ التفات، ایک تبسم کسی وقت شفقت سے کچھ پوچھ لینا سارا بوجھ ہلکا کردیتا، اور دل دیر تک اس کا مزہ لیتا"۔(۳۲)

یہاں مولانا علی میاں نے اپنی جس ذہنی وتعلیمی انداز تربیت کی طرف اشارہ کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس اجمال کی تفصیل خود مولانا کے مطالعہ ادب وحدیث کی سرگزشت، اور ان کے اساتذہ ادب و حدیث کے طریقہ درس سے روشن وعیاں ہے، مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا حیدرحسن خاں کے طریقہ درس وطرز تحدیث نے جو خالص محدثانہ ومحققانہ اور جو محدثین یمن کی خصوصیات کا حامل اور شیخ حسین یمانی کے درس کا عکس تھا، مولانا علی میاں کے فکروخیالات میں وسعت پیدا کی، اور عمل بالحدیث کی راہ آسان کردی، چنانچہ قراءۃ خلف الامام ہو یا سفر میں جمع بین الصلاتین، تعدیل ارکان فی الصلاۃ ہو یا صفت نماز کی ادائیگی کی کیفیت مولانا علی میاں مسلک احناف سے بالکل الگ عاملین بالحدیث کی صف میں نظر آتے ہیں، غالباً مولانا علی میاں اپنی اسی توسع کی وجہ سے ابویحیی امام خاں نوشہروی (ت ۱۳۸۶ھ) کی مشہور کتاب "تراجم علمائے اہلحدیث ہند" میں جگہ پانے کے مستحق ہوئے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مطالعہ حدیث مولانا علی میاں کا پسندیدہ موضوع و مشغلہ رہا ہے، ایک عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ابواب بخاری (کتاب الایمان، کتاب العلم) کا درس دینے کا معمول رہا ہے، ادھر چند سالوں سے عالمیت کے طلبہ کو ترمذی اور فضیلت کے طلبہ کو صحاح ستہ بشمول موطاامام مالک اور مسند احمد کی سند عطا فرماتے، نیز حجاز و شام اور ہندوستان کے متعدد علماء و مشائخ کو اجازت حدیث عنایت فرمائی۔

مولانا کی سند حدیث کا ذکر آگیا ہے تو یہ عرض کرتا چلوں کہ مولانا کو سند حدیث دو جلیل القدر محدث سے حاصل ہے ان میں ایک مولانا حیدر حسن خاں (ت۱۳۶۱ھ) اور دوسرے صاحب " تحفۃ الاحوذی" مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری (ت ۱۳۵۳ھ) اور ان دونوں کی سند حدیث شیخ حسین بن محسن یمانی کے طریق سے علامہ شوکانی صاحب نیل الاوطار، اور شیخ الاسلام عبدالرحمٰن بن سلیمان الاھدل کے واسطہ سے علمائے حرمین تک پہونچتی ہے، اور میاں سید نذیر حسین بہاری ثم دھلوی (ت ۱۳۲۰ھ) کے طریق سے مولانا ٹونکی اور مولانا مبارکپوری کی سند شاہ ولی اللہ عن ابی طاہر محمد بن ابراہیم الکردی ائمہ حرمین سے مل جاتی ہے، اس طرح مولانا علی میاں یمنی اور حجازی دونوں طرز تحدیث کے تلمیذ و خریج ہیں۔ (۴۳)

یہاں یہ بھی واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گو مولانا علی میاں نے مولانا حسین احمد کے درس بخاری ترمذی میں چار ماہ ضرور شرکت کی، لیکن ان سے اجازت حدیث کا ثبوت مولانا علی میاں کی کسی تحریر و بیان اور ان کی سند حدیث میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

اخیر عمر میں صحیح بخاری سے مولانا کا شغف بہت بڑھ گیا

تھا، اپنے کسی عزیز سے متن بخاری کا کچھ حصہ روزانہ سماعت فرماتے، اور اپنے والد کی حدیث میں تصنیف لطیف "تہذیب الاخلاق" زیر مطالعہ رہتی، ادھر کئی سالوں سے ندوۃ العلماء میں ختم بخاری کے موقع پر بخاری کی آخری حدیث کی روشنی میں پر از معلومات اور ایمان افروز تقریر فرماتے۔

مولانا موصوف نے اپنے تین قیمتی رسالہ میں حدیث کے موضوع پر مختلف زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے، وہ تینوں رسالے جو کہ عربی میں ہیں حسب ذیل ہیں (۱) المدخل إلى دراسات الحديث النبوى الشريف (۲) دور الحديث فى تكون المجتمع الإسلامى (۳) محمد بن إسمعيل البخارى و كتابه الجامع الصحيح۔

اول الذکر رسالہ میں حدیث سے متعلق نہایت قیمتی اور اچھوتی بحث ہے، ساتھ ہی صحاح ستہ کی خصوصیات، اصول حدیث، فن جرح وتعدیل، اسماء الرجال، تدوین حدیث جیسے موضوعات پر ایک نیا زاویہ فکر پیش کیا ہے، طالبان علوم حدیث کے لئے یہ رسالہ بہت مفید ہے۔

ثانی الذکر رسالہ جو خود صاحب مضمون کے بیان کے مطابق: "اس مقالہ میں ایک نئے زاویہ نگاہ اور ایک نئے اسلوب سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حدیث مسلمانوں کی زندگی میں کیا مقام رکھتی ہے؟ امت کو سنت کی کس قدر ضرورت ہے؟ اور اس امت کے سنت مطہرہ سے رشتہ منقطع ہو جانے اور حدیث نبوی کے سرمایہ سے محروم ہو جانے میں امت کا کتنا بڑا خسارہ ہے؟ اور وجود اسلامی کے لئے کتنا بڑا خطرہ مضمر ہے؟ حدیث کے سند و حجت ہونے

www.abulhasanalinadwi.org

کے بارے میں شک وشبہ و بے اعتمادی پیدا کرنے کی عالم اسلام کے بعض گوشوں میں جو تحریک چل رہی ہے وہ اسلام کے خلاف کتنی گہری اور خطرناک سازش ہے؟ اور اسکے پیچھے کون سے مقاصد و محرکات سرگرم عمل ہیں"۔(۴۴)

دراصل یہ رسالہ جس کا اردو ترجمہ "اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار" اور انگریزی ایڈیشن (Role of Hadith in the promotion of Islamic climate and attitudes) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے دورہ محاضرات کے موقع پر عالم اسلام کی اہم شخصیات کے سامنے پڑھا گیا، اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

آخر الذکر مولانا کا وہ مقالہ ہے جسے اکتوبر ۱۹۹۳ء میں سمرقند میں امام بخاری پر منعقد دو روزہ سیمنار میں عالم اسلام کے مشاہیر اور فضلائے حدیث کی موجودگی میں پیش کیا گیا، جس میں امام بخاری اور ان کی کتاب "الجامع الصحیح" سے متعلق قیمتی نکات و مباحث آگئے ہیں۔

"تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ اول میں تدوین حدیث، محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی، فن اسماء الرجال، محدثین کی احتیاط وامانت، ان کا قوت حافظہ اور استحضار، مجالس درس میں سامعین کے ہجوم پر خاصہ مواد جمع ہو گیا ہے، جو دراصل تاریخ تدوین حدیث کا خلاصہ و نچوڑ ہے۔

"تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ پنجم باب ششم میں حدیث کی اہمیت اور ہر ملک اور ہر دور میں اسکی ضرورت، حدیث امت کے

www.abulhasanalinadwi.org

لئے صحیح میزان و معیار ہے، تاریخ اسلام میں اصلاح و تجدید کی تحریکیں علم حدیث سے وابستہ ہیں، پھر ہندوستان میں علم حدیث کی تاریخ پر بڑی سیر حاصل بحث آگئی ہے۔

مولانا کی تصانیف بالخصوص "ارکان اربعہ" میں حدیث سے بھرپور استفاد ملتا ہے۔ ضعیف اور موضوع حدیث پر عمل کے سلسلہ میں مولانا علی میاں متشددین گروپ میں نظر آتے ہیں، یعنی یحی بن معین، امام بخاری و مسلم، ابن حزم اور شیخ البانی وغیرہ کی فکر کے قریب دکھائی دیتے ہیں، اس بارے میں مولانا کا موقف ملاحظہ فرمائیں۔

"اسلام میں اکثر فتنے شکوک و شبہات اور اختلافات ان حدیثوں سے پیدا ہوئے ہیں جو موضوع اور ضعیف ہیں در حقیقت موضوع اور ضعیف حدیثوں میں نور نبوت، اصلاح و تربیت کی حقیقی طاقت اور اللہ کی طرف سے وہ تائید و حفاظت نہیں ہے جو قرآن اور احادیث صحیحہ کے ساتھ موعود ہے، پھر اس کے اندر بکثرت وہ عنصر ہے جس کو عقلیں آسانی سے ہضم نہیں کر سکتیں اور مختلف شبہات کی تخم ریزی ہوتی ہے، میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ فضائل اعمال تک میں صرف احادیث صحیحہ پر اکتفا کی جائے، اور ان احادیث کو پیش کیا جائے جن پر محدثین نے بالاتفاق کلام کیا، یا جو ان مجموعوں میں بند ہیں جن کو عام شہرت اور تلقی امت کا درجہ حاصل ہے، بڑے تجربوں کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں اور آخر میں یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی کہ صحیحین کو خصوصیت کیساتھ اور پھر باقی صحاح کو بالعموم حدیث کے پورے ذخیرہ میں امتیاز حاصل ہے، اور وہ کتابیں جن کے ساتھ امت نے اس درجہ کا اعتناء نہیں کیا ان کے ہم پلہ

www.abulhasanalinadwi.org

نہیں ہو سکتیں خصوصیت کیساتھ اس دور فتن میں جس میں طبیعتوں میں بکثرت زیغ وضلال پایا جاتا ہے احادیث وروایات کے بارے میں اس احتیاط کو ملحوظ رکھنے کی بڑی ضرورت ہے"۔(۳۵)

حدیث شریف کی بعض اہم کتابوں اور شروح کے بارے میں مولانا علی میاں کے خیالات وتاثرات ملاحظہ فرمائیں۔

ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی (ت۶۷۶ھ) کی شرح مسلم کے بارے میں مولانا کی رائے ہے:

"درس حدیث میں عملی طور پر سب سے زیادہ فائدہ نووی کی شرح مسلم سے ہوا، جو ایک مبتدی طالب علم کے لئے بڑا اچھا استاد ہے شروح حدیث سے فائدہ اٹھانے اور ذہن پر زور دینے کا ملکہ اس سے پیدا ہوا"۔(۳۶)

حافظ ابن حجر عسقلانی (ت ۸۵۲ھ) کی "فتح الباری شرح صحیح البخاری" پر مولانا کا ریمارک ہے:

"فتح الباری سے استفادہ کی اصل نوبت تدریس کے زمانہ میں آئی، اس وقت حافظ ابن حجر کی وسعت نظر، فن حدیث میں ان کی قدرت اور اس کے وسیع ذخیرہ پر ان کا احتواء دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، یہ کتاب مسلمانوں کا ایک علمی کارنامہ ہے جس کی نظیر سے دوسری ملتوں کا مذہبی ذخیرہ خالی ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے کہیں کہیں وجد وسرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے"۔(۳۷)

محمد بن نصر المروزی (ت ۲۹۴ھ) کی کتاب "قیام اللیل" سے مولانا بہت متاثر ہیں، فرماتے ہیں:

"ابتدائے شباب میں جو کتابیں فرشتۂ رحمت بن کر سامنے آئیں ان میں سب سے زیادہ مؤثر اور محسن کتاب محمد بن نصر المروزی

www.abulhasanalinadwi.org

کی کتاب قیام اللیل ہے اس کتاب کا خاص کام یہ ہے کہ عقلی اور استدلالی طریق سے نہیں بلکہ قلبی اور ذوقی طور پر دلچسپی اور شوق کا رخ بدل دیتی ہے، اور سارا کھیل دلچسپی اور انس ہی کا ہے، اس کتاب میں شب بیدار نوجوانوں کے ایسے مؤثر واقعات لکھے ہیں اور قرآن مجید کی بعض آیات کی اتنی پراثر تفسیر اور قیام لیل کے فضائل جمع کیے ہیں جو اگر کسی خوش قسمت نوجوان کو آغاز شباب میں مل جائیں اور اپنا اثر کر جائیں تو ایک شیخ کامل کی بیعت سے کم نہیں"۔(۳۸)

حافظ ابن قیم الجوزیۃ (ت ۷۵۱ھ) کی " زاد المعاد" جو دراصل فقہ السنہ کی بے مثال شاہکار ہے، مولانا علی میاں اس کتاب کے بڑے قدرداں ہیں، فرماتے ہیں:

"میری مدرسی تعلیم کا اختتام ہو چکا تھا، اور آزاد مطالعہ کا آغاز، حافظ ابن قیم کی "زاد المعاد" میرا کتب خانہ، میری رفیق سفر، اور میری گویا اتالیق و معلم تھی، دینیات کے کتب خانہ کی اتنی بہتر نمائندگی ایک کتاب میں ملنی مشکل ہے، اگر مجھے کبھی پورے ذخیرہ علمی سے محروم کر دیا جائے اور صرف دو کتابوں کی اجازت دی جائے تو میں کتاب اللہ اور زاد المعاد اپنے ساتھ رکھوں گا، اس نے مجھے نماز سکھائی، دعائیں اور اذکار یاد کرائے، سفر کے آداب بتائے، روزمرہ زندگی کے مسنون قواعد و احکام سکھائے، اور سنت کا ضروری علم بخشا"۔(۳۹)

دوسری جگہ طلبہ حدیث اور دعوتی و تربیتی کام کرنے والوں کو اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں:

"حدیث کے طالب علم اور اصلاح و تربیت کے شائقین سے اس کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتا ہوں، میں نے مدینہ طیبہ

www.abulhasanalinadwi.org

کے قیام میں اس کی تجرید کا بھی کام شروع کیا تھا"۔(۴۰)

مولانا کے مطالعہ حدیث کے دو سالہ مدت تعلیم کے زمانہ میں قلبی اور اخلاقی حیثیت سے حدیث کے جس حصہ کا سب سے زیادہ اثر پڑا وہ ترمذی کی "کتاب الزهد والرقاق" اور ابوداؤد کی کتاب الأدعية ہے، ان ابواب سے بے اعتنائی کا شکوہ وجواب شکوہ مولانا ہی کی زبانی سنئے۔

"افسوس ہے کہ یہ ابواب ہمارے مدارس میں بہت رواروی اور سرسری طور پر پڑھائے جاتے ہیں، حالانکہ یہی ابواب باضافہ کتاب الایمان وکتاب العلم سیرت کی تعمیر میں سب سے بڑا ذریعہ اور تربیت واصلاح کا سب سے مؤثر سامان ہے"۔(۴۱)

محدث جلیل مولانا محمد زکریا کاندھلوی (ت ۱۴۰۲ھ) کے حدیث شریف سے شغف کا تذکرہ اور ان کی شروح وتعلیقات پر مولانا علی میاں کا تبصرہ ہے:

"حدیث وعلوم حدیث شیخ کا اصل ذوق، موضوع، اور محنت وتحقیق کا میدان تھا اور اس کو وہ تقرب الی اللہ وتقرب الی الرسول کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے، اور اس کو انہوں نے اپنا شعار ودثار بنا لیا تھا، یہاں تک کہ "شیخ الحدیث" کا لقب ان کے نام کا قائم مقام اور اس سے زیادہ مشہور ہو گیا تھا"۔(۴۲)

شیخ کے رسالہ "حجة الوداع" کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

"علمی، معنوی اور اپنے مواد ومعلومات کے لحاظ سے "بقامت کہتر وبقیمت بہتر" کا مصداق ہے، اور اس کے اندر اس موضوع پر اتنا محدثانہ ومحققانہ مواد آگیا ہے، جس کو دیکھ کر یہ خیال

www.abulhasanalinadwi.org

بھی نہیں گذر سکتا کہ یہ ایک دن ڈیڑھ رات میں پورا ہوا ہے، اس موقع پر عمرات نبوی کی بحث، ان کی تعداد اور تحدید کی تحقیق، اور ان سے فقہی احکام کا استخراج بھی فرمایا، اس طرح یہ رسالہ اس موضوع پر کافی وشافی بن گیا، اور اس کو اس موضوع پر ایک چھوٹا سا دائرۃ المعارف کہا جاسکتا ہے"۔(۴۳)

شیخ کی مہتم بالشان کتاب "اوجز المسالك شرح مؤطا امام مالك" کا تعارف کراتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

"اوجز کے شروع میں نوے صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں فن حدیث کے تعارف و تاریخ اور تدوین حدیث پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، پھر کتاب اور صاحب کتاب امام مالک کا مفصل تعارف، اور ان دونوں کی خصوصیات وامتیازات کا مفصل تذکرہ ہے، نیز اس کے شروح اور عہد بعہد خدمات اس کے ساتھ امت کا اعتناء کا ذکر ہے۔ پھر اپنے مشائخ اور سلسلہ ولی اللّٰہی کے اسانید کی تفصیل، پھر اس سب کے بعد امام ابو حنیفہ کا تذکرہ اور ان کی محدثانہ حیثیت ودرجہ، اور ان کے اصول ومسلک کا تذکرہ ہے، پھر متفرق فوائد و قواعد او ہدایات وتوجیہات ہیں"۔(۴۴)

"لا مع الدراری" جو اصلاً مولانا گنگوھی کی تقریرات بخاری اور مولانا محمد یحیٰی کے حواشی کا مجموعہ ہے شیخ کے اضافوں و حواشی سے شائع ہوئی ہے، مولانا علی میاں کی نگاہ میں:

"حدیث کے طالب علموں اور مدرسین کے لئے معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ بن گیا ہے، اس سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کی قدر اہل درس ہی کر سکتے ہیں، کتاب کے شروع میں ایک سو باون صفحے کا فاضلانہ مقدمہ ہے، جس میں نہ

www.abulhasanalinadwi.org

صرف امام بخاری اور ان کی نادر روزگار الجامع الصحیح کے مختلف گوشوں، مباحث ومسائل پر مبسوط کلام ہے، اور اس میں وہ معلومات فوائد ونکات جمع کردیئے گئے ہیں جو اصول ورجال اور تذکروں کے ہزاروں صفحات میں منتشر ہیں، بلکہ مراتب کتب حدیث، ابواب حدیث، تقلید واجتہاد اور احناف کے دفاع کے سلسلہ کی وہ تحقیقات بھی جمع کردی گئی ہیں، جن سے یہ مقدمہ طالبین حدیث، بالخصوص حنفی المسلک علماء کے لئے ایک اچھی بیاض بن گیا ہے"۔(۴۵)

اسی طرح شیخ کے رسالہ "الأبواب والتراجم للبخاری" کو مولانا علی میاں ان کے تحقیقی ذوق، اپنے مشائخ سے محبت اور ان کے علوم کی حفاظت کا نمونہ قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"یہ رسالہ شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود حسن دیوبندی کے رسائل وتحقیقات کا مجموعہ ہونے کے علاوہ، ابواب وتراجم کے سلسلہ میں ان اصول قواعد پر حاوی ہے، جو حافظ ابن حجر، قسطلانی، حافظ عینی کے شروح میں آئے ہیں، پھر ان میں ان اصول وقواعد کا اضافہ کیا ہے، جو ان کے ذوق وتحقیق اور طویل اشتغال وغور وتامل کا نتیجہ ہیں، اس طرح ان اصول وقواعد کلیہ کی تعداد ستر تک پہونچ گئی ہے، ہمارے علم میں اتنا احتواء کسی کتاب میں نہیں کیا گیا، جو لوگ جانتے ہیں کہ بخاری کے ابواب وتراجم میں کتنے لطائف ونکات اور دقائق شامل ہیں اور اساتذہ ومدرسین کو اس سلسلہ میں کیا ہفت خواں سر کرنا پڑتا ہے وہ اس کتاب کی افادیت واہمیت کو سمجھ سکتے ہیں"۔(۴۶)

شیخ کی ان چار کتابوں کا تعارف کرانے کے بعد مولانا علی میاں اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں :

www.abulhasanalinadwi.org

"یہ چار کتابیں جو سب فن حدیث اور اس کے امہات کتب سے تعلق رکھتی ہیں شیخ کو اپنے عہد کا (کم از کم علوم حدیث میں) عظیم مصنف بنانے اور اس کے محققین میں شامل کرنے کے لئے کافی ہیں"۔(۴۷)

شیخ کی ان کتابوں پر مولانا علی میاں کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں ان کتابوں کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

محدث کبیر مولانا خلیل احمد سہارنپوری (ت ۱۳۴۶ھ) کی ابوداود کی شرح "بذل المجهود" پر مولانا علی میاں کا بڑا قیمتی مقدمہ ہے، جس میں مولانا نے ابوداؤد کی اہمیت اور خطابی (ت ۳۸۸ھ) کی "معالم السنن" سے لیکر "بذل المجهود" تک عہد بعہد اسکی شروح کا جائزہ لیا ہے، "بذل المجهود" کی خصوصیات اور اس کی تالیف کے اسباب و محرکات سے بھی بحث کی ہے۔ابوداؤد پر کام کرنے والوں کے لئے کافی مواد جمع ہو گیا ہے۔

"الكوكب الدرى على جامع الترمذى" : جو دراصل مولانا رشید احمد گنگوھی کی تقریر ترمذی کا مجموعہ ہے، جسے ان کے ایک لائق شاگرد مولانا محمد یحیٰی کاندھلوی (ت ۱۳۳۴ھ) نے قلمبند کیا ہے مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے تحقیق و تعلیق کے بعد مولانا علی میاں کے مقدمہ کیساتھ ۱۹۷۵ء میں ندوہ پریس لکھنؤ سے ٹائپ پر چار جلدوں میں شائع کیا۔

مولانا علی میاں نے اپنے مقدمہ میں ابن صلاح، ابن اثیر، اور شاہ ولی اللہ کے حوالے سے ترمذی کی فنی اور تصنیفی خصوصیات پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے، جس میں مولانا نے کتب حدیث سے گہری واقفیت اور مراتب کتب پر دقت نظر کا ثبوت دیا ہے، ترمذی کے سلسلہ میں مولانا نے محدثین کے سرمایہ کا" كشف الظنون "اور

www.abulhasanalinadwi.org

"مقدمه تحفة الأحوذى" کے اعتناء کی طرف ریفر کرنے کے بعد گو اس بارے میں علمائے احناف کی تعلیقات وحواشی، افادات و تقریرات کی مختصر فہرست درج کی ہے، تاہم محدثین احناف کی ترمذی سے بے اعتنائی (باستثناء مولانا یوسف بنوری کی معارف السنن) کا گلہ کیا ہے، حیرت کی بات ہے کہ اس مقدمہ میں مولانا مبارکپوری کی شہرہ آفاق شرح ترمذی "تحفة الأحوذى" کا ذکر کیسے رہ گیا؟ جبکہ مولانا نے اپنی کتاب "المسلمون فی الهند" میں ہندوستانی شروح حدیث کے ضمن میں "تحفہ" کا ذکر کیا ہے (۴۸) "المدخل إلى دراسات الحديث النبوى" میں "تحفہ" کی اہمیت اور زمانہ تدریس میں اس سے استفادہ کا اعتراف بھی کیا ہے (۴۹) اسے الإنسان مركب من النسيان اور قلمی فروگذاشت پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

"کوکب" پر مولانا محمد زکریا کی تحقیق و تعلیق کا ذکر کرتے ہوئے مولانا علی میاں تحریر فرماتے ہیں:

"اس طرح حضرت گنگوہی کی ترمذی کی تقریرات پر ان مزید فوائد کا اضافہ کیا جو دوسری شروح حدیث میں پائے جاتے تھے، اور کتاب پر مفید حواشی چڑھائے، جن میں بہت سی نادر علمی تحقیقات و تنقیحات آ گئی ہیں، جو طویل عرصہ تک درس حدیث اور اشتغال بکتب الحدیث سے ان کے ذہن میں آئے"۔(۵۰)

"معارف الحديث": حدیث کے اردو لٹریچر میں مولانا محمد منظور نعمانی (ت ۱۴۱۷ھ) کا زبردست کارنامہ اور ان کا علمی و دینی شاہکار ہے، حصہ دوم مولانا علی میاں کے بیش بہا مقدمہ سے آراستہ ہے، مولانا نعمانی کے قلم سے اس مقدمہ کی اہمیت پڑھئے:

www.abulhasanalinadwi.org

"اس دوسری جلد پر مقدمہ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے، جس میں انہوں نے حدیث وسنت کی اہمیت پر ایک بالکل نئے انداز میں گفتگو کی ہے اور اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک نئی راہ کھولی ہے، ان چند صفحات کے مطالعہ سے یہ یقین انشاءاللہ ضرور ہو جائیگا کہ حدیث کی محفوظیت کا انکار اور اس کے بارے میں بے اعتمادی پھیلانے کی کوشش اسلام کے ساتھ بدترین دشمنی ہے"۔(۵۱)

مولانا علی میاں اپنے مقدمہ کے آغاز میں بعثت نبوی کے مقاصد: (۱) تلاوت (۲) تعلیم کتاب (۳) تعلیم حکمت (۴) تزکیہ نفوس کے تذکرہ کے بعد نئے معاشرہ اور نئی امت کی تشکیل کے عناصر وارکان ان تین چیزوں کو قرار دیتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی، آپ کی زندگی، سیرت واخلاق (۲) قرآن مجید (۳) آپ کے ارشادات وہدایات، مواعظ ونصائح اور تعلیم وتلقین۔

نیز معاشرت واخلاق کی تعمیر اور سیرت سازی میں حدیث کے بنیادی کردار پر حدیث ہی سے مثالیں پیش کرکے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالنے کے بعد فرماتے ہیں:

"حدیث زندگی کے مختلف شعبوں میں کیسی رہنمائی کرتی ہے؟ اور کیسا علم عطا کرتی ہے؟ اور انسانیت کے لئے کیسا بیش بہا خزانہ ہے؟"۔(۵۲)

پھر حدیث وسنت کے تعارف اور اس کی ہمہ گیریت پر مولانا ایک نیا زاویہ فکر پیش کرتے ہیں:

"درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ اور ارشادات و

www.abulhasanalinadwi.org

ہدایات (جن کے مجموعہ کا معروف نام حدیث و سنت ہے) دین کے لئے وہ فضا اور ماحول مہیا کرتے ہیں جس میں دین کا پودہ سرسبز وبار آور ہوتا ہے، دین کسی خشک اخلاقی ضابطہ یا قانونی مجموعہ کا نام نہیں، وہ جذبات، واقعات اور عملی مثالوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، ان جذبات و واقعات اور عملی مثالوں کا سب سے بہتر اور مستند مجموعہ وہ ہے جو خود پیغمبر کی ذات سے متعلق اور اس کے حالات زندگی سے ماخوذ ہو، یہودی اور عیسائی نیز ایشیا کے دوسرے مذاہب اس لئے بہت جلد مفلوج ہو کر رہ گئے کہ ان کے پاس پیغمبروں کی زندگی کے مستند واقعات اور ایمان آفریں کلام کا مجموعہ محفوظ نہیں تھا، اور ان مذاہب کو وہ ذہنی ماحول اور فضا میسر نہیں تھی جس میں پیروان مذاہب دینی نشو ونما و ترقی حاصل کرتے، اور مادیت والحاد کے حملوں سے محفوظ رہتے، انہوں نے بالآخر اس کی ضرورت تسلیم کرکے اس خلا کو پیروان مذاہب "پیران طریقت" کے واقعات و ملفوظات سے پر کیا، مگر اس خانہ پری نے رفتہ رفتہ مذاہب کو بدعات ورسوم اور نئی تفسیروں کا ایسا مجموعہ بنادیا جس میں اصل مذہب کی تعلیم گم ہو کر رہ گئی، ان مذاہب واقوام کی اپنے پیغمبروں کی سیرت اور مستند واقعات، زندگی کے بارے میں بے بضاعتی و تہی دامنی ایک مسلمہ حقیقت بن گئی ہے"۔ (۵۴)

حدیث کی آفاقیت اور اس کے ذریعہ اس امت کی بقاء و ہدایت پر مولانا روشنی ڈالتے ہیں:

"قرآن مجید کے ساتھ عہد نبوی کی اس تصویر کا باقی رہنا اور نبوت کے کلام اور ماحول کا محفوظ رہنا، اسلام کا اعجاز اور اس کا ایسا امتیاز ہے جس میں کوئی مذہب اور کوئی امت اس کی شریک و سہیم

www.abulhasanalinadwi.org

نہیں، ایک ایسا مذہب جس کو قیامت تک باقی رہنا اور تمام آنے والی نسلوں کو عملی نمونہ اور عمل کے جذبات و محرکات اور قلب و دماغ کی غذا فراہم کرتا ہے، ماحول کے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ ماحول حدیث کے ذریعہ محفوظ ہے۔" (۵۴)

تاریخ تدوین حدیث کے مطالعہ سے مولانا ایک خاص نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

"تدوین حدیث کی تاریخ پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک اتفاقی امر اور دور متاخر کی کوئی جدت نہیں ہے، صحابہ کرام کا عہد نبوی ہی میں کتابت حدیث کی طرف متوجہ ہونا اور بہت بڑی تعداد میں احادیث کا محفوظ کر لینا، پھر انہی کے آخر دور میں تابعین کا تدوین و ترتیب کی طرف توجہ کرنا، پھر ایران و خراسان و ترکستان کے طالبین علم کے سمندر کا امنڈ آنا، اس کا جمع حفظ حدیث سے عشق و شغف، ان کا غیر معمولی حافظہ، ان کا عزم و عالی ہمتی، پھر اسماء رجال و فن روایت، مجتہدین کا پیدا ہونا جن کو اس کا ملکۂ راسخہ اور بصیرت کاملہ حاصل تھی، پھر ان کا انہماک و خود فراموشی، پھر امت کی حدیث کی طرف توجہ اور اس کی عالم اسلام میں مقبولیت اور اشاعت، یہ سب واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ جمع قرآن کی طرح اللہ تعالیٰ کو اس "صحیفۂ زندگی" کو محفوظ کرنا مقصود تھا، اسی کی بدولت حیات طیبہ کا امتداد اور تسلسل باقی رہا اور امت کو اپنے ہر دور میں وہ روحانی، ذوقی علمی و ایمانی میراث ملتی رہی جو صحابہ کرام کو براہ راست حاصل ہوئی تھی، اس طرح صرف عقائد و احکام ہی میں "توارث" کا سلسلہ جاری رہا، حدیث کے اثر سے عہد صحابہ کا مزاج و مذاق ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ تک منتقل ہوتا رہا، اور

www.abulhasanalinadwi.org

امت کو طویل تاریخ میں کوئی مختصر سے مختصر عہد ایسا نہیں آنے پایا جب وہ مزاج و مذاق یکسر ناپید اور معدوم ہو گیا ہو، ہر دور میں ایسے افراد رہے جو صحابہ کرام کے مزاج و مذاق کے حامل کہے جا سکتے ہیں"۔ (۵۵)

اس بحث کو مولانا فتنہ انکار حدیث سے پیدا شدہ عظیم نقصان کی طرف نشاندھی فرماتے ہوئے ختم کرتے ہیں:

"جو لوگ امت کو زندگی اور قوت کے اس سرچشمہ سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور اس میں اس ذخیرہ کی طرف بے اعتمادی اور شک وارتیاب پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ وہ امت کو کیا نقصان پہنچا رہے ہیں؟ اور اس کو کس عظیم سرمایہ اور کتنی بڑی دولت سے محروم کر رہے ہیں؟ وہ نہیں جانتے کہ وہ اس امت کو اس طرح "محروم الارث" منقطع لا اصل اور آوارہ کر دینا چاہتے ہیں، جس طرح یہودیت اور عیسائیت کے دشمنوں یا حوادث روزگار نے ان عظیم مذاہب کو کر دیا، اگر وہ سوچ سمجھ کر ایسا کر رہے ہیں تو ان سے بڑھ کر اس امت اور اس دین کا دشمن کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ پھر اس "مزاج و مذاق" کو دوبارہ پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں جو صحابہ کرام کا امتیاز تھا، اور جو یا تو کامل طور پر براہ راست صحبت نبوی سے پیدا ہو سکتا ہے، یا بالواسطہ حدیث کے ذریعہ جو اس عہد کا جیتا جاگتا مرقع اور حیات نبوی کا بولتا چالتا روزنامچہ ہے اور جس میں عہد نبوی کی کیفیات بسی ہوئی ہے۔" (۵۶)

آخر میں ہندوستان میں اردو فارسی لٹریچر میں ذخیرۂ حدیث کے ترجمہ و تشریح اور نشر و اشاعت کی مختصر تاریخ پر مولانا اپنا مقدمہ ختم کرتے ہیں، گرچہ اس جائزہ میں مزید اضافہ و استدراک کی گنجائش ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا کی تحقیق کے مطابق شیخ عبدالحق (ت ۱۰۵۲ھ) نے سب سے پہلے "مشکاۃ المصابیح" کا فارسی میں ترجمہ و تشریح کی جو "اشعۃ اللمعات" کے نام سے شائع ہوا، پھر فارسی کا دور ختم ہو جانے کے بعد مولانا خرم علی بلہوری (ت ۱۲۷۱ھ) نے امام صغانی (ت ۶۵۰ھ) کی "مشارق الأنوار" کا ترجمہ مع تشریح اردو میں "تحفہ الأخیار" کے نام سے کیا، اس کے بعد نواب قطب الدین خاں (ت ۱۲۸۹ھ) نے مشکاۃ کا اردو ترجمہ ضروری تشریح کے ساتھ "مظاہر حق" کے نام سے کیا، اس دور کے ختم ہو جانے کے بعد اردو میں حدیث کے متعدد نئے مجموعے شائع ہوئے، جن میں مولانا ابراہیم آروی (ت ۱۳۱۹ھ) کا مجموعہ "طریق النجاۃ فی ترجمۃ الصحاح من المشکاۃ" خاص طور پر قابل ذکر ہے، پھر اردو میں حدیث کی خدمت کا کام اعلی معیار اور وسیع پیمانہ پر مولانا بدر عالم (ت ۱۳۸۵ھ) کا ہے، جو "ترجمان السنۃ" کے نام سے مشہور و متداول ہے، اس سلسلہ الذہب کی آخری کڑی "معارف الحدیث" ہے۔

اس کی پانچویں جلد مشتمل بر "کتاب الأذکار والدعوات" بھی مولانا علی میاں کے وقیع مقدمہ سے آراستہ ہے، جس میں مولانا نے خاتم النبیین ﷺ کی نبوت کے اعجاز اور کارنامے کو دو شعبوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) عبد و معبود کے رشتہ کی تصحیح و تنظیم (۲) عبد و معبود کے رشتہ کا استحکام و دوام۔

اور ان دونوں شعبوں کی مولانا نے بڑی دلنشین و ایمان افروز تشریح فرمائی ہے، انداز بیان اچھوتا اختیار کیا ہے، جس سے علوم نبوت اور اس کے اسرار و حکم پر ان کا احتواء، اور اس کی ترجمانی و

www.abulhasanalinadwi.org

تشریح پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

پھر مولانا نعمانی کی دعاء کے باب میں دسترس و شغف کا اعتراف کرتے ہوئے اس کتاب کے محاسن ان الفاظ میں اجاگر فرماتے ہیں:

"اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ کی تحقیقات کو قول فیصل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اور اکثر مقامات پر ان سے استفادہ کیا گیا، شاہ صاحب کے ماسواء انھوں نے حافظ ابن قیم، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن حجر، بالخصوص ان کی بے نظیر کتاب "فتح الباری" سے پورا استفادہ کیا، اس طرح یہ کتاب ان لوگوں کو جن کا مطالعہ اردو تک محدود ہے، ائمہ سلف اور محققین امت کے نتائج تحقیق سے متعارف کراتی ہے، اور اس نسل اور علمائے متقدمین کے درمیان علمی رابطہ کا کام دیتی ہے"(۵۷)

"محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے": تالیف ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری، پر مولانا علی میاں کے مقدمہ میں "مستشرقین اور علم حدیث" کے موضوع پر بڑی اہم اور کام کی باتیں آگئی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ استشراق کی تاریخ اور مستشرقین کی چابک دستی پر مولانا کی گہری نظر ہے، اس سلسلہ میں آپ مولانا ہی کے قلم سے پڑھئے:

"یورپ کے مستشرقین اور ان کے مشرقی تلامذہ و مقلدین کی ذہانت اور حسن انتخاب کی داد نہ دینا ظلم ہے کہ انہوں نے عالم اسلام میں ذہنی انتشار، تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بے عملی، تعطل، اخلاقی انارکی اور شک و ارتیاب پیدا کرنے کے لئے حدیث

www.abulhasanalinadwi.org

و سنت کا انتخاب کیا، اور اسکی حجیت، حفاظت تاریخیت پر ایک منظم حملہ کیا، اور اس پورے شعبہ اور جدید اصطلاح کے مطابق پورے ادارہ (Institution) کو علمی و تاریخی حیثیت سے نہایت مشکوک و مشتبہ اور کمزور و بے بنیاد عمارت کی حیثیت سے پیش کیا۔" (۵۸)

اس سلسلہ کو مولانا آگے بڑھاتے ہیں، اور استشراق کی تحریک کو بے نقاب کرتے ہیں:

"انہوں نے کبھی روایات کی اس تعداد پر جو محدثین کے حالات و تذکروں میں لکھی جاتی ہیں، اپنی سخت حیرت و استعجاب کا اظہار کیا اور اسکو خلاف فطرت بتایا، کبھی محدثین کے حافظہ کے واقعات کو خلاف عقل و قیاس ٹھہرایا، کبھی فاروق اعظمؓ اور بعض دوسرے صحابہ کے استفسارات اور انتظامات کی روایات کا سہارا لیکر مکثرین صحابہ۔ حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ۔ کی کثرت روایات میں شک و شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی، کبھی حدیث کی ترتیب، تدوین کو پچھلے دور اور تیسری چوتھی صدی کی کوشش بتا کر روایت حدیث کے تسلسل اور اس کی تاریخیت کو مجروح قرار دیا، کبھی سیاسی و اعتقادی محرکات و عوامل کو نمایاں کر کے حدیث کے ایک بڑے ذخیرہ کو سیاسی و کلامی مصالح کی بنا پر موضوع قرار دینے کی سعی کی، کبھی تدوین حدیث کو مذاہب اربعہ کے اثبات و احقاق کا تابع و خادم ثابت کر کے احادیث کی نقل و روایت کو فقہی گروہوں اور مکاتب خیال کے تقابل و کشمکش کا نتیجہ ثابت کرنا چاہا۔" (۵۹)

پھر اساتذہ حدیث کی مستشرقین کے حدیث کے بارے میں اعتراضات، شبہات سے بے خبری کا مولانا شکوہ کرتے ہیں، اور عالم عربی اور برصغیر ہند و پاک میں علما کے طبقے میں جو بیداری کی لہر

www.abulhasanalinadwi.org

آئی ہے اس کا تذکرہ فرماتے ہیں:

"ہمارے قدیم اساتذہ ومدرسین حدیث کو ان مستشرقانہ اعتراضات وتشکیکات کی بہت کم خبر ہے، ان کی زیادہ تر توجہ حدیث سے اپنے مذہب کے اثبات اور فنی تحقیقات پر مرکوز رہتی ہے، لیکن اب خدا کے فضل سے مصر وشام اور ہندوستان وپاکستان میں ان مستشرقین کی علمی تلبیسات کا جائزہ لینے کا کام، محدثین کے کارناموں کو علمی وتحقیقی انداز میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔"(۶۰)

اس زریں سلسلہ تصنیف میں مولانا نے دو کتابوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے ان میں ایک شام کے مشہور عالم ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی "السنة ومكانتها فی التشريع الإسلامی"، اور دوسری تصنیف مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی "تدوین حدیث"، اس سلسلہ بحث کو مولانا جاری رکھتے ہوئے مقدمہ "لامع الدراری" اور مقدمہ "تحفة الأحوذی" کے اندر حجیت حدیث اور اس پر جدید اعتراضات اور ان کے تشفی بخش جوابات اور قیمتی مواد جمع ہو جانے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، اور ڈاکٹر تقی الدین کے کام کی قدردانی کیساتھ اپنے مقدمہ کو اختتام کی منزل تک پہونچا دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا کتب حدیث کے علاوہ اور بھی حدیث کی متعدد کتابیں مولانا علی میاں کے مقدمہ سے آراستہ ہیں، گو ان میں مولانا کے قلم کی جولانی، مواد کی فراہمی اور جس موضوع سے ان مقدموں کا تعلق ہے اس کے مالہ وماعلیہ کے احاطے اور تحلیل وتجزیہ کی کمی دکھائی دیتی ہے، تاہم اس احساس کے باوجود ان مقدموں میں کچھ نہ کچھ کام کی باتیں آگئی ہیں جو یکسر فائدہ سے خالی نہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

"روائع الأعلاق شرح تہذیب الأخلاق" تالیف ابو سحبان روح القدس ندوی: جو فی الواقع استاذ گرامی علامہ ابو محفوظ الکریم معصومی کی نگرانی ورہنمائی کی رہین منت ہے، مولانا علی میاں نے اپنے حوصلہ افزا مقدمہ میں مسلم کی مرفوع حدیث "إن من أبرالبر صلة الرجل أهل ودأبيه بعد أن يولّى" (لڑکے کا باپ کیساتھ حسن سلوک ووفاداری کا بہترین درجہ یہ ہے کہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں اور اہل محبت کے ساتھ سلوک کرے) سے یہ نکتہ پیدا کیا کہ لڑکے کا اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں کیساتھ حسن سلوک والد کیساتھ سلوک کے مرادف ہے تو لڑکے کا والد کے علمی آثار اور ان کے میدان عمل سے تعلق ووابستگی والد کے ساتھ سلوک میں بدرجہ اولیٰ شامل ہے۔

"الروائع والبدائع فی البیان النبوی" تالیف محمد نعمان الدین ندوی: پر مولانا علی میاں نے اپنے مقدمہ میں علمائے معانی وبیان کی حدیث کے "جمالِ ادبی" سے بے اعتنائی کا شکوہ کیا ہے، اور فاضل ندوی نوجوان کے کام کی قدر کی ہے۔

"التعلیق الممجد علی موطأ الإمام محمد" تالیف عبدالحی فرنگی محلی، تحقیق ڈاکٹر تقی الدین ندوی: پر اپنے مقدمے میں مولانا نے اپنے زمانہ تعلیم حدیث میں اس کتاب سے اپنی واقفیت اور ایام تدریس میں اس کی سلامتی فکر اور وسعت قلبی سے اپنی وارفتگی کا اظہار کیا ہے۔

"ظفر الأماني شرح مختصر الجرجاني" تالیف عبدالحی فرنگی محلی، تحقیق ڈاکٹر تقی الدین: پر مولانا نے اپنے مقدمہ میں اس بات کو پوری قوت کیساتھ اٹھایا ہے کہ حدیث کی بقا اور اس کی حفاظت

www.abulhasanalinadwi.org

اور علماء وباحثین کا اس سے شغف دراصل یہ خاتم النبیین ﷺ کی ان خصوصیات میں سے ہے جس سے سابقہ شریعتوں کی تاریخ یکسر خالی ہے۔

نتیجہ بحث : مذکورہ بالا معروضات مولانا علی میاں کی حدیث فہمی، رسوخ فی الحدیث اور معرفت حدیث میں ان کی علو مرتبت اور صناعت حدیث میں کامل مہارت کی غمازی کے ساتھ ساتھ اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ مولانا علی میاں عصر حاضر کے محدثین کی صف میں بلند مقام رکھتے ہیں، گرچہ ان کی شہرت اس حیثیت سے نہیں ہوئی، حالانکہ مولانا کی بیشتر تصانیف، حدیث کی شرح وترجمان، اور ان کی پوری زندگی حدیث کی عملی اور جیتی جاگتی درخشاں تصویر تھی۔

نیز مولانا کے معاصر فضلائے حدیث کا اپنی حدیث کی کتابوں پر ان سے باصرار مقدمہ لکھوانا درحقیقت ان کی طرف سے سند وشہادت کے مرادف، اور ان محدثین وفضلائے حدیث کے اخلاص اور علمی تواضع اور عالی ظرفی کی روشن دلیل ہے......

"وما توفيقي إلا بالله وصلى الله وسلّم على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين"۔

حواشی وحوالہ جات :

(۱) الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام ۶:۱۳ (نزهة الخواطر) ندوہ پریس ۱۹۹۲ء

(۲) نفس مصدر ۷:۴۲۷

(۳) ایضاً ۷:۶۰، ۶۱

(۴) ایضاً ۷:۳۱۲

www.abulhasanalinadwi.org

(۵) ایضاً ۸:۶ ۳۷۰ ـ ۳۸۰

(۶) دیکھئے "روائع الأعلاق" ص ۴۴ ـ ۵۳

(۷) الإعلام ۸: ۴۷۰

(۸) دیکھئے پرانے چراغ: ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ فردوس لکھنؤ، بار دوم ۱۹۸۹ء ۲ : ۳۲۱ ـ ۳۳۹

(۹) ماہنامہ صبح صادق (قرآن نمبر) لکھنؤ جنوری ۱۹۵۶ء

(۱۰) صبح صادق (حدیث نمبر) نومبر ۱۹۵۶ء

(۱۱) نفس مصدر

(۱۲) نفس مصدر

(۱۳) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں: مرتب محمد عمران خاں ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ۔ ص: ۱۷۶

(۱۴) مولانا حیدر حسن خان: از عبدالسلام قدوائی ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ۔ ۱۹۷۵ء ص: ۷

(۱۵) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص: ۱۷۶

(۱۶) صبح صادق نومبر ۱۹۵۶ء

(۱۷) کاروان زندگی: ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ اسلام لکھنؤ ۱۹۸۳ء ۱: ۱۱۱

(۱۸) نفس مصدر ۱: ۱۱۱

(۱۹) پرانے چراغ: ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ فردوس لکھنؤ بار سوم ۱۹۸۶ء ۱: ۱۹۳

(۲۰) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص: ۱۶۷

(۲۱) مولانا حیدر حسن خاں ص: ۳۳

(۲۲) نفس مصدر ص: ۳۲

www.abulhasanalinadwi.org

(۲۳) نفس مصدر ص:۳۵

(۲۴) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص:۱۶۷

(۲۵) مولانا حیدر حسن خاں ص:۴۱

(۲۶) پرانے چراغ ۱:۱۹۳

(۲۷) صبح صادق نومبر ۱۹۵۶ء

(۲۸) کاروان زندگی ۱:۱۲۸

(۲۹) پرانے چراغ ۱:۱۹۳

(۳۰) کاروان زندگی ۱:۱۲۹

(۳۱) نفس مصدر ۱:۱۳۲

(۳۲) پرانے چراغ ۱:۱۰۲

(۳۳) دیکھئے نفحات الہند والیمن باسانید الشیخ ابی الحسن: محمد اکرم ندوی، مکتبہ الامام الشافعی ریاض ۱۹۹۸ء

(۳۴) اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار (مقدمہ)

(۳۵) صبح صادق نومبر ۱۹۵۶ء

(۳۶) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۱۶۸

(۳۷) ایضاً مع اضافہ برحاشیہ بقلم صاحب مضمون (مولانا علی میاں) ص ۱۶۸

(۳۸) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۱۷۳

(۳۹) نفس مصدر ص ۱۷۲، ۱۷۳

(۴۰) صبح صادق نومبر ۱۹۵۶ء

(۴۱) نفس مصدر

(۴۲) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب: ابوالحسن علی ندوی

www.abulhasanalinadwi.org

مکتبہ اسلام لکھنؤ ۱۹۸۲ء باراول ص ۲۴۶، ۲۴۷

(۴۳) نفس مصدر ص ۲۴۱، ۲۴۲

(۴۴) ایضاً ص ۲۴۳

(۴۵) ایضاً ص ۲۴۴

(۴۶) ایضاً ص ۲۴۴، ۲۴۵

(۴۷) ایضاً ص ۲۴۵

(۴۸) ص ۴۰

(۴۹) ص ۵۰

(۵۰) ایضاً ص ۲۴۵

(۵۱) دیباچہ معارف الحدیث: محمد منظور نعمانی۔ الفرقان بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۹۵ء ۲: ۱۰

(۵۲) نفس مصدر ص ۱۶

(۵۳) ایضاً ص: ۱۷، ۱۸

(۵۴) ایضاً ص: ۱۹

(۵۵) ایضاً ص: ۱۹، ۲۰

(۵۶) ایضاً ص: ۲۰، ۲۱

(۵۷) مقدمہ معارف الحدیث (مع تلخیص) الفرقان بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۹۹ء ۵: ۱۰

(۵۸) محدثین عظام اوران کے علمی کارنامے: ڈاکٹر تقی الدین ندوی، اعظم گڑھ ۱۹۹۵ء (مقدمہ) ص ۳، ۴

(۵۹) نفس مصدر ص: ۴

(۶۰) ایضاً ص: ۵

❁❁❁❁❁

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں کی سیرت نگاری

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی
شعبۂ اردو ، اے ایم یو علیگڑھ

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی (رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ) عہد حاضر کے کثیر التصانیف مصنفین میں سے تھے۔ نوع بہ نوع موضوعات پر چھوٹی بڑی صدہا نگارشات آپ سے یادگار ہیں۔ عام طور پر تصانیف کی کثرت کے ساتھ ساتھ علم و تحقیق کا معیار بلند قائم نہیں رہ پاتا اور کثرت سطحیت کا مرادف بن جاتی ہے۔ لیکن حق تعالیٰ نے حضرت مولانا کو جہاں دوسرے بہت سے اوصاف و کمالات سے نوازا تھا، وہیں ان میں یہ وصف بھی ارزانی فرمایا تھا کہ سرعت تالیف اور کثرت تصانیف کے باوجود علم و تحقیق کا پایہ جھکنے نہیں پاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تصانیف علمی و تحقیقی نقطہ نظر سے بھی گراں ارز اور گراں قیمت ہیں ۔

سیرت نبوی (علیہ الصلاۃ والسلام) کے موضوع پر حضرت مولانا کی کتاب ''السیرۃ النبویۃ'' کے عنوان سے اصلاً عربی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ ''نبی رحمت'' کے نام سے مولانا محمد الحسنی (مرحوم) کے قلم شگفتہ رقم نے کیا ہے۔ فی الوقت یہ کتاب عربی اور اردو دونوں زبانوں کا مشترکہ سرمایہ ہے ۔

اہل علم واقف ہیں کہ سیرت نبویؐ کے تمام بنیادی مآخذ عربی میں ہیں اور کوئی زمانہ اس موضوع پر تصنیف و تالیف سے خالی نہیں رہا ہے ۔ لہٰذا عربی میں سیرت کی کتابیں بلاشبہ ہزار سے

www.abulhasanalinadwi.org

متجاوز ہوں گی۔اردواگرچہ ایک کم عمرزبان ہے اوراس میں سیرت سے متعلق تصنیف وتالیف کا باقاعدہ آغازانیسویں صدی کے اواخراور بیسویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔تاہم اب اردو میں بھی سیرت کی چھوٹی بڑی صدہا کتابیں وجود میں آچکی ہیں۔ایسی صورت میں سیرت کے موضوع پر کوئی ایسی کتاب تیار کرنا جو بھیڑ میں کھونہ جائے اوراپنی انفرادیت وشناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوسکے بہت مشکل اوردشوار کام ہے۔مولانا کی کتاب سیرت بلاشبہ اس دشوارگذارمعیار پر پوری اترتی ہے۔اس میں متعددایسی خوبیاں اورخصوصیات موجود ہیں جوایک نئی کتاب سیرت کی تصنیف کا جوازفراہم کرتی ہیں۔

اس کتاب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اس میں چندایسے ابواب کااضافہ کیاہےاوران کے تحت ایسی معلومات فراہم کی ہیں جن سے سیرت کی عام کتابیں خالی ہیں مثلاًاس کتاب کا پہلاباب ہے''عہدجاہلیت''مصنف نے اس کے تحت چھٹی صدی عیسوی میں دنیاکے تمام مذاہب اوراہل مذاہب کااجمالی جائزہ پیش کیاہے۔ساتھ ہی مشرقی رومی سلطنت،ایرانی شہنشاہی،ہندوستان،جزیرۃ العرب اوریوروپ کی قوموں اورملتوں کے احوال وکوائف پرعمومی نظرڈالتے ہوئے اس عہدکے عالمگیرفساداورگھٹاٹوپ اندھیرے کا بیان کیاہے۔

اسی طرح کتاب کادوسراباب ہے''جزیرۃالعرب''مصنف نے اس میں جزیرۃ العرب کے حدود،وہاں کے طبیعی حالات،تمدنی ثقافتی مراکزاورلسانی وحدت کی تصویرکشی ہے۔اس ضمن میں عربی مآخذکے علاوہ دوسرے اقوام وملل کی تاریخ سے بھی استفادہ کیا ہے۔اسی طرح بعثت نبوی ؐ کے وقت شہرمکہ میں زندگی کی تنظیم،عہدوں کی تقسیم،درآمداور برآمد،اقتصادی حالت،اوزان اور پیمانے،ادب وثقافت جنگی طاقت،اخلاقی پہلووغیرہ میں سے ہرایک کابیان نہایت سلیقے کے ساتھ کیاہے۔مکہ مکرمہ کی طرح عہدبعثت کے یثرب سے متعلق بھی تاریخی،جغرافیائی،اقتصادی،دینی،معاشرتی اورتمدنی ہرطرح کی بیش قیمت معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

متذکرہ بالا ابواب اور عنوانات کے تحت مواد کی فراہمی میں مصنف نے غیر معمولی دیدہ وری و بالغ نظری سے کام لیا ہے اور ریزہ ریزہ معلومات اس طرح جمع کی ہیں گویا بقول خود چونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے فراہم کیے ہیں۔ بہ طور مثال بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں: -

اوزان اور پیمانے :

اہل مکہ رومانی اور بازنطینی اور ایرانی وساسانی سکّے استعمال کرتے تھے۔ مکہ اور جزیرۃ العرب میں اس وقت رائج سکّے دو قسم کے تھے ایک درہم اور دوسرے دینار۔ درہم کی دو قسمیں تھیں۔ ایک قسم وہ تھی جس پر فارس کا نقش اور مہر تھی، اس کو ''بغلیۃ'' اور ''سوداء دامیۃ'' کہتے تھے۔ دوسری قسم وہ تھی جس پر روم کا نقش تھا اور اس کو زیادہ تر ''طبریۃ اور بیزنطیۃ'' کہتے تھے......ان کے مختلف اوزان تھے اس لئے اہل مکہ ان کے شمار پر نہیں، بلکہ وزن پر معاملہ کرتے تھے۔

جہاں تک دینار کا تعلق ہے وہ سونے کا ہوتا تھا اور جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور میں شام اور حجاز میں اس کا رواج تھا۔ یہ سب سکے رومی تھے جو روم ہی میں ڈھالے جاتے تھے اور ان پر بادشاہ روم کی تصویر ہوتی تھی اور اس کا نام رومی زبان میں کندہ ہوتا تھا جیسا کہ ابن عبدالبر نے ''التمہید'' میں لکھا ہے۔

لفظ دینار دراصل ایک قدیم رومی سکہ (Denarius) سے عربی زبان میں آیا ہے اور بعض مغربی ممالک میں یہ لفظ اب تک رائج ہے اور انجیل میں اس کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔ دینار کا وزن ایک مثقال کے برابر مانا جاتا تھا اور خالص سونے کا ایک مثقال......متوسط جو کے (۷۲) دانوں کے ہم وزن مانا گیا تھا......دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں ہے کہ بازنطینی دینار ۴۲۵ گرام کے برابر ہوتا ہے۔ مستشرق زمباور کی تحقیق یہ ہے کہ مکہ کا مثقال ۴۲۵ گرام کے برابر ہوتا ہے......درہم اور دینار کے مابین تناسب سات سے دس تک تھا اور درہم کا وزن ۷/۱۰ مثقال کے مساوی تھا۔ (نبی رحمت ص۹۴-۹۵)

www.abulhasanalinadwi.org

مکہ کی صنعتیں اور ادب وثقافت

اہل مکہ کی نظر میں صنعت وحرفت کی زیادہ اہمیت نہ تھی، بلکہ وہ اس کو حقارت سے دیکھتے تھے اور اپنے لیے باعث ننگ وعار سمجھتے تھے۔ عام طور پر صنعت وحرفت غلاموں یا عجمیوں کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی تھی تاہم بعض صنعتیں جن کی انہیں سخت ضرورت تھی، وہاں موجود تھیں...... روایت میں آتا ہے کہ حضرت خباب بن الارت تلواریں تیار کرتے، تعمیرات وغیرہ میں...... رومی اور ایرانی مزدوروں سے کام لیا جاتا تھا۔

ناخواندگی وہاں عام تھی، لیکن کچھ پڑھنے والے لوگ موجود تھے...... مکہ والے پورے جزیرۃ العرب میں حسن ذوق، لطافت طبع اور آرائش وتجمل میں ممتاز سمجھے جاتے تھے...... جہاں تک ان کی زبان کا تعلق ہے اس کو سند اور میزان کا درجہ حاصل تھا...... تناسب اعضا، جسمانی ساخت، حسن وجمال نیز اعتدال وتوازن میں بھی وہ زیادہ ممتاز تھے۔

ان کی دلچسپی کے موضوعات میں بالترتیب انساب، شعروشاعری، علم نجوم، پنچھتر، پرندوں سے شگون لینے اور کسی قدر طب وعلاج...... اور بہت کچھ شہسواری، گھوڑوں کی پہچان، اس کے اعضاوصفات سے گہری واقفیت اور قیافہ شناسی جیسے علم شامل ہیں۔ علاج ومعالجہ کے جو طریقے ان میں رائج تھے، ان میں داغنے، فاسد عضو کو کاٹنے، فصد کھلوانے، پچھنا لگوانے اور استعمال ادویہ کا ذکر آتا ہے۔ (نبی رحمت ۱/۹۶-۹۷)

اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف نے نہایت خوبی و خوبصورتی کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی حیات پاک اور اسلام کے آغاز وارتقا کی تاریخ کو باہم آمیز کردیا ہے۔ بعثت نبوی سے پہلے کے حالات وواقعات پڑھیے تو اسلام کے ظہور ونمود کے لئے دنیا کی بے چینی وبے قراری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بعثت کے بعد مکی زندگی میں بتدریج پیش آنے والے واقعات کا مطالعہ کیجئے تو صاف نظر آنے لگتا ہے کہ کفر کی باد سموم اسلام کے نونہال کو جھلسائے دے رہی ہے اور شرار بولہبی چراغ مصطفویؐ کا خاتمہ کرنے کے لیے بے تاب ہے۔ ہجرت کے بعد مدنی زندگی کے واقعات پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اب

www.abulhasanalinadwi.org

اسلام کے قدم جم گئے ہیں۔اب وہ ایک چٹان ہے،جس سے کفر کی موجیں ٹکراتی اور لوٹ جاتی ہیں فتح مکہ کے اور اس کے بعد کے واقعات سے اسلام کے غلبے کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔عام الوفود اور حجۃ الوداع کے واقعات تحریک اسلامی کی تکمیل کا اشارہ دیتے ہیں۔بلاشبہ یہ حضرت مولانا کے سحر طراز قلم کا کرشمہ ہے کہ انہوں نے واقعات سیرت اور اسلام کی تاریخ کو ایک دوسرے میں اس طرح منعکس کر دیا ہے کہ ''من تو شدم تو من شدی'' کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔سیرت کی دوسری کتابیں اس وصف سے خالی ہیں۔صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ سفر ہجرت کے موقع پر غار ثور میں روپوشی اور مشرکین کے تعاقب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

انسانی تاریخ کا سب سے نازک لمحہ :

ادھر مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعاقب کیا۔یہ انسانیت کے طول طویل سفر کا سب سے نازک اور سب سے فیصلہ کن لمحہ تھا۔یا تو ایک ایسی بدنصیبی سامنے تھی جس کی کوئی انتہا نہیں، یا ایک ایسی خوش نصیبی واقبال مندی کا آغاز ہو رہا تھا،جس کی کوئی حد نہ تھی۔انسانیت نے بے چینی سے اپنی سانس روک لی تھی اور بے حس وحرکت ہو کر ان جاسوسوں اور تعاقب کرنے والوں کو پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی وہ اس وقت غار کے منہ پر کھڑے تھے اور صرف اتنی دیر باقی تھی کہ ان میں سے کوئی نیچے دیکھ لے۔لیکن خدا کی قدرت ان کے اور اس اقدام کے درمیان حائل ہوگئی اور وہ دھوکہ کھا گئے۔انہوں نے دیکھا کہ غار کا منہ مکڑی کے جالے سے بند ہے تو ان کا ذہن بھی ادھر نہ جا سکا کہ اندر کوئی ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالی نے اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے :

فانزل الله سكينته عليه و أيده بجنود لم تروها (سورۂ توبہ ۴۰) تو خدا نے ان پر تسکین نازل فرمائی اور ان کو ایسے لشکروں سے مدد دی جو تم کو نظر نہیں آتے تھے (نبی رحمت ۱/۱۶۸)

www.abulhasanalinadwi.org

اس کتاب کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسے محض سیرت وسوانح کی ایک کتاب بنانے کے بجائے ایک کتاب دعوت بنا کر پیش کیا ہے۔ آپ ﷺ کی پوری حیات طیبہ سراپا دعوت ہے اور الگ الگ سیرت کا ہر واقعہ بھی دعوت کا کوئی نہ کوئی پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے شعوری طور پر اس نکتے کو ملحوظ رکھا ہے کہ واقعات محض واقعات کی حیثیت سے نہ پیش کیے جائیں بلکہ دعوت کی وہ روح اور کشش جو صدور واقعات کے وقت ان میں موجود تھی، ممکنہ حد تک اسے برقرار رکھا جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مصنف کی یہ کوشش بار آور رہی ہے اور ایک ایسی کتاب سیرت تیار ہوگئی جو عوام وخواص، پیر و جواں اور مسلم و غیر مسلم بلکہ تمام طبقات انسانی کے لیے کتاب دعوت بھی ہے ایک مثال دیکھیے لکھتے ہیں :

<u>ایک مقتول کے الفاظ جو قاتل کے قبول اسلام کا سبب بن گئے :</u>

اسی سریہ (بئر معونہ) میں حرام بن ملحان بھی شہید ہوئے ان کو جبار بن سلمی نے قتل کیا۔ حرام بن ملحان نے انتقال کے وقت جو الفاظ کہے، وہی ان کے اسلام لانے کا سبب بن گئے۔ جبار خود بیان کرتے ہیں کہ مجھے جس چیز نے اسلام کی طرف کھینچا، وہ یہ واقعہ ہے کہ میں نے ان کے ایک آدمی کے دونوں شانوں کے درمیان ایک نیزہ مارا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سینے کے پار ہوگیا ہے۔ اسی وقت ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے "فزت ورب الکعبۃ" (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا) میں نے اپنے دل میں حیرت سے کہا کیسی کامیابی؟ کیا میں نے ان کو قتل نہیں کیا؟ بعد میں میں نے ان الفاظ کی تحقیق کی تو لوگوں نے بتایا کہ ان کا مطلب شہادت تھا۔ میں نے کہا خدا کی قسم وہ کامیاب رہے۔ اس طرح یہ جملہ ان کے اسلام کا سبب بنا۔ (نبی رحمت ۱/۲۴۵)

اس کتاب کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ یہ شذوذ اور تفردات سے خالی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس میں واقعات سیرت کو اسی نہج، اسی رخ اور اسی انداز سے پیش کیا گیا ہے، جیسا کہ وہ محدثین اور ارباب سیر کے درمیان مروج و متداول ہیں۔ پوری کتاب میں کوئی ایک موقع

www.abulhasanalinadwi.org

بھی ایسا نہیں آتا جہاں سیرت طیبہ سے متعلق کسی واقعے کو توڑنے مروڑنے کی کوشش کی گئی ہو۔ یا اس میں تاویل و توجیہہ کا پہلو اختیار کیا گیا ہو۔ یہ بات اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل اور لائق ذکر ہے کہ عربی اور اردو کے متعدد نامور مصنفین سیرت کی کتابوں میں اس قسم کی خامیاں اور کوتاہیاں موجود ہیں۔ مثلاً محمد حسین ھیکل، سرسید احمد خاں اور علامہ شبلی نعمانی وغیرہ۔ یہ مثالیں ماضی سے تعلق رکھتی تھیں ۔ دور حاضر میں بھی بعض ایسے مصنفین سیرت موجود ہیں جو شاذ اور غیر متداول روایات سیرت پر اعتماد کو ہنر جانتے اور انہیں بڑے شدومد کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً بعض حضرات کا یہ بیان کہ دادا عبدالمطلب کی وفات کے بعد آنحضرت اقدس ﷺ کی پرورش اور کفالت تنہا چچا ابو طالب نے نہیں کی بلکہ اس شرف میں آپؐ کے دوسرے چچا زبیر بن عبدالمطلب اور سب پھوپھیاں بھی شریک تھیں حالانکہ یہ بیان ایک شاذ اور غیر معتبر روایت پر مبنی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ زیر نظر کتاب سیرت اس قسم کے تفردات سے پاک ہے۔

اس کتاب کی پانچویں خصوصیت اس کا توازن و اعتدال ہے جو کئی سطحوں پر جلوہ گر ہے، اول یہ کہ یہ کتاب نہ حد درجہ مختصر ہے کہ قاری کو تسلی و تشفی نہ ہو اور تشنگی کا احساس باقی رہ جائے۔ نہ اس قدر مطول و مفصل ہے کہ پڑھنے والا اکتا اور گھبرا جائے بلکہ درمیان کی راہ اختیار کی گئی ہے۔ بایں طور کہ تمام ضروری واقعات اور ان کے قابل ذکر اجزا لیے گئے ہیں اور غیر ضروری جزئیات و تفصیلات سے صرف نظر کر لیا گیا ہے، کیونکہ ان کا موقع و محل سیرت کی مبسوط کتابیں ہیں۔

دوم اس کا اسلوب بھی نہ بالکل سادہ سپاٹ اور بے روح ہے، جو ہر قسم کی ادبی دلکشی و رعنائی سے عاری ہو اور نہ ایسا پر تکلف مصنوعی اور آرائشی کہ کتاب سیرت کا اصل مقصد فوت ہو جائے اور قاری زبان و بیان کی بھول بھلیاں میں کھو کر رہ جائے بلکہ یہاں بھی مصنف نے خوش ذوقی کا ثبوت دیتے ہوئے سادگی میں پرکاری کا ہنر دکھلایا ہے ۔

سوم مصنف نے معجزات کے ذکر میں بھی اعتدال کی راہ اپنائی ہے، یعنی انہوں نے

www.abulhasanalinadwi.org

نہ تو کسی فکری مرعوبیت اور ذہنی تحفظ کی بنا پر معجزات کے تذکرے سے بالکلیہ پہلوتہی کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ معتبر غیر معتبر ہر قسم کے ذکر سے کتاب کو گراں بار اور بوجھل بنایا ہے ۔
یہاں ایک مثال کا پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے سلاطین و امرا کو دعوت اسلام کے سلسلے میں ابن سعد اور جلال الدین سیوطی نے بعض روایات نقل کی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ حضور ﷺ کے وہ ایلچی جو آپ کے خطوط لے کر الگ الگ ملکوں میں گئے ۔اس ملک کی زبان معجزاتی طور پر خود بخود بولنے لگے اس بیان کو نقل کر کے حضرت مولانا لکھتے ہیں :

مصنف کو اس معجزے کے امکان و وقوع میں کوئی اشکال نہیں ہے ۔اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ اور انبیاء کی سیرت اس قسم کے معجزات اور خارق عادت واقعات سے بھری ہوئی ہے ۔تاہم اس کے نزدیک یہ بات بالکل ممکن قرین قیاس ہے کہ یہ دراصل رسول اللہ ﷺ کی حکمت و دانش اور حسن انتخاب پر مبنی ہو...... اس مہم کے لیے انہی لوگوں کا انتخاب کیا ہو جو رومی ، فارسی ، قبطی اور حبشی زبان پہلے سے جانتے ہوں اور ایسے لوگوں سے عرب کی سرزمین خالی نہ تھی ، جو ان ملکوں میں بار بار جانے اور عرصے تک رہنے کی وجہ سے ان چاروں زبانوں سے آشنا اور ان کے ذریعے سے سفارت کا فرض انجام دینے پر قادر ہوں ۔(نبی رحمت ۲/۱۰)

چہارم مستشرقین کے رد و ابطال میں بھی یہی طریق اعتدال ملحوظ رکھا گیا ہے یعنی موقع بہ موقع ان کے اعتراضات کے معقول اور مدلل جوابات دیے گئے ہیں، لیکن ساتھ ہی پوری کتاب کو کلامی رنگ دینے سے احتراز بھی کیا گیا ہے ۔حاصل یہ ہے کہ یہ کتاب مختلف حیثیتوں سے توازن و تناسب کی اچھی مثال قائم کرتی ہے ۔

اس کتاب کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مصنف کے تاریخی شعور ، علم و تحقیق کے قافلے کی ہمرکابی اور عصری حسیت کی آئینہ دار ہے ۔اس نکتے کی توضیح یہ ہے کہ مصنف نے ایک طرف اس کی اساس قرآن پاک ، احادیث اور سیرت و تاریخ کی قدیم بنیادی کتابوں پر رکھی ہے اور دوسری جانب تاریخ ، جغرافیے ، اثریات وغیرہ سے متعلق جدید مشرقی و مغربی

www.abulhasanalinadwi.org

مآخذ سے بھی پورا استفادہ کیا ہے چنانچہ مصنف کے مآخذ میں بخاری، مسلم، ترمذی، مسند احمد، الاصابۃ، الاستیعاب، آثار المدینۃ المنورۃ، اخبار مکہ اور ایران بہ عہد ساسانیان وغیرہ کے پہلو بہ پہلو درج ذیل کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں :

Islam in The World

Encyclopaedia Britannica

Jewish encyclopaedia

The Roman World

Ancient India

Ancient Iraq

A Short History of the World

Popular Hinduism

The History of Christianity

جدید وقدیم اور مغربی ومشرقی مآخذ سے بیک وقت استفادے کی بنا پر مصنف کے مباحث میں طرفگی وتازگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں ایک مثال کا پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مکہ مکرمہ کی عالمگیر مرکزیت کے حوالے سے لکھتے ہیں :

ڈاکٹر حسین کمال الدین نے جو ریاض یونیورسٹی کے انجینیر نگ کالج میں سول انجینیر نگ کے شعبے کے صدر ہیں، اپنے ایک پریس انٹرویو میں کہا کہ وہ ایک نئے جغرافیائی نقطۂ نظر پر پہنچ چکے ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مکۂ مکرمہ روئے زمین (خشکی کے حصے) کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیق کا آغاز ایک ایسے نقشے سے کیا جس میں مکہ مکرمہ سے دوسرے مقام کی مسافتیں دکھائی گئی تھیں۔ ان کا مقصد اس سے در اصل ایک ایسے کم قیمت آلے کی تیاری تھی جو سمت قبلہ کا تعین کر سکے۔ اسی درمیان ان پر یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ مکہ مکرمہ ٹھیک دنیا کے وسط میں واقع ہے۔ اسی تحقیق سے ان پر یہ

www.abulhasanalinadwi.org

راز بھی منکشف ہوا کہ مکہ مکرمہ کو بیت اللہ کا مرکز اور ہدایت آسمانی کا نقطۂ آغاز بنانے میں خدا کی مصلحت کیا تھی (روزنامہ الاہرام ۵؍ جنوری ۱۹۷۷) (نبی رحمت ۵۹/۱)

ایک اور مثال ملاحظہ ہو تبوک کے محل وقوع کے سلسلے میں رقم طراز ہیں :

تبوک مدینہ منورہ اور دمشق کے درمیان نصف فاصلے پر ہے اور ایلہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یاقوت نے معجم البلدان میں ابوزید کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''تبوک حجر اور شام کی سرحد کے درمیان حجر سے چار منزل پر واقع ہے کہا جاتا ہے کہ اصحاب الایکہ جن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی یہیں آباد تھے'' انتہی۔ تبوک بحر قلزم سے چھ منزل کے فاصلے پر ''حسمی'' اور ''شروی'' دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے (از دائرۃ المعارف للبستانی باختصار) اس وقت یہ ایک اہم سعودی چھاؤنی ہے جو مدینے کے انتظامیہ (امارت) کے ماتحت ہے جس کا فاصلہ مدینے سے سات سو کیلومیٹر ہے۔ (نبی رحمت ۹۹/۲)

اس کتاب کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سیرت کے مباحث سے متعلق بعض اہم تحقیقات پیش کی گئی ہیں۔ مثلاً ہرقل کے نام آپ کے مکتوب گرامی میں ایک جملہ ہے: '' فان تولیت فعلیك إثم الیریسیین (اگر تم نے نہ مانا تو ''یریسیین'' کا گناہ تمہارے اوپر ہوگا) اس جملے میں ''یریسیین'' یا ''اریسیین '' کے اصل مفہوم کی تعیین کے سلسلے میں علمائے حدیث ولغت کے درمیان خاصا اختلاف رہا ہے۔ مصنف نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :

ہمارے نزدیک ترجیح اس قول کو ہے کہ ' اریسیین '' سے مراد اریوس مصری (ARIUs, 280-336) کے پیرو ہیں، جو ایک ایسے مستقل مسیحی فرقے کا بانی تھا، جس نے مسیحی عقائد اور اصلاح کے شعبے میں ایک خاص کردار ادا کیا۔ اس فرقے نے بازنطینی سلطنت اور مسیحی کلیسا کو عرصۂ دراز تک پریشان رکھا تھا۔ اریوس وہ شخص ہے جس نے توحید کا نعرہ بلند کیا اور خالق ومخلوق (عیسائیوں کے الفاظ میں) ''باپ بیٹے'' کے درمیان فرق کرنے

www.abulhasanalinadwi.org

کی دعوت دی۔ اس نے اس موضوع پر بحث و مباحثہ کا دروازہ کھول دیا اور عیسائی معاشرے میں صدیوں تک یہی موضوع رہا: (نبی رحمت ۲/۲۹)

یہ بہت عمدہ اور تحقیقی بحث ہے اور اصل کتاب میں قابل مطالعہ ہے۔ اسی طرح کی ایک بحث یہ ہے کہ غزوۂ تبوک کس موسم میں پیش آیا؟ موسم سرما میں یا موسم گرما میں؟ منشائے اختلاف یہ ہے کہ رجب ۹ھ میں اس کا ہونا متعین ہے، لیکن شمسی حساب سے اس کی تطبیق ماہ نومبر سے ہوتی ہے۔ اس بنا پر علامہ شبلی کا خیال ہے کہ یہ ماہ نومبر میں پیش آیا۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں کی جدید مفتاح التقویم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن دوسری احادیث صحیحہ میں صراحت ہے کہ یہ سخت گرمی کا موسم تھا۔ ان تفصیلات کے ذکر کے بعد مولانا لکھتے ہیں۔

واقعے کے داخلی شواہد اور حدیث صحیح کی تصریحات سے جو شیخین اور دوسرے اصحاب صحاح وسنن سے ثابت ہیں۔ ان سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ یہ غزوہ گرمیوں کے زمانے میں ہوا۔ کعب بن مالکؓ کی حدیث میں صاف آتا ہے: " إن رسول الله صلى الله عليه وسلم غزاها في حر شديد حين طابت الثمار و الظلال " اسی کو اس سلسلے میں معیار و میزان بنانا چاہئے اور وقت کی جو تحدید اس سے مطابقت نہ رکھتی ہو اسے نا قابل اعتبار سمجھنا چاہئے (نبی رحمت ۲/ ۱۰۳-۱۰۴)

ایک اور علمی بحث ملاحظہ ہو۔ سیرت نگاروں نے عام طور پر لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مدینہ منورہ تشریف آوری کے موقع پر انصار کی بچیاں بڑے سرور و مستی کے عالم میں یہ اشعار پڑھتی تھیں۔

طلع البدر علينا   من ثنيات الوداع
وجب الشكر علينا   ما دعا لله داع

لیکن حافظ ابن قیم کہتے ہیں '' ثنية الوداع '' جس کا ذکر ان اشعار میں آیا ہے مکے سے مدینے آنے والے راستے میں نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ '' ثنية الوداع'' شام جانے

www.abulhasanalinadwi.org

والے یا شام سے آنے والے راستے میں واقع ہے۔ اس لیے ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اشعار غزوۂ تبوک سے واپسی کے وقت پڑھے گئے تھے۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا لکھتے ہیں :

لیکن عام طور پر اہل سیر جن میں سیرت کے قدیم مصنفین بھی شامل ہیں، ان اشعار کو مکہ سے تشریف آوری کے موقع پر نقل کرتے ہیں۔ راقم نے بعض ایسے حضرات سے دریافت کیا جو مدینہ کے گلی کوچے سے واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ مکہ سے آنے والا بھی یہ راستہ اختیار کر سکتا ہے اور ہجرت جن حالات میں پیش آئی ان میں یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ آپ نے عام راستہ چھوڑ کر ''ثنیۃ الوداع'' سے مدینے کا رخ فرمایا ہو۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مدینے میں ''ثنیۃ الوداع'' نام کا ایک ہی مقام نہ تھا۔ مکے کے راستے میں بھی ایک ایسی چڑھائی تھی جس کے اتار پر وادی عقیق واقع تھی اور وہ چاروں طرف سے حرہ سے گھری ہوئی ہے۔ یہ اس زمانے میں اہل مدینہ کی ایک سیر گاہ بھی تھی جہاں گرمیوں میں شام کو لوگ جمع ہوتے تھے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ان اشعار میں اسی مقام کی طرف اشارہ ہو۔ تاریخ کی بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مدینہ مکے جانے والوں کو یہاں تک پہنچانے آتے تھے۔ (آثار المدینۃ المنورۃ ص ۱۶۰ طبع سوم)

خود ان اشعار میں اس امر کی داخلی شہادتیں پائی جاتی ہیں کہ یہ ترانۂ شکر و مسرت اسی وقت گایا گیا ہے، جب پہلی مرتبہ مدینہ آپؐ کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف ہوا۔ اشعار کی بے ساختگی، جوش مسرت اور خاص طور پر آخری شعر :

ایھا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع

بول رہا ہے کہ یہ اشعار اس وقت پڑھے گئے جب اہل مدینہ کی آنکھیں پہلی مرتبہ آپ کے دیدار پر انوار سے روشن ہوئیں۔ اگر غزوۂ تبوک کے موقع پر بھی یہ اشعار پڑھے گئے جیسا کہ بعض صحیح روایات میں آیا ہے تو اس میں کوئی استبعاد نہیں کہ اس طرح کا ترانۂ مسرت بار بار استقبال کے موقع پر گایا جا سکتا ہے۔ (نبی رحمت ۲/ ۱۹۴-۱۹۵)

اس کتاب کی آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اس میں سیرت نبوی سے

www.abulhasanalinadwi.org

تعلق رکھنے والے الگ الگ واقعات کو اپنی ترتیب اور پیشکش کے ذریعے وحدت کی لڑی میں پرودیا ہے۔ چنانچہ ایک واقعے کے بعد دوسرا واقعہ پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہی اس کے ذکر کا صحیح موقع و محل ہے۔اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مصنف نے سفر طائف کے بعد واقعۂ معراج کا ذکر کیا ہے۔پھر دونوں کے درمیان ربط و تعلق کی نوعیت اس طرح واضح کی ہے :

رسول اللہ ﷺ طائف سے مکہ تشریف لائے تو آپ کی قوم آپ کی مخالفت، دشمنی اور آپ کے تمسخر اور ایذا رسانی میں اسی طرح سرگرم تھی۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کو معراج ہوئی۔ راتوں رات آپ کو قدرت غیبی کے ساتھ مسجد حرام لے جایا گیا۔وہاں سے مسجد اقصیٰ پہنچایا گیا۔اس کے بعد ان مقامات قرب و اختصاص، ساتوں آسمانوں کی سیر، اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے مشاہدے اور انبیائے کرام سے ملاقات کے وہ تمام واقعات پیش آئے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

مازاغ البصر و ماطغی لقد رای من آیا ت ربه الکبری ۔ (النجم ۱۷-۱۸) ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ آگے بڑھی انہوں نے اپنے پروردگار کی قدرت کی کتنی ہی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی ایک ضیافت و عزت افزائی تھی جو آپ کی دلداری و دلنوازی اور طائف کے ان زخموں کو مندمل کرنے اور اس توہین و ناقدری اور بے گانگی و بے وفائی کی تلافی کے لیے تھی جس کے سخت امتحان سے آپ وہاں گذرے تھے (نبی رحمت ۱/ ۱۴۷)

اسی طرح مصنف نے دعوت اسلام کی راہ میں ابولہب کی مخالفتوں، ایذا رسانیوں اور رکاوٹوں کے ذکر کے بعد حضرت ابوذر غفاریؓ کے قبول اسلام کا واقعہ بیان کیا ہے اور دونوں واقعات کو باہم اس طرح مربوط کیا ہے :

یہ راستہ جو رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی طرف جاتا تھا کانٹوں اور ہر قسم کے

www.abulhasanalinadwi.org

اندیشوں اور خطرات سے بھرا ہوا تھا، جس پر اپنی جان کا خطرہ مول لیے بغیر چلنا اور منزل مقصود تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ نے حضرت ابوذر غفاری ؓ کے مکے تک پہنچنے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت مبارک میں حاضر ہونے اور قبول اسلام کا جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ (نبی رحمت ۱/۱۵۰)

اس کتاب کی نویں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اس کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ اور خود واقعات سیرت سے آپ کا سراپا رحمت و رافت اور شفقت و کرم ہونا محسوس و مشاہد ہونے لگتا ہے۔ گویا یہاں کسی حجت و برہان اور منطق و کلام کا سہارا لیے بغیر واقعات خود بولتے اور معاملات خود شہادت دیتے ہیں کہ آپ تمام بنی نوع انسان بلکہ حیوانات و جمادات کے لیے بھی پیکر نوازش و کرم تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والا، وہ مسلم ہو یا غیر مسلم آپ کی سیرت طیبہ میں ایک کشش محسوس کرتا ہے اور یہی مطالعہ سیرت کا اصل مقصد بھی ہے۔ یہ کیفیت پوری کتاب پر حاوی ہے، تاہم ذیل میں بعض مثالیں ملاحظہ ہوں۔ بعثت سے پہلے خانۂ کعبہ کی تعمیر نو کے موقع پر حجر اسود کے نصب سے متعلق آپ کے حکیمانہ فیصلے نے قریش کو باہم کشت وخون سے کس طرح بچایا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

آپ ؐ نے اس معاملے میں جس حکمت اور تدبر سے کام لیا، اس سے بڑھ کر کوئی حکمت اور تدبیر ہو نہیں سکتی تھی۔ نبوت کے بعد آپ ؐ نے تمام انسانوں اور دنیا کی قوموں کو جس طرح جنگوں کی بھٹی سے نجات دی، یہ واقعہ دراصل اسی کا پیش خیمہ اور مبارک آغاز تھا اور آپ کی فہم و تدبیر، بہترین تعلیمات، نرمی و تلطف اور رفع نزاع و صلح جوئی کا ترجمان و آئینہ دار۔ یہ وہ بات تھی جس نے آپ کو رحمۃ للعالمین کا منصب عالی عطا کیا اور آپ اس سادہ و ان پڑھ قوم کے ان جنگجو اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے قبائل کے لیے نبی رحمت ثابت ہوئے۔ (نبی رحمت ۱/۱۱۱)

www.abulhasanalinadwi.org

اسی طرح جنگ بدر کے قیدیوں کے ساتھ مسلمانوں کے سلوک کے حوالے سے لکھتے ہیں :

رسول اللہ ﷺ نے قیدیوں کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے کی نصیحت فرمائی اور ارشاد ہوا" استوصوا بهم خيرا " (ان سے اچھا معاملہ کرنا) ......ابوعزیز راوی ہیں کہ جب وہ مجھے بدر سے قیدی بنا کر لائے تو مجھے انصار کے ایک خاندان میں جگہ ملی۔وہ دونوں وقت اپنے کھانوں میں سے روٹی تو مجھے دیتے اور خود کھجور پر اکتفا کرتے۔یہ رسول اللہ ﷺ کی اسی نصیحت وہدایت کا اثر تھا۔کسی کو کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی مل جاتا تو مجھے لاکر دیتا۔ مجھے شرم محسوس ہوتی اور میں اسے لوٹا دیتا۔لیکن وہ زبردستی مجھے دیتا اور خود اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔(نبی رحمت ۱/۲۲۵)

اس سلسلے کی بعض دوسری مثالوں کے لیے بطور خاص عنوانات ذیل کے مندرجات قابل مطالعہ ہیں :

۱- عفو و درگذر اور سخاوت و دریا دلی	۱/۱۷۲
۲- معافی کی صدائے عام	۲/۶۵
۳- معافی ورحم دلی کا دن ہے،خون ریزی کا نہیں	۲/۶۸
۴- آج حسن سلوک اور پاس وفا کا دن ہے	۲/۷۰
۵- نبی رحمت	۲/۷۲
۶-شفقت ومحبت ورحمت عامہ	۲/۲۰۵-۲۰۹
۷- وما ارسلناك إلاّ رحمة للعالمين	۲/۲۱۱-۲۳۲

اس کتاب کی خصوصیات وامتیازات کا بیان ختم ہوا، البتہ یہاں ایک سوال رہ جاتا ہے کہ اس کتاب میں مذکور روایات وواقعات کی استنادی حیثیت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مصنف نے اس میں صحیحین اور دوسری کتب احادیث کے علاوہ بطور خاص سیرت ابن ہشام اور زاد المعاد پر اعتماد کیا ہے۔اس لیے اس میں مرفوع ومتصل روایات کے پہلو بہ پہلو

www.abulhasanalinadwi.org

سیرت کی دوسری کتابوں کی طرح مرسل و منقطع روایات بھی ہیں، لیکن چونکہ مصنف نے دوسری کتب سیرت کے مقابلے میں اپنی کتاب کے لیے اس پہلو سے کسی امتیاز و اختصاص کا دعوی بھی نہیں کیا ہے، اس لیے اس باب میں انہیں مورد الزام قرار نہیں دیا جایا سکتا۔ دوسرے انہوں نے اپنی کتاب میں صرف وہی روایات داخل کی ہیں جنہیں تمام ارباب سیر نقل کرتے آئے ہیں اس لیے انہیں تعدد طرق کی وجہ سے حسن لغیرہ کے درجے میں رکھا جا سکتا ہے۔ تیسرے یہ روایات معتبرہ کے معارض بھی نہیں ہیں، لہذا محدثین کے فیصلے کے مطابق انہیں قبول کرنے کی گنجائش ہے۔

اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ کتاب حضرت مولانا نے اصالۃً اردو میں لکھی ہوتی تو زبان و بیان کے لحاظ سے بھی یہ اردو کتب سیرت کے درمیان ایک امتیاز خاص کی حامل اور مصنف کے اردو اسلوب نگارش کی آئینہ دار ہوتی۔ بہ صورت موجودہ اردو کی حد تک یہ ترجمہ ہے۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں کہ یہ ترجمہ نہایت شگفتہ اور رواں دواں ہے، تاہم اصل اور ترجمے میں فرق ہوتا ہے، وہ یہاں بھی موجود ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ اس کتاب کے اردو ایڈیشن کے آخر میں محمد غیاث الدین ندوی (مرحوم) کا مرتبہ مکمل اشاریہ (INDEX) تو موجود ہے، لیکن انہوں نے مآخذ و مراجع کی علاحدہ فہرست نہیں بنائی، جس کی وجہ سے یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ کس کتاب کا کون سا ایڈیشن مصنف کے پیش نظر رہا ہے [۱]۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مولانا نے یہ معرکہ آرا کتاب اس حال میں لکھی ہے جب کہ وہ ضعف بصارت کے سبب نہ تو کتابوں سے خود مراجعت کر سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھوں سے لکھ سکتے تھے لہذا مطلوبہ کتابیں دوسروں سے پڑھوا کر سنتے اور بوقت تصنیف املا کراتے تھے۔ فلِلّٰہ درّہ۔

---

[۱] ملاحظہ ہو نبی رحمت، از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ترجمہ سید محمد الحسنی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ طبع اول ۱۹۷۸ء، صفحات جلد اول ۲۹۳ صفحات جلد دوم ۲۳۲، اشاریہ ص ۲۳۳ - ۹۵

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں کا فقہی ذوق و مسلک

مولانا عتیق احمد قاسمی
استاذ فقہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا علی میاں ندوی نے علم فقہ کی تحصیل اگرچہ ماہر فن اساتذہ سے کی، لیکن اس علم سے تدریسی اشتغال کا انھیں زیادہ موقع نہیں ملا، اس لئے مسئلہ بتانے اور فتوی دینے سے وہ ہمیشہ گریز فرماتے تھے۔ کوئی اگر مسئلہ پوچھتا تو مفتی صاحب ندوۃ العلماء یا کسی دوسرے استاذ فقہ کے پاس بھیج دیتے، استفتاء پر مشتمل خطوط دار الافتاء ندوۃ العلماء یا مجلس تحقیقات شرعیہ بھجوا دیتے۔

ائمہ مجتہدین اور فقہ اسلامی مولانا علی میاںؒ کی نظر میں:

بیسویں صدی میں متجددین کا ایک طبقہ پوری اسلامی فقہ کو ائمہ مجتہدین کی ذاتی رائے قرار دے کر مسترد کر دینے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ شریعت کا جوا کندھے سے اتار پھینکا جائے، یہ طبقہ فقہا، مجتہدین کے علمی کارناموں کا استخفاف کر رہا تھا اور ان کے خلاف زبان طعن دراز کر رہا تھا، اس پس منظر میں حضرت مولانا ابو الحسنؒ علی ندوی نے فقہ اسلامی اور فقہاء اسلام کا زبردست دفاع کیا، اپنی متعدد تحریروں میں فقہاء مجتہدین کے کارناموں کو خراج تحسین پیش کیا اور نئی نسل کے دل و دماغ میں فقہ اسلامی اور فقہاء کے اجتہادی کارناموں کی اہمیت جاگزیں کر دینے کی کوشش کی، حضرت مولانا ابو الحسنؒ علی ندوی تحریر فرماتے ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

''اسلام جزیرۃ العرب سے (جہاں زندگی سادہ اور تمدن انتہائی محدود تھا) نکل کر مصر و شام، عراق و ایران اور دوسرے وسیع، زرخیز اور سرسبز و شاداب خطوں میں پہنچ گیا تھا جہاں کا نظام تمدن و معیشت، تجارت، انتظام ملکی سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت ان نئے حالات و مسائل میں اسلام کے اصول کی تطبیق کے لئے بڑی اعلیٰ ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری، قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے پیشتر اسلام کی تاریخ، روایات اور روح شریعت سے گہری واقفیت، عہد رسالت اور زمانہ صحابہ کے حالات سے پوری آگاہی اور اسلام کے پورے علمی ذخیرہ (قرآن و حدیث اور سنت و قواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی۔

یہ اللہ کا بڑا فضل تھا اور اس کی اقبال مندی کہ اس کار عظیم کے لئے ایسے لوگ میدان میں آئے جو اپنی ذہانت، دیانت، اخلاص اور علم میں تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں، پھر ان میں سے چار شخصیتیں امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) امام مالک (م ۱۷۹ھ) امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) جو فقہ کے چار دبستان فکر کے امام ہیں، اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہے۔

دور حاضر اور اجتہاد :

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ نے اجتہاد و تقلید کے معرکہ آرا مسئلہ میں نقطۂ اعتدال کی طرف امت کی رہبری کی، اپنے اپنے حدود و قیود میں دونوں کو ضروری قرار دیا، دور حاضر میں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت تسلیم کرنے کے ساتھ وہ اس طبقہ پر سخت نکیر کرتے ہیں جو اجتہاد کے نام پر شریعت اسلامی کے حقائق ثابتہ سے کھلواڑ کرنا چاہتا ہے، ایک جگہ حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

''اس دور میں اجتہاد کی باتیں بہت ہو رہی ہیں اور یہ نعرہ لگایا جا رہا ہے کہ اس زمانہ میں اجتہاد کی ضرورت ہے، چنانچہ اجتہاد کا نعرہ لگانا ایک طرح سے ترقی پسندی کی

www.abulhasanalinadwi.org

علامت بن گیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اجتہاد اس زمانہ کی حاجت اور اس دین کی ضرورت ہے جو زندگی کے قافلے کی رہنمائی اور قیادت کرتا ہے، خصوصاً اس زمانہ میں اور بھی اس کی ضرورت ہے جب کہ تمدن اور صنعت و تجارت نے ایسی غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی کرلی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، جدید تجارتی معاملات اور معاہدوں میں ایسے فقہی احکامات اور فیصلوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اسلامی فقہ کے اصولوں اور شریعت اسلامی کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوں لیکن شرعی مسائل اور جدید عصری ایجادات کے بارے میں جو لوگ اجتہاد کا نعرہ لگاتے رہتے ہیں وہ اسلامی دنیا کے وہ قائدین و مفکرین اور مغربی دانش گاہوں کے فضلاء ہیں جنھوں نے خود مغربی تہذیب وتمدن کا سامنا پورے عزم وارادے اور ایمان ویقین سے کرنے میں اپنی مہارت اور ذہانت وذکاوت کا ثبوت نہیں دیا ہے، حالانکہ ان کا فرض تھا کہ مغربی تہذیب وتمدن اور اس کی سائنسی ایجادات اور ترقی، اس کی خوبیوں اور خامیوں کے درمیان تمیز کرکے وہی چیزیں لیتے جو مشرقی قوموں اور ان کے دین ومذہب اور تہذیب ومزاج سے میل کھائیں اور ان قوموں کو بھی روشنی دکھاتے جو مادیت کا شکار ہو چکی ہیں، وہ مغرب سے جو کچھ حاصل کرتے پہلے اس سے اس غبار کو جھاڑ دیتے جو قرون مظلمہ ہی سے ان کا جزبن گئی ہے اور اب بھی اس کی وجہ سے نفسیاتی کشمکش اور اعصابی تناؤ میں مبتلا ہیں، مغربی دانش گاہوں کے ان فضلاء کو اس کا کوئی حق نہیں پہونچتا کہ اس دور میں وہ ان علوم سے فائدہ اٹھائیں، اس لئے کہ جن میدانوں میں انھوں نے تخصص کیا ہے اور جو ان کا خاص موضوع رہا ہے اس میں بھی انھوں نے اپنا رول ادا نہیں کیا اور نہ ہی نظام تعلیم وتربیت کو آزاد اسلامی نظام تعلیم کے سانچے میں انھوں نے ڈھالنے کی کوشش کی، حالانکہ یہ کام بھی اجتہاد ہی کی طرح ہے لیکن انسان کی ہمیشہ سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ خود کچھ نہیں کرپاتا تو دوسروں کو مورد الزام ٹھہراتا اور اس سے مطالبہ کر بیٹھتا ہے

اس گرفت اور احتساب کے باوجود یہ بات بہر حال اپنی جگہ صحیح ہے اور اسمیں

www.abulhasanalinadwi.org

کوئی شک نہیں کہ اجتہاد کی ضرورت اپنی جگہ پر ہے، اس مسئلہ پر کوئی اختلاف نہیں، جو لوگ علوم شریعت میں بصیرت اور اس پر دسترس رکھتے ہیں وہ اس میدان میں اپنا قائدانہ کردار ادا کریں اور اصول فقہ جیسے قیمتی خزانہ سے جس کی کوئی نظیر قوموں اور ملتوں میں نہیں ملتی، احکام و مسائل کے استنباط میں فائدہ اٹھائیں، فقہ کا یہ ذخیرہ عرصہ سے صرف تاریخ بن کر رہ گیا ہے، جس سے ہمیں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دور کے مجتہدین کس طرح احکام و مسائل کا استنباط کیا کرتے تھے اس سے زیادہ کچھ نہیں، لیکن وقت کی گھڑی کو نہ تو اپنی جگہ روکا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کو معطل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسکو ماضی کی طرف لوٹایا جاسکتا ہے، جبکہ اسلام ایسی قوموں اور معاشرہ کا دین ہے جو ان مسائل و مشکلات کے ساتھ ساتھ چلتا ہے بلکہ ان کا سامنا کرتا ہے۔

اجتہاد کے معطل ہونے کی وجہ :

مختلف ادوار، ملکوں اور شہروں میں امت نے اجتہاد کو اختیار کیا اور علماء اس پر گامزن رہے، مذاہب اربعہ کی کتابیں ان مثالوں سے بھری پڑی ہیں، لیکن تاتاری حملہ کے بعد مذاہب اربعہ (جدید مفہوم میں ہم اسکو علمی اکیڈمی یا ادارے سے تعبیر کرتے ہیں) پر کسی قدر پژمردگی اور کمزوری چھاگئی، اس لئے کہ تاتاری حملے نے خود اعتمادی اور ذہانت کے سوتوں کو خشک کردیا تھا، جو قومیں تاتاری قوموں کے ماتحت ہوئیں ان کے اندر مسلح اور غیر مسلح لشکر کے مقابلے کی جرأت ختم ہو کر رہ گئی، چنانچہ اسلامی دنیا کے مشرقی حصے کے علماء نے اس خاص وقفہ میں اجتہاد کی سرگرمیوں پر کسی حد تک پابندی لگانے میں عافیت سمجھی، اس لئے کہ انھیں اندیشہ ہونے لگا کہ اگر اجتہاد کی اجازت دیدی گئی تو حکام اور والیان سلطنت کے سیاسی اور انفرادی مصالح کا اسمیں خیال رکھا جائیگا اور اس سے نفع کے بجائے نقصان زیادہ ہوگا، اس کا بھی امکان ہے کہ دین میں تحریف کا سبب انفرادی اجتہاد بن جائے یا اس امت کی رفتار میں انحراف اور کجی پیدا ہوجائے، اگرچہ ان علماء کا یہ خیال وقتی طور پر پابندی کیلئے تھا جس کی بنیاد فقہ کے اس

www.abulhasanalinadwi.org

اصول پر رکھی گئی تھی کہ جلب منفعت پر دفع ضرر کر ترجیح دی جانی چاہئے۔

اب اگر اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہی ضروری ہے تو ضرور کھولا جائے لیکن اصول فقہ کی کتابوں میں اس کے لئے جو شرائط بیان کی گئی ہیں ان کا لحاظ ضروری ہے، بہتر تو یہ ہے کہ انفرادی طور پر اجتہاد کے بجائے اجتماعی طور پر اجتہاد کیا جائے، وہ اس طرح کہ شریعت کے ماہرین کی ایک اکیڈمی ہو جسمیں کسی مسئلہ پر طویل غور و فکر، بحث مباحثہ اور تبادلہ آراء اور قرآن و سنت اور فقہ و اصول فقہ کے پورے ذخیرے کے پورے جائزے کے بعد فیصلہ کیا جائے تاکہ اسمیں کسی سازش یا کسی سیاسی قوت یا استبدادی حکومت کا عکس نہ پڑنے پائے۔

اجتہاد کے حدود اور اس کا میدان :

جدید طبقہ کے لوگ اجتہاد کی دعوت دیتے ہیں خصوصاً عصری دانش گاہوں کے پرجوش جذباتی نوجوان اور اسلامی ملکوں کے بعض سربراہ،، ان کی اس دعوت سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہر مسئلہ میں اجتہاد مطلق کی دعوت دے رہے ہیں، وہ مغربی اقدار و قیم اور عصری پیمانوں کو جوں کا توں لینے پر مصر ہیں، گویا کہ زمانہ پہلے اسلامی دور کی طرح ہو گیا ہے جب اسلام نیا نیا آیا تھا اور انسانی سوسائٹی مکمل طور پر انقلاب سے دوچار ہو چکی تھی اور گذشتہ دور میں فقہا، اور مجتہدین نے جو نتائج نکالے اور علم و تحقیق اور مطالعہ کے بعد جو اصول انہوں نے بنائے تھے وہ اپنی قیمت اور اہمیت کھو چکے ہیں اور اب موجودہ زمانہ اور قوموں کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں، اسمیں زیادہ تر سطحیت، لاپروائی، نام نہاد ترقی پسندانہ ادب کے پھیلائے ہوئے پروپیگنڈے کا اثر ہے، اس ادب نے نوجوانوں کے سامنے زمانہ کی ایسی تصویر کھینچی جیسے یہ دور بالکل نیا ہے ہے اور گذشتہ زمانہ سے یہ دور کسی طرح بھی ہم آہنگ نہیں، واقعہ یہ ہیکہ یہ تصویر تخیلات پر مبنی ہے اور اس میں ذرہ برابر حقیقت نہیں، واقعیت و منطقیت سے زیادہ اسمیں جذباتیت سے کام لیا گیا ہے،

www.abulhasanalinadwi.org

اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں :

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالہ کا اختتام اس تقریر کے اقتباس پر کروں جو میں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک سمینار بہ عنوان "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" کی تھی۔

زمانہ اپنی تغیر پذیری اور زیادہ صحیح الفاظ میں تغیر پرستی یا اقبال کے الفاظ میں "تازہ پسندی" کے لئے بدنام زیادہ ہے اور بدکم ہے۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ تغیر پذیری ہی کا نام ہے، زمانہ ثبات اور تغیر کے متوازن مرکب اور مجموعے کا نام ہے جب کبھی اس کا تناسب بگڑے گا یعنی ٹھہراؤ تغیر پر غالب آجائے گا یا تغیر ٹھہراؤ پر غالب آجائیگا تو زمانے، سوسائٹی اور تہذیب کا قوام بگڑ جائیگا، ان دونوں کے تناسب کا معاملہ کیمیاوی اجزاء کے تناسب سے بھی کہیں زیادہ نازک ہے۔ زمانہ جہاں تغیر کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کو بدلنا چاہئے اس کیلئے بدلنا زندگی کی کوئی کمزوری، کمی یا عیب نہیں وہ زندگی کا عین مزاج ہے اور زندگی کی تعریف ہے۔

ہر دم رواں ہر دم دواں ہر دم جواں ہے زندگی۔

وہ زندگی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں جسمیں نمو کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہو، وہ درخت شاداب اور پر ثمر نہیں کہلایا جاسکتا جو اپنی نمو کی صلاحیت کھودے۔

تغیر پذیری یا اس کے بجائے اگر آپ اس کو نمو یا ترقی کا نام دیں تو میرے خیال میں آپ اس کے ساتھ زیادہ انصاف کرسکیں گے۔ زمانہ تغیر قبول کرنے کے ساتھ مقابلہ کی بھی ایک طاقت رکھتا ہے۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ زمانہ کتنا بدل گیا اور اس تبدیلی کے مظاہر بھی صاف نظر آتے ہیں، لیکن زمانے نے اپنی اندرونی صلاحیتوں کو باقی رکھنے اور اپنے صالح اجزاء و عناصر کو محفوظ رکھنے کیلئے کتنی کشمکش کی اور کس قوت مقابلہ سے کام لیا، عام حالات میں ہم اس کو نہیں دیکھ پاتے، اس کیلئے ایک خاص طرح کی خوردبین کی ضرورت ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

ایک دریا ہی کو آپ لے لیں جو روانی اور حرکت کیلئے سب سے بہتر مثال ہو سکتا ہے۔ دریا کی کوئی موج اپنی پہلی موج کی بالکل عین اور مماثل نہیں ہوتی، لیکن دریا اپنی گذرتی ہوئی موجوں کے باوجود اپنے نام کیساتھ، اپنے حدود کے ساتھ، اپنی بہت سی خصوصیات کے ساتھ ہزاروں برس سے قائم ہے۔ دجلہ و فرات آج بھی دجلہ و فرات کہلائیں گے اور گنگ و جمن بھی گنگ و جمن کہلاتے ہیں۔

زمانے کے اندر ٹھہراؤ بھی ہے اور بہاؤ بھی، اگر زمانہ ان دونوں خصوصیتوں اور صلاحیتوں میں سے کسی ایک سے محروم ہو جائے تو وہ اپنی افادیت کھودیگا، اسی طرح کائنات میں جتنے بھی وجود شخصیتیں اور ہستیاں ہیں سب کے اندر مثبت اور منفی لہریں برابر اپنا کام کرتی رہتی ہیں اور دونوں لہروں کے ملنے سے وہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے اور وہ منصب پورا ہوتا ہے جو ان کے سپرد کیا گیا ہے۔

مذہب زندگی کا نگراں ہے:

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے مذہب کے ایک پیرو اور طالب علم کی حیثیت سے میں مذہب کیلئے یہ پوزیشن قبول نہیں کر سکتا اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات بھی مذہب کیلئے یہ پوزیشن نہیں پسند کریں گے کہ مذہب ہر تغیر کا ساتھ دے، یہ کسی تھرمامیٹر کی تعریف تو ہو سکتی ہے کہ وہ درجہ حرارت و برودت بتلائے، یہ مرغ باد نما (Weathercock) کی بھی تعریف ہو سکتی ہے جو کسی اونچی عمارت یا ہوائی اڈے پر لگایا گیا ہے صرف یہ معلوم کرنے کیلئے کہ ہوا کسی طرف کی چل رہی ہے لیکن مذہب کی تعریف نہیں ہو سکتی، میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا کہ مذہب کو اس کے بلند مقام سے اتار کر تھرمامیٹر یا مرغ باد نما کا مقام دینا چاہتا ہوں کہ مذہب کا کام یہ ہیکہ وہ صرف زمانے کی تبدیلیوں کی رسید دیتا رہے، اکنالج (Acknowledge) کرتا رہے، اس کی عکاسی کرتا رہے، صحیح آسمانی مذہب کے تو کیا کسی نام نہاد مذہب کے پیرو یا اس کے نمائندے بھی اس پوزیشن کو قبول

www.abulhasanalinadwi.org

کر لینے کیلئے تیار نہیں ہوں گے۔

مذہب تغیر کو ایک حقیقت مانتا ہے اور اس کے لئے وہ ساری گنجائش رکھتا ہے جو ایک صالح، صحیح، فطری اور جائز تغیر کیلئے ضروری ہوں، مذہب زندگی کا ساتھ دیتا ہے، لیکن یہ محض ساتھ دینا، یا محض رفاقت اور پیروی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کا فریضہ یہ بھی ہیکہ وہ اس کا فرق کرے کہ یہ صالح یا غیر صالح ہے، یہ تخریبی رجحان ہے اور یہ تعمیری رجحان ہے، اس کا نتیجہ انسانیت کے حق مین یا کم از کم اس مذہب کے پیروں کے حق کیا ہوگا۔ مذہب جہاں رواں دواں زندگی کا ساتھ دینے والا ہے وہاں وہ زندگی کا محتسب، نگراں، گارجین (Guardian) اور زندگی کا اتالیق بھی ہے۔ گارجین کا کام یہ نہیں ہیکہ جو ہستی اس کی اتالیقی میں ہے اس کے ہر صحیح و غلط رجحان کا ساتھ دے اور اس پر مہر تصدیق ثبت کردے، مذہب ایسا سسٹم نہیں ہیکہ جہاں ایک قسم کی مہر رکھی ہوئی ہے، ایک ہی طرح کی روشنائی ہے اور ایک ہی طرح کا ہاتھ ہے، جو دستاویز اور تحریر آئے مذہب کا کام یہ ہیکہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کردے، مذہب پہلے اس کا جائزہ لیگا پھر اس پر اپنا فیصلہ صادر کریگا۔ اور ترغیب اور بعض اوقات مجبوراً ترہیب کے ذریعہ اس سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا، اور اگر کوئی غلط دستاویز اس کے سامنے آتی ہے جس سے اس کو اتفاق نہیں یا جس کو وہ انسانیت کے حق میں مہلک اور تباہ کن سمجھتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے انکار کرے گا بلکہ اس کی بھی کوشش کرے گا کہ وہ اس کی راہ میں مزاحم ہو۔

یہاں اخلاقیات اور مذہب میں ایک فرق پیدا ہو جاتا ہے، مذہب اپنی ذمہ داری اور فرض سمجھتا ہیکہ غلط رجحان کو روکے، ماہر اخلاقیات و نفسیات کی ڈیوٹی صرف یہ ہیکہ وہ غلط رجحانات کی نشاندہی کردے یا اپنا نقطۂ نظر ظاہر کردے، لیکن مذہب اس کی کوشش کرے گا کہ وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے"۔

اگر ہم نے اس باریک بینی، گہرائی و گیرائی، امانت و احساس ذمہ داری، اس دین کے مزاج اور اس کے پیغام سے گہری واقفیت کا ثبوت دیا اور اسی کے ساتھ ہم نے

موجودہ زمانے کے مزاج و خصوصیات کو سمجھا جسمیں نمو اورتغیر کی صلاحیت ہے اور ثبات واستقامت بھی، اوراس نے قدیم صالح عناصر کو باقی بھی رکھا ہے، اگر ہم نے ان خصوصیات کو اچھی طرح سمجھ لیا تو فقہ اسلامی کی ضرورت (وسیع معنوں میں) کو ہم پوری کر سکتے ہیں اور ہم اسلامی سوسائٹی کی بھی ضرورت کو پوری کر سکتے ہیں، اور اسلامی احکام اور دینی تعلیمات پر ہم اس مذہب اور ترقی یافتہ زمانہ میں بھی عمل کر کے دکھا سکتے ہیں اور اس زندگی کا بھی ساتھ دے سکتے ہیں جو تیزی اور انتہائی سرعت کے ساتھ ترقی کرتی جارہی ہے۔

(مجلہ بحث و نظر، فقہی سیمنار نمبر جلد ۲ شمارہ نمبر ۶ ص ۵۹ تا ۶۵

تقلید کے بارے میں حضرت مولانا علی میاں کا نقطہ نظر :

تقلید کے مسئلہ میں بھی حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ بہت معتدل نقطۂ نظر رکھتے تھے۔اس سلسلہ میں ان کا نقطۂ نگاہ حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کے نقطۂ نگاہ سے ہم آہنگ تھا، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نقطۂ نظر کو حضرت مولانا علی میاںؒ نے بہت تفصیل کے ساتھ تحسین واستحسان کے انداز میں بیان فرمایا ہے، مولانا مرحوم رقم طراز ہیں۔

”شاہ صاحب غایت انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ایسے شخص کو تقلید کے بارے میں معذور سمجھتے ہیں جو کسی مذہب فقہی یا معین امام کا مقلد تو ضرور ہے لیکن اس کی نیت محض صاحب شریعت کی پیروی اور اتباع نبوی ہے، لیکن وہ اپنے اندر اس کی اہلیت نہیں پاتا کہ وہ حکم شرعی اور جو چیز کتاب وسنت سے ثابت ہے اس تک براہ راست پہنچ جائے، اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً وہ عامی شخص ہے، یا اس کے پاس براہ راست تحقیق کرنے کے لئے وقت اور فرصت نہیں، ایسے وسائل (علم و تحقیق) حاصل نہیں جن سے وہ نصوص کا خود پتہ چلا لے، یا ان سے مسئلہ استنباط کرے، شاہ صاحب علامہ ابن حزم کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ تقلید حرام

www.abulhasanalinadwi.org

ہے، اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ رسول ﷺ کے علاوہ کسی کے قول کو بلادلیل قبول کرے، تحریر فرماتے ہیں۔

"ابن حزم کے قول کا مصداق وہ شخص نہیں جو رسول ﷺ کے قول کے علاوہ کسی کو اپنے لئے واجب الطاعت نہیں سمجھتا وہ حلال اسی کو گردانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کیا اور حرام اسی کو مانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا، لیکن چونکہ اس کو براہ راست آں حضرت ﷺ (کے اقوال واحوال) کا علم حاصل نہیں اور وہ آپ کے کلام سے مسائل استنباط کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، وہ کسی خداترس عالم کا دامن پکڑ لیتا ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ صحیح بات کہتا ہے، اور اگر مسئلہ بیان کرتا ہے تو اس میں وہ محض سنت نبوی کا پیرو اور ترجمان ہوتا ہے، جیسے ہی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح نہیں تھا، اسی وقت وہ بغیر کسی بحث واصرار کے دامن چھوڑ دیتا ہے، بھلا ایسے آدمی کو کوئی کیسے مطعون کرے اور اس کو سنت وشریعت کا مخالف قرار دے گا؟

سب کو معلوم ہے کہ استفتاء اور افتاء کا سلسلہ عہد نبویؐ سے لے کر برابر چلتا رہا ہے، اور دونوں میں کیا فرق ہے کہ آدمی ہمیشہ ایک سے فتوی لیتا ہے کبھی ایک دوسرے سے، ایسی حالت میں کہ اس کا ذہن صاف ہے، اس کی نیت سلیم ہے، اور وہ صرف اتباع شریعت چاہتا ہے، یہ بات کیسے جائز نہیں؟ جب کہ کسی فقیہ کے بارے میں ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر آسمان سے فقہ اتاری اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے"

(تاریخ دعوت وعزیمت جلد ۵ ص ۲۰۸، ۲۰۹)

ایک دوسری جگہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ اجتہاد و تقلید

www.abulhasanalinadwi.org

کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کے معتدل نقطۂ نظر کی تمہید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''حضرت شاہ صاحب کے ان وَہبی کمالات اور تجدیدی امتیازات میں سے جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص طور پر نوازا تھا وہ متوازن اور معتدل مسلک اور وہ نقطۂ اعتدال ہے جو انھوں نے اجتہاد و تقلید کے درمیان اختیار کیا اور جو ان کے طبع سلیم، ذوق صحیح اور حقیقت پسندی کا بہترین مظہر ہے، ایک طرف وہ لوگ تھے، جو ہر مسلمان کو خواہ عامی ہو یا خاص براہ راست کتاب و سنت پر عمل کرنے اور ہر معاملہ میں وہیں سے احکام حاصل کرنے کا مکلّف قرار دیتے تھے اور تقلید کی مطلق حرمت کے قائل تھے، اگر انکے کلام میں اس کی صراحت نہیں ملتی تو ان کے طرز عمل اور ان کی تحریروں سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، اس گروہ میں متقدمین میں علامہ ابن حزم پیش پیش نظر آتے ہیں، لیکن یہ بالکل ایک غیر عملی بات ہے اور اس کا ہر مسلمان کو مکلّف قرار دینا تکلیف مالا یطاق ہے۔

دوسری طرف وہ گروہ تھا جو تقلید کو اسی طرح ہر مسلمان پر واجب قرار دیتا تھا اور اس کے تارک کو سخت فقہی احکام ''فاسق'' اور ''ضال'' سے یاد کرتا تھا جیسا کہ پہلا گروہ مقلدین اور کسی خاص مذہب فقہی کے متبعین کو، یہ گروہ اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ تقلید عوام کو نفسانیت اور خودرائی سے بچانے، مسلم معاشرہ کو انتشار و فوضویت (انارکی) سے محفوظ رکھنے، دینی زندگی میں وحدت و نظم پیدا کرنے اور احکام شریعت پر بسہولت عمل کرنے کا موقع دینے کی ایک انتظامی تدبیر ہے، لیکن انھوں نے اس انتظامی عمل کو تشریعی عمل کا درجہ دیدیا، اور اس پر اس شدت سے اصرار کیا جس نے اس کو مذہب فقہی اور مسئلہ اجتہادی کے بجائے منصوص اور قطعی عمل اور مستقل دین کا درجہ دیدیا۔

(تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۵، ص ۲۰۴، ۲۰۵)

حضرت مولانا علی میاںؒ جس طرح اجتہاد کے نام پر شریعت کے ساتھ

www.abulhasanalinadwi.org

کھلواڑ کرنے کے بارے میں سخت ترین نکیر کرتے ہیں، اسی طرح تقلید میں غلووانحراف کا سختی کے ساتھ نوٹس لیتے ہیں۔ تقلید کی جائزاور فطری شکل کی وضاحت کرنے کے بعد اس میں غلووانحراف کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”رفتہ رفتہ عوام میں جہالت نے اثر کیا، اور کہیں ائمہ کی حیثیت وسائط اور وسائل کے بجائے مقصود اور ایک طرح سے شارع ومطاع کی پیدا ہوگئی، لوگوں کو ان مذاہب سے بالذات دلچسپی اور ان کی اس درجہ عصبیت پیدا ہوگئی کہ وہ کسی حال میں ان کے ایک شوشہ یا نقطہ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے، اس سلسلے میں عوام تو زیادہ قابل الزام نہیں ہیں کہ انھوں نے ان مذاہب کو سنت کی پیروی سمجھ کر اختیار کیا تھا اور ان کیلئے ترجیح کے اسباب معلوم کرنا اور ان کے مطابق ترک مذہب یا ایک مذہب سے دوسرے کی طرف انتقال مشکل بھی تھا اور خطرناک بھی، لیکن بہت سے علماء کی یہ حالت تھی کہ ان کو اگر اپنے امام یا مذہب کے کسی مسئلہ کا حدیث وسنت کے خلاف ہونا ثابت ہو جائے اور اس کا قطعی علم حاصل ہو جائے کہ اس مسئلہ میں اپنے امام کا مسئلہ مرجوح اور دوسرے امام یا مذہب کا مسئلہ راجح اور حدیث وسنت کے مطابق ہے اور اپنے مذہب اور عمل کے خلاف کیسی ہی صحیح وصریح احادیث ملیں تب بھی وہ اس مسئلہ کو ترک کرنے اور احادیث پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور ان کی طبیعت اس کے لئے منشرح نہیں ہوتی۔

(تاریخ دعوت وعزیمت جلد ۲ص ۷ ۳۳، ۳۳۸)

اصحاب تحقیق علماء برابر یہ صراحت کرتے رہے کہ ائمہ فقہ کی تقلید کتاب وسنت ہی کی پیروی کی نیت سے ہونی چاہئے، مجتہدین کو شارع کا مقام دیدینا فساد عقیدہ کا موجب ہے، متبحر عالم جو دلائل شرعیہ کو جاننے پرکھنے، ان کے درمیان ترجیح وتطبیق کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے، وہ اگر کسی مسئلہ میں تفصیلی غور وخوض اور مطالعہ کے بعد محسوس کرتا ہے کہ اس مسئلہ میں اس فقہی مسلک کے حق میں جس کی طرف انتساب رکھتا ہے کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں ہے، اس کا مدار قیاس پر ہے اور مخالف رائے

کے حق میں صحیح وصریح حدیث موجود ہے تو ایسی صورت میں متبحر عالم کے لئے مسلک کی پابندی کے نام پر صحیح وصریح حدیث کو مسترد کردینا ہرگز درست نہیں۔

آخری دور کے علماء محققین میں سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے باربار اس کی صراحت کی ہے۔ حضرت تھانوی نے تقلید کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے "تقلید کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ امام کے قول کو حدیث وقرآن سے زیادہ سمجھا جاتا ہے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ہم کو اتنا علم نہیں جتنا کہ ان فقہا کو تھا، جنھوں نے فقہ کو مرتب کیا نصوص سے جس فہم واحتیاط کے ساتھ وہ مسائل کا استخراج کر سکتے ہیں ہم نہیں کر سکتے" (وعظ الصالحین :۳۱) حضرت تھانوی ایک اور جگہ فرماتے ہیں "بعض اہل تعصب کو ائمہ کی تقلید میں ایسا جمود ہوتا ہے کہ وہ امام کے قول کے سامنے احادیث صحیح غیر معارضہ کو بے دھڑک رد کردیتے ہیں، میرا تو اس سے رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے" (اشرف المعلومات :۱۹)

حسن العزیز میں فرماتے ہیں "اگر امام کی دلیل سوائے قیاس کے کچھ نہ ہو اور حدیث معارض موجود ہو تو قول امام چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسے "ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام" میں ہوا ہے کہ امام صاحب نے قدرِ غیر مسکر کو جائز کہا ہے اور اس حدیث میں اس کے خلاف کی تصریح موجود ہے، یہاں امام کے قول کو چھوڑ دیتے ہیں، مگر اس کے لئے بڑے تبحر کی ضرورت ہے" (حسن العزیز ۴/ ۳۹۷)

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا ابوالحسن علی الندوی رحؒ کا

نظریۂ تزکیہ وسلوک

مولانا عبدالکریم پاریکھ
خازن آل انڈیا مسلم پرسنل لاءبورڈ

عالم ربانی حقانی، مصلح امت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے بیشمار گوشے ہیں۔ دینی، علمی، فکری، تعلیمی، تربیتی، تصنیفی وتالیفی اسی میں "تزکیہ وسلوک" بھی ایک اہم گوشہ ہے

اللہ نے اپنے بندوں کی اصلاح کیلئے حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ تک برابر انبیاء کو مبعوث فرمایا تاکہ یہ مقدس گروہ تعلیم وتربیت، تزکیہ وطہارت، حکمت ودانائی کی باتیں لوگوں کو سکھانے کا فریضہ انجام دیتا رہے، جب انسانیت علم وقلم کے چوراہے پر آکھڑی ہوئی تو حضرت محمد ﷺ کو خاتم النبیین، ورحمۃ للعلمین بناکر مبعوث فرمایا گیا۔ اور قرآن مجید آسمانی "ہدایت نامہ" آپؐ پر نازل کیا گیا۔ اس طرح رہتی دنیا تک کے انسانوں کیلئے "ہدایت کے دروازے کھول دیئے گئے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

نزل به الروح الامين على قلبك لتكون من المنذرين
(۲۶الشعراء آیت ۱۹۳۔۱۹۴)

(روح الامین نام کا فرشتہ لے کر اسے اترا ہے، اے نبیؐ آپ کے دل پر اس قرآن کا نزول فرمایا گیا تاکہ آپ ہمارے اس بیان سے لوگوں کو خبردار کردیں۔)

www.abulhasanalinadwi.org

قلب کی اصلاح

"قرآن مجید" حضرت محمد ﷺ کے قلب پر اتار کر اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے جملہ معاملات کو وحی کی روشنی سے منور فرمادیا۔ انسانیت کے عقل ودماغ اور قلب کی اصلاح کے راستے کھول دیئے۔ ۱۳ سالہ مکّی زندگی اور ۱۰ سالہ مدنی زندگی کل ۲۳ سال میں حضرت محمد ﷺ نے کتاب اللہ کی نورانی کرنوں سے ساری انسانیت کو منور کردیا۔ دین اسلام اپنی اصل چوکھٹ پر قائم ہوگیا۔ نبیؐ نے مکمل طور پر منصب نبوت کا حق ادا کردیا۔ اور "خیر امت" کے نام سے آخری امّت کی تشکیل جدید ہوئی، خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کا قیام عمل میں آیا اور ملکوں ملکوں میں ایمان کی نہریں جاری ہوگئیں۔

تخت سلطنت

دین وایمان کی بنیاد پر سلطنتوں اور حکومتوں کا قیام بھی ہوتا رہا ہے۔ چونکہ دنیا دارالامتحان ہے لہذا حق وباطل کی کشمکش اور ایمان ونفاق کا کھنچاؤ تناؤ کا تسلسل بھی جاری رہا۔ ادھر نبی ﷺ کے مشن کے مقابلے میں شیطان بھی اپنے قدیم وجدید ہتھیاروں سے لیس ہو کر امت پر اپنا زور آزماتا رہتا ہے۔ نیز تخت سلطنت پر جو لوگ براجمان ہوئے بقول قرآن مجید منهم مهتدٍ و كثير منهم فاسقون، حکمرانوں کا ایک طبقہ ہدایت یافتہ ہوا جو دین اور ایمان کا خادم بنا رہا۔ اور حکومت وسلطنت کے وسائل واسباب کا استعمال دعوت دین میں ہوتا رہا۔ لیکن دوسرا طبقہ فاسقوں فاجروں کا بھی رہا جو حکومت وسلطنت جیسی نعمت پر قابض ہوا اور عیش وعشرت میں یادگاریں قائم کرنے اور آپسی مارکاٹ کرنے میں اپنا وقت صرف کرتا رہا ہے۔ اس امت میں جیسے ہی یہ صورت حال پیدا ہوئی تو علماء امّت مبلغین ومصلحین کے بڑے بڑے افراد الحمد للہ دعوت واصلاح کے میدان میں آکھڑے ہوئے اور اپنے طور پر انسانوں کے قلوب کی اصلاح اور ان کے نفوس کے تزکیہ کیلئے ہر زمانے میں متحرک رہے جبکہ سرمایہ کے لحاظ سے ان کے پاس کوئی طاقت نہیں تھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

سلسلۂ بیعت:

نامساعد اور سخت حالات کا بھی ان کو سامنا کرنا پڑا، پھر بھی ہر زمانے میں ان پاکباز نفوس نے دعوت دین، اصلاح حال اور تزکیۂ نفس کا اہم فریضہ انجام دیا۔ اس کے لئے ان حضرات نے سنت نبوی کا وہ اسلوب اختیار کیا جو مکی دور کا تھا۔ جس میں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ان کے رب کی طرف بلانے کا کام انجام دیا گیا۔

ادع الی سبیل ربّك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن (۱٦ النحل آیت ۱۲٥)

(اپنے پروردگار کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت ودانائی اور دانشمندی کے ساتھ اور اچھی نصیحت کر کے دعوت دیتے رہئے۔ ضرورت پڑنے پر ان سے بحث کرنی پڑے تو نہایت حسن وخوبی کے ساتھ بات سمجھایئے۔)

سنیاس یا رہبانیت نہیں:

حکمت اور دانائی اور تزکیہ وسلوک پر نہایت خوبی سے یہ کام کرنے والے نفوس قدسیہ، مرشد، صوفی اور پیر وغیرہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ لیکن یہ لوگ سنیاسی، رہبان یا تارک الدنیا درویش نہیں تھے بلکہ دعوت دین میں سنت کے طرز پر راہِ سلوک طے کرنے اور کرانے والے تھے۔ حکومت سلطنت تو ان کے پاس تھی نہیں کہ وہ اپنا بادشاہی حکم چلا سکتے، اس لئے انہوں نے اس راہ سلوک کیلئے نبی ﷺ کے طریقہ میں سلسلۂ بیعت کو اختیار کیا، ان کے پاس حکومت کی طاقت نہیں تھی، سادہ اور موٹا لباس اور کم سے کم ضروریات زندگی کے سبب یہ حضرات صوفیا کہے جانے لگے، اسی وجہ سے لفظ تصوف بھی ان کے نام کے ساتھ جاری ہوا۔

مرشد نا حضرت مولانا علی میاںؒ نے زندگی سادہ گذاری، اوسط درجے کا رہن سہن، لباس میں وضع قطع میں کوئی بناوٹ نہیں۔ عام آدمیوں سے ملتے تو کیا، وزراء اعلیٰ افسران اور بادشاہ تک بھی ملاقات کو آئے تو کبھی بھی آپ نے تصنع یا خود نمائی

www.abulhasanalinadwi.org

سے کام نہیں لیا۔ نیز اپنے متعلقین سے بھی کبھی سختی سے پیش نہیں آئے بلکہ ہمیشہ لطف و کرم کا معاملہ کرتے تھے۔

اللہ کی ایک رحمت :

سالک کی غلطی پر نہایت حکیمانہ انداز سے ایسی تربیت فرماتے کہ سننے والا اپنی غلطی کو درست کرنے میں لگ جاتا۔ آپؒ نے کھنچاؤ و تناؤ، غیظ و غضب سے پرہیز کیا۔ حضرتؒ کا یہ وصف بیسویں صدی کے عوام و خواص، سیاست دانوں، باشاہوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کیلئے اللہ کی ایک رحمت بن گیا۔ لیکن حضرت مولاناؒ نے کبھی بھی صوفی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

دو طریقے ظاہر ہوئے :

سلطنتیں حکومتیں لڑکھڑاتی رہیں، کرسی نشینوں میں فسق و نفاق بھی آنے لگے، اس امت کی تشکیل دعوتِ دین و ایمان کی بنیاد پر ہوئی ہے، جب تک خلافت علی منہاج النبوۃ کا دور دورہ رہا اس وقت تک دعوت الی اللہ کا، یعنی لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے اور انسانوں کی دینی تربیت اور اصلاح کے کام کیلئے ہزارہا ہزار لوگ کھڑے ہو گئے۔ اقتدار پر قابض لوگ صحیح رخ پر چلیں سبحان اللہ، نہ چلیں استغفر اللہ، مگر علماء صلحاء اور صوفیاء کرام قلوب کی اصلاح کا کام برابر کرتے رہے۔ سرمایہ کے لحاظ سے بھی کوئی طاقت ان کے پاس نہیں تھی، ان کے پاس قول و عمل کی صداقت تھی وجاء بقلبٍ منیبٍ (اور ہماری محبت سے بھرا دل لے کر آیا) کے تحت انہوں نے تزکیۂ نفوس اور تطہیر قلوب کا کام انجام دیا اور دعوتِ الی اللہ کی راہ ہموار کرنے میں لگے رہے۔ بیعت اور ارشاد اور سلوک کے ذریعہ آدمی کو صراط مستقیم پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔ جس کے سبب بندہ رضاء الٰہی کا مستحق بن جاتا ہے۔ ذیل ہم قرآن مجید سے وہ آیات نقل کرتے ہیں جو بیعت وارشاد کے مضمون پر مشتمل ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

بیعت کے ذریعے دعوت کا طریقہ:

یاایّھا النبیّ اذا جاء ک المؤمنات یبایعنک علیٰ انّ لایشرکنَ باللہِ شئیاً وّلایسرقن وّلایزنین ولا یقتلن اولادھنّ ولا یأتین ببھتانٍ یفترینہٗ بین ایدیھن وارجلھنّ ولا یعصینک فیِ معروفٍ فبا یعھن وٖاستغفرلھن اللہ ان اللہ غفور رحیم(۶۰ الممتنحہ آیت ۱۲)

(اے نبی جب آپ کے پاس ایمان والی خواتین اس بات پر بیعت کرنے کو حاضر ہوں کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، اور چوری نہ کریں گی اور بدکاری نہیں کریں گی اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی اور اپنے ہاتھ پاؤں کے درمیان بہتان گھڑ اکر کے نہ لائیں گی، اور کسی بھلے کام میں آپؐ کی نافرمانی نہیں کریں گی تو ان کی بیعت قبول کرلواور ان کے لئے اللہ سے مغفرت کی درخواست کرو، بیشک اللہ مغفرت فرمانے والارحیم ہے)

تزکیہ وسلوک کی مبارک کڑی:

مرد تو مرد خواتین کو بھی حضور اکرم ﷺ نے سلسلۂ بیعت میں شریک کیا تاکہ ایمان والے معاشرہ میں اللہ کی توحید عام ہو، شرک 'بدعات، خرافات، چوری، بدکاری، زناکاری، قتل، بہتان، جھوٹ، غیبت، چغل خوری وغیرہ گناہوں سے انسانوں کو بچایا جائے۔ ایسے لوگوں کیلئے نبی کی طرف سے استغفار کا تحفہ بھی وارد ہوا ہے۔ تزکیہ وسلوک کی اس مبارک کڑی میں جن نفوس قدسیہ کے نام بہت مشہور ومعروف ہیں ان میں ایک نام نامی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا ہے۔ ان کے دستِ مبارک پر اس امت کے لاکھوں لوگ سلسلۂ بیعت میں منسلک ہوئے اور الحمدللہ انہیں فیض بھی پہنچا ہے۔ کسی کام کو کرنے کیلئے جب مختلف لوگ اٹھتے ہیں تو طریقۂ کار میں کچھ نہ کچھ اختلاف ہوتا ہی ہے۔ یہ قدرتی بات ہے۔ اور کچھ اختلافی مسائل بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں لہذا طریقۂ کار کے اختلاف ومسائل میں بہت زیادہ بحث وتکرار

www.abulhasanalinadwi.org

نہ کرتے ہوئے اصلاحِ قلب اور نفس کا تزکیہ جو اس سلسلے کا اہم فائدہ ہے اسی کی طرف توجہ فرمائی۔

حضرت مولاناؒ نے سلسلۂ بیعت وارشاد اور راہ سلوک میں اختلافی مسائل سے ہٹ کر کتاب وسنت کی روشنی میں بیسویں صدی میں کارِ خیر کو ایسی حکمت عملی دانش مندی اور دانائی سے چلایا کہ جس کے سبب الحمد للہ ثم الحمد للہ حضرتؒ کی تربیت سے لاکھوں لاکھ لوگ راہ حق کو پالینے میں کامیاب ہوگئے اور اس طریقۂ کار پر ناک بھوں چڑھانے والے حضرت مرشدنا کے ہاتھ پر الحمد للہ بیعت ہوگئے۔

مروجہ پیری مریدی:

بعض کم علم اور نادان لوگوں نے بلسلۂ بیعت کا مذاق بھی اڑایا ہے۔، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کتاب وسنت پر ان کی گہری نگاہ نہیں ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض دھندادار ی اور مال وجاہ کے حریص لوگ اس سلسلہ میں داخل ہوگئے اور اصلاحات کے بجائے خرابیاں بداعتقادیاں پیدا ہوگئیں، جتھے اور مسلک بن گئے اور اس ٹولی بازی اور مسلک کی لڑائی نے دین وشریعت کی جگہ لے لی، مگر ہمارے اکابر نے تزکیہ وسلوک کے بارے میں جو نظریہ اور طریقۂ کار پیش کیا ہے۔ وہ عین کتاب وسنت کے منشا کے مطابق ہے اور خلق کثیر کو اس سے نفع پہنچا ہے۔

بعض اہل اور مخلص لوگ بھی سلسلۂ بیعت کا نام پیری مریدی رکھ کر اس پر لعن طعن کرتے ہیں اور اعتراض وارد کرتے ہیں۔ چونکہ اصلاح امت کا یہ طریقہ نبوی طریقہ تھا اس لئے اسے مٹایا نہیں جاسکتا۔ ہمارے اس دور میں حضرت اقدس مرشد محترم مولانا سید ابوالحسن علی الندویؒ نے بیعت کے طریقہ میں ایسا طرز اختیار کیا جس کی سنت نبویؐ سے مماثلت تھی۔ مولانا علی میاں صاحبؒ کا طریقۂ بیعت موجودہ کاروباری پیری مریدی کا کبھی نہیں رہا، بلکہ عین سنت قائمہ کے دائرے کے اندر راہِ سلوک میں تزکیہ نفس اور تربیت کا رہا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

قرآن مجید اور سنت نبوی ؐ :

حضرت اقدس مولانا علی میاں صاحبؒ سلسلۂ بیعت میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوریؒ اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے منسلک تھے اور ان کے علاوہ بہت سی اہم شخصیات سے روحانی اور علمی فیض آپ نے حاصل کیا تھا جس کے سبب آپ کے سینے میں بے شمار لوگوں کے فیض کا عطر یکجا ہو گیا تھا۔ میں نے بھی دیکھا ہے اور آپ بھی میری بات کی تصدیق کریں گے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے کثیر افراد نے سلسلۂ بیعت میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے منسلک ہو کر کسب فیض کیا۔ میرے نزدیک اس کا سب سے بڑا کریڈٹ قرآن مجید اور سنت نبویؐ کو ہے۔ آپ کی صحبت و تربیت میں جو بھی رہا اللہ تعالیٰ نے اس کی ظاہری باطنی روحانی کیفیات کو بلندی پر پہنچادیا اور ان کی زندگی کے تمام معاملات شریعت کے سانچے میں ڈھل گئے۔

نظریۂ تزکیہ و سلوک :

اس وقت ایسے مؤقر اور چیدہ نیز صاحب علم و فکر مجمع کے سامنے تزکیہ و سلوک کے نظریے پر بحث نہ کرتے ہوئے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے طرز اصلاح و تربیت کی وضاحت اور اس کا تذکرہ مقصود ہے۔ آپؒ سے جو بھی قریب ہوا وہ فبما رحمةٍ مّن الله لنت لهم کے تحت حضرت والاؒ کی محبت و مودت، ترحم اور نرمی کا مستحق ہوا۔ تعلیم نبویؐ کی جو نورانی کرنیں آپؒ کی ذات میں موجود تھیں اس کا عکس ہر ایک نے اپنی طلب اور استعداد کے مطابق اخذ کیا اور جو شخص بھی بیعت کے سلسلے میں حضرت مولانا علی میاںؒ سے جڑا وہ دنیا اور آخرت کے اعتبار سے کچھ نہ کچھ مل گیا۔ سلسلۂ بیعت بہت اہم اور بڑی بھاری نعمت ہے۔ ارشاد رب ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَا يِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَا يِعُوْنَ اللهَ يَدُا اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ فَمَنْ نَكَثَ فانما ينكث عَلىٰ نفسه ومَنْ اَوْفى بمَا عٰهَدَ عَلَيْه الله فَيسؤ تيه اَجرًا عَظيماً (۴۸ الفتح آيت ۱۵)

www.abulhasanalinadwi.org

(جن لوگوں نے آپؐ سے بیعت کی تھی دراصل ان کی بیعت اللہ سے ہوئی۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا۔اب جو کوئی بیعت کرنے کے بعد اپنے قول و قرار کو توڑ ڈالے گا تو اس کا وبال اسی پر پڑے گا اور جو اللہ کو گواہ بنا کر وعدہ کر چکا پھر وفاداری سے اس پر قائم رہا تو بہت جلد اللہ اس کو اجر عظیم سے نوازے گا۔)

دل کا اندھا پن :

اس آیت کے متن اور ترجمہ پر نظر ڈالنے کے بعد یہ کہنے میں کیا حرج واقع ہو گا کہ سلسلۂ بیعت کا تعلق و ثبوت قرآن سے ہے اور یہ ایک اہم عنوان قرآن ہے۔ انسانوں کے قلب کی صفائی و تطہیر کیلئے بہترین تحفۂ ربانی ہے۔ کیا خوب ارشاد فرمایا ہے رب تعالیٰ نے :

فَاِنَّهَا لَاتَعْمَى الاَبْصَارُ وَلٰكِن تَعمى القُلوبُ الَّتى فِى الصُّدُور

(آنکھیں اندھی ہونے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا لیکن لوگوں کے سینوں میں جو دل ہوتے ہیں اگر وہ اندھے ہو گئے تو ان کی بات ہی بگڑ جاتی ہے)

تربیت نفس کا کورس :

معلوم ہوا کہ دل کا اندھاپا پوری زندگی تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔دل کی اصلاح کیلئے تربیت نفس کا وہ کورس جسے کتاب و سنت کے آئینے میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے پورے اخلاص اور محبت الٰہی کے تحت اختیار فرمایا وہ ہم جیسے عاصیوں کیلئے ایک نعمت ربانی ہے۔دلوں کی اصلاح کیلئے دل والوں کے ساتھ رہنا اٹھنا بیٹھنا بہت مفید ہے۔اور منشاء الٰہی کے مطابق ہے ذیل کی آیت ملاحظہ فرمائیں۔

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداوٰةِ والعشى يريدون وجهه ولاتعد عينٰك عنهم تريد زينة الحيٰوة الدنيا ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتّبع هواه وكان امره فرطا

(الکهف آیت ۲۸)

www.abulhasanalinadwi.org

(اپنے آپ کو ایسے لوگوں کے بیچ تھام رکھو جو اپنے رب کو صبح وشام پکارتے ہیں (اور اس کی دعوت میں لگے ہوئے ہیں) اس کی رضا صبح وشام پکارتے ہیں (اور اس کے دعوت میں لگے ہوئے ہیں) اس کی رضامندی چاہنے کیلئے، اور دیکھو دینوی زندگی کی چاہت کا ارادہ تمہاری نگاہ کو ان سے ہٹانہ سکے اور کسی ایسے شخص کا کہنا مت مانو جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل پایا اور پھر تو ایسا شخص اپنی من چاہی کرنے میں لگ گیا ایسے آدمی کا ہر کام بے لگام ہے)

آیت سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کو چاہئے کہ ہمیشہ نیک بخت لوگوں کی صحبت میں رہے، برے لوگوں کے پاس جانا بھی پڑے تو نصیحت کر کے سرک جائے، ان کی محفل میں جی لگا کر نہ بیٹھے اور بدکاروں کی محفل میں رنگ رلیاں اور دنیا کی زینت ورونق دیکھ کر اللہ کے ذکر سے غافل نہ ہو ورنہ پھسل جانے کا ڈر ہے، بری صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے ہر طرح اس سے پرہیز کرے مگر نصیحت کرنے کیلئے اجازت ہے۔

صالح بندوں کی صحبت کا اثر:

۱۸ سورہ کہف کی آیت ۶۰ سے ۸۲ تک ۲۳ آیات میں حضرت موسیٰ کی ملاقات کا جو بیان آیا ہے اس میں بھی بیعت وارشاد کے تعلق سے بیشتر مضامین مل سکتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم صرف اتنا لینا چاہیں گے کہ حضرت موسی علیہ اسلام کی ملاقات حضرت خضرؑ سے ہوئی تو حضرت موسیٰ نے کہا۔

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا

(الکهف آیت ٦٦)

(کیا میں آپ کی اتباع میں کچھ عرصہ تک رہوں کہ جو مفید علم آپ کو سکھایا گیا ہے اس میں کچھ مجھے بھی آپ سکھادیں)

ان آیات بینات سے معلوم ہوتا ہے کہ علم وتزکیہ کیلئے کسی کی اتباع کرنا اس کے ساتھ رہنا ضروری اور مفید ہے۔ اور تزکیہ قلوب و تطہیر نفس کیلئے اللہ کے صالح

www.abulhasanalinadwi.org

بندوں کی صحبت میں کچھ دن رہنا چاہیے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جنھوں نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ مولانا علی میاں صاحبؒ نے مسترشدین کی تربیت و تعلیم اس طرح فرمائی کہ کہیں بھی ریا و نمود اور دکھاوا کا شائبہ نہ رہا اور آپ کی زندگی بھی چمتکار و نمسکار سے خالی رہی۔

حرام سے اجتناب :

بس اللہ کے گناہگار بندوں کو اللہ غفور رحیم کی بارگاہ میں توبہ کراتے اور بہت لمبے چوڑے وظائف بھی نہ بتاتے۔ متوسلین کی مشکلات کا بھی خیال رکھتے تاکہ ہر طبقہ کے لوگ اپنی طلب و استعداد کے مطابق اپنے قلب و دماغ اور فکر و نظر کی اصلاح کروانے میں کامیاب ہو سکیں۔

لاکھوں لاکھ لوگوں کے قلوب کی اصلاح کرنا، اعمال صالحہ کی پابندی اور محرمات اور منہیات سے اجتناب کرنے کی طرف متوجہ کرنا، اللہ کی محبت و ملاقات کا شوق دلانا، دنیا کے مال و متاع سے کچھ پرے رہ کر استغناء کی زندگی گذارنا، ہمارے اس دور میں آسان کام نہ تھا

لیکن حضرت مولانا علی میاں صاحب نے تزکیہ و احسان کی اس راہ کو اس دور کے لوگوں کے لئے آسان کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

بیعت والے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ :

تزکیہ و سلوک میں بیعت کا تذکرہ اس مضمون میں قرآن مجید کی آیتوں کے حوالے سے ہم نے پیش کر دیا ہے۔ سلسلہ بیعت میں دورِ اوّل کے افراد کا ہاتھ نبی ﷺ کے دست مبارک میں پہنچ کر اہلِ ایمان کے فوز و فلاح کا ذریعہ بن گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک میں بیعت کو قرآن مجید میں ان الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ یدُ اللہِ فَوقَ اَیدِیْھِم (جس نے نبیؐ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا اس پر اللہ کا ہاتھ ہے)

نیز قرآن میں یہ ارشاد بھی موجود ہے

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِی بَا یَعْتُمْ بِهِ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیم

(۹ التوبہ آیت ۱۱۱)

www.abulhasanalinadwi.org

(پس اب تم خوش ہو جاؤ اپنی اس سوداگری پر، جو سودا بیچ دیا تم نے اللہ کو، یاد رکھنا یہ بڑی کامیابی ہے)

سچی بیعت پر اللہ راضی :

اوپر درج شدہ آیت میں اللہ کی رضامندی کی بشارت موجود ہے ۔ گو وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کیلئے ہے۔ مگر سلسلۂ بیعت میں داخل ہونے والے ہر دور کے لوگ، خاص و عام اللہ کی رضا اور بشارت کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ ایک اور جگہ رب العزت کا ارشاد ہے۔

لَقَدْ رَضِیَ اللہ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اذ یبا یعو نك تحت الشجرة فعلم مافی قلوبهم فانزل السکینة علیهم (٤٨ الفتح آیت ١٨)

(بے شک اللہ راضی ہو گیا، ان ایمان والوں سے جب وہ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، ان کے دلوں میں جو خلوص تھا اللہ کو معلوم تھا۔ اللہ نے ان کے دلوں پر تسکین نازل فرمائی)

بیعت میں خواتین کیلئے ایک سہولت :

بیعت لینے والے اور بیعت کرنے والے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ سلام ہو حضرت محمد ﷺ پر کہ مردوں کی بیعت تو دستِ مبارک میں ہاتھ لیکر قبول فرمائی لیکن کسی خاتون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بیعت نہیں کی بلکہ کسی پیالے میں پانی ڈال کر اپنا دستِ مبارک پانی بھرے پیالے میں داخل فرما دیتے اور پھر خواتین تک یہ پانی بھرا پیالہ پہنچا دیا جاتا، وہ بھی اس میں ہاتھ ڈال کر بیعت اور توبہ کے الفاظ دہرا کر بیعت ہو جائیں۔ اسی احتیاط اور نبوی طریقے پر مصلح امت حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ بھی عمل پیرا رہے۔ اور بیعت کے وقت کبھی کسی خاتون کے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر بیعت نہیں فرماتے بلکہ چادر کا ایک سرا آپ پکڑ لیتے اور دوسرا سرا بیعت ہونے والی خاتون پکڑ لیتی، زیادہ مجمع ہونے پر چادریں ایک دوسرے سے جوڑ کر دراز کر دی جاتیں،

www.abulhasanalinadwi.org

خواتین کے لئے بڑی سہولت ہوتی اور الحمدللہ پردے اور حجاب کا شرعی تقاضا بھی پورا ہوتا۔

بیعت میں صحابہؓ کا طریقہ :

صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کا بیعت ہونے کا یہی طریقہ رہا ہے۔ اس نبوی طرز کے علاوہ جو لوگ بیعت کا طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ معتبر اور بابرکت نہیں ہے۔ اس سے احتراز کرنا لازم ہے۔

ہر زمانے کے وہ جعلی پیر و فقیر جو بناوٹی مذہبیت چلا کر عوام کو اپنے سامنے سجدے کراتے ہیں، نذرانے وصول کرتے ہیں اور بخشش کے پروانے بانٹتے ہیں اور مخلوق کو گناہ پر دلیر کرتے ہیں ان کے سبب طریقۂ سلوک کی بدنامی ہوتی ہے۔

حضرت مرشد علی میاں صاحبؒ نے اپنے قلم اور زبان سے مشرکانہ اور غیر سنت والے طریقۂ کار کی زندگی بھر سختی سے مذمت فرمائی اور سنت رسولؐ کو ہمیشہ اپنے طریقۂ کار میں اولیت پر قائم رکھا۔

بس یہ طریقۂ سلوک بیسویں صدی میں حضرت مولانا علی میاںؒ کا تزکیہ اور سلوک کا نظریہ ہے جو کتاب و سنت سے ہر طرح ثابت ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت مولانا علی میاںؒ اور تصوف

ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی
لکچرر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تصوف کا مسئلہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے علماء اور اہل تصوف کے درمیان صدیوں سے اس میں اختلاف چلا آرہا ہے۔ اصطلاح تصوف اور اس کے طریق کار سے ہٹ کر اگر ہم قرآن وسنت کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وسنت، اصلاح نفس کے لئے خصوصیت کے ساتھ توجہ دلاتے ہیں جیسے قرآن اپنی اصطلاح میں تزکیہ سے تعبیر کرتا ہے جو ان چار ارکان میں سے ایک ہے جس کی تکمیل حضور ﷺ کے منصب نبوت سے متعلق اور مقاصد بعثت میں شامل تھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ **لقد من الله علی المومنین اذ بعث فیهم رسولا منهم یتلو اعلیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة** [1] (احسان کیا ہے اللہ نے مومنین پر انہیں میں سے ایک رسول بھیج کر جو اللہ کی آیات پڑھکر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔)

اس آیت میں حضور ﷺ کی چار شانیں بیان کی گئیں ہیں جن میں ایک تزکیہ نفوس ہے۔ جس سے مراد انسانی نفوس کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ کرنا اور انکو تمام نفسانی آلائشوں اور رزائل سے پاک وصاف کرنا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے۔ **ان الله یامر بالعدل والاحسان** [2] (بیشک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا)

www.abulhasanalinadwi.org

نبی ﷺ سے احسان کی تعریف دریافت کی گئی تو فرمایا، تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو جیسے اسے دیکھ رہے اگر تم اسکو نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے[۳]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احسان سے مراد یقین واستحضار کی وہ کیفیت ہے جسے تمام امور دینیہ انجام دیتے وقت موجود ہونا ضروری ہے۔ صحابہ اور تابعین کے یہاں اسکے شاندار نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ایسا صالح اور پاکیزہ اور مثالی معاشرہ وجود میں آیا جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عاجز ہے اور ایسی حق پرست حکومت قائم ہوئی جس کی مثال روئے زمین پر کہیں اور نہ مل سکی، یہ تزکیہ واحسان نہ رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے اور نہ جہاد جیسے اہم دینی اور ملی فریضہ سے منھ موڑنے کو سکھاتا ہے اور نہ زندگی کے جملہ فرائض اور ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کو کہتا ہے۔ مولانا علی میاںؒ جس تصوف کی ترجمانی کرتے ہیں وہ موجودہ زمانے کا نہیں بلکہ تزکیہ اور احسان ہے جس کی بنیاد قرآن وسنت ہے، وہ ایک ایسی روحانی کیفیت ہے جو حاصل ہونے کے بعد تمام اعمال خشوع وخضوع سے انجام ہونے لگتے ہیں۔ وہ شریعت کی روح اور دین کا لب لباب اور مقاصد نبوت کا ایک اہم حصہ ہے۔ مولانا اس تزکیہ اور احسان کے لئے کسی مخصوص اور متعین شکل پر زور نہیں دیتے بلکہ طریقہ خواہ کوئی بھی ہو جس میں رہبانیت اور جمود نہ ہو جس میں جہاد سے گریز نہ ہو غرض کہ زندگی کے کسی بھی شعبہ اور اس کے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ آتی ہو مولانا اسے تزکیہ اور احسان سے تعبیر کرتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں "میں تزکیہ کی خاص لگی بندھی اور متعین شکل پر زور نہیں دیتا جس کا رواج عام ہوا اور جس کا نام آخری دور میں تصوف پڑا[۴]

ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں کہ اہل نظر اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ذوق ومعرفت، ایمان حقیقی اور یقین، اخلاص، استقامت، تزکیہ باطن اور تہذیب اخلاق، کامل اتباع سنت، فنافی الشریعت وہ حقیقی مقاصد ہیں جن کے لئے مختلف وسائل اختیار کئے جاتے ہیں محققین ان مقاصد کے حصول کو کسی ایک وسیلہ میں منحصر نہیں مانتے"[۵]

ان مقاصد کے حصول کے لئے مولانا تصوف وسلوک کو بھی ایک وسیلہ

www.abulhasanalinadwi.org

مانتے ہیں لیکن صرف تزکیہ پر انحصار نہیں کرتے۔ فرماتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی چیزیں جیسے محاسبہ نفس، سنتوں کا تتبع، کتب حدیث وشمائل سے محبت وعظمت کے ساتھ اشتغال، کثرت نوافل ودعا کثرت درود، نیت واحتساب کیساتھ خدمت خلق، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، دعوت وتبلیغ اور جہاد وغیرہ، ان میں ایک چیز بھی استحضار واہتمام کیساتھ تقرب کا ذریعہ اور حصول نسبت کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ وسائل اگر چہ مختلف ہیں لیکن مقصود سب کا ایک ہی ہے" (وہ تزکیہ نفس ہے)

اصطلاح تصوف اور اس کا مخصوص طریقہ کار دونوں ہی پر مولانا کو کلام ہے فرماتے ہیں "یہ علم جس کا کام تزکیہ نفوس اور تہذیب ہے جو نفس انسانی کو فضائل شرعیہ سے آراستہ اور نفسانی واخلاقی رذائل سے پاک وصاف کرتا ہے "تزکیہ" یا "احسان" ہی کے نام سے جانا جاتا یا کم از کم "فقہ باطن" ہی کہتے تو شاید اختلاف ونزاع کی نوبت نہ آتی"[۷] آگے تصوف کے طریق کار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اگر اہل تصوف اس کے مقصد یعنی اصلاح نفس کے لئے جس کو ہم تزکیہ اور احسان سے تعبیر کرتے ہیں کسی خاص اور متعین راستہ یا شکل پر اصرار نہ کرتے اس کے لئے زماں ومکاں اور نسلوں کے مزاج اور ماحول کے ساتھ اصلاح وتربیت کا طریقہ اوران کے نصاب بھی بدلتے رہتے اور وسیلہ کے بجائے مقصد پر زور دیتے تو اس مسئلہ میں آج سب ایک زبان ہوتے"[۸]

مولانا فاسد العقیدہ اور نام نہاد صوفیوں کو معصوم قرار نہیں دیتے جنھوں نے اپنے عمل سے ایک اہم حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے اور بہت سے لوگوں کی راہ میں اس حقیقت کے حصول میں مانع بن گئے مولانا لکھتے ہیں "اصطلاح تصوف کے علاوہ دوسری چیز جس نے اس دینی حقیقت کو اور زیادہ غبار آلود کردیا وہ پیشہ ور، جاہ طلب، حقیقت فروش اور فاسد العقیدہ نام نہاد صوفی ہیں جنھوں نے دین میں تحریف کرنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے کے لیے تصوف کو آلہ کار بنایا اور اسکے محافظ اور علمبردار بن کر لوگوں کے سامنے آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ اہل غیرت اور اہل

www.abulhasanalinadwi.org

حمیت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان سے بدظن ہو گئی، کچھ غیر محقق صوفی ایسے تھے جو اس شعبہ کی روح اور اس کے حقیقی مقاصد سے نا آشنا تھے۔ وہ مقصد اور وسیلہ میں تمیز نہ کر سکے۔ بعض اوقات انھوں نے وسائل پر تو بہت اصرار کیا لیکن مقاصد کو نظر انداز کر دیا۔ اور اس شعبہ میں ایسی چیزیں داخل کر دیں جن کا ان سے کوئی تعلق نہ تھا، غرضیکہ اس طرح انھوں اس تزکیہ اور احسان کو رہبانیت بنا کر پیش کیا جس کی ہمت صرف وہی شخص کر سکتا تھا جو ترک دنیا اور مادی اسباب سے کنارہ کشی کا فیصلہ کر چکا ہے اور دنیا کی ساری نعمتوں سے دستبردار ہونا چاہتا ہو ظاہر ہے کہ ایسے لوگ ہر جگہ اور ہر زمانے میں بہت کم ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ یہ نہ دین کا مطالبہ نہ رسول کی سنت اور نہ ہی تخلیق انسانی کی حکمت"[9]

حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی صوفیوں کی وجہ سے اس پوری جماعت کو تنقید و نکتہ چینی کا ہدف بنایا گیا جبکہ ان میں بہت سے اللہ والے ایسے بھی تھے جنھوں نے تزکیہ کا کام منہاج نبوت اور کتاب و سنت کی روشنی میں کیا۔ امت مسلمہ میں نئی روح اور نیا ایمان پیدا کیا جن کے ہاتھوں لاکھوں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ جابر بادشاہوں اور حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہنے اور امراء و بادشاہوں کا احتساب کرنے سے گریز نہیں کیا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ جاہل، فاسد العقیدہ اور نام نہاد صوفیوں کی وجہ سے ان عارفین اور اہل اللہ کو بیجا تنقید کا نشانہ نہیں بنانا چاہئے بلکہ ہمیں ان کا احسان مند ہونا چاہئے خاص طور پر ہندوستان کے تناظر میں یہاں زیادہ تر اسلام انھیں بزرگوں کی مساعی سے پھیلا[10]

ان بزرگوں کے علاوہ مولانا کی نگاہ میں تزکیہ اور احسان کے حاملین وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے دعوت کے کام کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا جن کی کوششوں سے ہزاروں لاکھوں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ لوگ بھی ہیں جن کے تبلیغ وارشاد سے لاتعداد لوگ ایمان کی حقیقت سے آشنا ہوئے جو اگرچہ مسلمان تھے لیکن اسلام ان کی زندگیوں میں داخل نہیں ہوا تھا، وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے تاتاریوں جیسے سخت دل وحشی انسانوں میں گھسکر انکے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کیا۔ غرض یہ کہ تزکیہ کا کام جو کتاب و سنت کی روشنی میں ہو وہ صرف تصوف تک محدود نہیں بلکہ اس کے مختلف

www.abulhasanalinadwi.org

وسائل میں کسی بھی ایک کو لیکر کیا جاسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ مولانا نے جہاں ایک طرف شیخ عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، شیخ احمد سرہندیؒ، مرزا جان جاناں دہلوی، مولانا فضل الرحمٰن مراد آبادیؒ اور شیخ عبدالقادر رائپوریؒ کو تزکیہ واحسان کا علمبردار بتایا وہیں دوسری طرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ، مولانا رومیؒ، مجاہد جزائر امیر عبدالقادر محمد احمد سوڈانی، حضرت سید احمد شہیدؒ، سید جمال الدین افغانی، شیخ حسن البناء، شاملی کے میدان کے حاجی امداد اللہؒ، حضرت حافظ ضامن، مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی جیسے اہل علم وفن اور مجاہدین کو بھی تزکیہ اور احسان کے حاملین میں شمار کیا۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا کے یہاں تزکیہ نفوس کے مسئلہ میں کتنی وسعت ہے مولانا تزکیہ نفوس کی کسی ایک متعین او مخصوص شکل پر زور نہیں دیتے بلکہ اسکے اصل مقصد پر زور دیتے ہیں فرماتے ہیں کہ ہمیں اصطلاح تصوف اور طریقہ کار سے بحث نہیں البتہ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ تزکیہ واحسان کے اس خلاء کو پر کیا جائے جو آج ہماری زندگیوں میں نظر آرہا ہے۔ [۱۱]

مراجع

۱۔ آل عمران ۱۶۴

۲۔ النحل ۹۰

۳۔ بخاری کتاب الایمان، باب سوال جبرائیل علیہ السلام عن الایمان والاسلام والاحسان

۴۔ سید ابو الحسن علی ندوی، تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک ص ۲۴ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۷۹ء

۵۔ ایضاً ص ۵۱

۶۔ 〃 ص ۵۱۔۵۲

۷۔ 〃 ص ۱۶

۸۔ 〃 ص ۱۷

۹۔ 〃 ص ۱۸

۱۰۔ ماخوذ ص ۹۳۔۱۲۵

۱۱۔ ص ۲۴

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں کی ذہنی و فکری تشکیل اور قدیم و جدید علماء

ڈاکٹر محمد مسعود عالم قاسمی
ناظم دینیات اے ایم یو علی گڑھ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذہنی و فکری تشکیل میں خاندانی ماحول اور تربیت اساتذہ کے بعد بہت سے قدیم و جدید علماء اور اسکالرس کا اثر رہا ہے، ان شخصیات کے ثمرات اور اثرات کو سمیٹ کر مولانا علی میاں نے اپنی دینی و علمی زندگی کو قوت وسعت اور رفعت کا وسیلہ بنایا۔ جن شخصیات نے مولانا علی میاں کی فکری نشو نما میں موثر کردار ادا کیا وہ باہم مختلف الخیال اور مختلف الجہات ہیں مثلاً ایک طرف تو مولانا علی میاں کی فکر پر امام غزالی کا اثر ہے تو دوسری طرف ان کے ناقد امام ابن تیمیہ کا اثر ہے۔ ایک طرف وہ مجدد الف ثانی کے خوشہ چین ہیں تو دوسری طرف ان کے ناقد شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے متأثر ہیں مولانا علی میاں جہاں مولانا حسین احمد مدنی کی شاگردی کو باعث شرف سمجھتے ہیں تو وہاں ان کے نظریہ قومیت کے بڑے ناقد علامہ اقبال سے گہری اثر پذیری کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ مولانا سید ابوالاعلی مودودی کی تحریروں کا اثر قبول کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کے ناقد مولانا شیخ زکریا سے تعلق ارادت رکھتے ہیں ایک طرف وہ مولانا حمید الدین فراہی

www.abulhasanalinadwi.org

سے استفادہ کرتے ہیں تو دوسری طرف مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی کے فن حدیث کے خوشہ چین ہیں

غرضیکہ مولانا علی میاں نے معروف معنوں کسی ایک مکتب فکراور مرکز علم کے علماء اور اصحاب دانش کواپنی دینی وفکر کی بنیادنہیں بنایا بلکہ جہاں سے بھی ان کواستفادہ کا موقع ملا اسے ضائع نہیں کیا۔اور اسے تشکیل ذات کا ذریعہ بنالیا یعنی۔ع

ہم نے اپنے آشیانے کیلئے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

اس سلسلے میں مولانا علی میاں کی مثال شہد کی مکھی کی ہے جو ہر باغ اور گلشن میں جاتی ہے ہر کھیت اور کشت کا سفر کرتی ہے اور ہر پھل اور پھول پر بیٹھتی ہے ان کے مختلف اور متنوع رنگ و بو سے لطف اندوز ہوتی ہے اس سے مواد اخذ کرتی ہے اور اپنے چھتہ میں آ کر اس کا رس نچوڑ کر جمع کر دیتی ہے۔اس میں شیرینی، چاشنی، غذائیت اور شفا ہوتی ہے۔مولانا علی میاں بھی اسی طرح مختلف شخصیات کے فکر و نظر، علم و فن اور دینی جمال اور کمال سے استفادہ کر کے اپنی شخصیت کی تشکیل کرتے نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ علماء کی طرح ان کی فکراور تحریر میں تنگ نظری، محدود خیال مسلکی اور گروہی عصبیت بہت کم پائی جاتی ہے۔ان کی یہ خوبی اگرچہ بعض اہل علم کو پسند نہیں مگر سچ پوچھئے تو یہی انکی جامعیت اور مقبولیت کا راز بھی ہے۔

مولانا علی میاں جن علماء کی شخصیت اور فکر سے متاثر ہوئے کوئی ضروری نہیں کہ وہ ان کی پوری فکر سے اتفاق کرتے ہوں بلکہ جس شخصیت کا جو پہلو ان کو متاثر کرتا ہے وہ اس کو جزو زندگی بنا لیتے ہیں اور صحت مند علمی زندگی کا یہی اصول ہے'' خذ ما صفا ک ودع ما کدر ''مولانا علی میاں کی کتابوں میں ان شخصیات کے تذکرے اور ان سے استفادہ کے پہلو متفرق طور پر ملتے ہیں خاص طور پر کاروان زندگی، تاریخ دعوت وعزیمت، پرانے چراغ اور مولانا عمران خاں ندوی کی کتاب مشاہیر علماء کی محسن کتابیں اس کی وضاحت کرتی ہیں

www.abulhasanalinadwi.org

ذیل میں ان علماء اور اس فکر کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو مولانا علی میاں کی شخصیت پر اثر انداز ہوئے۔

امام غزالی : بیرون ہند کے متقدمین علماء میں غزالی، رومی ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن جوزی، وافدی کے اثرات خاص طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ امام غزالی کا تذکرہ علی میاں نے دعوت و عزیمت کی پہلی جلد میں شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے ان کی کتابوں خاص طور پر احیاء علوم الدین سے انہوں نے بہت استفادہ کیا ہے۔ مولانا اس کتاب کے تربیتی پہلو سے اس حد تک متاثر تھے کہ فضلاء کو اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے راقم نے ایک مرتبہ ان سے جب عرض کیا کہ آپکی نصیحت پر میں نے عمل تو کیا مگر اس کتاب میں کمزور احادیث کی کثرت نے دلچسپی ختم کردی تو مولانا نے کہا یہ کمزور پہلو ضرور ہے مگر تربیت کے لحاظ سے اچھی کتاب ہے۔ مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

"تاریخ اسلام میں جن چند کتابوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ اور ان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے اور جن سے اسلامی حلقے طویل عرصہ تک متاثر رہے ہیں ان میں احیاء علوم الدین کو ممتاز مقام حاصل ہے[۱]

مولانا رومی : مولانا علی میاں نے مولانا روم کی مثنوی سے بھی استفادہ کیا ہے اور اپنی شخصیت کے روحانی پہلوؤں کو اس سے جلا بخشی ہے، مثنوی کی تاثیر کو وہ ہمہ گیر اور لافانی قرار دیتے ہیں ان کے بقول "مثنوی نے عالم اسلام کے افکار و ادبیات پر بڑا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا، اسلامی ادب میں ایسی شاذ و نادر کتابیں ملیں گی جنہوں نے عالم اسلام کے اتنے وسیع حلقہ کو اتنی طویل مدت تک متاثر رکھا ہے چھ صدیوں سے مسلسل دنیاء اسلام کے عقلی، علمی ادبی حلقے اس کے نغموں سے گونج رہے ہیں اور وہ دماغ کو نئی روشنی اور دلوں کو نئی حرارت بخش رہی ہے"[۲]

مولانا نے اپنی کتاب تزکیہ احسان میں ایک باب دعوت عشق و مقام انسانیت (ص ۷۳ تا

---

[۱] تاریخ دعوت و عزیمت اول ص ۱۲۸ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء [۲] ایضاً ص ۳۶۸

www.abulhasanalinadwi.org

ص ۸۷) میں مولانا روم کی مثنوی کو فکر و خیال کا مرکز و محور بنایا ہے۔[۱]

ابن تیمیہ : ابن تیمیہ کی تحقیقی اور تنقیدی نگارشات سے مولانا علی میاں خاص طور پر متاثر ہیں۔ تاریخ دعوت و عزیمت کی دوسری جلد ابن تیمیہ کے ہی آثار و احوال پر مشتمل ہے۔ ابن تیمیہ کی فکر کے طاقت اور اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا علی میاں نے لکھا ہے کہ

"آٹھویں صدی کیلئے ایک ایسے ہی مرد کامل کی ضرورت تھی جو زندگی کے تمام میدانوں کا مجتہد ہو اور جس کی جدو جہد اور اصلاحات کسی ایک شعبہ میں محدود نہ ہوں، یہ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کی ذات تھی جس نے عالم اسلام میں ایک ایسی علمی و عملی حرارت اور زندگی پیدا کردی جس کے اثرات صدیاں گذر جانے کے بعد بھی قائم ہیں"[۲]

علامہ ابن قیم : ابن تیمیہ سے بھی کہیں زیادہ مولانا علی میاں علامہ ابن قیم الجوزیہ کی تالیفات سے متاثر نظر آتے ہیں اور ان کی تحریروں میں بھی ابن قیم کی جھلک دکھائی دیتی ہے، خاص طور پر الجواب الکافی اور زادالمعاد کا رنگ نمایاں ہے۔ زادالمعاد سے مولانا علی میاں نے بھرپور استفادہ کیا ہے اور اس حد تک اس سے متاثر ہوئے کہ اسے اپنی زندگی کا سرمایہ قرار دیا ہے اور اس کے ایک حصہ کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے مولانا کے بقول

"حافظ ابن قیم کی زادالمعاد میرا کتب خانہ میری رفیق سفر اور میرا گویا اتالیق اور معلم تھی دینیات کے کتب خانہ کی اتنی بہتر نمائندگی ایک کتاب میں ملنی مشکل ہے اگر مجھے کبھی پورے ذخیرہ علمی سے محروم کردیا جائے اور صرف دو کتابوں کی اجازت دی جائے تو میں کتاب اللہ اور زادالمعاد اپنے ساتھ رکھوں گا"[۳]

واقدی : مولانا علی میاں کی ابتدائی زندگی پر جن کتابوں کا نقش مرتسم ہوا ان میں ایک نام واقدی کی فتوح الشام کا بھی ہے واقدی کی عربی کتاب فتوح الشام کا منظوم اردو ترجمہ عبدالرزاق کلامی صاحب نے کیا تھا جو مولانا علی میاں کے گھر میں پڑھی جاتی تھی، ابتدائی

---

[۱] تزکیہ و احسان ص ۸۷-۷۲ لکھنؤ ۱۹۷۹ء [۲] تاریخ دعوت و عزیمت ۲/۱۱ [۳] مولانا عمران خاں ندوی، مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۷۳، معارف پریس اعظم گڑھ

www.abulhasanalinadwi.org

عمر میں مولانا کے ذہن پر اس کتاب کا جو اثر مرتب ہوا آخری عمر تک قائم رہا مولانا نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

فتوح الشام کی ان زندہ مجلسوں نے دل پر یہ اثر چھوڑا کہ مجاہدین کی محبت وعظمت اور اللہ کی راہ میں جان دینے کی قیمت کو کوئی نئی علمی تحقیق اور جہاد کو مدافعانہ ثابت کرنے کی کوئی کوشش کم نہیں کر سکی خون کے نقش کو سیاہی کے وہ نقوش نہیں مٹا سکے جو لیٹے لیٹے یا آرام سے بیٹھے بیٹھے کاغذ پر ثبت کیے جائیں پھر وہ جس کو بچپن کے پاک آنسوؤں نے بیداری بخشی ہو۔ [1]

محمد بن نصر مروزی : مولانا علی میاں نے مروزی کی کتاب قیام اللیل کا اثر جس طرح قبول کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”ابتدائے شباب میں جو کتابیں فرشتہ رحمت بن کر سامنے آئیں ان میں سب سے زیادہ موثر اور محسن کتاب محمد بن نصر مروزی کی کتاب قیام اللیل ہے، اس کتاب کا خاص کام یہ ہے کہ عقلی او استدلالی طریق سے نہیں بلکہ قلبی اور ذاتی طور پر دلچسپی اور شوق کا رخ بدل دیتی ہے اور سارا کھیل دلچسپی اور انس کا ہی ہے اس کتاب میں شب بیدار نوجوانوں کے ایسے موثر واقعات لکھے ہیں اور قرآن مجید کی بعض آیات کی اتنی پراثر تفسیر اور قیام لیل کے فضائل جمع کیے ہیں جو اگر کسی خوش قسمت نوجوان کو آغاز شباب میں مل جائیں اور اپنا اثر کر جائیں تو ایک شیخ کامل کی بیعت سے کم نہیں [2]

ڈاکٹر احمد امین : جدید مصنفین میں مولانا علی میں نے جن شخصیات کا اثر قبول کیا ان میں ڈاکٹر احمد امین کا نام نمایاں ہے مولانا نے ان سے اثر پذیری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”میرا مطالعہ بھی جو ابھی تک تفسیر وحدیث اور تاریخ وادب کے دائرہ میں محدود تھا ۳۸-۳۷ سے یہ مطالعہ اپنے خول سے باہر نکل آیا تھا۔ ڈاکٹر احمد امین کی کتابوں فجر الاسلام، ضحی الاسلام (۱-۲-۳) کے سلسلے اور بعد میں ظہر الاسلام پھر ان کی کتاب زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث (جو بڑی شگفتہ وسنجیدہ زبان میں لکھی گئی ہے) کے اسلوب اور تحلیل وتجزیہ کی خوبی نے مجھے بہت متاثر کیا [3]

---

۱ مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۵۸ ۲ مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۷۳ ۳ کاروان زندگی ۱/۲۳۰

www.abulhasanalinadwi.org

<u>شکیب ارسلان</u> : دوسرے فضلائے عرب میں امیر شکیب ارسلان اور عبد الرحمان الکواکبی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی تحریروں کا مولانا علی میاں کے فکری افق کے دائرہ کو بڑھانے میں نمایاں کردار رہا ہے بقول مولانا علی میاں امیر شکیب ارسلان کی حاضر العالم الاسلامی کے پر از معلوم اور اسلامی روح سے معمور حواشی، عبد الرحمان الکواکبی کی فکر انگیز کتاب موتمر ام القری اور الفتح کے ولولہ انگیز مضامین نے فکر و نظر میں وسعت پیدا کی اور ہندوستان سے باہر نکل کر عالم اسلام اور اس کے مسائل اور تحریکات سے دلچسپی لینے کا سامان پیدا کیا[1]

<u>عبد الرحمٰن الکواکبی</u> : الکواکبی کے فکری اثر کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا علی میاں رقم طراز ہیں۔ امت اسلامیہ کے حقیقی امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز میں جس شخص کے خیالات وافکار میں سب سے زیادہ بلند نظری اور باریک بینی معلوم ہوئی اور جس کی فراست نے متاثر کیا وہ سید عبد الرحمٰن الکواکبی کی تمثیلی کتاب ام القری ہے جو اب پرانی ہو چکی ہے اور اس کے لائق مصنف کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔

<u>امام حسن البنا شہید</u> : مولانا علی میاں تحریک الاخوان المسلمون اور اس کے بانی امام حسن البنا سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے مولانا کی امام حسن البناء سے ملاقات تو نہ ہو سکی مگر ان کی فکر اور شخصیت کے جن اثرات کا انہوں نے مطالعہ اور مشاہدہ کیا اس کا حاصل ان کی زبانی یہ ہے۔

ان کی شخصیت تاریخ کی ان غیر معمولی شخصیتوں میں سے تھی جن کو اللہ تعالی کسی تحریک دعوت کو چلانے اور کسی عہد میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کیلئے پیدا فرماتا ہے اور اس کو قیادت کی وسیع اور متنوع صلاحیتیں عطا فرماتا ہے۔ وسیع اور روشن دماغ، گرم و پر محبت و دردمند دل، فصیح و بلیغ زبان، تسخیر کرنے والے اخلاق، دل آویز شخصیت یہ ان کے عناصر ترکیبی تھے میں جب اقبال کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو بے ساختہ شیخ حسن البناء کی شخصیت آنکھوں کے سامنے

---

[1] ایضاً

www.abulhasanalinadwi.org

آ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے انہی کو دیکھ کر کہا ہے۔

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے ![1]

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی: مولانا علی میاں الاخوان المسلمون کی شخصیات میں ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی جو شامی پارلیامنٹ کے اسپیکر بھی تھے کے گرویدہ تھے ان سے دوستانہ مراسم بھی تھے اور علمی کام سے متاثر بھی ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے ۔

''۱۹۵۵ء کی آخری تاریخوں میں فاضل گرامی اور اپنے عزیز و محترم دوست ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کا خط ملا جن سے شام کے قیام کے دوران دوستانہ اور برادرانہ روابط قائم ہو گئے تھے وہ میری کتاب کے بڑے قدرداں تھے اور میں ان کی محققانہ و مومنانہ تصنیف السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی سے جو اپنے موضوع پر منفرد تصنیف ہے بہت متاثر تھا''[2]

علامہ محمد اسد: مغربی تاریخ و افکار کے مطالعہ میں مولانا علی میاں نے جن شخصیات کا اثر قبول کیا ان میں نومسلم علامہ محمد اسد کا نام نمایاں ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ اسی زمانے میں نومسلم فاضل محمد اسد صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب Islam on the Cross road تقریباً سبقاً سبقاً پڑھی اور ان کے پراز اعتماد اقدامی طرز تحریر، مغربی تہذیب کے پوسٹ مارٹم اور اس کے اسلامی تہذیب کے تضاد پھر سنت کی طاقت و رحمایت سے دل و دماغ متاثر ہوئے [3]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں، مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کے حقیقی نقائص اسلامی تہذیب سے اس کے اصولی و بنیادی تضاد اور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پر مغز چیز محمد اسد صاحب کی کتاب اسلام دوراہے پر معلوم ہوئی جس کا لفظ لفظ دل نشین ہوا [4]

مولانا علی میاں نے درسی کتابیں اپنے اساتذہ سے پڑھیں اس تعلیم و تعلم نے ان کی دینی فکر کی اساس بنائی اور انکی شخصیت میں اہلیت اور وقعت پیدا کی۔ ان اساتذہ میں شیخ خلیل عرب

---

[1] کاروان زندگی اول ص ۲۷۷ [2] ایضاً ص ۴۱۸ [3] ایضاً ص ۲۳۱ [4] مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۷۸

www.abulhasanalinadwi.org

علامہ تقی الدین، مولانا احمد علی، مولانا حیدر حسن اور مولانا حسین احمد کے نام نمایاں ہیں۔

شیخ خلیل بن محمد بن حسین مدنی : شیخ خلیل عرب کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے کہ میری عربی زبان وادب کی تعلیم اور اس کا ذوق یکسر شیخ خلیل بن محمد بن حسین مدنی کا رہین منت ہے ان کو یمنی خصائص کا ایک بڑا حصہ وراثت میں ملا تھا اور ان کے رگ و پے میں ساری اور جاری تھا [۱]

شیخ خلیل نے مولانا علی میاں کے اندر عربی زبان وادب کا ہی ذوق پیدا نہیں کیا بلکہ قرآن اور اس کے نکتہ توحید کو بھی دلنشین کرایا بقول مولانا علی میاں ''توحید ان کا ذوقی مضمون ہے دل کھول کر پڑھایا اور دل کو توحید کیلئے کھول دیا وہ دن ہے اور آج کا دن اللہ کا ہزار شکر ہے کہ الا للہ الدین الخالص (سورہ زمر) کا نقش قائم ہے [۲]

علامہ تقی الدین ہلالی : مولانا کے عہد طالب علمی میں عربی زبان وادب کے محقق و عالم علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں استاد بن کر تشریف لائے جسے علی میاں تاریخ ساز واقعہ قرار دیتے ہیں اور ان سے بھرپور استفادہ بھی کرتے ہیں مولانا نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔ علامہ موصوف عربی زبان کے ان گنے چنے اساتذہ اور فضلا میں ہیں جو سند کا درجہ رکھتے ہیں ان کے امتیاز کیلئے اتنی شہادت کافی ہے کہ جب علامہ رشید رضا صاحب مدیر المنار اور علامہ امیر شکیب ارسلان مصنف حاضر العالم الاسلامی کا نحو عربیت کے کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا تو دونوں ہلالی صاحب کو حکم (ثالث) بناتے [۳]

میں نے بے ضابطہ طریقہ پر تو ان سے بہت استفادہ کیا روزانہ ان کی خدمت میں حاضری دیتا اور انکی صحبتوں اور مجلسوں سے فائدہ اٹھاتا لیکن باقاعدہ طور پر دیوان نابغہ ان سے پڑھا اور ان کے افادات نوٹ کئے شرح شذور الذہب کی ایک جماعت میں جس کو وہ اپنے گھر میں پڑھاتے تھے شریک ہوا ان کی ایک تصنیف کردہ ناتمام تفسیر بھی ان سے پڑھی [۴]

مولانا احمد لاہوری : علی میاں کی دینی فکر میں جن اساتذہ کا اثر ہے ان میں مولانا احمد علی

---

۱ کاروان زندگی ۳/۳۰ ۲ مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۶۴ ۳ کاروان زندگی ۱/۱۱۶ ۴ ایضاً ص ۱۱۷

www.abulhasanalinadwi.org

لاہوری کا نام بھی نمایاں ہے۔مولانا علی میاں نے مدرسہ کی تعلیم حاصل کرنیکے بعد قران کی تعلیم وتدریس خصوصی طور پر ان کی خدمت میں لاہور جا کر حاصل کی۔مولانا علی میاں نے بار بار ان کا عقیدت سے تذکرہ کیا ہے مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی کی مجلس درس کا فیض اور برکت شامل ہے'' ۱؎

دوسری جگہ لکھتے ہیں'' اگر مولانا احمد علی لاہوری سے ملاقات نہ ہوتی تو میری زندگی اچھی یا بری بہر حال موجودہ زندگی سے بہت مختلف ہوتی اور شاید مجھ میں ادب وتاریخ اور تصنیف وتالیف کے سوا کوئی ذوق اور رجحان نہ پایا جاتا خداشناسی اور خدارسی، راہ یابی و راست روی تو بڑی چیزیں ہیں'' ۲؎

سید احمد سرہندی : مولانا علی ہندوستانی بزرگوں میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی سے خصوصیت کے ساتھ متاثر ہوئے ان کے مکتوبات کے مجموعہ نے علم ومعرفت اور دین وعقیدہ کی بہت سی گرہیں کھولیں اور قرآن وسنت کے نظام پر ان کا یقین مستحکم کرنے میں مدد کی مولانا لکھتے ہیں

اس کے چاروں دفتر پڑھے لفظ بلفظ دل لگا او رلطف لیکر پڑھے۔استعدادی قوت، قوت مطالعہ کی کمی اور علوم عقلیہ وآلیہ کی بے بضاعتی قدم قدم پر عناں گیر رہی لیکن ایک عامی کے حصہ میں جو کچھ آیا اس پر اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے۔ع ''آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف است''۔علم کا نیا عالم آنکھوں کے سامنے آگیا وحی نبوت کی قطعیت، مقام نبوت ومنصب رسالت کی بلندی وبرتری اور خصائص نبوت وانبیاء اور نبوت وولایت کے لوازم وما بہ الامتیاز چیزوں کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں اس پر دقت فکر کے لحاظ سے یونان وعجم کا پورا فلسفہ سو بار قربان اور وجد آفرینی اور کیف آوری کے لحاظ سے شعراء دواوین اور ادب کی بیاض ہزار بار نثار ۳؎

۱؎ مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۸۶ ۲؎ پرانے چراغ ص ۱۳۴ ۳؎ مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۸۲

www.abulhasanalinadwi.org

شاہ ولی اللہ دہلوی : مولانا علی میاں شاہ ولی اللہ کی فکر انگیز کتابوں اور ان کی دینی تحریک سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے ان کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اپنی کتابوں میں ان کے حوالے بکثرت دیئے ہیں خاص طور پر ارکان اربعہ کی اساس شاہ صاحب ہی کے فکر پر استوار معلوم ہوتی ہے ۔ مولانا لکھتے ہیں کہ

'' انسانی تصنیفات میں کم کتابوں سے اتنا متاثر ہوا ہوں گا جتنا کہ مکتوبات اور ازالۃ الخفا سے علم کا چشمہ ابلتا نظر آتا ہے آدمی ایک نکتے کا لطف نہیں لے پاتا کہ تیسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے ؎۲

حجۃ اللہ البالغہ کے بارے میں لکھتے ہیں '' دماغ پر اس کی عقلیت محکم استدلال اور شاہ صاحب کی باریک بینی کا اثر اسی سے قائم ہوا، حجۃ اللہ البالغہ سے علمی واصولی مباحث اور متکلمانہ وفلسفہ آمیز دینی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی اور اس حیثیت سے اس نے بڑا احسان کیا ؎۳

سید احمد شہید : سید احمد شہید مولانا علی میاں کی عقیدت کا مرکز خاص تھے، ان سے علمی روحانی اور نسبی تعلق کو بڑی اہمیت دیتے تھے ان کی سوانح دو جلدوں میں لکھی اور ان مقامات کا سفر کیا جہاں سید احمد نے جہاد کیا تھا ان کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں ۔

'' کیفیات ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا آچکے ہیں لیکن ایمان و یقین اور خلوص وللہیت کی ایسی باد بہاری ہمارے علم میں کم از کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی، نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر عزم وتوکل اور جوش و جہاد، ایمان و احتساب شوق شہادت اور یقین آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے آدم گری اور مردم سازی اصلاح و انقلاب کے ایسے محیر القول واقعات بھی اصلاح و تربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں '' ؎۴

شاہ اسماعیل شہید : سید احمد شہید کا جب ذکر آتا ہے تو شاہ اسماعیل شہید کا ذکر یقیناً آتا

؎۲ ایضاً ص ۱۸۴ ؎۳ ایضاً ص ۱۸۴ ؎۴ سیرت سید احمد شہید ۱/ ۱۶۹

www.abulhasanalinadwi.org

ہے خانوادہ ولی اللہی کے اس چشم و چراغ نے اپنی علمی قابلیت کے ساتھ ذوق شہادت کا جو مظاہرہ کیا وہ آج بھی ہمارے دلوں میں تابندہ ہے بقول مولانا علی میاں

"شاہ اسماعیل شہید کی عقیدت خاندانی ورثہ ہے لیکن ان کی شہرہ آفاق اور مسلم ذکاوت اور وفور علم کا اندازہ صرف منصب امامت سے ہوا جو اس موضوع پر میرے محدود علم میں اپنے طرز کی منفرد تصنیف ہے" ۱؎

الطاف حسین حالی : علامہ حالی کی کتاب "مسدس" ایک زمانہ تک مسلمانوں کی نئی نسل کی تعلیم و تربیت میں غیر معمولی اثر انگیز رہی ہے اور اسکی افادیت آج بھی کم نہیں ہے مولانا علی میاں اس کتاب سے بچپن میں متعارف ہوئے اور اس کے اشعار کو زبانی یاد کر کے اپنی دینی تربیت کا سامان کرتے رہے وہ کہتے ہیں دل و دماغ پر مسدس کا اچھا خاصا اثر رہ چکا ہے عام استعداد کے علاوہ اس کا ایک احسان یہ تھا کہ برسوں بعد مغربی مؤرخین و مصنفین کی یہ کوشش بالکل بے اثر رہی کہ جاہلیت عرب کی اتنی مدح سرائی کی جائے اور اس میں اگر خوبی کے کچھ ذرات تھے تو ان کو خوردبین سے دیکھ کر پہاڑ بنا کر اس طرح پیش کیا جائے کہ معلوم ہو کہ عربوں میں اخلاقی انقلاب کی پوری تیاری تھی اور کوہ آتش فشاں پھٹنے کو تیار تھا کہ موقع شناسی سے بروقت اس کو چنگاری دکھا دی گئی" ۲؎

مولانا عبدالحی : مولانا اپنے والد سے کم سنی کے باعث علمی استفادہ نہ کر سکے مگر ان کے علمی سرمایہ سے بھرپور فیض اٹھایا ان کے بقول ۔

"علمی طور پر کسی کتاب کے مواد اور علمی ذخیرہ سے اتنا استفادہ نہیں کیا اور مضامین اور تحریروں میں کسی سے اتنا کام نہیں لیا جتنا کہ نزہۃ الخواطر کی ان ضخیم آٹھ جلدوں کی تاریخی معلومات سے جن کی تلاش کیلئے تاریخ و تصوف کی کتابوں کے ہزاروں صفحات دیکھنے کی نہ توفیق تھی نہ فرصت اور نہ یہ اندازہ کہ ان کو کہاں تلاش کرنا چاہئے اور کس جگہ وہ دستیاب ہو سکتے ہیں ۱؎

۱؎ مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۸۴ ۲؎ ایضاً ص ۵۹ ۱؎ مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۸۰

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا حمید الدین فراہی : مولانا فراہی کے بارے میں علی میاں فرماتے ہیں کہ میں مولانا حمید الدین فراہی کے مکتب فکر اور ان کی تصنیفی و فکری دانش گاہ کا ایک حقیر طالب علم ہوں اور آپکے سامنے پوری دیانت اور صداقت کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ میں اپنی زمانہ طالب علمی میں بھی اور جب مجھے دار العلوم ندوۃ العلماء میں شعبہ تفسیر میں تدریس کا موقع دیا گیا تو قرآن مجید کے ایک خادم کی حیثیت سے تفسیر کا درس مجھ سے متعلق کیا گیا تو اس وقت میں نے بہت عمیق سنجیدگی اور محنت کے ساتھ مولانا کی تصنیفات کا مطالعہ کیا اور اس سے پورا استفادہ کیا ، جب ۱۹۵٦ء میں مجھے دمشق یونیورسٹی کی طرف سے دعوت دی گئی تو میں مولانا کی کتابیں اپنے ساتھ لے گیا اور خاص طور پر جمہرۃ البلاغۃ جس سے میں تاریخ ادب عربی اور عربی ادب کے ایک طالب علم اور کام کرنے والے ایک غور کرنے والے طالب علم کی حیثیت سے بہت متاثر تھا'' ۲؎

مولانا تھانوی : مولانا تھانوی سے استفادہ کا علی میاںؒ نے متعدد مواقع پر ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں اگست ۱۹۳۸ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے اور چالیس روز قیام فرمایا یہ نہ صرف اہل لکھنؤ بلکہ دور نزدیک اضلاع کے لئے بھی ایک نعمت غیر مترقبہ تھی کہ مولانا عرصہ سے سفر ترک فرما چکے تھے اور طالبین و مخلصین کے لئے تھانہ بھون جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا مگر اب کنواں خود پیاسے کے پاس آ گیا تھا اور معالج روحانی جسمانی علاج کے لئے مریضوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ ا؎

قاضی محمد سلیمان منصور پوری : مولانا علی میاں کے اندر سیرت رسولؐ سے شفقت اور انس پیدا کرنے میں اور سیرت و کردار کو رخ دینے میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری کا بڑا دخل ہے مولانا نے اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے ۔

''قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی کتاب رحمۃ للعالمین کا بڑا گہرا اثر پڑا مجھے یاد ہے کہ کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ میں جب والدہ صاحبہ کی تیمارداری اور خدمت کیلئے مقیم تھا۔ اس کا

۲؎ علامہ حمید الدین فراہی ،حیات و افکار ص ۲۱ سرائے میر اعظم گڑھ ۱۹۹۲ء

www.abulhasanalinadwi.org

خیال کئے بغیر کہ کالج کے طلبہ پروفیسر اور مریضوں کے تیاردار کیا رائے قائم کریں گے اور کس نظر سے دیکھیں گے رحمۃ للعالمین کھولے ہوئے سڑک پر ٹہل ٹہل کر وجد و تاثر کی کیفیت میں پڑھتا تھا[1] ایک دوسرے موقع پر اس کتاب کی اثر انگیزی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''قاضی سلیمان صاحب کے درجات اللہ بلند فرمائے اس عالم میں ہوتے تو کہتا کہ آپ کی کتاب کا مجھ پر بڑا احسان ہے اس نے سب سے پہلے سرور کائنات ﷺ کی محبت کے اس مزہ سے آشنا کیا جس کے بغیر یہ زندگی خاک اور عالم خش و خاشاک ہے

در خزین کائنات کردیم نگاہ　　　یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ[2]

<u>مولانا ابوالکلام آزاد</u>: مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر و تقریر کا ان کے عہد میں جو شہرہ اور اثر تھا اس نے ہزاروں ذہن و دماغ کو اپنی گرفت میں رکھا تھا مولانا علی میاں بھی مولانا آزاد کی تحریروں سے متاثر ہوئے مولانا لکھتے ہیں۔

''مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکرہ سے امام احمد بن حنبل اور محدثین کی عمومی عظمت دل و دماغ پر قائم ہوئی تذکرہ اور الہلال کے ادبی سحر جلال نے محسور کیا' ترجمان القرآن کے دوسری جلد سے تفسیر و فہم قرآن کی بعض نئے گوشے سامنے آئے اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی''[3]

<u>مولانا حسین احمد مدنی</u>: مولانا علی میاں اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ مولانا حسین احمد مدنی سے متاثر تھے ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب بھی ان کے شاگرد تھے اسی وجہ سے یہ تعلق گہرا ہو گیا تھا مولانا کے بقول۔

'' دارالعلوم دیوبند اس چار ماہ میں میری دل بستگی کا سامان اور میرے انس و عقیدت کا مرکز مولانا مدنی کی ذات تھی اور اصل مناسبت انہی سے تھی میں نے کئی سال کے بعد دیوبند سے نکلنے والے ایک عربی رسالہ میں ایک مضمون صلتی بمولانا حسین احمد المدنی اور صفحہ من صفحات حیاتی کے عنوان سے لکھا تھا جس میں اپنے قلبی تاثرات اور عینی مشاہدات کا تذکرہ کیا تھا[4]

---

[1] کاروان زندگی ۱/ ۱۷۳　[2] کاروان زندگی ۱/ ۲۷۹　[3] مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۶۱　[4] مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۷۸

www.abulhasanalinadwi.org

علامہ اقبال : ہندوستان کے شعراء میں مولانا علی میاں علامہ اقبال سے بہت متاثر ہوئے ان کی نظموں کا ترجمہ بھی کیا اوران پر متعدد عربی مقالات لکھے جن کا مجموعہ روائع اقبال یا اردو نقوش اقبال ہے مولانا لکھتے ہیں ۔

"علامہ مرحوم کی وفات کے بعد مصر میں پڑھے جانے کیلئے ایک مفصل وطویل مضمون علامہ مرحوم کی زندگی وخصوصیات پر لکھا اشعار ورد زبان تھے اوران کی کتابیں ہر وقت کی ہمدم وہم نشیں، پھر تنبہ ہوا کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفتگی اچھی نہیں محسوس ہوا کہ ذوق قرآن مجید کے اشتغال پر غالب آرہا ہے، رفتہ رفتہ دوسرے مشاغل اور ذوق اس پر غالب آئے لیکن اب بھی ان کے اشعار خون میں تموج اور جذبات میں حرکت پیدا کرتے ہیں ۔[1]

مولانا مودودیؒ : مولانا مودودی کی تحریروں نے مولانا علی میاں کے فکر وذہن اور تحریر وبیان کی جس طرح تربیت کی اس کا اظہار مولانا علی میاں نے متعدد جگہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں ۔

اسی زمانے میں رسالہ ترجمان القرآن میں جو اب لاہور سے نکلنے لگا ہے مولانا سید ابوالاعلی مودودی صاحب کا مضمون 'آنے والا انقلاب'' پڑھا اور ذہن نے اسکا تاثر قبول کیا اور جن خطرات کی انہوں نے نشاندہی کی تھی ،واقعات کے سیاق وسباق میں ان کا قریبی امکان نظر آیا اوران سب چیزوں نے ذہن کی ساکن فضا پر ایک تموج پیدا کردیا اور فطرت کی بعض خوابیدہ صلاحیتوں کے پیدا ہونے میں مدد کی۔[2] ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں ۔

"مولانا ابوالاعلی مودودی کے ترجمان القران کے مضامین نے طرز استدلال اور طرز تحریر پر بڑا اثر ڈالا اوران کی تحریروں نے ذوق وفکر کو متاثر کیا" [3]

مولانا مناظر احسن گیلانی : مولانا مناظر احسن گیلانی نے تذکیر بسورۃ الکھف نامی کتاب لکھی اسی عنوان پر مولانا علی میاں نے معرکہ ایمان ومادیت لکھی ۱۹۴۶ء میں مولانا گیلانی کے یہاں مولانا علی میاں نے قیام کیا اوران سے استفادہ کیا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

---

[1] مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۸۱ [2] کاروان زندگی ۱/ ۲۳۱ [3] مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۷۷

www.abulhasanalinadwi.org

"مولانا کی باقاعدہ شاگردی کی سعادت سے محروم رہا لیکن ان کو اپنے اساتذہ شیوخ میں سمجھتا رہا اور وہ بھی ہمیشہ مجھے اپنا ایک عزیز بھائی سمجھتے رہے اور بہت شفقت و تعلق کا معاملہ فرماتے رہے ان کے اس مقالہ میں نکات علمی، بلیغ اشارات اور لطائف قرانیہ کا جو قیمتی ذخیرہ ہے اس سے مجھے بڑی مدد ملی"۔ ۱ اور اسی خیال کا اظہار کاروان زندگی میں بھی کیا ہے ۲

ڈاکٹر عبدالعلی : مولانا علی میاں کے والد کا انتقال مولانا علی میاں کی کم عمری میں ہوا، انکی جگہ انکی تعلیم و تربیت ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب نے کی جو فاضل دیو بند بھی تھے اور ایم بی بی ایس ڈاکٹر بھی، بقول مولانا جب تقدیر الہی نے ۱۹۵۱ء میں مشرق وسطی کے سفر کا سامان کیا تو اس وقت اپنے مربی اور ولی نعمت مولوی حکیم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی فراست اور دور بینی اور دینی بصیرت کی قدر آئی کہ انہوں نے میرے لئے یہ راستہ انتخاب کیا اور مجھے تعلیم و تعلم کے مروجہ طریقوں سے الگ کر کے عربی زبان و ادب اور عربی تحریر و انشا اور خطابت کے ذریعہ عالم عربی کو خطاب کرنے اور انکو بضاعتکم ردت الیکم کہہ کر جھنجھوڑنے اور ان کے جذبات خوابیدہ کو بیدار کرنے کی سعادت حاصل کرنے کا موقع دیا ۳

مولانا عبدالماجد دریابادی : مولانا عبدالماجد دریابادی کی شگفتہ تحریروں نے مولانا علی میاں کی ابتدائی زندگی سے لیکر دور معلمی تک رہنمائی کی، مغربی تہذیب و تاریخ پر ناقدانہ نظر اور قران کے ان مقامات کی تفسیر جو اہل کتاب کی تاریخ سے متعلق ہیں میں مولانا علی میاں نے مولانا دریابادی سے بھرپور استفادہ کیا مولانا لکھتے ہیں کہ اب وہ زمانہ آیا کہ میرا ذہن پختگی کی منزلیں طے کرنے لگا بڑے بھائی صاحب کی صحبت میں مغربی تہذیب کی سطحیت اور موجودہ تمدن کا کھوکھلا پن نمایاں ہونے لگا اس موقع پر "سچ" کے پرچے جو ندوہ کی طالب علمی اور مولانا سے روز افزوں تعلق کی بنا پر باقاعدہ مطالعہ میں آنے لگے تھے بڑی رہنمائی کرنے لگے۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

---

۱ معرکہ ایمان و مادیت ص ۶ ۲ کاروان زندگی ۱/۲۱۵ ۳ ایضاً ص ۲۵۴ ۱ پرانے چراغ

www.abulhasanalinadwi.org

"میں اپنے درس میں سورہ بقرہ میں ہاروت و ماروت کے قصہ وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا کی آیت پر پہونچا تو مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ مولانا کی تحقیقات و مطالعہ سے استفادہ کرلوں غالباً سبق روک کر میں پہلی مرتبہ دریاباد اس مقصد سے گیا، مولانا نے قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اور دوسری مرتبہ تعلقات کی بنا پر بھی بڑی شفقت فرمائی میں وہاں سے سوالات کے جوابات اور بہت سا قیمتی مواد لیکر آیا یہ اتفاق غالباً کئی بار پیش آیا کہ مجھے جب کوئی ایسی مشکلات پیش آئیں تو میں دریاباد کا قصد کرتا یا مولانا کو خط لکھتا مولانا ہمیشہ جواب شافی سے مدد فرماتے" ۲

مولانا عبدالشکور فاروقی صاحب : لکھنؤ کے مخصوص شیعہ سنی ماحول میں مولانا عبدالشکور کا مقام ناقابل فراموش ہے مولانا علی میاں بھی ان سے متاثر ہوئے وہ کہتے ہیں ۔

"اللہ تعالے نے صحابہ کرام کی سینوں کے دل میں عظمت پیدا کرنے ان کے حقوق و مقام سے آشنا کرنے اور شیعیت کے اثرات کو دور کرنے کے سلسلے میں (جو سلطنت اودھ کے اثرات سے اودھ کے گھر گھر پھیلے ہوئے تھے) ان سے تجدید کی خدمت لی مجھے خاص طور پر ان کی جس ادا نے فریفتہ کیا اور ان کا معتقد بنایا وہ اولاً ان کی سادگی تواضع اور بے نفسی تھی، دوسرے ان کا حقانی و ربانی وعظ جو علماء سلف کی طرح لفاظی اور تصنع سے پاک، عقیدہ کی اصلاح ، فرائض کی پابندی اور تذکیر بالآخرۃ پر مشتمل ہوتا تھا ۳

مولانا عبدالقادر رائے پوری : مولانا علی میاں مولانا عبدالقادر رائے پوری سے صرف متاثر ہی نہیں بلکہ ان کے مرید اور مجاز بھی تھے اور اپنے دوستوں اور شاگردوں کو بھی ان سے بیعت ہونے کی تلقین کرتے تھے وہ کہتے ہیں ۔

"تقسیم کے بعد سے پاکستان جانے اور اپنے قدیم مرکز روحانی سے تعلق پیدا کرنے کی راہ میں جو دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں انہوں نے اور بھی اس کی ضرورت پیدا کردی کہ دل کی انگیٹھی کو گرم رکھنے، نفس و اخلاق کی کمزوریوں پر مطلع ہونے اور جس سفر کا میں مسافر تھا دعوت

---

۲ پرانے چراغ ۱۵۰/۲ ۳ کاروان زندگی ص ۲۵۳

www.abulhasanalinadwi.org

وتصنیف اس کیلئے زاد سفر لیتے رہنے کے لئے ایک ایسی ہی جگہ اور ایسی ہی شخصیت کی ضرورت تھی جہاں یہ جنس ملتی ہو۔رائے پور جا کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ مادیت وعقلیت کے بحر ظلمات میں جو چاروں طرف پھیلا ہوا ہے یہی ایک جزیرہ ہے جہاں ذکر وفکر کے علاوہ کوئی موضوع گفتگو اور مشغلہ زندگی نہیں اور جہاں پتہ پتہ سے اللہ اللہ کی آواز آتی ہے۔ باطنی کمالات کا ادراک نہ اس وقت تھا نہ اس وقت لیکن حضرت کی تین خصوصیتوں نے خاص طور پر متاثر کیا ایک فنائیت و بےنفسی دوسرے ذہن کی وسعت اور حقیقت پسندی تیسری بے پایاں شفقت[۱]

مولانا محمد الیاس :

مولانا علی میاں نے تبلیغی جماعت کے بانی مولانا الیاس ؒ سے ملاقات کو اپنی زندگی کے دو اہم موڑ میں سے ایک شمار کیا اور ان کے علم وبصیرت اور طریقہ کار کا گہرا اثر قبول کیا ہے ،وہ لکھتے ہیں:۔

" اس عصر کے عارف مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی (۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء) سے ملاتو ان کی باتیں اور ان کے معارف سمجھنے میں نسبتاً سہولت ہوئی ،حسن الفاظ حسن ادا کا خیال، زمانے کی زبان اور علمی اصطلاحات کی تلاش مقصود سمجھنے میں حجاب نہ بن سکی میں نے ایک موقع پر عرض کیا کہ اگر میں نے حضرت سید احمد شہید کے حالات نہ لکھے ہوتے اور حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات نہ پڑھے ہوتے تو مجھے آپ کی باتوں سے بڑی وحشت ہوتی[۱]

شاہ محمد یعقوب مجددی : شیخ محمد یعقوب کے بارے میں مولانا علی میاں لکھتے ہیں۔

مشائخ عصر میں سب سے زیادہ دینی مناسبت بھوپال کے حکیم و عارف شیخ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی ؒ سے تھی دل را بدل رہیست ۔ مجھے بھی حضرت کے ارشادات و ملفوظات میں تصوف و احسان کے لطیف نکتوں نادر تحقیقات کے ماسوا بھی ،زندگی کے عمیق مطالعہ، مسلمانوں کے مختلف طبقوں سے گہری واقفیت اور ان کی کمزوریوں اور مغالطوں کی نشاندہی،

---

[۱] ایضاً ص ۳۵۳ [۲] مشاہیر علماء کی محسن کتابیں ص ۱۸۶

www.abulhasanalinadwi.org

اصلاح باطن کی ضرورت کو اس زمانے کے طبائع و اذواق کے مطابق بیان کرنے اور اس کو ایک بدیہی حقیقت اور ضرورت ثابت کرنے، شکستہ دلوں کی تسکین اور مثالوں اور چھوٹی چھوٹی حکایتوں کے نمونے نظر آئے جن کی مثال کم سے کم اس دور مادیت اور رسمیت میں نہیں دیکھی[۱]

مولانا زکریا کاندھلوی :

ہم عصر علماء و محدثین میں مولانا محمد زکریا کاندھلوی سے بھی مولانا علی میاں متاثر ہوئے اور اخذ استفادہ کیا ان کے بقول۔

مولانا عبدالقادر رائے پوری اور مولانا احمد علی لاہوری کے سوا سب سے زیادہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے تعلق تھا، رائے پور آنے جانے ان کی خدمت میں قیام ضروری تھا، شیخ کی جامعیت نے بے پایاں شفقت اور علمی مناسبت جس میں ایک خورد و خوشہ چیں تھا دوسرا بزرگ محقق و محدث عصر نے اس ربط و تعلق میں اضافہ کر دیا تھا[۲]

---

[۱] کاروان زندگی ۱/۳۴۳ [۲] ایضاً ص ۳۴۲

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے افکار عالی

مولانا محمد رضوان القاسمی
ناظم دار العلوم سبیل السلام
حیدر آباد (دکن)

مفکر اسلام مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی کتابوں میں ایک اہم کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ہے۔ مولانا کی یہ کتاب فکر انگیز ہی نہیں انقلاب انگیز بھی ہے، خصوصیت کے ساتھ کتاب کا آخری "باب ہفتم" جس کا عنوان ہے "عالم اسلام زندگی کے میدان میں" نہایت اہم، معنی خیز اور چشم کشا ہے، یہاں اس کے بعض اقتباسات ملاحظہ فرمایئے...... عصر حاضر میں مسلمانوں کو اولین فرصت میں جو کام مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرتے رہنا چاہیئے اس پر مولانا روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"آج عالم اسلامی کے قائدین و مفکرین اور اس کی جماعتوں اور حکومتوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کا تخم دوبارہ بونے کی کوشش کریں، جذبۂ دینی کو پھر متحرک کریں۔ اور پہلی اسلامی دعوت کے اصول و طریق کار کے مطابق مسلمانوں کو ایمان کی دعوت دیں اور اللہ و رسول اور آخرت کے عقیدہ کی پوری طاقت کے ساتھ دوبارہ تبلیغ و تلقین کریں اس کے لئے وہ سب طریقے استعمال کریں جو اسلام کے ابتدائی داعیوں نے اختیار کئے تھے، نیز وہ تمام وسائل اور طاقتیں کام میں لائیں جو عصر جدید نے پیدا کر دی ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت اب بھی زندگی اور طاقت کا ایسا سرچشمہ ہے جس سے عالم اسلام کی خشک رگوں میں زندگی کا گرم اور تازہ خون پھر دوڑ سکتا ہے، ان کے مطالعہ اور اثر سے اس جاہلی دنیا کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرتا ہے اور ان کی تاثیر سے ایک اونگھتی سوتی قوم ایک پر جوش بے چین اور سرگرم عمل قوم بن جاتی ہے"۔(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ص ۳۴۳)

مباض وقت کی حیثیت سے عالم اسلام کی اصل بیماری کی نشاندہی کرتے ہیں:۔

"موجودہ عالم اسلام کی بیماری، پریشانی اور بے اطمینانی نہیں ہے، بلکہ حد سے بڑھا ہوا اطمینان و سکون دنیا کی زندگی پر قناعت اور حالات سے مصالحت ہے، آج دنیا کا عالمگیر فساد اور انسانیت کا زوال اور ماحول کی عریانی اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں پیدا کرتی، اس کو زندگی کے اس نقشہ میں کوئی چیز غلط اور بے محل نظر نہیں آتی، اس کی نظر اپنے ذاتی مسائل اور مادی فوائد سے آگے نہیں بڑھتی، اس کی موجودہ افسردگی اور مردہ دلی کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کا پہلو خلش سے اور اس کا دل تپش سے خالی ہے ۔

طبیب عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی

اس لئے ضرورت ہے کہ یہ مبارک کش مکش پھر پیدا کی جائے اور اس امت کا سکون برہم کیا جائے، اس کو اپنی ذات اور اپنے مسائل کی فکر کے بجائے (جو جاہلی قوموں کا شعار ہے) انسانیت کا درد و غم، ہدایت و رحمت کی فکر اور آخرت اور محاسبہ الٰہی کا خطرہ پیدا ہو، اس امت کی خیر خواہی اس میں نہیں ہے کہ اس کے لئے سکون و اطمینان کی دعا کی جائے بلکہ اس میں ہے کہ اس کے لئے درد و اضطراب کی دعا کی جائے اور برملا کہا جائے ۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ص ۳۴۵)

مسلمانوں کے عروج کا راز کیا ہے؟ فرماتے ہیں:۔

www.abulhasanalinadwi.org

"اگر عالم اسلامی کی خواہش ہے کہ نئے سرے سے وہ اپنی زندگی شروع کرے اور غیروں کی غلامی سے آزاد ہو، اگر وہ عالم گیر قیادت حاصل کرنا چاہتا ہے تو صرف تعلیمی خود مختاری ہی نہیں بلکہ علمی لیڈر شپ بھی بہت ضروری ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں، مسئلہ بہت گہرے غور و فکر کا محتاج ہے اس کے لئے ضرورت ہے کہ وسیع پیمانے پر تصنیف و تالیف اور علوم کی تدوین جدید کا کام شروع کیا جائے، اس کام کے سربراہ کار عصری علوم سے اتنی واقفیت اور گہری بصیرت رکھتے ہوں جو تحقیق و تنقید کے درجہ تک پہنچتی ہو اور اس کے ساتھ اسلام کے اصلی سرچشموں سے پورے طور پر سیراب اور اسلامی روح سے ان کا قلب و نظر معمور ہو، یہ وہ مہم ہے جس کی تکمیل کسی جماعت یا انجمن کے لئے مشکل ہوگی، یہ اسلامی حکومتوں کا کام ہے، اس مقصد کے لئے اس کو منظم جماعتیں اور مکمل ادارے قائم کرنے ہوں گے اور ایسے ماہرین فن کا انتخاب کرنا ہوگا جو ہر فن میں دست گاہ رکھتے ہوں، وہ ایسا نصاب تعلیم تیار کریں جو ایک طرف کتاب سنت کے محکمات اور دین کے ناقابل تبدیل حقائق پر مشتمل ہو اور دوسری طرف مفید عصری علوم اور تجزیہ و تحلیل پر حاوی، ہو وہ مسلمان نوجوانوں کے لئے علوم عصریہ کی از سرنو تدوین کریں جو اسلام کے اصولوں اور اسلام کی روح کی بنیاد پر ہو، اس میں ہر ایسی چیز ہو جو نو خیز طبقہ کے لئے ضروری ہو اور جس سے وہ اپنی زندگی کی تنظیم کر سکے اور اپنی سالمیت کی حفاظت کر سکے وہ مغرب سے مستغنی ہو اور مادی و دماغی جنگ میں اس کے مقابلے میں آسکے، اپنی زمین کے خزانوں سے فائدہ اٹھائے اور اپنے ملک کی دولتوں کو استعمال میں لائے، اسلامی ملکوں کی مالیات کی نئی تنظیم میں یورپ پر اسلامی

تعلیمات کے ماتحت اس طرح چلائے کہ طرز حکومت اور مالیاتی امور کی تنظیم میں یورپ پر اسلامی نظام کی برتری صاف ظاہر ہو جائے اور وہ اقتصادی مشکلات حل ہو جائیں جن کے حل کرنے کے معاملہ میں یورپ سپر ڈال چکا ہے اور اپنی بے بسی کا معترف ہے۔

اس روحانی، صنعتی اور فوجی تیاری اور تعلیمی آزادی کے ساتھ عالم اسلامی عروج حاصل کر سکتا ہے، اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے اور دنیا کو اس تباہی سے نجات دلا سکتا ہے جو اس کے سر پر منڈلا رہی ہے، قیادت ہنسی کھیل نہیں نہایت سنجیدہ معاملہ ہے اور منظم جدوجہد مکمل تیاری، عظیم الشان قربانی اور سخت جانفشانی کا محتاج ہے"۔(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ص ۲۵۳،۲۵۲)

مولانا ایک اہم رائے یہ دیتے ہیں :۔

"عالم اسلامی کی طرح عالم عربی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تجارت، مالیات، صنعت وحرفت اور تعلیم میں پورے طور پر آزاد اور خود کفیل ہو، وہاں کے رہنے والے انہیں چیزوں کا استعمال کریں جو ان کی زمین کی پیداوار اور ان کی صنعت و محنت کا نتیجہ ہوں، زندگی کے ہر شعبہ میں وہ مغرب سے مستغنی ہوں۔ اپنی تمام ضروریات، مصنوعات، غذا، لباس، ہتھیار، مشینیں، آلات حرب کسی چیز میں وہ غیر کے دست نگر اور مغرب کے پروردہ رحمت اور نمک خوار نہ ہوں"۔(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ص ۳۶۲)

تعلیم وتربیت کے جو لوگ ذمہ دار ہیں ان کا یہ فرض بتاتے ہیں :۔

"تعلیم وتربیت کے ذمہ داروں کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر ایسی چیز کا مقابلہ کریں جو مردانگی وشجاعت کی روح کو کمزور کر رہی ہو اور عجز و تخنث پیدا کرتی ہو، عریاں صحافت نگاری، فحش اور ملحد ادب کی روک تھام کریں جو نوجوانوں میں نفاق، بے حیائی، فسق وفجور اور شہوت پرستی کی تبلیغ کر رہا ہو، ان پیشہ وروں کو رسول اللہ ﷺ کے فوجی کیمپ میں نہ داخل ہونے دیں، جو نسل اسلامی کے قلب واخلاق میں فساد برپا کرنا چاہتے

www.abulhasanalinadwi.org

اور فسق و معصیت اور فحش پسندی کو چند حقیر پیسوں کے لئے خوبصورت اور مزین بنا کر پیش کرتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کسی قوم میں مردانگی اور غیرت انسانی کو زوال ہوا، عورتوں نے اپنی نسائیت اور فطرت مادری کے خلاف بغاوت کی اور آزادی و بے حجابی کی راہ اختیار کی ہر چیز میں مردوں کی مسابقت کی کوشش کی، خانگی زندگی سے نفرت و غفلت بڑھی اور ضبط تولید کی رغبت پیدا ہوئی، اس کا ستارہ اقبال غروب ہوا اور رفتہ رفتہ اس کے نشانات بھی مٹ گئے، یونانی، رومی اور ایرانی اقوام کا انجام یہی ہوا اور یورپ بھی آج اسی راہ پر گامزن ہے، جو اس انجام تک لے جاتی ہے۔ عالم عربی کو ڈرنا چاہئے کہ کہیں اس کا انجام بھی ایسا نہ ہو" (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص ۳۶۱، ۳۶۰)

مولانا اہل اسلام کو خود غرضی اور انانیت کے خول سے نکلنے کی دعوت دیتے ہیں:

"خود غرضی اور انانیت شخصی ہو یا خاندانی، جماعتی ہو یا طبقاتی قوم کی، زندگی کے لئے ایک غیر طبعی چیز ہے جس سے اس کو پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ نہ اسلام میں اس کی کوئی جگہ ہے، نہ اس بیدار سوسائٹی میں جو بلوغ اور سن رشد کو پہنچ گئی، مسلمانوں کے لئے اور عربوں کے لئے اور ان کے رہنماؤں اور حکمرانوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اس سے آزاد ہو جائیں اور اس سے اپنا تعلق منقطع کر لیں قبل اس کے کہ وہ اپنے ساتھ ان کو بھی لے ڈوبے" (انسانی دنیا پر مسلمانوں کا عروج و زوال کا اثر ص ۳۴۹)

مولانا کے نزدیک عیش و عشرت، غیر ضروری لوازم زندگی کا اہتمام اسراف، فضول خرچی، بربادی، تباہی اور بہت سارے فتنوں کا موجب ہے، فرماتے ہیں:۔

"عربوں کو مغربی تہذیب کے اثر سے اور بہت سے دوسرے اسباب

کی بنا پر عیش و عشرت، غیر ضروری لوازم زندگی کے شدید اہتمام، اسراف، لذت و خواہش اور فخر و آرائش کے لئے فضول خرچی کی عادت پڑ چکی ہے، اس عیش و تنعم اور بے دردی کے ساتھ خرچ کے پہلو بہ پہلو فقر و فاقہ اور عریانی بھی موجود ہے جب ایک شخص بڑے بڑے عرب شہروں پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور سر شرم سے جھک جاتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ ایک طرف وہ آدمی ہے جس کو اپنی ضرورت سے زائد غذا لباس کا مصرف نظر نہیں آتا دوسری طرف اس کی نگاہ ایسے بدوی پر پڑتی ہے جس کو ایک روز کا کھانا اور ستر پوشی کے لئے کپڑا بھی نصیب نہیں جب عرب کے امراء واصحاب ثروت ہوا سے باتیں کرنے والی موٹروں پر سرگرم سفر ہوتے ہیں، اسی وقت چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے بچوں اور بچیوں کی ایک فوج سامنے آتی ہے جن کا لباس تار تار ہوتا ہے جو ایک پیسہ کے لئے ان کی موٹروں کے ساتھ دوڑنے لگتی ہیں۔

جب تک عرب ملکوں میں فلک بوس محلوں، بہترین کاروں کے ساتھ ساتھ حقیر جھونپڑیاں اور تنگ و تاریک مکانات نظر آئیں گے جب تک تخمہ و فاقہ ایک شہر میں شباب پر ہوگا اس وقت تک کمیونزم کے لئے دروازے کھلے ہوئے ہیں، ہنگامے جھگڑے ہونا لازمی ہیں، کوئی پروپیگنڈا اور طاقت اس کو روک نہیں سکتی، وہاں اگر اسلامی نظام اپنے جمال واعتدال کے ساتھ قائم نہیں ہوگا تو تعزیر خداوندی کے طور پر اور رد عمل کے طریقہ پر اس کی جگہ ایک ظالم و جابر نظام کا قائم ہونا ضروری ہے"۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص ۳۶۱،۳۶۲)

قومی زندگی میں "صحیح شعور" کی کیا اہمیت ہے؟ اس پر اظہار خیال کرتے

www.abulhasanalinadwi.org

ہوئے فرماتے ہیں :

"کسی قوم کے لئے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ صحیح شعور سے خالی ہو، ایک ایسی قوم جو ہر طرح کی صلاحیتیں رکھتی ہو اور دینی و دنیاوی دولتوں سے مالامال ہو لیکن اس کو نیک وبد کی تمیز نہ ہو وہ اپنے دوست و دشمن کو نہ پہچانتی ہو، پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کی اس میں صلاحیت نہ ہو اپنے رہنماؤں اور قائدین کا احتساب کرنے کی اور قومی مجرموں کو سزا دینے کی اس میں جرأت نہ ہو وہ خود غرض رہنماؤں کی چرب زبانی وشیریں کلامی سے مسحور ہو جاتی ہو اور ہر مرتبہ نیا دھوکا کھانے کے لئے تیار رہتی ہو، وہ قوم اپنی تمام دینی ترقیات اور دنیاوی سرفرازیوں کے ساتھ قابل اعتماد نہیں، وہ پیشہ ور اور خود غرض رہنماؤں اور منافق قائدین کا کھلونا بن جاتی ہے ان کو قوم کی سادہ لوحی اور بے شعوری کی بنا پر من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع ملتا ہے اور ان کو اس کا اطمینان ہوتا ہے کہ کبھی ان کا محاسبہ اور ان سے باز پرس نہیں کی جائے گی"

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ص ۳۳۶، ۳۳۵)

"اس لئے عالم اسلام کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ اس میں صحیح شعور پیدا کیا جائے، ایسا شعور جو نہ کسی ظلم و ناانصافی کو برداشت کر سکے، یہ دین واخلاق سے انحراف کو جو صحیح اور غلط، خلوص اور نفاق، دوست اور دشمن، مصلح اور مفسد کے درمیان آسانی سے تمیز کر سکے، مجرم اس کی ناراضگی اور عتاب سے بچ نہ سکیں اور مخلص اس کے اعتراف اور قدرشناسی سے محروم نہ رہیں، وہ اپنے تمدنی سیاسی اجتماعی اور دینی مسائل ومعاملات میں ایک عاقل وبالغ انسان کی طرح غور کر سکے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جب تک یہ شعور نہ پیدا ہو، کسی اسلامی ملک وقوم کا جوش عمل صلاحیت کار دینی جذبات اور مذہبی زندگی کے مظاہر ومناظر کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے"

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ص ۳۴۴)

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کل امت میں حکمت ودانشمندی کی کمی ہے اور مزاج میں جذباتیت داخل ہو گئی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا علی میاں مولانا عبد

www.abulhasanalinadwi.org

الکریم پاریکھ صاحب کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"آپ نے صحیح لکھا ہے کہ امت کے پاس سب کچھ ہے مگر حکمت ودانشمندی کی کمی ہے، جذباتیت مزاج میں داخل ہوگئی ہے اور خیر خواہوں کی بات نہ ماننا طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔اس موقع پر قرآن مجید میں ایک نبی کے درد میں ڈوبے الفاظ اکثر یاد آتے ہیں کہ " وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَكِنْ لاَّ تُحِبُّوْنَ النَّاصِحِيْنَ " (الاعراف۔ ۷۹) (اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی لیکن تم تو خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے تھے)

(مولانا علی میاں کے خطوط، مولانا عبدالکریم پاریکھ کے نام، ص ۱۳۰)

مولانا پاریکھ ہی کے نام ایک دوسرے خط میں مولانا نے انضباط وقت کی تلقین فرمائی ہے کیونکہ کوئی بھی کام خواہ بڑا ہو یا چھوٹا، انضباط وقت کے بغیر تکمیل نہیں پاسکتا۔ مولانا زور دے کر لکھتے ہیں :

"اپنے اوقات کو ضرور منضبط کیجئے اور ملاقات کا ایک وقت مقرر کر دیجئے اور میری طرح کہہ دیا کیجئے کہ اگر حضرت خضر بھی آئیں تو ان کو ٹھالیا جائے ہم فلاں وقت ہی مل سکتے ہیں"۔(مولانا علی میاں کے خطوط مولانا عبدالکریم پاریکھ کے نام ص ۹۹)

نبی آخر الزماں محمد ﷺ اپنے ۲۳ سالہ دور نبوت میں "توحید" اور "اتحاد" پر بطور خاص زور دیتے رہے جس سے یہ پیغام ملتا رہا ہے کہ توحید جس قدر مضبوط ہوگی اتحاد اس قدر مستحکم ہوگا۔ مولانا علی میاں اپنی تقریر، تحریر اور عمل سے ان دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرتے رہے۔ فرماتے ہیں :

"نوع انسانی کی تاریخ میں سب سے پہلی جو وحدت نظر آتی ہے وہ گھرانوں کی وحدت ہے، قبیلہ کی وحدت ہے، قوم ونسل کی وحدت، ہے نام ونسب کی وحدت ہے پھر اس کے بعد آگے بڑھ کر دنیا نے جب ذرا اور ترقی کی تو زبان کے اشتراک کی وحدت ہے، جسے ہم لسانی وحدت کہتے ہیں پھر تہذیبی وثقافتی وحدت ہے ان وحدتوں میں سب سے زیادہ جس وحدت سے امید ہونی چاہیئے تھی وہ تہذیبی وثقافتی وحدت ہے کہ تہذیب وثقافت کو مردم آزاری اور آدم بیزاری سے کیا تعلق ؟ تہذیب وثقافت کے

www.abulhasanalinadwi.org

معنی یہ ہیں کہ غلط فہمیاں رفع ہوں، آدمی آدمی کو سمجھے اس کے ساتھ انصاف کرے اس کی مجبوریاں معلوم کرے اس کی کمزوریاں معلوم کرے اس کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو اس کے ادب و شاعری سے واقفیت کا ذوق پیدا ہو، تہذیب و ثقافت کی وحدت کے اندر جارحیت کا پہلو اور اس کے اندر انسانوں کو ذلیل کرنے یا انسانی تہذیب کے خلاف حملہ آور ہونے کا پہلو تو ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانوں کی زندگی مختلف قسم کے تناقضات (CONTRADICTIONS) کا مجموعہ ہے اس کو سمجھنا بڑا مشکل ہے ہمارا موجودہ علم نفسیات بھی اس کے لیے کافی نہیں ہے انسان کے اندر ایک دوسرا انسان پیدا ہو جاتا ہے انسان کے کچھ ایسے مقاصد بن جاتے ہیں جو دوسرے انسانوں کے لیے مہلک ہوتے ہیں ان مقاصد کی تعمیر بعض اوقات دوسرے انسانوں کے مقاصد کے ملبہ پر ہی ہو سکتی ہے، اس کے کھنڈروں پر ہی یہ عمارت تعمیر ہو سکتی ہے کوئی فلسفہ زندگی ایسا ہو جو انسان کی تباہی اور انسان کے مفتوح ہونے اور شکست کھانے ہی سے بنتا، ابھرتا، پھلتا اور پھولتا ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

اسلام نے ان مصنوعی وحدتوں کے معاملے میں دو حقیقی وحدتوں کو تسلیم کیا اور ان کی دعوت دی ہے۔ یہ دنیا کی معصوم ترین، غیر مضر ترین، مثبت اور تعمیری وحدتیں ہیں۔ ایک وحدت انسانی اور ایک وحدت ایمانی، وحدت انسانی تو یہ کہ پوری نسل انسانی ایک آدم کی اولاد ہے اور حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ایسے معجزانہ الفاظ میں اس پر مہر لگادی کہ اس سے زیادہ انسانی مساوات کا کوئی منشور یا چارٹر نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ " ان ربکم واحد و ان اباکم واحد " اے انسانو! تمہارا رب بھی ایک ہے۔ اور تمہارا باپ بھی ایک ہے وحدت اب اور وحدت رب دو وحدتیں ہیں جو ہر انسان کو ملی ہیں اس کے جسمانی وجود کا آغاز ایک انسانی وجود سے ہوتا ہے، بڑا ہو چھوٹا ہو، کسی زبان کا بولنے والا ہو کسی سطح کا انسان ہو سب کا سلسلۂ نسب ایک انسان پر ختم ہوتا ہے اور وہ نسل انسانی کے باوا آدم ہیں اور "ان ربکم واحد "اور تمہارا پیدا کرنے والا اور پرورش کرنے والا بھی ایک ہے، ان دو مختصر لفظوں میں وحدت انسانی

www.abulhasanalinadwi.org

کا وہ اعلان کیا گیا ہے جس سے زیادہ وسیع، عمیق اور جس سے زیادہ قابل فہم کوئی اعلان نہیں ہو سکتا، یہ دونوں وحدتیں جو انسان کو ملی ہیں انسان کو ایک دوسرے سے منسلک اور وابستہ کیے ہوئے ہیں نسل انسانی کا مورث ایک اور نسل انسانی کا خالق مربی اور رازق ایک، اس لیے ہر شخص ایک دوسرے کا بھائی ہے اور دو رشتوں سے بھائی ہے ایک باپ کے رشتہ سے اور ایک پیدا کرنے والے کے رشتہ سے، باپ کا ذکر پہلے اس لیے کیا کہ یہ حقیقت سب سے زیادہ عام فہم ہے اور اس کو سب مانتے ہیں، زبان نبوت نے اعلان کیا کہ نسل انسانی کا مورث اعلی ایک ہے اس کا پیدا کرنے والا اور اس کی پرورش کرنے والا رب بھی ایک ہے، اور اس کی پرورش کا سلسلہ جاری ہے یہ وہ وحدت انسانی ہے جس کا اعلان حجۃ الوداع کے موقع پر کیا گیا، یہ ایک عالمگیر خطبہ تھا جس کی مخاطب پوری نوع انسانی تھی یہ ایک شہادت تھی جو ایک نبی دے رہا ہے اور ایک طرح کا اعلان تھا جو خاتم الانبیاء کر رہے تھے" (دعوت فکر و عمل ص ۳۷ تا ۴۰)

مولانا نے حیدر آباد کی ایک تقریر میں فرمایا تھا:۔

"کامیابی کسی چیز کی مصنوعی صورتوں کو اختیار کرنے سے نہیں ہوتی بلکہ اصل چیز دلی جذبہ ہے جو کامیابی کے لیے نہایت ضروری ہے قوموں کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے دو چیزیں نہایت اہم ہیں (۱) خطرے کا احساس اور (۲) مقصد سے وابستگی، مثلاً اگر ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہوں کہ کسی چیز کو آگ لگ گئی ہو اور شعلے بھڑک رہے ہوں تو فطری طور پر ہم اپنے تمام اختلافات کو فراموش کر کے فوری متحدہ طور پر آگ بجھانے کی فکر میں لگ جائیں گے" (اتحاد امت ص ۱۰)

یاد رکھیے! آپس کے اتحاد کے لیے ایک دوسرے کو چپکانے والی اور ملانے والی مادی شیئ آج تک دنیا میں ایجاد نہیں ہوئی بلکہ اتحاد ملت اللہ کی توفیق اور اس کا خاص انعام ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تبارک و تعالی نے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا" لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ (الانفال ۶۳)

www.abulhasanalinadwi.org

(اے نبی! اگر آپ ساری دنیا کے خزانے بھی خرچ کر دیتے تو ان صحابہ کے قلوب میں الفت (اتحاد اور محبت و یگانگت) نہیں پیدا کر سکتے تھے لیکن اللہ ہی نے اپنے فضل و کرم سے بطور انعام و احسان) ان میں آپس میں الفت (اتحاد) پیدا فرمادیا) ظاہری طور پر اگر کوئی چیز اتحاد کے لیے محرک ہو سکتی ہے تو وہ خطرہ کا احساس ہے جب خطرے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے تو انسان خود بخود متحد ہو جاتا ہے ہم جو ہندوستان میں آپسی انتشار کا شکار ہو کر ایک دوسرے کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں وہ خطرے کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے ہی ہے" (اتحاد امت ص ۱۱-۱۰)

"یہاں حالت یہ ہے کہ اگر کسی فرد کو دوسرے فرد سے یا جماعت کو دوسری جماعت سے ایک فیصد بھی اختلاف ہو تو سو فیصد مخالفت کی جاتی ہے افسوس کہ ہم میں کردار کشی اور کسی کی عزت کو خاک میں ملا دینے کا مذموم جذبہ پروان چڑھ رہا ہے اس کے بر خلاف ہماری ہمسایہ قوم میں یہ بات ہمارے مقابلے میں چوتھائی بھی نہیں مثلا گاندھی جی سے اختلاف کے باوجود انہیں ذلیل کرنے بدنام کرنے اور گرانے کی کوشش نہیں کی گئی خاص طور سے ہماری صحافت کا یہ بہت بڑا عیب ہے کہ وہ مخالفت میں حدود سے تجاوز کر جاتی ہے۔

ایک ایسی ملت جو اپنے اندر اخلاق حسنہ کی ایک عظیم تاریخ رکھتی ہو اس کی یہ افسوسناک صورتحال ہے کہ ذرا بھی کسی فرد یا جماعت سے ناپسندیدگی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو کسی رعایت کے بغیر آگ کی طرح اس کی مخالفت کی جاتی ہے کسی قیادت شخصیت یا ادارے کا احترام اور اس کی افادیت کو تسلیم کرنا مفقود ہوتا جارہا ہے، اس سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں اس ملک میں ایسے حالات پیدا نہ ہو جائیں کہ ہم اچھوت کی طرح ہو جائیں، اجتماعی طور پر آپس میں ایک دوسرے کا تعاون کرنے کی صلاحیت مسلمانوں سے ختم ہوتی جارہی ہے ذرا سا کسی کو ابھرتا ہوا دیکھیں تو اس کی مخالفت میں سارا زور خرچ کر دینا ہمارا وطیرہ بن گیا ہے، ایسا بھی نہیں کہ کوئی شدید بنیادی اختلاف اور ٹکراؤ پیدا ہو رہا ہو بلکہ صرف نظریاتی اختلاف ہی کو بنیاد بنا کر فساد پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ماحول سے

www.abulhasanalinadwi.org

آنکھیں بند کر لینا اور فضا کو ہموار کرنے کی کوشش نہ کرنا ہماری عادت سی بن گئی ہے ہم نہ حالات کو سمجھنا چاہتے ہیں اور نہ ملکی نقطہ نظر سے کبھی اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ہم اس ملک کو کچھ دے بھی سکتے ہیں، ہمارا حال ایک جزیرے کا بلکہ جزیروں میں جزیرے کا سا ہو گیا ہے ملت اسلامیہ خود ایک جزیرہ اور پھر جزیروں میں جزیرہ بن کر رہ گئی ہے ہر ادارہ ہر پارٹی بلکہ ہر انجمن ایک جزیرہ بن گئی ہے (اتحاد امت ص ۱۱ تا ۱۳)

ہمارے تعصب کا عالم یہ ہے کہ ہم اپنی جماعت یا اپنے لوگوں کے علاوہ کسی دوسری جماعت یا فرد کو کوئی کریڈٹ دینا نہیں چاہتے، خواہ وہ کتنا ہی مفاد ملت کا کام کرے ملت اصل ہے ملت کی مثال دریا کی ہے اور جماعتیں گویا لہریں ہیں میں یہاں سے لے کر مصر تک گیا ہوں لیکن سب میں جماعتی تعصب دیکھا سوائے اخوان المسلمین کے کہ اس کا حال البتہ یہ ہے کہ قطع نظر اس کے کہ یہ ہماری جماعت کا آدمی ہے یا نہیں صرف مسلمان ہونے کی بنا پر ملتے اور ایک دوسرے کا اکرام کرتے ہیں لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ کسی جماعت کے بانی سے ہمارے خیالات کی کتنی مطابقت ہے اگر مطابقت نہیں ہے تو دل کھلتا نہیں" (اتحاد امت ص ۱۵)

مسلم آبادی میں دینی مدارس کی ضرورت واہمیت پر مؤرخانہ مدبرانہ اور حکیمانہ انداز میں روشنی ڈالتے ہیں :۔

"اگر دین اور اس کے شرعی نظام کی ضرورت ہے اور مسلمانوں کو محض ایک قوم بن کر نہیں بلکہ ایک صاحب شریعت و کتاب قوم بن کر رہنا ہے تو مذہب کے محافظین و حاملین اور شریعت کے ترجمان و شارحین کی ضرورت ہے اور اگر ان کی ضرورت ہے تو لامحالہ ان مرکزوں اور اداروں کی ضرورت ہے جو ایسے اشخاص پیدا کر سکتے ہیں اور یہ ضرورت مسلمانوں کی ہر قومی ضرورت سے اہم ہے۔

خلافت راشدہ کے طرز کی اسلامی سلطنت میں بھی دینی مدارس اور تربیت گاہوں کی ضرورت ہے تاکہ امت کے اسلامی جسم میں ہر دم تازہ خون پہنچتا رہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ جس نظام کی پشت پر ایسا ادارہ یا تربیت گاہ نہ ہو جو اس قسم کے اشخاص

www.abulhasanalinadwi.org

پیدا کرتا ہے جو اس نظام کو چلا سکیں اگلوں کی جگہ لے سکیں اور اس مشین میں فٹ ہو سکیں اس نظام کی جڑیں ہمیشہ کھوکھلی اور اس کی عمر ہمیشہ کم ہوتی ہے۔

اگر برائے نام اسلامی سلطنت بھی ہے تو بھی ایسے اداروں کی ضرورت ہے تاکہ حکومت کو اپنے ذمہ دارانہ عہدوں کے لیے دین دار امین اور مسلمانوں کی ضرورت سمجھنے والے کارکن مل سکیں۔

لیکن اگر کسی ملک میں بدقسمتی سے اسلامی حکومت نہ ہو تو وہاں ایسے اداروں کی ضرورت شدید تر ہو جاتی ہے اگر کوئی جماعت کسی صحیح اسلامی حکومت کی کچھ نہ کچھ قائم مقامی کر سکتی ہے اور حفاظت دین کا فرض انجام دے سکتی ہے تو وہ صرف جماعت علماء ہے، چنانچہ اسی نکتہ کی وجہ سے اسلامی سلطنت کے زوال کے وقت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خاندان نے اسلامی تعلیم اور دینی درس و تدریس کا نظام قائم کیا جس نے بڑی حد تک ایک اچھی اسلامی ریاست کی دینی ضرورتیں پوری کیں اہل بصیرت جانتے ہیں کہ عملی حیثیت سے اسلام ہندوستان میں ان ممالک سے بہتر حالت میں ہے جہاں برائے نام اسلامی سلطنت موجود ہے مگر دینی آزاد مدارس کا کوئی نظام یا خاندان ولی اللہی کی شان کے علماء نہیں پیدا ہوئے۔

جب ہندوستان میں حکومت مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا اور مسلمانوں کا سیاسی قلعہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا تو بالغ نظر اور صاحب فراست علماء نے جابجا اسلام کی شریعت و تہذیب کے قلعے تعمیر کر دیئے انہیں قلعوں کا نام عربی مدارس ہے اسلام انہیں قلعوں میں پناہ گزیں ہے۔ اور اس کی ساری قوت و استحکام انہیں قلعوں پر موقوف ہے۔" (میر کارواں ص ۱۶۹۔۱۷۰)

مسلم آبادی میں جہاں یہ ضرورت ہے کہ دین کا علم تحقیقی اور تفصیلی طور پر حاصل کرنے کی سہولت دین کی اپنی زبان (عربی) میں رہے اور اس کا اجتماعی بندوبست ہو اس کے ساتھ دین کی بنیادی تعلیم بھی ہر مسلمان مرد اور عورت کی ضرورت ہے اس ضرورت پر مولانا اپنے مخصوص انداز میں اظہار خیال فرماتے ہیں:۔

"حضرات! اس کے ساتھ ساتھ ہمارا فرض ہے کہ ہم مسلمانوں میں دینی شعور بیدار کریں آپکی ذمہ داری ہے کہ مسلمانوں میں دینی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا کریں ہماری آئندہ نسلیں ارتداد کے خطرہ میں مبتلا ہیں، تہذیبی اور ذہنی ارتداد تو بالکل کھلی سی بات ہے لیکن اعتقادی ارتداد کا خطرہ بھی سر پر آگیا ہے آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ قصبات میں گاؤں مین شہروں میں محلوں میں گھروں اور برادریوں میں بچوں کو دینی تعلیم دینے کی ضرورت کا احساس پیدا کریں مدارس اور مساجد قائم کریں، شبینہ اور صباحی مدارس و مکاتب قائم کردیں اور ان کا جال بچھادیں۔ میں اس موقعہ پر اپنی ایک گزشتہ تقریر کا اقتباس پیش کروں گا جو میں نے کچھ عرصہ پہلے دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم پر کی تھی۔

"اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ ملت کے لئے صرف ایک پوسٹر بنانا ہے اور صرف ایک جملہ کی گنجائش ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں تو میں کہوں گا" مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ" لکھ دو پوسٹر کے نیچے لکھو کہ ہر مسلمان اپنی اولاد سے دنیا سے جانے سے پہلے سوال کرے اور جب تک دنیا میں ہے اپنا جائزہ لے محاسبہ کرے کہ اس کے نزدیک اس کی اہمیت ہے یا نہیں؟ وہ اپنے بچوں کے لئے اپنی آئندہ نسل کے لئے یہ اطمینان کرنا ضروری سمجھتا ہے یا نہیں کہ "مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ" (میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے) میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم اور آپ سب اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور یہ دیکھیں کہ واقعی اس سوال کی ہمارے یہاں اہمیت ہے یا نہیں؟ اور یہ سوال افراد کے پیمانہ پر خاندان کے پیمانہ پر برادری کے پیمانہ پر معاشرہ کے پیمانہ پر محلہ کے پیمانہ پر قصبہ کے پیمانہ پر اور آخر میں میں کہتا ہوں کہ ملت کے پیمانہ پر

www.abulhasanalinadwi.org

اور ملت ہندیہ اسلامیہ کے پیمانہ پر ہمارے دلوں پر نقش ہے یا نہیں؟ ہماری آئندہ نسل ہمارے بعد کس راستہ پر چلے گی وہ کس گروہ وملت کی پیرو ہوگی کس کی پرستش کرے گی، کن عقائد کو مانے گی یہ خدائے واحد کی پرستار ہوگی یا سیکڑوں ہزاروں لاکھوں کروڑوں خداؤں اور دیوتاؤں کی یہ اس وسیع کائنات میں اور اپنی محدود زندگی میں کس کے دست قدرت کو کام کرتا ہوا دیکھے گی اور مانے گی۔

(ماخوذ از خطبہ صدارت علاقائی دینی تعلیمی کانفرنس الہ آباد منعقدہ ۱۷/فروری ۱۹۸۵ء مشمولہ رسالہ آئندہ نسلوں کے اسلام کی ضمانت اور ایمان کی حفاظت کی ذمہ داری شائع کردہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ص ۲۲۔۲۳)

ہر مسلمان کو دین کی بنیادی حقیقتوں اور تعلیمات سے باخبر اور آشنا رہنے کی یہی وہ بات ہے جسے ہندوستان میں جدید اور نئی تعلیم کے معمار سر سید احمد خاں نے اپنے "مدرسۃ العلوم" (جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہوا) کی بنیاد رکھتے ہوئے کہا تھا:

"فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا تاج سر پر (موج کوثر ص ۱۴۶)

سر سید احمد خاں مرحوم نے اپنی ایک تقریر میں مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے بطور خاص یہ بھی کہا تھا:۔

"یاد رکھو! سب سے سچا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو ہماری قوم نہ رہے، پھر اگر تم آسمان کے تارے ہوگئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہوگے اور جب ہی ہماری قوم کی عزت ہوگی" (حیات جاوید ص ۲۱۵)

اس حقیقت سے باخبر حضرات بے خبر نہیں ہیں کہ ہمارا ملک ہندوستان

www.abulhasanalinadwi.org

انگریز کی غلامی سے طویل لڑائی کے بعد آزاد ہوا ہندوستان میں مختلف مذاہب اور اقوام و ملل سے وابستہ افراد جو رہتے اور بستے ہیں ان کی رعایت کرتے ہوئے سب لوگوں کے لیے قابل قبول ایک سیکولر اور جمہوری دستور بنایا گیا لیکن مفادات حاصلہ تنگ نظری اور عصبیت کے شکار جو لوگ آئیں، اور دستور میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں مولانا ان کے اس رجحان کو ہندوستان کے لیے نہایت خطرناک قرار دیتے ہیں وہ فرماتے ہیں :۔

"ملک کے ابتدائی اور مخلص رہنماؤں نے ملک کے لئے جو تین بنیادی اصول طے کئے تھے وہی اس ملک کے لئے بقا اور سلامتی کی ضمانت ہے

۱۔ایک جمہوریت

۲۔دوسرے نامذہبیت۔SECULARISM

۳۔اور عدم تشدد۔ اگر ان کے خلاف ورزی کی گئی تو ملک تباہ ہو جائے گا

(مولانا علی میاں کے خطوط مولانا عبدالکریم پاریکھ کے نام ص ۳۶۰۔۳۶۱)

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :

"ملک کا جو سیاسی اور انتظامی مستقبل نظر آرہا ہے وہ عمومی طور پر ملک کیلئے اور خصوصی طور پر ملت اسلامیہ کیلئے بڑا اندیشناک اور تشویش انگیز ہے۔

جن قائدین نے ملک کیلئے تین اصول اور شرطیں مقرر کی تھیں وہ بڑے حقیقت پسند اور دور بین تھے۔ ایک یہ کہ اس ملک کی قیادت آزادی اور بقا کیلئے تین شرطیں ہیں۔

۱۔ جمہوریت ۲۔ نامذہبیت ۳۔ عدم تشدد

حقیقت یہ ہے کہ یہ ملک ان تینوں کی پابندی کے بغیر قلیل مدت تک بھی نہیں چل سکتا۔ یہاں فوراً CIVIL WAR شروع ہو جائے گی اس وقت اس حقیقت کے اعلان کی بڑی ضرورت ہے۔ جہاں تک علم ہوا ہے۔ جس جماعت کے اقتدار میں آنے کی امید اور قرائن ہیں وہ مسلمانوں کے سلسلہ میں اور ان کے شرعی فرائض اور عمل میں مداخلت کا پورا ارادہ رکھتی ہے پرسنل لاء کا مسئلہ تو الگ رہا۔ آزاد مذہبی تعلیم

www.abulhasanalinadwi.org

اور اسلامی مکاتب و مدارس تک کے بارے میں اس کے خطرناک منصوبے ہیں“(مولانا علی میاں کے خطوط مولانا عبدالکریم پاریکھ کے نام ص ۳۶۴۔۳۶۵)

ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے مسلم پرسنل لاء کی اہمیت ان کی جان ومال اور آبرو سے کم نہیں اس کی حفاظت کا مطلب اپنے اسلامی تہذیب و تشخص کی حفاظت ہے۔ مولانا ہندوستانی مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان اگر مسلم پرسنل لا (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کرلیں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں۔ فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت و تہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر و محفوظ نہیں رہ سکتا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے، اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اپنے عائلی و خاندانی روابط و تعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں، اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت نظام تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے ہم اس کو دعوت ارتداد سمجھتے ہیں اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوت ارتداد کا مقابلہ کرنا چاہئے، اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا

www.abulhasanalinadwi.org

اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں، مضمر ہے" (خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ ممبئی اجلاس ہشتم ص ۲۳۔۲۴)

تلک، گھوڑا جوڑا اور مروج جہیز کو مولانا کی مصلحانہ طبیعت "وبائے عام" اور زمانۂ حال کا "فتنہ" قرار دیتی ہے اور وہ کہنا چاہتے ہیں کہ "خارجی محاذ" پر مضبوطی دکھانے کے ساتھ داخلی محاذ کو بھی تمام کمزوریوں سے پاک رہنا چاہئے۔ایک اصلاحی رسالہ کے پیش لفظ میں وہ تحریر فرماتے ہیں :

"لڑکی والوں سے کسی رقم یا خاص چیز کا مطالبہ یا من مانی فرمائشیں اور مالی و اقتصادی منافع کے حصول کی شرط جس کو بعض علاقوں میں تلک، بعض مقامات پر "گھوڑا جوڑا" بعض جگہ جہیز کی معروف و متداول اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو ہندوستان میں کچھ عرصہ سے برادران وطن (ہندو معاشرہ) کی تقلید میں یا اس کے ساتھ رہنے سہنے یا مال و دولت کی اس بڑھی ہوئی حرص یا لالچ کی وجہ سے جو موجودہ تہذیب تعلیم دینی کمزوری اور حب دنیا نے مسلمانوں میں پیدا کردی ہے، وقت کی وہ وبائے عام اور زمانۂ حال کا وہ فتنہ اور ابتلاء ہے جس نے اس مسلم معاشرہ کے لئے اس ماحول میں (جس میں دینی تعلیم و تربیت کی کمی ہے) اس شرعی و فطری شریفانہ و تمدنی ضرورت کی تکمیل کو پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لانے سے کم دشوار نہیں بنا دیا ہے،

ضرورت ہے کہ اصلاحی و تربیتی کام کرنے والے اور علماء ائمہ و خطباء اس وبائے عام اور زمانۂ حال کے فتنہ کو اپنا موضوع تقریر و تحریر بنائیں اور مجالس و تقریبات میں اس کو اپنے اپنے انداز میں پیش کریں نوجوان اس پر عمل کرنے کا معاہدہ کریں اور اپنے دوستوں اور عزیزوں سے عہد و وعدہ لیں کہ وہ اس رسم قبیح سے نہ صرف خود احتراز کریں گے بلکہ دوسروں کو بھی اس سے متنفر و مجتنب بنانے کی کوشش کریں گے اگر ضرورت ہو تو اس کے خلاف دستخطی مہم اور تحریک چلائیں گے یہاں تک کہ اگر خود لڑکی کے سرپرستوں اور اولیاء کی طرف سے اس کی پیش کش ہو تب بھی اس کو

www.abulhasanalinadwi.org

قبول نہ کریں گے یہ دین و اخلاق اور اصلاح و تبلیغ کا ایک اہم ترین تقاضا اور مسلم معاشرہ کی حفاظت کا اہم ترین مطالبہ ہے اور اس میں کوتاہی و غفلت بڑے خطرات کا پیش خیمہ اور خدا اور رسول کی ناراضگی و ناپسندیدگی کا ذریعہ ہے،

"وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّاتُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ" (الانفال ۲۵)

(اور اس فتنہ سے ڈرو جو خصوصیت کے ساتھ انہیں لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں گناہ گار ہیں اور جان رکھو کہ خدا سخت عذاب دینے والا ہے (جہیز یا نقد رقم کا مطالبہ ص ۵۔۶ و ۸)

مولانا نے علماء کرام کے مقام و مرتبہ کو بتاتے ہوئے حیدر آباد کی ایک تقریر میں فرمایا تھا:۔

"آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک طویل سفر کر کے آرہا ہوں دہلی سے چلا اور حیدر آباد پہونچا خدا جانے گاڑی نے کیا کیا رخ بدلے کن کن علاقوں سے گذری لیکن قبلہ نما نے ہمیشہ صحیح قبلہ بتایا اس نے نہ گاڑی کے پھرنے کی پرواہ کی نہ سمت کے تبدیل ہونے کی مجھے بڑا رشک آیا کہ ایک ادنی سی جماداتی چیز جو انسان کی صنعت ہے وہ اتنی امین ایسی ثابت قدم ایسی خود دار اور ایسی پابند اصول ہے کہ اس نے نہ یہ دیکھا کہ گاڑی کس طرح رخ بدل رہی ہے نہ یہ کہ انسان (جو اشرف المخلوقات ہے) برابر اپنا رخ بدلتا رہا ہے ہر جگہ اس نے صحیح طور پر قبلہ بتایا اور ہم نے اس پر اعتماد کیا اور نماز پڑھی اس سے مجھے غیرت بھی آئی اور عبرت بھی ہوئی کہ قبلہ نما تو کسی کی پروا نہ کرے اور ہمیشہ سمت قبلہ بتائے اس نے اپنا مقصد وجود تبدیل نہیں کیا اور نہ اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں فرق آنے دیا اس سے مجھے خیال ہوا کہ علمائے دین کو حقیقت میں "قبلہ نما" ہونا چاہئے ان کے اندر قبلہ نمائی

www.abulhasanalinadwi.org

سی استقامت ہونی چاہئے کسی طرف کی ہوا چلے اور کہنے والے کتنا ہی کہیں کہ ؎

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی
اور سمجھانے والے کتنا ہی سمجھائیں ؎
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بہ ساز

لیکن ان کا عقیدہ اقبال کی (جو خود اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ اور مفکر و فلسفی اور پھر شاعر تھے) کی اس تعلیم پر ہو ؎

حدیث کم نظراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

(تحفۂ دکن ص ۴۱-۴۰)

مفکر اسلام مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے بصیرت افروز اور فکر انگیز خیالات کا جو مرقع اوپر پیش کیا گیا ہے (جس میں زبان و ادب کی چاشنی اور ندرت بھی ہے) اسے آپ نے پڑھا انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق مولانا کے جو خیالات و احساسات ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ عصر حاضر میں ان کی معنویت کو محسوس نہیں کیا جائے اس مین صاف طور پر مولانا کی درد مندی اور فکر مندی جھلکی نہیں بلکہ چھلکی پڑتی ہے وقت کی ضرورت ہے کہ نہایت خلوص اور بالغ نظری کے ساتھ مولانا کے ان خیالات و احساسات سے استفادہ کیا جائے اور ان کے اس ''پیام'' کو عام کیا جائے مولانا علی میاں اپنے اس پیام کے بارے میں بجا طور پر اقبال کا پیام جو طلبہ علی گڑھ کے نام ہے اس کا پہلا شعر مستعار لیتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں ؎

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرز کلام اور ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور نوجوانوں کی فکری تربیت

مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ایک نظام اور لائحہ عمل :۔

۱۹۲۶ء میں مولانا نے "سیرت سید احمد شہید" تصنیف فرمائی، جو صرف ایک بزرگ کی سوانح حیات نہیں تھی، بلکہ ایک دعوت، ایک تحریک، ایک نظام فکر اور لائحہ عمل، بلکہ ایک تجدیدی واصلاحی کارنامہ کی ترجمان تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نے اس کتاب کی تصنیف سے نوجوانوں کے سامنے نہ صرف فکری تربیت کا بلکہ عملی جدوجہد کا ایک مکمل نظام پیش کیا ہے۔

مولانا کے الفاظ میں اسکا مقصد یوں بیان کیا گیا ہے :

" مسلمان اس وقت ایسی دعوت اور لٹریچر کے آرزو مند اور ضرورت مند تھے جوان میں خود شناسی، خودنگری اور بلند نگاہی پیدا کرے، جوان کو غلامی کے طریق سمجھانے اور ہندوستان میں بے زبان و بے عذر رعیت اور تابع فرمان رعیت بننے کے بجائے باوزن و باوقار اور صاحب عزت واعتبار ملت بننے کی دعوت دے، اور انکے قریبی اسلاف کے مجاہدانہ کارناموں کو سامنے لاکر ان میں ایثار وقربانی کی روح پیدا کرے، بقول اقبال :

موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ ملت بیضاء ہے امامت اسکی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

www.abulhasanalinadwi.org

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں شوکت و قوت کا پیام

ذہنی تربیت، صالح تحریک کی ضرورت:۔

مولانا نے اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۱۹۳۴ء سے بحیثیت مدرس تفسیر وادب کا کام شروع کیا تھا، لیکن انہیں یہ احساس چند سالوں کی محنت کے بعد ستانے لگا کہ طلباء اور نوجوانوں کی تربیت محض مدرسہ کی چہار دیواری میں محدود رہ کر تدریسی مشغلہ کے ذریعہ نہیں کی جاسکتی، انکی ذہنی وفکری تربیت اور عملی اصلاح کے لئے کسی صالح تحریک و دعوت کی ضرورت ہے۔

اس تجسس و جستجو کا نتیجہ یہ تھا کہ مولانا نے مولانا مودودی سے ملاقات کی، ان کے مضامین کا تاثر اور نقش دماغ پر قائم تھا، اور جن بنیادی مقاصد کے لئے مولانا نے جماعت قائم کی تھی، اس کیلئے جو فکری سانچہ بنایا تھا، مولانا اس سلسلہ میں پائے جانے والے خلا کو پر کرنے کیلئے اس سے منسلک ہو گئے ۱۹۴۱ء میں جماعت کے باقاعدہ رکن بن گئے اور پھر دارالعلوم کے طلباء اور شہر کے نوجوانوں کی ذہن سازی ان خطوط پر کی جانے لگی جنکا نظری خاکہ مولانا مودودی نے اپنے رسائل اور دعوتی وفکری کتابوں میں پیش کیا ہے، اور اسکا مقصد یہ تھا کہ مسلم نوجوان احساس کمتری سے آزاد ہوں، انگریزوں کی ذہنی وفکری غلامی کا طوق اتار کر پھینک دیں اور عالم میں اسلام کی بالادستی کیلئے کوشاں ہو جائیں، لیکن مولانا اس دوران یہ محسوس کرتے تھے کہ اس نظام کو عملا برپا کرنے اور اسلام کی سچی نمائندگی کرنے کے لئے جو صفات ایمانی، اخلاق ربانی، روحانیت وتزکیہ نفس ضروری ہیں وہ اس ماحول میں فراہم نہیں ہیں، اس سے ان کے اندر ایک بے چینی پیدا ہوئی اور یہ خیال غالب آیا کہ فکری تربیت جو محض نظری ہو، وہ اسلام کی بالادستی پر تو منتج ہوسکتی ہے، لیکن اسلام کی پرکشش روحانی نمائندگی اور اصلاح قلوب کے مطلوبہ عمل کی طرف نہیں لے جاسکتی، اس لئے مولانا کشاں کشاں تزکیہ کیلئے مولانا عبدالقادر رائے پوری اور دعوت وتحریک کیلئے مولانا الیاس کاندھلوی کے یہاں پہونچے۔

www.abulhasanalinadwi.org

نوجوانوں کی جامع تربیت کا تصنیفی خاکہ:۔

۱۹۴۴ کی بات ہے کہ مولانا پر ایک کتاب کی تصنیف کا داعیہ پیدا ہوا ، جس سے اس وقت کے مسلمانوں اور خاص طور پر نوجوانوں کی ذہنی وفکری تربیت ہو، اور جو اس حقیقت کو واضح کرے کہ پوری دنیا کو مسلمانوں کے زوال سے کیا نقصان پہونچا؟ اور اب انہیں اس زوال کو دور کرنے کیلئے کیا کرنا ہے، یہ کتاب اصلا عربی میں عالم عربی کے نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ کو مخاطب کرنے کیلئے لکھی گئی، اور جسکا عنوان (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین) تجویز ہوا (مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا)۔

اس میں دور جاہلیت کی بڑی اہمیت کے ساتھ تصویر کشی کی گئی ہے، اور محمد عربی ﷺ کے ذریعہ جو عظیم تاریخ ساز اور معجزانہ انقلاب برپا ہوا، اس کا تذکرہ کیا گیا ہے، حضور ﷺ نے جس جماعت کو تیار کیا تھا، اس کا نہایت پرکشش، حسین اور طاقتور مرقعہ پیش کیا گیا ہے، جوان کی تقلید اور اتباع پرابھارتا اوران کے انقلاب کا ازسر نو داعی بناتا ہے ۔

اسکے بعد مسلمانوں کے زوال کی المناک داستان سنائی گئی ہے، لیکن اس کا تذکرہ ظاہر ہے کہ نوحہ گری اور مرثیہ خوانی کیلئے نہیں کیا گیا ہے بلکہ یورپ کی ترقیات اور مسلمانوں کے اسباب زوال کا جائزہ لے کر ایک جامع متوازن اور ہمہ گیر تبدیلی کی دعوت دی گئی ہے

اس سلسلے میں ایمان وعمل، روح دعوت، اخلاق وروحانیت سے لے کر حربی اور صنعتی تیاریوں اور عالم اسلام کو خود کفیل بننے کا مشورہ دیا گیا ہے، آخر میں عربوں کو عالم اسلام کی قیادت اور اسکے منصب امامت سنبھالنے کی پرزور دعوت دی گئی ہے ۔

مولانا کی یہ کتاب جس ذہن، جذبہ، ایمان ویقین، توازن، جامعیت ، وسعت نظر اور دعوتی روح کی حامل ہے، اس میں مولانا کے مشفق اساتذہ ، بزرگان خاندان اور تحریکات و تنظیمات اسلامی کے بانی اور مشائخ مرشدین کے ملے جلے اثرات نمایاں ہیں ۔

نوجوانوں کی تربیت کیلئے دورے :۔

۱۹۴۰ء ہی سے مولانا نے طلباء اور نوجوانوں کی تربیت کیلئے تبلیغی دورے اور اسفار شروع کردئے تھے، جن میں طلباء کو ساتھ لے جاتے، اپنا بستر اٹھا کر ۷-۸ میل پیدل بھی جانا ہوتا ،

www.abulhasanalinadwi.org

شہر لکھنؤ کے نواحی قصبات اور دیہاتوں میں کثرت سے آمد و رفت ہوتی، اور ان سے دینی و اصلاحی فوائد، نمازوں میں ترقی، ذکر و شب بیداری، سادگی و جفاکشی، آپس میں روابط و تعارف، اپنی کمزوریوں کا علم، عوام کی دینی پسماندگی اور جہالت کا علم اور دینی ذمہ داری کا احساس ہوتا۔

خطر پسندی کی ضرورت :-

مولانا نے آزادی کی تحریک کے ابتدائی وقت میں خاص طور پر ۴۲ء میں جب ''ہندوستان چھوڑو'' کا نعرہ لگا، یہ محسوس کیا کہ مسلمان خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں، اور برادران وطن کی قربانیوں پر ہنستے ہیں، اس سے مولانا کے حساس دل پر چوٹ لگی، ان کا احساس تھا کہ انگریزوں کے اصل رقیب و حریف مسلمان ہیں، انہیں کو اصلا میدان میں آنا اور قائدانہ کردار ادا کرنا چاہیے، قومیں اور ملتیں دلیری اور جانبازی، قربانی اور خطر پسندی اور قائدانہ کردار ادا کرنے سے ہی عزت و سرفرازی حاصل کرتی ہیں۔

مولانا تحریکات اور دعوتی محنتوں اور تنظیموں کیلئے ضروری سمجھتے تھے کہ وہ منصوصات و غیر منصوصات اور مقاصد و وسائل میں فرق کریں، اور خوب سے خوب تر کی تلاش اور نافع سے انفع کی جستجو میں رہیں، ان کو نمو و ارتقاء، زندگی اور اس کے مسائل سے واقفیت اور جائز اور ضروری حد تک انکی تکمیل اور زندگی سے تطبیق دینا ضروری ہے۔

المیہ فلسطین کے اسباب :-

مولانا نے ۱۹۵۱ء میں مصر، حجاز و شام اور فلسطین کا سفر کیا، تو وہاں کے نوجوانوں کو دینی غیرت، اسلامی حمیت اور مغرب کے نظریات و افکار اور اسکی نقالی سے آزادی کی پرزور دعوت دی، مسئلہ فلسطین اور بیت المقدس پر ان کی غیرت کو للکارا، اور المیہ فلسطین کے تین اسباب بتائے:

(۱) اصول و عقیدہ پر مر مٹنے اور جان کی بازی لگا دینے کے جذبہ کا فقدان۔

(۲) اس ذہنی و نفسیاتی کیفیت کا فقدان جسکو اقبال نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

(۳) تیسرا سبب یہ ہے کہ عرب حکومتوں اور قوموں میں کوئی صلاح الدین نہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

اور صاف وارننگ دی کہ مسئلہ فلسطین کانفرنسوں، ریزولیشنوں اور خوشامدوں سے حل نہیں ہوگا ۔

دعوتی و تجدیدی کوششوں کا جائزہ :۔

مولانا نے دعوتی کاموں کے دوران یہ محسوس کیا کہ بہت سے تعلیم یافتہ اور دینی جذبہ رکھنے والے نوجوان یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں کئی کئی صدیوں کے بعد کچھ بڑی مصلح اور مجدد شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں، کبھی کوئی بلند قامت اور کوہ پیکر انسان نظر آجاتا ہے، ورنہ عام طور پر سیل حوادث اور اقتدار وقوت کے رجحان ومذاق کے ساتھ بہنے والے علماء، مشائخ اور مصنفین و مفکرین نظر آتے ہیں ۔

اس سے اسلام کی اندرونی طاقت سے مایوسی اور بدگمانی پیدا ہوتی ہے، یہ خیال احساس کمتری اور ذہنی شکست خوردگی کا نتیجہ ہے، حالانکہ کوئی صدی بھی اسلام کی ایسی نہیں گذری جس میں مجددین و مصلحین کی جماعتیں وجود میں آتی نہ رہتی ہوں، ضرورت اس بات کی تھی کہ اس غلط فہمی کو دور کیا جائے، اور مسلم نسلوں اور بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ کو دلائل و شواہد کے ساتھ بتایا جائے کہ اسلام کسی دور میں بھی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کے انقطاع کی مصیبت سے دوچار نہیں ہوا، اس نے ہر دور میں دیو پیکر اور عظیم انقلابی اور تجدیدی شخصیتیں پیدا کیں اس کیلئے تاریخ دعوت وعزیمت کے سلسلہ کو شروع کیا، جسکی پہلی جلد ۱۹۵۴ء میں منظر عام پر آئی ، پھر دوسرا حصہ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا ، پھر ۱۹۶۳ء میں تیسرا حصہ طبع ہوا ، ۱۹۸۰ء میں چوتھا حصہ اور ۱۹۸۴ء میں پانچواں حصہ شائع ہوا ، اسکا چھٹا حصہ جو حضرت سید احمد شہید کے حالات پر ہے پہلے ہی ۱۹۳۹ء میں طبع ہو چکا تھا، اور اسکے بعد کی کڑیاں کاروان ایمان وعزیمت اور مولانا الیاس ، مولانا رائے پوری ، حضرت شیخ الحدیث ، مولانا یعقوب مجددی وغیرہ کی سوانحی کتابوں کے ذریعہ تیار ہو چکی ہیں ۔

تحریک کیلئے ماضی سے ربط کی ضرورت :۔

تاریخ کی ان کڑیوں میں نوجوانوں اور خاص طور پر دعوتی و تحریکی کام کرنے والے افراد کیلئے بہت بڑا سرمایہ فکر وعمل ہے، اصلاح و تجدید کی تاریخ فی الحقیقت اسوۂ عمل کی ہے ، اور ہر دور میں اسکے انطباق کی عملی شکلوں کی تصویر ہے، آج ہمارے دعوتی اور تحریکی کاموں میں

www.abulhasanalinadwi.org

ایک بہت بڑا خلا اسی سے پیدا ہوتا ہے کہ کام کرنے والے کے سامنے واضح نمونۂ عمل نہیں ہوتا، اور تیز وطباع ذہن تحریک کے شاخسانے تیار کر لیتے ہیں، جن کا حال سے جتنا ربط ہوتا ہے اتنا ماضی سے نہیں ہوتا، حال کی کارگزاری انکی جو کچھ بھی ہو ماضی کی جڑیں مضبوط نہ ہونے کے سبب وہ پودا کسی وقت بھی اکھڑ جاتا ہے، ہندوستان میں خلافت تحریک، خاکسار تحریک اور اسی طرح کی بہت سی تحریکات ایک ابال اور وقتی ردعمل کے طور پر ابھریں اور ناپید ہوگئیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ مولانا کی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' حوصلہ مند، اسلامی الفکر نوجوانوں کی فکری اور ذہنی بلکہ روحانی وربانی تربیت کا ایک بڑا موثر ذریعہ ہے، اور اصلاً اس کتاب کی تالیف اور اس موضوع پر لکچرز کا آغاز بھی ۱۹۵۲ء میں تبلیغی مرکز میں آنے والے اصحاب اور دینی دعوت سے دلچسپی لینے والے نوجوانوں اور رفقاء کی ذہنی تربیت کیلئے کیا گیا تھا۔

نیا ارتداد اور اسکا مقابلہ :۔

مولانا نے ۵۸ء ۵۹ء میں شدت سے یہ محسوس کیا کہ حالات کے سخت دباؤ، انگریزی تہذیب کی بالادستی، اور اسکے مرعوب کن مظاہر، اسکے نت نئے نظریات اور فلسفوں نے جو ''سحر سامری'' کا اثر رکھتے ہیں، نوجوانوں کی نسل کو ایک فکری، تہذیبی اور علمی ارتداد کی طرف ہنکانا شروع کر دیا ہے، بلکہ لاکھوں افراد اس ارتداد کا لقمہ بن چکے ہیں، اس ارتداد کی زد میں آنے والا اور ضروریات دین اور حقائق دین کا انکار کرنے والا کسی کلیسا اور مندر میں نہیں جاتا اور نہ تبدیلی مذہب کا اعلان کرتا ہے، اور نہ اسلامی معاشرہ اس پر چونکتا ہے اور اس سے فصل وانقطاع کا وہ معاملہ نہیں کرتا جو مرتدین سابقین کیساتھ کیا جاتا تھا، یہ بات عالم اسلام، بالخصوص عالم عربی میں زیادہ شدت سے محسوس کی گئی، مولانا نے اس شعور کو دوسروں تک منتقل کرنے اور اس صورتحال پر انہیں چونکا دینے اور معاملہ کی سنگینی سے واقف کرانے اور اسکا مقابلہ کرنے کیلئے اس صدیقی مزاج اور اعلان کیساتھ میدان میں اترنے کیلئے ایک مضمون لکھا جسکا عنوان تھا (ردۃ ولا ابابکر لھا: فتنۂ ارتداد ہے اور اس سے کوئی مقابلہ کرنے والا ابوبکر نہیں) اس میں پوری قوت سے اس فکری، اعتقادی، علمی اور نظریاتی یلغار اور ارتداد کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی گئی جو تیزی سے پھیلتا جارہا ہے اور جس کیلئے علمی وفکری ہتھیاروں کی ضرورت تھی، طاقتور، موثر اور مدلل

www.abulhasanalinadwi.org

لٹریچر کی ضرورت تھی جو مسلمانوں کے دلوں سے احساس کمتری ختم کرے، اور انہیں اسلام کی برتری اور عظمت کا احساس دلائے، اور ان میں داعیانہ اسپرٹ پیدا کرے، وہ متاثر ہونے کے بجائے موثر ہوں، منفعل ہونے کے بجائے فاعل بنیں اور موجودہ دجالی تہذیب کے دجل وفریب کو پائے حقارت سے ٹھکرادیں، مولانا نے اس مقصد جلیل کیلئے ایک اکیڈمی بھی ۱۹۵۹ء میں قائم فرمائی، جو "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کے نام سے خدمات انجام دے رہی ہے اور جس نے مختلف زبانوں میں طاقتور دعوتی وفکری لٹریچر تیار کیا اور بڑے پیمانہ پر اسکی اشاعت کا انتظام کیا۔

دینی تعلیمی مہم :-

نوجوانوں کی فکری تربیت، تعمیری ذہن سازی اور سیرت سازی کیلئے مولانا کا ایک اور کام بڑی اہمیت کا حامل ہے ، ہندوستان میں بچے بچیاں اور نوجوان جن خطرات سے دوچار ہیں ان میں غالبا سب سے بڑا گہرا خطرہ اس تعلیمی نظام سے اور اس کے وسائل سے ہے جو ایک خاص مشرکانہ مذہب وتہذیب پر مبنی ہے، اور جس کو نافذ کرنے کا کام بڑی حد تک پورا کرلیا گیا ہے اور جو باقی ہے اسکو پورے اصرار اور شدت کے ساتھ پورا کرنے کا منصوبہ ہے، اس صورت حال کا یوپی میں کم از کم زیادہ شدت سے قاضی محمد عدیل عباسی نے احساس کیا تھا اور تحریکی جوش وخروش کے ساتھ انہوں نے اپنے ضلع بستی میں یہ کام شروع بھی کردیا تھا لیکن پھر حضرت مولانا اور مولانا منظور نعمانی تھے جن کے اشتراک نے اس کو صوبائی تحریک بنادیا، ۱۹۵۹ء میں بستی صوبائی کانفرنس اس مسئلہ پر منعقد ہوئی، "دینی تعلیمی کونسل" کا قیام عمل میں لایا گیا، حضرت مولانا کو اس کا صدر منتخب کیا گیا، اور اس وقت سے آج تک مولانا کی اس موضوع پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں تقاریر ہوئیں، سالانہ جلسوں میں صدارتی خطبات ہوئے جن میں نوجوانوں کیلئے کام کا بڑا سرمایہ ہے، اور انہیں دو رخ پر کام کرنے کی ہدایات دی گئی ہیں، ایک مثبت اور ایک منفی، مثبت کا مطلب یہ ہے کہ نوجوان اپنی دینی تعلیم کی فکر کریں، اور قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں دینی تعلیم کا جال بچھادیں، دوسری طرف حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں چوکنا رہیں، اور حکومت کے غلط اور غیر دستوری فیصلوں پر احتجاج کرتے رہیں، اور اس سے مطالبہ کریں کہ وہ دستور کی ان دفعات

www.abulhasanalinadwi.org

کا لحاظ کرے جن کے ذریعہ آبادی کو اپنے مذہب پر عمل کرنے، اسکو پڑھانے اور اسکی تبلیغ کرنے کا حق دیا گیا ہے ۔

قومیت کا بت :۔

مولانا کی تحریروں میں یوں تو فکری تربیت کے بہت سے گوشے ہیں ، لیکن بعض گوشے بہت طاقتور اور انقلابی نوعیت کے ہیں ، انہی میں قومیت کا مسئلہ ہے، قومیت کا وہ تصور جو یورپ سے عالم اسلام میں درآمد کیا گیا، اصلا مسلمانوں کیساتھ یورپ کی حریفانہ کشمکش کی وہ آخری فتح تھی، جو یورپ کو حاصل ہوئی، اسی ''سحر سامری'' سے اس نے خلافت عثمانیہ کی قبا تارتار کرادی، ترک ناداں تو کم ، ہاں ترک کے عیار وملحد اور عربوں کے ملحد وانگریز کے ایجنٹ طبقہ نے نادان ترکوں اور عربوں سے خلافت اور وحدت واخوت اسلامی پر پے بہ پے حملے کروا کرا سے بے جان کردیا، یہ فتنہ عربوں میں بالخصوص مصر میں سب سے زیادہ شدت سے اٹھا تھا ، اور ''عبدالناصر'' اس فتنہ کا سرخیل اور اسکی مملکت کا فرعون بنا ہوا تھا، مریض مصری صحافت اسے ''نبی القومیۃ العربیۃ'' کا خطاب دے رہی تھی، یہ وقت تھا اور ادھر ۱۹۶۷ء میں قومیت عربیہ کا یہ ''جھوٹا اور منافق نبی'' اسرائیل سے شکست کی ذلت کی سیاہی عربوں پر مل چکا تھا، کہ مولانا نے وقت کے فرعون کے خلاف اور اس خطرناک بت کے خلاف ایسے طاقتور تیشے چلائے کہ جس سے عالم عربی کا یہ مسحور طبقہ تلملا اٹھا، اور اس حقیقت کو نہایت مدلل اور طاقتور اسلوب میں واضح کیا کہ قومیت کی دعوت اسلام کی حریف، اخوت اسلامی کی دشمن اور اسلامی سیاست ونظام کی قاتل ہے، مسلم نوجوانوں کو اس فتنہ کے پیچھے کام کرنے والی طاقتوں کو سمجھنا چاہئے اور اسکو یکسر مسترد کر کے عشق محمدی کے چراغ کو جلانا اور اسلامی نظام کو برپا کرنا چاہئیے ۔

بے لاگ صحافت کی ضرورت :۔

مولانا نے صحافت کے میدان میں بھی محسوس کیا کہ اس میں اس جرأت مندانہ قیادت ورہنمائی کی کمی ہی، جو مسلمانوں کے مسائل اور حالات سے گہری واقفیت، دیانتدارانہ تجزیہ اور بے لاگ مشورہ پر مبنی ہو، اور پھر اس میدان میں ایک نمونہ پیش کرنے، نوجوانوں کی ٹیم تیار کرنے، جرأت مندانہ اور بے لاگ صحافت کی طرح ڈالنے کیلئے ۱۹۶۰ء میں مولانا منظور نعمانی

www.abulhasanalinadwi.org

کیساتھ مل کر ہفتہ وار ''ندائے ملت'' کا اجراء کرایا، جومختلف حالات سے گزرتا ہوا اب بھی جاری ہے ۔

مغرب زدگی کا مقابلہ :۔

مولانا نے ان نوجوانوں کیلئے جومغرب زدہ، تہذیب مغرب کے اسیر اور یورپ کی مادی ترقیات اور آزادی کی تحریکات سے متاثر رہے ہیں، مومنانہ بصیرت، داعیانہ جذبہ اور جوش وخروش، ناقدانہ تجزیہ اور عالمانہ فکروراۓ کا بڑا سرمایہ تیار کردیا ہے، مولانا کی کتاب ''اسلامیات اور مغربیت کی کشمکش'' اور ''مغرب سے صاف صاف باتیں'' اس سلسلہ میں بڑی رہنما اور موثر کتابیں ہیں، مولانا کے مکاتیب یورپ بھی بڑے چشم کشا اور سبق آموز ہیں، مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مادیت زندگی کے انہماک، تنازع للبقاء اور خودساختہ معیاروں اور مقاصد کے حصول کی تگ ودو، لطیف تر احساسات، روحانی تشنگی اور خداطلبی کے جذبہ کو یکسر فنا کردیا ہے، اس لئے وہ اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں، قوت ارادی، احساس ذمہ داری، نظم وضبط اور بہت سی خوبیوں کے باوجود صحیح روحانی تحریکوں اور دینی وروحانی فتوحات سے محروم ہیں...... رہی سہی فطرت کی سلامتی اور نفس لوامہ کی سرزنش، خمر وخنزیر نے ختم کردی،

فرقہ وارانہ فسادات کے اسباب اور انکا ازالہ :۔

ہندوستان میں تقسیم سے پہلے اور پھر اسکے بعد فسادات کا جوسلسلہ چلا، خاص طور پر ۶۳-۶۴ء میں کلکتہ، رانچی، جمشید پور اور راوڑکیلا کے فسادات جنہوں نے ہر صاحب ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور مسلم نوجوانوں کو یا تو سخت مشتعل یا مایوس کردیا۔ ہندوستان کا یہ مسئلہ جوان کے سامنے سوالیہ نشان بنا کھڑا ہوا ہے اور رہنمائی کا محتاج ہے، مولانا نے اس صورت حال میں اپنی کیا رائے دی، ان کے نزدیک اسکا کیا حل ہے، اور کیسے ان حالات سے نمٹنا ہے؟ نوجوانوں کی فکری تربیت کے سلسلہ میں اسے بھی نوٹ کرنا چاہیۓ ۔

''ایک طرف تو مسلمانوں میں حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت وعزم اور خدااعتمادی و خوداعتمادی کی شان پیدا کی جائے جسکو ان ناشدنی حالات کو پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے ۔

www.abulhasanalinadwi.org

دوسری طرف ملک میں ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جس سے یہ اعصابی دباؤ کم ہو، ملک کے شہری انسانوں اور ہم وطنوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گذارنے پر آمادہ ہوں اور انسانیت کا احترام پیدا ہو اور دلوں سے منافرت کا وہ زہر امکانی حد تک دور ہو جو فرقہ وارانہ سیاست، اشتعال انگیز تقریروں اور غیر ذمہ دار پریس نے پیدا کر دیا ہے"۔

آزاد اسلامی نظام تعلیم :۔

تعلیم کا موضوع بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آج دنیا میں سیکولر (نامذہبی) تعلیمی ادارے ہی زیادہ ہیں، مسلمان تعلیم کی طرف کم متوجہ ہیں اور جو ہیں بھی اسکے نظام کے بارے میں واضح تصور نہیں رکھتے، نوجوان طبقہ جسے تعلیمی و تربیتی اور دعوتی میدان میں کام کرنا ہے اگر اسکا ذہن اس کیلئے نہیں بنایا گیا تو ہم کسی صالح نظام کے برپا ہونے کی توقع نہیں کر سکتے، مولانا نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا، کہا اور ایک مجموعۂ مضامین "نحو التربیة الاسلامیة الحرة" (اسلامی ممالک کیلئے آزاد اسلامی نظام تعلیم) کے نام سے شائع بھی کیا۔ مولانا کے الفاظ میں ہی اس فکر کے خلاصہ کو سمجھتے چلئے :

میں شروع سے اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ ممالک اسلامیہ بالخصوص ممالک عربیہ کی موجودہ صورت حال عقائد کا تزلزل ذہنی انتشار، اخلاقی انارکی اور اسلام کی قائدانہ صالحیت کے بارے میں بے اعتمادی اور اسکے مستقبل سے مایوسی اس نظام تعلیم کا نتیجہ یا عطیہ ہے جو مغرب سے کسی بنیادی تبدیلی اور مجتہدانہ فکر و نظر کے بغیر درآمد کر لیا گیا ہے ۔

نظام تعلیم وہ لباس ہے جس کو اس ملت اور نسل کے قد و قامت، سائز، اسکے ماضی اور حال اور اس آب و ہوا کے مطابق تیار ہونا چاہئے جس میں یہ ملت اور نسل پیدا کی گئی ہے اور اس میں اسکو جینا اور مرنا ہے ۔

یہ نظام تعلیم حال کو ماضی سے اور پھر ان دونوں کو مستقبل سے مربوط کرنے کا موثر اور پائیدار ذریعہ ہے اور اسکا اصل مقصد ان عقائد اور حقائق پر اس نسل کے عقیدہ اور رابطہ کو نہ صرف مضبوط کرنا ہے بلکہ ان کیلئے علمی بنیاد پر دلائل فراہم کرنا اور ان کو صالح اور افضل ثابت کرنا ہے جن سے اس ملت کا قوام اٹھایا گیا ہے اور اسکو علمبردار بنایا گیا ہے، یا اسکو وہ بہر حال عزیز ہیں

www.abulhasanalinadwi.org

،اور جونظام تعلیم اس مقصد کی نہ صرف تکمیل نہیں کرتا بلکہ اسکونقصان پہونچاتا ہے اوراس سے بھی زیادہ سنگین صورت یہ ہے کہ انکے خلاف باغی بناتا ہے وہ نظام تعلیم اس ملت ونسل کا سب سے بڑادشمن، اس کی متاع عزیز کا رہزن اور سیاسی فتوحات اور غلبہ سے بھی زیادہ اس ملت کے حق میں سم قاتل ہے"۔

ملکی سیاست اور ملی مسائل میں نوجوانوں کا رول :۔

ہندوستان جیسے ملک میں ملی وسیاسی مسائل میں مسلمانوں اور بالخصوص مسلم نوجوانوں کا کیا رول ہونا چاہیئے، کیا مسلمان صرف اپنی عبادات اور چند دینی شعائر کے اظہار میں مصروف رہیں اور ملک کے قومی وملی مسائل اور سیاسی جدوجہد سے کنارہ کش رہیں؟ یا انہیں ملک کی سیاست میں حصہ لینا چاہیے؟ نوجوانوں کی فکری تربیت ورہنمائی کیلئے ضروری تھا کہ مولانا اس موضوع پر بھی روشنی ڈالتے،واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے اس موضوع پر نہ صرف اپنی تقریروں اور تحریروں میں بارہا اظہار خیال فرمایا، بلکہ انہوں نے اپنی افتادطبع اور مزاج کے خلاف اس میں عملی شرکت کی ا ور قائدانہ رول ادا کیا۔اس سلسلہ میں مولانا کے خیالات کا مندرجہ ذیل خلاصہ ہے :

"ایسے دور میں جب حکومتوں کا دائرہ اتنا وسیع اور زندگی پر حاوی ہے اور ایسے ملک میں جہاں اپنے رائے حق دہندگی، سیاسی اثرونفوذ اور دانشمندی کے سوا کوئی ذریعہ اپنے تحفظ یا کسی خطرہ کو روکنے کا نہیں ہوسکتا، ایک ایسی ملت ملک کی سیاست اور جمہوری طریقہ سے اثر انداز ہونے سے کیسے کنارہ کشی اختیار کرسکتی ہے جس کے دین کا دائرہ اور تصور پوری زندگی پر محیط ہے، وہ مذہب "بندہ اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے" کے مسیحی تصور پر یقین نہیں رکھتی اسکا مذہب دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں (زندگی پر حاوی اور محیط ہونے کی وجہ سے) زیادہ ذکی الحس اور جلد متاثر ہونے والا ہے،اس ملت کیلئے جولوگ سیاست کو شجر ممنوعہ نہیں بلکہ "الشجرة الملعونة فی القرآن" کی تلقین کرتے ہیں اور اسکو ذہنی اور عملی عزلت کا مشورہ دیتے ہیں یا اسکو اسکی تلقین کرتے ہیں کہ پارسی اور ماڑواریوں کی طرح محض رفاہی اور خیراتی ادارے قائم کرنے یا اپنی اقتصادی اور اپنی مالی پوزیشن کو مضبوط کرنے یا تعلیم کا معیار بلند کرنیکی طرف کلیتا متوجہ ہیں وہ حقیقت میں مسلمانوں کو اجتماعی اور ملی خودکشی کا مشورہ دیتے ہیں کہ مسلمان اسطرح

www.abulhasanalinadwi.org

نہ اپنے ملی تشخصات کی حفاظت کرسکیں گے، نہ اپنے فرائض وشعائر دینی اور عائلی قوانین کیساتھ باقی رہ سکیں گے، نہ اپنا اعتقادی اور تہذیبی تشخص برقرار رکھ سکیں گے اور قیادت ودعوت کا مسئلہ تو الگ رہا (جو اس ملت کا حقیقی منصب ہے) اس ملک میں آزادانہ باعزت طریقہ پر زندگی بھی نہیں گزار سکیں گے ۔

......۱۹۶۷ء کے عمومی انتخابات کے موقعہ پر میرے ذہن پر اس بات کا غلبہ تھا کہ مسلمان اس ملک میں اپنا سیاسی وزن ثابت کرنے کیلئے اور اس حقیقت کے اظہار کیلئے کہ وہ پاسنگ یا فیصلہ کن طاقت کا درجہ رکھتے ہیں کسی سیاسی پارٹی یا حکمران جماعت کے پابند نہ رہیں اور اپنے حق رائے دہندگی کا آزادانہ استعمال کریں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل اور قسمت مستقل طور پر کانگریس سے وابستہ ہے اور مسلمانوں کے ووٹ اسکی جیب میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ یہ بات واضح ہوجائے کہ مسلمانوں نے کسی جماعت کے نام خط غلامی نہیں لکھا دیا ہے میں اس وقت بھی اس خیال کا تھا اور اب بھی اس خیال کا ہوں کہ مسلمانوں کو کبھی کبھی اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا چاہیے کہ جس طرح ان میں نفع پہونچانے کی صلاحیت ہے ضرر پہونچانے کی بھی صلاحیت ہے (چاہے وہ اپنی شرافت سے اسکا ثبوت نہ دیں) تاکہ کوئی جماعت انکو صرف نفع کا ذریعہ سمجھ کر ان کے حقوق ومسائل سے مسلسل چشم پوشی نہ برتے، میں اس وقت اکثر اقبال کے یہ دو شعر پڑھتا تھا

تمیز خار و گل سے آشکارا
نسیم صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

ادب کے نام پر بے ادبیوں کی اصلاح :۔

مولانا نے ادبی دنیا کے نوجوانوں ،شعروادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو ایک اہم پیغام دیا ہے ۔زبان وادب کے بارے میں عمومی غلطی یہ پھیلی ہوئی تھی کہ نام نہاد فنکار شاعر وادیب جو کہیں لکھیں وہ ادب ہے چاہے وہ کتنی ہی فضول، لغو، فحش اور بے ادبی کی بات ہو اور خدا کے

www.abulhasanalinadwi.org

پیغمبر، وقت کے مصلح وریفارمر، صوفی، درویش، عالم وفقیہ، داعی ومربی جو کہیں لکھیں وہ دینی وعظ ہے اور بس خواہ اس میں کتنی ہی بلاغت، کتنی ہی تاثیر ودلکشی، زبان وبیان کی کیسی ہی شوکت اور طاقت کیوں نہ ہو۔

جو چاہے آپکا حسن کرشمہ ساز کرے

مولانا نے سب سے پہلے عربی نصاب کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہوئے اس عوامی مسلمہ غلط فہمی کا پردہ فاش کیا اور اس بے ادبی وبدذوقی کے خلاف صدا لگائی، عربی نصاب کی کتاب ''مختارات'' (انتخابات) میں انہوں نے اس سابقہ مفروضہ کو بے بنیاد قرار دیکر یہ دکھایا کہ ادب کے اعلی ترین شاہکار مذہبی واخلاقی ودعوتی تحریروں میں کہاں کہاں پوشیدہ ہیں، جو ہزاروں ادیبوں کی تحریروں پر بھاری ہے، ضرورت ہے کہ انہیں سامنے لایا جائے ظاہر ہے کہ سیکولر ادب پر جب یہ وار ضرب کاری ثابت ہوئی تو کیمونسٹ وملحد وگستاخ ''ادب'' کی بے ادبیوں کیلئے تو یہ صدا پیام موت تھی، مولانا نے نہ صرف چند نصابی کتابیں تیار کیں بلکہ انکی ہر تصنیف اسی داعیانہ ادب اسلامی کی ایک نظیر ومثال بنتی گئی، یہاں تک کہ ۱۹۸۱ میں انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک بین الاقوامی سیمینار اسی مقصد کیلئے منعقد کرایا، جس میں پوری طاقت وقوت سے اس حقیقت کو پیش کیا گیا اور ایک مجلس عمل قرار دی گئی، تاکہ ادب کے گیسو سنوارے اور اسے مسلمان بنائے۔ اس صدا کا یہ نتیجہ تھا کہ ریاض میں ''رابطۃ الادب الاسلامی'' کے نام سے ۱۹۸۴ء میں ''ادب اسلامی'' کی ایک عالمی تنظیم قائم کی گئی، جسکی صدارت کیلئے بالاتفاق ہندوستان کے اس درویش کا انتخاب ہوا جس نے اس سلسلہ میں پہلا سبق بڑی بلند آہنگی سے دیا تھا۔

مولانا کے اس پیام کا حاصل یہ ہے کہ نوجوان صحافی، ادباء، شعراء، اہل قلم اور اہل زبان عالی وشگفتہ ادب سے اپنی زبان وقلم کو آراستہ کریں، اور آب زمزم سے دھوتے رہیں اور حجازی لے لگاتے رہیں اور اقبال کے الفاظ میں یوں گنگناتے رہیں:

اے اہل نظر، ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

www.abulhasanalinadwi.org

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر
مقصود ہنر، سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا؟

طلبائے مدارس کو کیا کرنا ہے:۔

مدارس کے طلباء اور نوجوان فضلاء مولانا کی توجہ و تربیت کا خاص طور پر مرکز رہے، ہیں مولانا خود بھی مدارس کی تربیت گاہ کا ایک بہترین نمونہ ہیں۔ مولانا نے طلبائے مدارس اور فضلائے مدارس کی ذہنی وفکری وروحانی تربیت کیلئے جن امور پر توجہ مرکوز کی ہے اوران پر بار بار اور بہت تاکید کے ساتھ زور دیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اخلاص۔ جسکے بغیر نہ برکت ہوتی ہے، نہ حقیقی ترقی۔

(۲) جذبۂ قربانی۔ جسکے بغیر انسان خطرات مول لیتا ہے، نہ عزم وہمت وحوصلہ پیدا کر پاتا ہے۔

(۳) جوہر ذاتی۔ جسکو رسوخ، تفقہ، اختصاص اور دوسرے عنوانات سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے یعنی علمی پختگی اور فن کی مہارت۔

(۴) ذاتی محنت۔ محض نظام ونصاب اور اچھے اساتذہ بھی کچھ نہیں کر سکتے جب تک طلبہ خود محنت نہ کریں۔ علم انسان سے یکسوئی اور سخت محنت کا طالب ہے۔

(۵) عصر حاضر کے فتنوں کا ادراک، نئی تحریکوں اور نظریات سے گہری اور ناقدانہ واقفیت اوران سے مقابلہ کرنے کی علمی ودعوتی تیاری۔

(۶) کیفیات باطنی کا اہتمام۔ یعنی: ایمان واحتساب، تعلق مع اللہ، انابت واخبات، خشوع وخضوع، دعاوابتہال، استغناء وتوکل، دردومحبت، خودشکنی وخودداری، کیونکہ علوم نبوت احکام اوراوصاف وکیفیات دونوں کے جامع ہیں۔

(۷) احساس کمتری سے حفاظت اور خودشناسی:

برخود نظر کشا نہ تہی دامنی مرنج

www.abulhasanalinadwi.org

در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

(۸) زندگی کی رفاقت اور زمانہ کے تقاضوں کی تکمیل۔

(۹) وسیع تیاریوں اور متنوع صلاحیتوں کی ضرورت

سپاہی کیلئے نہ کوئی ہتھیار قدیم ہے نہ جدید، اسکو تو یہ دیکھنا ہے کہ میدان جنگ کیلئے کون سا ہتھیار کارگر ہے، اور کونسا طریق جنگ موزوں۔

(۱۰) ملک کی زبان وادب سے رابطہ و تعلق اور اس میں کمال کی کوشش۔

(۱۱) عربی زبان پر قدرت اور بین الاقوامی زبانوں سے بھی واقفیت۔

(۱۲) عقائد صحیحہ، احکام شریعت، دینی تہذیب اور ملی تشخص کے تحفظ کیلئے ہر ممکن کوشش، اور اس کیلئے جان کی بازی لگا دینے کا جذبہ و حوصلہ اور تاریخ عزیمت سے سبق:

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخون دل

قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

(۱۳) تحریف کے چور دروازے بند کرنے، زمانے کے ابوالفضل و فیضی کا مقابلہ کرنے، مغرب کے لادینی افکار، تصورات سے مورچہ لینے کی ضرورت۔

(۱۴) فکر و دعوت، مسائل اور موقف میں تعین اور وضاحت کی ضرورت، ابہام و اجمال سے گریز۔

(۱۵) بقائے انفع کے بے لاگ قانون کو سمجھنا چاہیے، مذہب عجائب خانہ یا میوزیم نہیں ہے، مدارس آثار قدیمہ نہیں، قدامت اور تاریخ کے سہارے پر کوئی ادارہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

اور مختصر یہ کہ "آج اپنے خیالی جزیروں میں پناہ لیکر ساحل کے خاموش تماشائی بن کر ہم علم وادب اور سیاست و قوت کی دنیا میں کوئی دیرپا نقش ہرگز قائم نہیں کر سکتے، اس کیلئے بڑی زندگی اور زندہ دلی، بڑے ایمان و یقین، بڑے اخلاق و کردار، بڑے علمی رسوخ اور امتیاز، بڑی کاوش و ریاض کی ضرورت ہے، اور یہ مقدس فرض وہی خوش نصیب و باہمت نوجوان انجام دے سکتے ہیں جنکے سینوں میں علوم نبوت کا نور، جنکے دلوں میں حالات کو بدلنے کا عزم و حوصلہ، جنکی رگوں میں زندگی کا ابلتا ہوا نیا خون، جنکے قدموں میں فاتح کا اعتماد و سرخوشی، جنکی آنکھوں میں عزم و یقین کی

www.abulhasanalinadwi.org

روشنی، اور جن کی دمکتی ہوئی پیشانیوں پر ستارۂ اقبال و ہوشمندی ہویدا ہو"

پندرھویں صدی کیلئے دس نکاتی پروگرام:۔

اس فکری تربیت کے سلسلے کی آخری کڑی یہ ہے کہ نوجوانوں کو یہ معلوم ہو کہ انہیں اپنی صالح تربیت کو کہاں استعمال کرنا ہے، اور کیا کیا کام ہیں جو انہیں انجام دینا ہیں، مولانا نے پندرھویں صدی میں کام کیلئے ایک دس نکاتی پروگرام پیش کیا تھا، جنکے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(۱) مسلم عوام میں ایمان وعقیدہ کو طاقت پہونچانے اور انکے دینی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش۔

(۲) دینی حقائق اور قرآنی وایمانی اصطلاحات کو نیز دین کے صحیح تصور اور فہم کو ہر طرح کی تحریف سے بچانا۔

(۳) ذات نبوی سے عشق ومحبت، جو سنتوں کی پابندی پر آمادہ کرے۔

(۴) مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کی حقانیت اور قیادت کی صلاحیت پر اعتماد کی بحالی۔

(۵) نظام ونصاب تعلیم میں ضرورت کے مطابق تبدیلی اور اسکو "درآمد شدہ نظامہائے تعلیم" کے غیر مطابق اسلام اجزاء سے پاک کرنا۔

(۶) ایک طاقتور عالمگیر علمی وتحقیقی تحریک جو جدید نسل کا اسلام کے علمی ذخیرہ سے رشتہ استوار کرے اور اسلامی علوم میں نئی روح پھونک سکے۔

(۷) اسلامی ممالک اور مسلم معاشرہ میں اسلام کے تمدن اور اسکی تہذیب کے اظہار کی کوشش۔

(۸) ایک ایسی فکری قیادت کی تیاری جو مغربی تہذیب کا جرأت، اعتماد اور قوت اجتہاد کیساتھ سامنا کرے۔

(۹) ان حکومتوں کو جو اسلام پسند طبقہ کے خلاف ہیں اور عوام کے دینی مطالبات کو دبانا چاہتی ہیں یہ باور کرانے کی کوشش کہ یہ حکمت عملی بے نتیجہ قومی سالمیت اور استحکام کیلئے مضر اور انتشار انگیز کوشش ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

(۱۰) غیر مسلم ممالک میں اسلام کا ایسا موثر اور معقول تعارف اور مظاہرہ جو اسلام کی قدر وتعظیم پر آمادہ کرے اور اسکی پرکشش نمائندگی کرے۔

مسلم نوجوان، اقبال کا مردمؤمن:۔

مولانا کے نزدیک مسلم نوجوانوں کو ایک مردمومن کی مثال ہونا چاہیے، اسکی تربیت ایسی جامع، موثر و پرکشش ہو کہ اقبال کے الفاظ میں یوں کہا جاسکے:

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ　　غالب وکار آفرین، کارکشا، کارساز
خاکی ونوری نہاد، بندۂ مولاصفات　　ہردو جہاں سے غنی، اسکا دل بے نیاز
اسکی امیدیں قلیل، اسکے مقاصد جلیل　　اسکی ادا دلفریب، اسکی نگہ دلنواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو　　رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل پاک باز

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ

دیارِ مغرب میں داعی اسلام

پروفیسر عبد الرحیم قدوائی
شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی عبقری شخصیت بیک وقت مختلف شعبائے زندگی، متعدد علوم اور موضوعات پر حاوی تھی ان کے کارنامے ہمہ جہت ہیں اور ہر کارنامہ اپنی جگہ پر قابل ذکر ہے۔ البتہ ان کی شخصیت اور فکر اسلامی کی دعوت سے عبارت تھی ان کی شخصیت کے اسی غالب پہلو کا مظہر فکر مغرب پر ان کا محاکمہ بھی ہے اور ان کی دیار مغرب میں علمی اور عملی کاوشیں بھی۔ اس مقالے میں مولانا کے فکر و عمل کے اس پہلو کو روشن تر کرنے کی کوشش کی گئی ہے :

برطانوی ہندوستان میں مولانا کی ولادت اس خانوادے میں ہوئی جس کا ایک فرد فرید سید احمد شہیدؒ تقریباً ایک صدی قبل اسلام اور مسلمانان ہند کے خلاف مغربی قوتوں کی ناپاک سازشوں کے خلاف سربکف ہو کر امت مسلمہ کو اعلائے کلمۃ الحق، جہاد اور ہجرت کے فراموش شدہ سبق یاد دلا چکا تھا، وہ ایسی اسلامی تحریک کے قائد تھے جنھوں نے اپنی مومنانہ جرأت اور فراست سے قرون اولیٰ کی اسلامی تاریخ کو انیسویں صدی کے ہندوستان میں پھر زندہ کر دیا تھا۔ بچپن ہی سے مولانا کے قلب وذہن پر اس تاریخ ساز شخصیت کا بڑا گہرا نقش مرتسم ہوا اس کی شہادت اس سے بھی ملتی ہے کہ

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا کی اولین قابل ذکر تصنیف کا محور یہی شخصیت اور اس کی عظیم الشان تحریک ہے۔ جس والہانہ انداز میں مولانا نے موصوف کو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ ان کی فکری ہم آہنگی اور قلبی تعلق کی غمازی کرتا ہے۔ یہاں مقصود مولانا کی اس معرکہ آرا تصنیف یا سید احمد شہیدؒ کی ایمان پرور تحریک کا جائزہ لینا نہیں بلکہ اس اہم نکتے کو ذہن میں تازہ کرنا ہے کہ لوائل شعور ہی میں مولانا نے سید احمد شہیدؒ کے حوالہ سے اپنا میدانِ فکر اور عمل متعین کر لیا تھا اہم تر نکتہ یہ ہے کہ اس محاذ میں مغرب کی حیثیت حریف کی تھی۔ ایسا حریف جو سارے طاغوتی لوازمات سے لیس تھا۔ گویا نا قابل تسخیر سیاسی قوت کا حامل، مادی وسائل پر پوری طرح قابض اور اس کی ریل پیل سے ہر ایک کی نگاہیں خیرہ کر دینے والا، اپنی طاقت کے نشے میں بد مست، مالک السموات والارض سے ایسی بے خوفی جس کے ڈانڈے صریحا سرکشی اور بغاوت سے جا ملتے، ظلم اور استبداد اور خلق خدا کا استیصال، شیطانی حربوں کے ذریعہ عوام الناس کو فساد میں مبتلا رکھنا، انھیں حیوانیت اور شہوانیت میں غرق رکھنا اور صالح، خداترس عناصر کی بیخ کنی اس حریف کے امتیازات تھے۔ کچھ کیفیت قرآنی نمرود اور فرعون کی!

مولاناؒ نے جب ہوش کی آنکھوں سے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا تو مغرب کا عفریت پوری دنیا بالخصوص عالم اسلام کو اپنے شکنجے میں جکڑے ہوا تھا۔ ترکی میں بنیادی اور قدیم ترین اسلامی ادارے خلافت کا سقوط، پورے عالم عرب پر سیاسی بالادستی اور ثقافتی یورش، عالم اسلام کے عین قلب اور قبلہ اول میں صہیونیت کی سرپرستی، بلقان، طرابلس، سوڈان، افغانستان حتی کہ حجاز مقدس میں مسلح افواج کا نرغہ اور خود مولانا کے اپنے وطن ہندوستان میں پے در پے اور منظم طور پر ایسے اقدام جن کی زد مانند برق مسلمانوں کے تشخص اور اجتماعی مفادات کو خاکستر کر رہی تھی۔ اس پر مستزاد مزید خطرناک فتنہ مغربی تعلیم اور تہذیب کا تھا جس کی قربان گاہ پر نسل در نسل ہندوستانی مسلمان اپنے دین اپنی روایات اور اپنی میراث سے غافل اور برگشتہ ہو رہے تھے۔ مستشرقین کی علمی کاوشوں کا واحد مقصد مسلمانوں کے قلوب اور اذہان میں تشکیک کے بیج بونا اور اپنی تاریخ

www.abulhasanalinadwi.org

اور تہذیب سے متنفر کرنا تھا۔ غرضیکہ مولانا کا تعارف مغرب سے محض ایک نظریاتی حریف کے طور پر نہیں بلکہ ایسے زور آور حریف کی شکل میں ہوا جو ان کے اپنے ہی چمن پر غاصبانہ قبضہ ہی نہیں رکھتا بلکہ اس کے انتظام اور انصرام میں اپنی تمام تر عیاری کے ساتھ پوری طرح دخیل، اس کا تسلط صرف زمین ہی تک محدود نہیں بلکہ وہ اہل چمن کے دل ودماغ کو مسموم اور محکوم کیے ہوئے تھا۔

یہ وہ پس منظر تھا جس میں مولانا کو مغرب سے واسطہ پڑا مغرب کی اس شیطنت بھری دراندازی، اس استحصالی رویے اور اس کا طاغوتیت کے خلاف اگر مولانا کارد عمل شدید جارحانہ اور معاندانہ ہوتا تو کچھ ایسا عجب نہ ہوتا لیکن اسے مولانا کی اپنی عابدہ اور زاہدہ والدہ ماجدہ کے زیر عاطفت صحیح اسلامی تربیت کا فیضان کہیے یا پھر خود مولانا کے اپنے قلب سلیم کا کارنامہ کہ فکر مغرب اور اہل مغرب کے بارے میں ان کا رویہ تنفر، بغض اور عناد سے مملو نہیں، وہ ایک ہزیمت خوردہ عسکری قائد کی طرح اپنے دشمن کے خلاف اٹھتے، بیٹھتے اپنے غم اور غصے کا غبار نکالتے نہیں نظر آتے، اپنے شکست زدہ متبعین کے دل ودماغ میں آتش انتقام سلگاتے اور بھڑکاتے نہیں بلکہ مولانا کے نقد واحتساب کا رنگ وہ ہے جسے حکیم مطلق نے قرآن کریم میں جنگ احد میں مسلمانوں کی شکست کا تجزیہ کرتے ہوئے اختیار کیا ہے۔ اپنی کمزوریوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ، رجوع الی اللہ کی تلقین، ہر گوشۂ زندگی میں اسلامی احکام اور اقدار کی بجا آوری پر اصرار، اپنے دین کی حقانیت پر ایمان اور ایقان کی ضرورت، اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ تج دینے کا جذبہ اپنی صفوں میں انتشار سے گریز اور اتحاد اور اتفاق کی ترغیب، باطل کی ریشہ دوانیوں سے اپنی حفاظت۔ غرضیکہ مولانا نے اپنے عہد کے سب سے بڑے فتنے۔ مغرب کی سیاسی، فکری اور فوجی یلغار سے مقابلہ کرنے کی حکمت عملی قرآن مجید جیسے نسخۂ کیمیا سے حاصل کی اور ساری عمر اسے حرز جاں بنائے رکھا، اس کی تشریح اور تعبیر مولانا کی ہر اس گراں قدر تصنیف میں نظر آتی ہے جس میں انھوں نے فکر مغرب کا علمی تعاقب کیا ہے اور عالم اسلام کو اس کے مضمرات سے آگاہ کیا ہے اس کی روشن

www.abulhasanalinadwi.org

مثالوں کے طور پر مولانا کی مندرجہ ذیل تصانیف کا مطالعہ از حد مفید ہوگا:

Islam and the west

western Civilizaton- Islam and Muslims

Faith versus Materialism

From the Depth of the Heart in America

Islam in a Changing world

Speaking plainly to the west

the Role and Responsibilities of Muslims in the west

Dawah in the west: the Quranic Paradigm

یہ اضافہ البتہ ضروری ہے کہ طلسم مغرب کو پاش پاش کرنے کے ان کے اس عصائے کلیمی میں کچھ آب و تاب ان کے بعض متقدمین کی مرہون منت بھی ہے جس کا بڑی شکر گزاری کے ساتھ فیاضانہ اور کریمانہ اعتراف خود مولانا نے کیا ہے۔ اس ضمن میں خصوصی ذکر کے مستحق ڈاکٹر اقبال، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ مولانا کے ان باکمال پیشرو اہل قلم نے اپنے اپنے مخصوص اسلوب اور محاورۂ بیان میں فکر مغرب کی کجی کو واشگاف کیا ہے۔ وقت کی تنگی کے باعث مولانا کے اس استفادے کے جملے پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہیں اس کی محض ایک جھلک خود مولانا کی تحریروں کے اقتباس کے ذریعے پیش ہے جس میں مولانا نے مولانا دریابادی اور مولانا مودودی سے خوشہ چینی کا ذکر کیا ہے۔ مولانا دریابادی کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

"اب وہ زمانہ آیا کہ میرا ذہن بلوغ کی منزلیں طے کرنے لگا، بڑے بھائی صاحب کی صحبت میں مغربی تہذیب کی سطحیت اور موجودہ تمدن کا کھوکھلا پن نمایا ہونے لگا، اس موقع پر سچ کے پرچے جو ندوہ کی طالب علمی اور مولانا سے روز افزوں

www.abulhasanalinadwi.org

تعلق کی بناء پر باقاعدہ مطالعے میں آنے لگے تھے، بڑی رہنمائی کرنے لگے اور ان سے ذہن اور شعور کو فراوانی کے ساتھ غذا ملنے لگی۔ "سچ" کے مطالعے نے دو بڑے کام کئے ایک مغربی تہذیب کی جسے مولانا یاجوج اور دجالی فتنے سے تعبیر کرتے تھے حقارت اور بے وقعتی اور اس کے ثبوت میں دلائل اور واقعات کی فراہمی جو مولانا برطانیہ سے نکلنے والے انگریزی پرچوں سے براہ راست مہیا فرماتے تھے۔۔ مولانا انگلستان اور ہندوستان سے نکلنے والے پرچوں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنے حقائق اعداد و شمار، تہذیب مغرب کی ناکامی اور اس کی انسانیت دشمنی کی مثالیں پیش کرتے رہتے تھے کہ آنکھیں کھل جاتیں"

(سید ابوالحسن علی ندوی پرانے چراغ حصہ دوم، کراچی مجلس نشریات اسلام، ۱۹۸۰ء ص ۱۴۹۔۱۴۸)

مولانا مودودی کے ذیل میں مولانا رقم طراز ہیں :

"(مولانا مودودی) کی تحریریں اور مضامین مغرب کی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات کے گہرے مطالعے اور ذاتی واقفیت پر مبنی ہیں۔ انھوں نے ایسے مبصرانہ اور جرأت مندانہ انداز میں اس کی تنقید اور اس کی علمی تحلیل اور تجزیے کا فرض انجام دیا ہے جو خود اعتمادی سے بھر پور اور مرعوبیت اور سطحیت سے دور ہے۔ انھوں نے بارہا مغربی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات کے بارے میں اقدامی پوزیشن اختیار کی اور خود اس کی بنیادوں اور جڑوں پر تیشہ زنی کی۔

میرے مولانا کی تحریروں اور جماعت کے لٹریچر سے تأثر اور وابستگی کی بنیاد مولانا کے وہ فاضلانہ تنقیدی مضامین تھے جو انھوں نے مغربی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات اور موجودہ مادی نقطۂ نظر کے خلاف لکھے تھے۔ یہاں میرے اور مولانا کے خیال میں وہی توارد تھا جو ایک چھوٹے اور بڑے نو مشق و کہنہ مشق مصنفوں کے درمیان ہو سکتا ہے"

(حوالہ بالا، ص ص ۳۰۱۔۳۰۰ اور ۳۱۳)

www.abulhasanalinadwi.org

ہر چند کہ بکمالِ انکسار مولانا نے اپنی فکر کو "توارد" سے تعبیر کیا ہے در حقیقت فکرِ مغرب پر ان کی تنقید ان کے طباع اور دراک ذہن اور داعی اسلام کے شایانِ شان پورے عالم انسانیت کے لئے ہمدردی اور خیر خواہی سے معمور پرسوز قلب کی آئینہ دار ہے، وہ مغرب کے عیارانہ ذہن سفاکانہ ذہنیت سازشی مزاج سے بخوبی واقف اور معترض بھی نظر آتے ہیں لیکن پیغام قرآنی سے رچا بسا ان کا تجزیہ فکر مغرب کے اعتقادی اور نظریاتی مآخذ اس کی مادہ پرستی اور اس کی نفسانیت سے سروکار رکھتا ہے جسے وہ بنی نوع انسانی کے لئے سم قاتل سمجھتے ہیں ایک داعی کے طور پر ان کی توجہ تمام تر مرض کی تشخیص اور اس کے ازالے پر مرکوز رہتی ہے وہ مغربی قوتوں کے خلاف جذباتی انداز میں جہاد کا اعلان عام کرتے ہوئے نظر نہیں آتے وہ مغربی سربراہان مملکت کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار بھی نہیں کرتے وہ اقوام مغرب کو میدان جنگ کے عسکری فریق کے طور پر بھی نہیں متصور کرتے بلکہ وہ انھیں بڑی حکمت، بڑی دل سوزی کے ساتھ حق کی جانب متوجہ کرتے ہیں وہ انھیں مغربی تہذیب کے تباہ کن پہلوؤں سے خبردار کرتے ہوئے اسلام کا ابدی اور حیات بخش پیغام پیش کرتے ہیں وہ مسلمانوں کو سائنس اور ٹیکنولوجی کے میدان میں جدید تحقیقات سے محترز رہنے کا فتوی نہیں دیتے بلکہ ہر شعبۂ زندگی میں انھیں اسلامی اقدار کو جاری اور ساری رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ شتر مرغ کی طرح حقائق سے چشم پوشی نہیں کرتے بلکہ وہ مسلمانوں کو قرآن مجید کی اس ہدایت کی تذکیر کرتے ہیں کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باطل کا کس طور پر مقابلہ کیا جائے۔ وہ مستشرقین کے افتراء اور بے بنیاد اعتراضات کا پردہ ہی چاک نہیں کرتے بلکہ مسلمانوں کو یہ حیات بخش درس بھی دیتے ہیں کہ وہ علوم اور فنون پر ایسی دسترس حاصل کریں کہ دنیا اسلام کے ضمن میں مستشرقین کی تصانیف کی محتاج نہ رہے، وہ عالم اسلام پر مغرب کی یلغار کی صرف مذمت اور ماتم ہی نہیں کرتے وہ اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت کو بھی اجاگر کرتے ہیں کہ مسلم معاشرہ دور جدید کے مسائل کا حل تلاش کر لے۔ وہ مسلمانوں پر مغرب کے ظلم اور استبداد کے بیان ہی

پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ مسلمانوں کو اپنے آپ کو ان معاشرتی برائیوں اور لعنتوں سے پاک ہونے کی ہدایت بھی کرتے ہیں جو غیر اسلامی طرز حیات اختیار کرنے کے باعث ان کے معاشرے میں در آئی ہیں وہ صرف مغربی تہذیب کے ننگ انسانیت پہلوؤں ہی کو نہیں نمایاں کرتے بلکہ مسلمانوں کو احکام قرآنی، اسوۂ رسول اور صحابہ کرام کے نقش قدم پر عمل پیرا ہونے کا حیات پرور درس بھی دیتے ہیں۔ وہ مغرب کی اسلام دشمن قوتوں کے خلاف مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکاتے اور دہکاتے نہیں بلکہ مسلمانوں کو اس حکم الٰہی کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ بنی نوع انسانی کے لئے امت مسلمہ رحمت، شفقت اور موعظت کا درجہ رکھتی ہے۔

یہ اجمالی ذکر مولانا کے نقد مغرب کا ہوا ان کی اسی تابندہ فکر کے جلوے دیار مغرب میں ان کی عملی دعوت میں بھی نمایاں ملتے ہیں۔ اس داعی اسلام کو اللہ نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے مغربی ممالک کے متعدد اور طویل اسفار کے مواقع فراہم کئے۔ مولانا نے اپنی بصیرت سے نہ صرف مغربی طرز حیات کا بغائر مطالعہ کیا بلکہ اس سے اہم تر کارنامہ یہ انجام دیا کہ دیار مغرب میں مقیم لاکھوں مسلمانوں کی دینی، فکری اور علمی قیادت کا نازک فریضہ بھی بدرجہ احسن انجام دیا۔ راقم السطور کے انگلستان میں اپنے طویل دورِ قیام (۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۳ء) میں بارہا وہاں مولانا کی تشریف آوری ہوئی ان کے ورود سعود پر مقامی مسلمانوں کا جوش و جذبہ قابل دیدنی ہوتا۔ کچھ کیفیت وادی غیر ذی زرع میں حیات بخش بارش کی سی ہوتی کہ ہر شخص اس کا منتظر ہر شخص اس سے سیراب ہونے کا مشتاق مولانا کی شخصیت ہی کچھ ایسی طاہر اور مطہر تھی، ہر چند کی انگلستان کے مسلمان ہندوستانی اور پاکستانی کی کھلی ہوئی تفریق کے علاوہ بیسیوں مسلکی، جغرافیائی، لسانی اور نسلی تفرقوں میں تقسیم در تقسیم اور مسلکی عصبیت میں گرفتار اور اپنے اپنے شیخ سے وابستگی ان پر ایسی حاوی کہ اتحاد بین المسلمین کے خوش کن منظر کو نگاہیں عموماً ترسا ہی کرتیں۔ مولانا کی مسحور کن شخصیت میں رب کائنات نے کچھ ایسی مقناطیسیت رکھ دی تھی کہ ان کی آمد کے موقع پر مسلکی اور گروہی اختلافات کی

www.abulhasanalinadwi.org

دیواریں ڈھے جاتیں اور ملی اتحاد سے فضاء معطر ہو جاتی اس میں بڑا دخل مولانا کی ہر تقریر میں اس التزام کا ہوتا کہ وہ انھیں ملی اتحاد پر ہر ممکن طریقے سے ابھارتے مولانا کی تلقین یہی رہتی کہ ہر کار خیر میں سب مسلمان بلا تفریق مسلک سب سے تعاون کریں اس میں رنگ آیت کریمہ (المائدہ : ۲) کی تفسیر کا نظر آتا جس میں اللہ تبارک وتعالی نے مسلمانوں کو نیکی اور تقوی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا حکم دیا ہے۔

ابھی ذکر آیت کریمہ اور اس کی مولانا کے یہاں تفسیر کا ہوا۔ اس ضمن میں مولانا کی یہ کرامت قابل ذکر ہے جس کا برائی العین مشاہدہ بارہا ہوا کہ مولانا کی تقریر سے قبل دستور کے مطابق مقامی منتظمین مقامی قاری سے تلاوت کلام پاک کا نظم کرتے، ادھر قاری صاحب کی تلاوت ختم ہوئی اور مولانا سے تقریر کی درخواست ہوئی کہ معاً مولانا تلاوت کی ان ہی آیات کو اپنی تقریر کا موضوع بنا لیتے اور اس کی تعبیر تعبیر اور تشریح میں ایسے حقائق ایسے معارف ایسے نکات برآمد کرتے جو سامعین کی ذہنی سطح کے مطابق ہوتے اور ان کا دامن وعظ اور تذکیر سے مالا مال کر دیتے۔ تخلیقی فن کار کی شان آمد میں ہے ان مجالس میں کلام اللہ کے شارح کی یہی شان نظر آتی کہ آورد کا گمان تک نہ ہوتا۔ یہ اضافہ غالباً غیر ضروری ہے کہ مولانا کی ہر تقریر، قطع نظر اس کے کہ وہ اردو میں ہوتی یا عربی میں فصاحت اور سلاست ان کی بلائیں لیتی، انداز کی دل نشینی ایسی کہ سامعین ہمہ تن گوش ہوتے اور از دل خیزد بر دل ریزد کا سماں ہوتا۔ راقم الحروف کو مولانا کی انگلستان میں بعض تقاریر کے انگریزی ترجمے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اپنی مطبوعہ شکل میں اپنی ضخامت اور اپنے مندرجات کی بلاغت کے لحاظ سے بے ساختہ تقاریر کا درجہ مولانا کی کسی دیگر معیاری تصنیف سے کم نہیں۔ اہل نظر حضرات سے غالباً یہ نکتہ مخفی نہ ہوگا کہ بے ساختہ تحریر اور باضابطہ تصنیف میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اسے مولانا کی ذکاوت کا کرشمہ کہئے کہ ان کے ہاں تفریق نہیں ملتی۔ جس شخص نے اپنے آپ کو اللہ کے کلام کی اشاعت کے لئے وقف کر رکھا ہو اس

www.abulhasanalinadwi.org

پر اللہ کا یہ فضل کچھ ایسا عجب نہیں کہ وہ اسے تحریر اور تقریر دونوں پر بیک وقت اور یکساں قدرت مرحمت فرمادے۔

اور ایک اسی امتیاز ہی پر کیا موقوف، مولانا کے امتیازات متعدد تھے ان کے شمار ہی کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ یہاں موضوع گفتگو دیار مغرب میں ان کی دینی اور علمی فتوحات کا ہے۔ ان کی تقاریر کے موضوعات یہ ہوتے۔ اتحاد بین المسلمین کی تلقین، دیار مغرب میں اپنے کردار اور گفتار کے ذریعے اسلام کی حقانیت کی نمائندگی، اسلامی عقائد کی صلابت کا اہتمام، اسلامی اقدار کی محافظت، حضور اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کی نیابت، اپنے جملہ فرائض کی حسن وخوبی بجاآوری، اپنے اخلاق اور اعمال پر کڑی نظر اور سب سے بڑھ کر فکر آخرت اور موت کا استحضار۔ یہ نکات خشک اور بوجھل تقریروں کی شکل میں نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے واقعات کے لطیف پیرایہ میں شگفتہ انداز اور سلیس ٹکسالی زبان میں اس طرح ادا ہوتے کہ پندنامے یا وعظ کا گمان ہوتا اور اللہ کا یہ نیک بندہ یاجوجی تہذیب اور مادہ پرستی کے اسیر ان مسلمانوں کو صراط مستقیم کا روشن اور واضح راستہ دکھا دیتا۔

مولانا کے تعمیری اور مثبت طرز فکر کا اجمالی تذکرہ اس صراحت کے بغیر کچھ نامکمل سا رہے گا کہ مولانا نے دیار مغرب میں ایسے اداروں کی سرپرستی اور اعانت فرمائی جن کا مقصد اہل مغرب کو اسلام کی تعلیمات سے انگریزی زبان میں اور جدید محاورہ بیان میں روشناس کرانا ہے آکسفورڈ کے اسلامی مرکز کے وہ بانی صدر تھے اس کے علاوہ اسلامک فاؤنڈیشن، لیسٹر، اسلامک اکیڈمی کیمبرج اور لیسٹر، دارالعلوم بری اور ڈریوزبری وغیرہ بھی ان کی سرپرستی سے فیض یاب ہوتے رہے۔

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
اقبال

www.abulhasanalinadwi.org

حضرتؒ کی تدریسی خدمات

محمد شاہد ندوی بارہ بنکوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی تدریس قرآن اور تفہیم دین میں گذری اور وہ زمانہ جو اصطلاحی لحاظ سے درس و تدریس میں گذارا ہے اس کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) پابند نظام تدریس کا زمانہ جو ایک تنخواہ دار مدرس کی حیثیت سے گذارا، وہ عرصہ گیارہ سال اور چند ماہ پر مشتمل ہے (۱۹۴۵ء۔ ۱۹۳۴ء)

(۲) مسجد دارالعلوم میں نوجوان اساتذہ کی فرمائش پر ۱۹۴۸ء میں ایک حلقہ درس قائم ہوا جو آٹھ ماہ تک جاری رہا۔

(۳) المعهد العالي للدعوة والإرشاد میں محاضرات دیئے[۱] (جو مطبوعہ شکل میں موجود ہیں)

(۴) زندگی کے آخری پندرہ سال بھی اس طرح باقاعدہ گذرے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے آخری درجہ فضیلت کی ایک جماعت رائے بریلی جاکر وہاں قیام کرتی اور حضرت مولانا ایک یا دو درس دیا کرتے یہ سلسلہ ۱۹۸۴ء سے لے کر ۱۹۹۹ء تک جاری رہا یعنی جس سال کے آخری دن میں آپ کی وفات ہوئی۔

---

[۱] یہ محاضرات "روائع من أدب الدعوة في القرآن والسيرة" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے اس کا اردو ترجمہ ہے "تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب، قرآن کریم اور سیرت نبوی کے ادبی شہ پارے۔

www.abulhasanalinadwi.org

تدریسی خدمات کے ضمن میں جو بات قابل ذکر ہے اور جس سے دوسرے اساتذہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ کی تدریس میں کیا انفرادیت تھی؟ یوں تو ہر جگہ الحمد للہ تعلیم کا سلسلہ جاری ہے اور کسی کی بھی خدانخواستہ ادنی درجہ کی تنقیص مقصود نہیں ہے، مگر مولانا کی تدریس کے اندر کچھ خصوصیت تھی جو دوسرے روایتی طریقۂ تعلیم سے جدا تھی اس کے علاوہ جو تفاصیل ہیں ان کی حیثیت صرف تاریخ بیانی کی ہے ان سے کوئی علمی فائدہ طلباء یا اساتذہ کو نہیں ہو سکتا۔

پہلا دور: جب بیس سال کی عمر میں ایک تنخواہ دار مدرس کی حیثیت سے آپ نے پڑھانا شروع کیا۔ اس کام پر تقرری کس طرح ہوئی اور یہ تعلق کب تک قائم رہا اور کیوں کر یہ تعلق منقطع ہوا اس روداد کو حضرت مولانا مرحوم نے اپنے خود نوشت سوانح کاروان زندگی کی پہلی جلد میں قلم بند کر دیا، اس دور میں جن بزرگان علم و تربیت نے آپ کی سرپرستی فرمائی اور دفتری امور کے جن حضرات نے انتظامی امور میں سہولیت پہنچائی وہ سب بے کم و کاست آپ نے بیان کر دیا، آپ پر جو لوگ ریسرچ کر چکے ہیں یا جو اہل علم اب کر رہے ہیں وہ "حقائق وارقام" (Facts & Figures) کاروانِ زندگی کے پہلے حصہ سے حاصل کر سکتے ہیں، چونکہ ان تفاصیل کی کوئی علمی اہمیت نہیں ہے صرف تاریخی یادداشت ہے اس لئے ہم اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے، دیکھنا یہ ہے کہ زمانہ تدریس میں آپ نے طلباء کو کیا دیا اور آپ کی تدریس کا انداز کیا تھا کس بات پر اور کس طرح زور دیتے تھے وہ علمی اسپرٹ کیا تھی جو طلباء کے اندر پیدا کرنا چاہتے تھے، حضرت مولانا نے کاروان زندگی میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے ان کے مزاج، جو تواضع بلکہ "انکار ذات" پر ڈھلا ہوا تھا، سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ان باتوں کا ذکر کریں گے جن سے آپ کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔

حضرت مولانا کے فطری اور غیر مصنوعی تواضع کا ذکر جو عربی اصطلاح کے مطابق "انکار ذات" تک پہنچا ہوا تھا اس کو عرب اسکالرز اور وہاں کی یونیورسٹیوں کے پروفیسروں نے محسوس کیا اور اس کا ذکر وضاحت کے ساتھ کیا (ملاحظہ ہو **الأدب الإسلامي** - ریاض کا خاص نمبر جو آپ کی سیرت پر شائع ہوا ہے اس میں پروفیسر محمد رجب البیّومی اور ڈاکٹر ابو جابر قیمیحہ کے مضامین۔ ص۔ ۱۸، ص۔ ۷۶)

آپ کا اسلوب تدریس اس دور میں جب کہ سبقاً سبقاً کتاب پڑھاتے تھے، کیا تھا اس پر روشنی ڈالنے والے وہ حضرات ہیں جو آپ کے اس دور میں ندوہ کے طالب علم تھے۔ اور ان کے تعلیمی حصص (گھنٹے) آپ کے یہاں تھے، ان حضرات میں جو لوگ زندہ رہ گئے ہیں ان میں

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی بھی ہیں جنھوں نے اپنی کتاب "میر کارواں" میں اس کو کسی درجہ تفصیل سے بیان کیا ہے، ندوہ میں اساتذہ کی تقریر لکھنے کا رواج نہیں تھااور اس زمانہ میں ٹیپ ریکارڈنگ کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھااس لئے تحریری طور پر جو موجود ہے وہ مجھے یا جو بھی اس گوشہ پر روشنی ڈالنا چاہے وہ اسی کتاب سے نقل کرنے پر مجبور ہے۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی مدظلہٗ نے اپنے کتاب کی ابتداء حضرتؒ کے درس اول کی تمہیدی تقریر کے چند جملوں سے کی ہے جو آپ کے انداز تدریس کی ایک تصویر ہے، لکھتے ہیں:

"دینی تعلیم کے لئے کسی مدرسہ میں آنا ایک طرح کی قربانی ہے، سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو جو دنیاوی منافع کی توقع رہتی ہے وہ مدرسوں میں پڑھنے والے طلباء کو نہیں ہوتی ہے، زمانہ کا رخ جس بہاؤ پر ہے اس کے مخالف رخ پر چلنا آسان نہیں، اس کے لئے عزم کی ضرورت ہے اور سب سے پہلے نیت کی تصحیح ضروری ہے، مدرسے قربانی کی چھاؤنیاں ہیں، اگر کوئی ان مدرسوں میں بغیر عزم و نیت اور بغیر جذبۂ ایمانی کے جاتا ہے اور اس کے نزدیک ترقی کا معیار وہی ہے جو سرکاری کالجوں کے طلباء کے نزدیک ہے تو اس کے لئے خسارہ کا بڑا خطرہ ہے"۔

۱۳۵۸ھ میں شوال کا مہینہ نومبر ۱۹۳۹ء میں پڑا تھا، راقم کا داخلہ درجہ پنجم میں ہوا تھا، جس میں مخدوم و مربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہٗ کے دو گھنٹے تھے، ایک عربی نثر کا جس میں "مختارات" خود مولانا کی تالیف پڑھائی جاتی تھی، اور اس وقت تک "مختارات" طبع نہیں ہوئی تھی، قلمی مسودہ سے ہم لوگ اسباق نقل کرتے تھے، اور دوسرا گھنٹہ قرآن کریم کے ترجمہ و تشریح کا تھا۔ ۷؍شوال کو میرا داخلہ ہوا تھا قرآن کریم کا گھنٹہ نماز ظہر سے پہلے ہوا کرتا تھا، مولانا کو پہلی بار اس درجہ میں دیکھا اور پہلا سبق ۱۴؍شوال ۱۳۵۸ھ کو ہوا، سبق سے پہلے تمہیدی تقریر میں مولانا نے جو ارشاد فرمایا تھا وہ یہی تھا جو اوپر نقل کیا گیا، الفاظ میں خفیف ردو بدل کا امکان ہے مگر مفہوم کا جہاں تک تعلق ہے وہ یہی تھا، اکثر الفاظ بھی اس تقریر کے یاد ہیں، تصحیح نیت، عزم قربانی کی چھاؤنیاں وغیرہ"[۱]

ادب عربی کی تدریس کے سلسلہ میں مولانا عبداللہ عباس ندوی مدظلہٗ تحریر فرماتے ہیں:

"عربی زبان وادب سے مولانا کا تعلق اسی طرح کا رہا جیسے کسی کو مادری زبان سے ہو، اور پھر اس زبان کے ادبیات کو پڑھا بھی ہو، اور صحبتیں بھی ادباء اور اہل ذوق کی ملی ہوں، ایک غیر زبان داں لغت کے الفاظ زیادہ سے زیادہ یاد کر کے زبیدی بن سکتا ہے، نحو کے مسائل

---

[۱] میر کارواں ص ۲۳ تا ۲۴۔

www.abulhasanalinadwi.org

کی باریکیاں اپنے مطالعہ سے اس درجہ میں سمجھ سکتا ہے کہ سیبویہ بن جائے، اس کے مقابلے میں وہ شخص جس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ تو نہ ہو اور صرف و نحو اور بلاغت کے مسائل کا حافظ ہو مگر زبان سے فطری تعلق رکھتا ہو، اور بچپن سے اس کو اہل زبان سے سیکھتا آیا ہو، زبان و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے والوں کی صحبتیں اٹھائی ہوں، اچھے شعر، پاکیزہ جملوں، چبھتے ہوئے فقروں کی لذت اس کو حاصل ہو اس کی سطح ''مفردات لغت کے بڑے بڑے جاننے والوں'' سے ممتاز ہوگی۔

مولانا نے عربی کی ابتدائی کتابیں اور نظم و نثر کا معتدبہ حصہ مولانا خلیل عرب صاحب سے پڑھا، یہ اہل زبان بھی تھے اور صاحب ذوق بھی، انھوں نے چند ابتدائی کتابیں پڑھانے کے بعد عربی میں گفتگو کرنے پر پابند کر دیا تھا، اور اردو بولنے پر جرمانہ عائد کیا کرتے تھے، ادبیات کی اعلیٰ تعلیم تقی الدین الہلالی سے حاصل کی جو عربی زبان و ادب میں صف اول میں شمار کئے جاتے تھے، خود عرب نژاد اور ماہر فن تھے، اس طرح مولانا کی عربیت میں عجمی آمیزش نہیں ہے، مصر و شام کے لکھنے والوں، ادباء اور اہل فکر سے مولانا کی واقفیت اسی طرح کی رہی جیسے کوئی اپنی زبان کے مشہور نثر نگاروں اور شعراء سے واقف ہو وہاں کی علمی تحریکات، سیاسی رجحانات اور شخصیات سے واقفیت ہی نہیں بلکہ ان کے امتیاز یا اوصاف سے آگاہی ہمیشہ حاصل رہی۔

جن بزرگوں کی صحبتیں ملیں ان میں ان کے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب کا نام نمایاں ہے، یوں خود خاندان مصنفوں اور ادیبوں کا ہے، والد ماجد مورخ ہند، جد امجد مورخ و ادیب، قریب ترین عزیزوں میں مولانا ابوالخیر صاحب تھے جن کو صحیح مسلم تقریباً ازبر تھی، والدہ ماجدہ خود صاحب دیوان، طبع موزوں اور سوز دروں کی دولت پائی ہوئی بی بی تھیں، ادب کا ذوق صرف الفاظ یاد کرنے یا قواعد نحو کے ضوابط یاد کرنے سے نہیں بلکہ ماحول، تعلیم، مطالعہ اور خاندانی اثرات سے تعمیر پاتا ہے، جس کے مجموعہ کو عربی میں سلیقہ کہتے ہیں، مولانا کو یہ سلیقہ لغویہ یا سلیقہ ادبیہ قدرت نے پوری فیاضی کے ساتھ عطا فرمایا ہے۔

مولانا عربی ادب جس طرح پڑھاتے تھے وہ عام مروجہ طریقوں سے بہت مختلف تھا، وہ لفظ کی تشریح میں اس کا نسب نامہ اور تاریخ نہیں بتاتے تھے جس سے معلوم ہو کہ لغت میں اس کی اصل یہ ہے پھر فلاں مناسبت سے یہ معنی لئے جانے لگے، اور اس کو فلاں شاعر نے اس معنی میں باندھا ہے، یہ موضوع ادب کا نہیں ہے بلکہ مفردات لغویہ کی تاریخ کا ہے کہ ایک لفظ کے استعمال میں جو توسع ہوتا رہا اور ابتدائی مفہوم اور موجودہ مفہوم میں کیونکر منتقل ہوا، اس کو انگریزی میں Semantics کہتے ہیں۔ یہ فن ادب نہیں بلکہ فن لسانیات کی ایک شاخ ہے

www.abulhasanalinadwi.org

جس کو عصر حاضر کے علمائے لسانیات ادب میں شامل نہیں سمجھتے اور اس کے معقول اسباب ہیں، ادب مفردات کی تحقیق کا نام نہیں اس میں گفتگو اس سے ہوتی ہے کہ کس بات کو کس طرح ادا کیا جارہا ہے پھر یہ کہ اس کلام کا ادبی حس پر کیا اثر پڑرہا ہے، مخاطب مفہوم کو کسیلے، کڑوے گھونٹ کی طرح برداشت کرتا ہے یا فرحت بخش شربت کی طرح قبول کررہا ہے، اگر شربت کی طرح اس کا مزاج قبول کررہا ہے تو دولمرے انواع کی مشروبات سے کس درجہ اور کس طرح مختلف ہے۔

الحمد للہ ندوہ کے درجہ پنجم میں مختارات پڑھتے وقت جس بات نے طبیعت کو قبول کیا ہے اس کی حرف بہ حرف تصدیق آج اس عمر میں ہورہی ہے جب کہ بلاغت اور لسانیات پڑھانے کا اور لکھنے کا کافی موقع مل چکا ہے، مولانا کا طرز یہ تھا کہ ایک عبارت جو سامنے آگئی اس کے اندر عربیت کی جو روح ہوتی اس کو اس طرح اجاگر کرتے کہ پہلے اس کو ایک بار خود دہراتے جیسے مصری کی ڈلی منہ میں پڑی ہے اور کام ودہن اس کی شیرینی سے حسی طور پر لطف اندوز ہورہے ہوں، یا جس طرح کوئی چبھتا ہوا فقرہ یا اچھا مصرعہ سن کر پھڑک جائے، ادبی مقطوعہ کا اثر ادبی حس پر اس طرح ہوتا ہے جیسے بجلی کا کرنٹ کسی مادی جسم پر برف کی ایک ڈلی یا آگ کی چنگاری جب جسم سے چھو جاتی ہے تو اس کا اثر قبول کرنے کے لئے آگ یا برف کے فارمولے اور اس کی حقیقت اولیٰ جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی، بعینہ یہی حال کسی بات کے اثرات کا ہے، جس کے وقوع اور تاثیری کیفیت پیدا کرنے کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوتا، جن لوگوں کو ادباء کی صحبت میں بیٹھنے سے ادبی ذوق ملتا ہے یا شعراء کی محفلوں میں شرکت سے شعر کے محاسن کی تمیز ہوجاتی ہے وہ ان صحبتوں یا محفلوں میں حسن بیان کے اسرار ورموز پر لکچر نہیں سنا کرتے بلکہ صاحب ذوق کی دل اندوزی، اس کے وجدان پر اہتزازی کیفیت کسی لفظ کو مکرر، سہ کرر دہرانا ان کے احساس و وجدان کے اندر ادبی قبولیت کا سوتا کھول دیتا ہے۔

ہمارے مولانا کا طرز تدریس بھی فطری و وجدانی تھا، وہ خود لطف اندوز ہوتے اور ان کی لطف اندوزی اور وجدانی اہتزار کا اثر غیر مرئی طور طلباء پر پڑا کرتا" [۱]

ادب عربی کی تاریخ جو احمد حسن زیات نے لکھی ہے وہ ندوہ میں داخل درس تھی (اب اس کی جگہ ندوہ کے دو ممتاز اساتذہ ادب [۲] نے اس فن کی تمام کتابوں کو کھنگال کر عصر اموی اور عصر عباسی پر علاحدہ علاحدہ کتابیں تیار کرلی ہیں) یہ کتاب ایک حسین اسلوب بیان کا نمائندہ ہے شعراء و ادباء کی سوانح اور ان کے تحریری نمونے اور محاکمہ بہت جامع ہے، جو زیادہ تر

---

[۱] میر کاررواں ص ۸۰۔۸۳

[۲] مولانا سید محمد رابع حسنی اور مولانا سید واضح رشید ندوی

www.abulhasanalinadwi.org

جاحظ اور اصمعی سے منقول ہے، اس مجموعہ میں نمونۂ کلام کے ضمن میں جو نظم و نثر کے مقطوعات ہیں، وہ بھی خوان ادب کے لئے خاصہ کی چیزیں ہیں۔

یہ مکمل کتاب ہم سب (راقم اور اس کے ساتھی طلباء) نے درجہ ہفتم میں مولانا سے پڑھی ہے، مولانا کا طرز تدریس یہ تھا کہ مصنف کی رائے پر اکتفانہ کرتے بلکہ ہر شاعر ونثر نگار کے متعلق مزید معلومات بھی دیتے جو اس کے رنگ اور اسلوب بیان کو دوسرے سے ممتاز کرتا، اور ادباء کے اسالیب کا باہمی فرق اس طرح ظاہر ہو جاتا جیسے رنگوں کا فرق سفید، سیاہ، نیلا رنگ ایک دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے، اسی طرح اسالیب کا فرق بھی ذہن قبول کر لیتا، قرآن کریم کے اعجازی پہلو کو بغیر تحلیل و تجزیہ اور فنی و اصطلاحی موشگافیوں کے دل میں اتار دیتے کہ علم کلام (علم التوحید) پر لکھی ہوئی کتابوں کو پڑھ کر وہ تسکین نہیں ہو سکتی تھی جو مختلف پیرائے بیان کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کی کسی آیت کو پڑھنے کے بعد حاصل ہوتی ہے، ہم غیر عرب جو عربی ادبیات پر عمریں گنواتے ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ قرآن کی عظمت اور اس کے وحی الٰہی ہونے پر ایمان اس درجہ پختہ ہو جائے، جس کو بشاشت قلب کہتے ہیں، جیسے سخت پیاس میں کسی کو ٹھنڈے، میٹھے شربت کے گلاس سے آسودگی ہوتی ہے اور روئیں روئیں میں ایک تازگی اور زندگی آجاتی ہے، وہ بات قرآن کریم کی ایک آیت پڑھ کر حاصل ہو جائے، اگر کسی نے قاضی الفاضل، حریری، جاحظ کے ادبی مقطوعات کو علاحدہ علاحدہ پڑھا ہے تو طبیعت میں ایک طرح کا اہتزاز پیدا ہو جائے گا، اور دماغ ان فن پاروں کی خوبیوں کا معترف ہو جائے گا مگر انہی فن پاروں کو قرآن کریم کی کسی آیت کے مقابلے میں رکھئے تو ایسا محسوس ہوگا کہ ساحران فرعون کی نظر بندیوں کے مقابلہ میں عصائے موسیٰ سامنے آگیا، ”**فاذا هی تلقف ما یافکون**“ (تو ان کے تمام بنے بنائے دھندے نگلنا شروع کر دیا)

حضرت مولانا کی تدریس کا دوسرا دور وہ ہے جب آپ نائب معتمد تعلیم کی حیثیت سے تعلیمی امور کی نگرانی فرمایا کرتے تھے مولانا عبداللہ عباس ندوی مدظلہ لکھتے ہیں:

”مولانا سے استفادہ کی طلب یہاں سے فارغ ہونے کے بعد بلکہ خود مدرس تفسیر و ادب ہو جانے کے بعد بھی باقی رہی، اور اپنی اس کوتاہی پر پشیمانی رہی جو تحصیل علم کے زمانہ میں ہوتی رہی، اس لئے جب ۱۹۴۸ء میں ندوہ میں نیا نیا مدرس ہو کر آیا اور مولانا نائب معتمد کی حیثیت سے ندوہ کی طرف ملتفت ہوئے، اس وقت گذارش کی کہ ہم مدرسین ادب کو کچھ وقت دیا جائے تاکہ عربیت میں ذوق کی تربیت کا کوئی وسیلہ نکلے، مولانا نے ازراہ شفقت اس کو

www.abulhasanalinadwi.org

قبول فرمایا اور ندوہ کی مسجد میں ایک عمومی حلقۂ درس قائم ہوا، کسی کتاب کی قید کے بغیر عام ادبی محاسن کو ذہن نشین کرانے کے لئے محاضرات کا سلسلہ شروع کیا، اس حلقہ میں بہت سے طلباء بھی ہوتے اور اسی صف میں بڑی عمر و استعداد کے مدرسین بھی ہوتے تھے، اس سلسلۂ محاضرات میں مولانا نے "حماسہ" کے چند قصائد کا درس دیا، اس حلقۂ درس میں ادب کے نصوص اور بلاغت پر لکھی ہوئی نادر کتابوں کا تعارف حاصل ہوا، جیسے عسکری کی کتاب " **الالصناعتین** علی القالی کی **امالی**[۱] جاحظ کی مشہور کتابیں (**البخلا ، البیان والتبیین** وغیرہ) لیکن مولانا کا مذاق کہئے یا قرآن کریم سے والہانہ وابستگی، کہ بات کہیں سے شروع ہو گھوم پھر کر قرآن ہی پر آکر مرکوز ہو جاتی، وہ بات جو دل سے لگی ہو اور دماغ کی باریک سے باریک رگوں میں پیوست ہو اگر اس کا ذکر آجائے تو طبیعت کا جوش زبان کی روانی اور مضمون کی آمد کا ایک سلسلہ لگ جاتا، یہ تو یاد نہیں کہ کس کا ذکر تھا مگر اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ موضوع یہ تھا کہ اندرونی کیفیات کو بھی ایک لفظ یا ایک جملہ اس طرح ظاہر کر دیتا ہے جس کی تصویر بڑے سے بڑے قصیدہ یا طویل کلام سے بھی نہیں کھینچی جا سکتی، اس کو بیان کرنے کے لئے قرآن کریم کی سورہ اعراف کی وہ آیتیں پڑھیں جن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت اور دعوت سے انکار کے بعد زلزلہ سے پوری قوم کے ہلاک ہو جانے کا تذکرہ ہے، اس کے آخر میں ہے:

الذین کذبوا شعیبا کأن لم یغنوا فیھا الذین کذبوا شعیبا کانوا ھم الخاسرین فتولی عنھم وقال یا قوم لقد أبلغتکم رسالات ربی ونصحت لکم فکیف آسیٰ علی قوم کافرین۔
(الاعراف ۔۹۲۔۹۳)

جنھوں نے شعیب کی تکذیب کی تھی (ان کی یہ حالت ہوگئی) جیسے ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے جنھوں نے شعیبؑ کی تکذیب کی تھی وہی خسارے میں پڑگئے، اس وقت وہ (یعنی شعیبؑ) ان سے منھ موڑ کر چلے گئے اور فرمانے لگے اے میری قوم! میں نے تم کو اپنے پروردگار کے احکام پہنچا دیئے تھے اور میں نے تمھاری خیر خواہی کی، پھر ان کافر لوگوں پر کیوں رنج کروں۔

اس آیت کے صوتی و بلاغی محاسن کو الفاظ میں بیان کرنا محال ہے۔ **الذین کذبوا شعیباً** کی تکرار کتنی گہرائی اور رنج والم کی تصویر پیش کر رہی ہے اس کو کس طرح ترجمہ میں

---

[۱] اس کتاب کی شرح سمط اللآلی پر علامہ عبدالعزیز میمن کی شرح ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے، جس کے عربی النسل ماہرین فن اساتذۂ ادب معترف ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

نقل کیا جاسکتا ہے، مولانا نے فرمایا کہ آیت کریمہ کا آخری ٹکڑا **كيف آسىٰ على قوم كافرين** میں صرف یہ لفظ **كيف آسي** شفقت پدری اور حب نبوی کے ملے جلے رنج وحسرت دونوں کے اظہار سے پوری طرح جلوہ گر ہے کہ اس کے پیغمبر جس کے دل میں قوم کا درد ہے، جس کی اصلاح حال کے لئے اس نے جان توڑ کوشش کی، مگر وہ لوگ مصر رہے جس کی پاداش میں ان کو تباہ کردیا گیا، جس کی آگاہی پیغمبر وقت نے دے دی تھی۔ جو انجام کار سامنے آیا وہ پہلے سے معلوم تھا، سنت الٰہی کا قطعی علم تھا مگر پھر بھی وہ اپنے تھے، اپنی ہی قوم کے افراد تھے ان کی تباہی پیغمبر کے لئے فتح مندی نہیں ہے بلکہ ان کا حسرت ناک انجام موجب درد والم ہے یہ تمام نفسیاتی کیفیت اس لفظ **كيف آسىٰ** میں پورے جمال وکمال کے ساتھ موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس آیت کو بار بار پڑھا جائے تو حسرت والم کی تصویر سامنے آجاتی ہے اور پیغمبر کے دل کا اندوہ اس کے شفقت پدری کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے، دوسری طرف حکم ربی سے چارہ کار نہیں ہے، اس کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص ایسے فرزند کو زہر کھانے سے منع کرتا رہا اور بار بار اس کو جتلاتا رہا کہ اس کا نتیجہ موت ہے مگر وہ لڑکا بات ماننے پر تیار نہیں ہوا، پھر جب وہ زہر کھا کر مرجاتا ہے تو اس کا باپ اس کی لاش پر جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آہ! میں غم کا اظہار کن الفاظ میں کروں، اس جملہ میں اس کے دل کا درد اور صورت حال کا اعتراف دونوں نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، یہی صورت حال حضرت شعیب علیہ السلام کی نظر آتی ہے، جب وہ اپنی تباہ شدہ قوم کی لاشوں اور زلزلہ سے تباہ شدہ بستی کے ملبوں کے سامنے کھڑے فرمارہے تھے۔ **كيف آسىٰ على قوم كافرين**۔

خلاصہ یہ کہ تفسیر کی طرح عربی ادب میں بھی تدریس وتفہیم کا انداز **من قلب إلى قلب** (دل سے نکلے اور مخاطب کے دل میں اترے) کا رہا، جہاں نحو وبلاغت کی اصطلاحوں اور لفظ کا شجرۂ نسب حائل نہیں ہوتا۔ یہ بات ذرا نازک ہے اور ادب وزبان کے متعلق جو عمومی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اس کے خلاف ہے، اس لئے اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو تعجب کی بات نہ ہوگی۔

ع لذت بادہ نشناسی بخدا تا نچشی"[1]

مولانا کا تفسیری درس بھی اپنی نئی شان رکھتا تھا، مولانا عبداللہ عباس ندوی مد ظلہ لکھتے ہیں:

(الف) تفسیر کے سبق میں تلاوت وترجمہ کے بعد اگر کسی آیت کریمہ میں نحوی

---

[1] میر کارواں ۸۴۔۹۰

www.abulhasanalinadwi.org

ترکیب طلباء کے فہم سے بلند ہوئی، اس کی توضیح فرمادیتے، اسی طرح لفظ کی اس قدر تحقیق فرماتے جو مفید مطلب ہو مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عیسائیوں کے دو گروہ ہیں، ایک وہ گروہ جو سمجھتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ تعالیٰ کے (معاذ اللہ) اسی طرح فرزند ہیں جس طرح ایک باپ کا جسدی فرزند ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو قرآن نے جواب دیا:

إن مثل عيسى عندالله كمثل آدم خلقه من تراب ثم قال له كن فيكون (آل عمران ۵۲)	بے شک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے اسے مٹی سے بنایا پھر اس سے کہا ہو جا پھر ہو گیا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف جسدی باپ ہونے کی نسبت نہیں کرتا بلکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا متبنیٰ بنالیا ہے۔

وقالوا اتخذ الله و لدا (البقرہ۔۱۱۶)	اور انھوں نے کہا، اللہ نے ایک بیٹا بنالیا ہے

فرمایا: "**اتخذولدا**" کا صحیح ترجمہ "لے رکھا ہے ایک بیٹا" یا بنا رکھا ہے ایک بیٹا" یہاں عیسائیوں کا قول نقل نہیں ہو رہا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے فرزند ہیں، بلکہ یہ کہ خدا نے ایک بیٹا بنالیا ہے، **اتخذ** کا لفظی مفہوم بعینہ وہی ہے جو انگریزی میں To Adopt کا ہے، مسیحیوں کے یہاں ایک فرقہ ہے جسAdoptionat کہا جاتا ہے ان کے مرکزی عقیدہ کے لئے اصطلاح "تبنیت" کی وضع کی گئی ہے۔

اس اندازہ کی ضروری تشریح جس کے ساتھ کسی لفظ کا کوئی خاص پس منظر ہو وہ مولانا بتادیا کرتے تھے اس سے زیادہ لفظی تشریح نہیں فرماتے، ترکیب نحوی میں جہاں طلباء کے معیار کو دیکھتے ہوئے وضاحت کی ضرورت محسوس فرماتے وہ بھی بیان کردیتے مثلاً **وأشربوا في قلوبهم العجل بكفرهم** میں **أشربوا في قلوبهم حب العجل** کا مفہوم واضح کیا کہ گوسالہ کی محبت ان کے رگ وپے میں رچ گئی تھی، اور **بكفرهم** میں "ب" شبیہہ ہے، یعنی اپنے کفر کے سبب گوسالہ کی محبت میں وہ مست تھے۔ اس سال سبق کے دوران مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا تھا کہ قرآن کریم میں لفظ "نور" جہاں آیا ہے وہ مفرد کے صیغہ میں ہے اور ظلمات ہمیشہ جمع کے صیغہ میں وارد ہوا ہے، کیونکہ روشنی ایک ہی ہے اور وہ خدا کی بخشی ہوئی روشنی ہے بلکہ وہ خود نور ہے۔ **الله نورا لسموٰت والأرض** اور ظلمتیں اتنی ہیں جن کا شمار نہیں، راقم کے ذہن میں یہ علمی نکتہ درجہ پنجم سے اس درجہ راسخ رہا کہ جب قرآنی الفاظ کی ڈکشنری قاموس الفاظ القرآن الکریم لکھی اس میں بھی نور کے ضمن میں

www.abulhasanalinadwi.org

اسی کو ذکر کیا ہے۔

لیکن ان معمولی تشریحات کے علاوہ جس پر زور دیتے وہ قرآن کریم کا دائمی پیغام ہے جو ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لئے ہے اور آج بھی اس درجہ تازہ ہے اور حالات کے مطابق ہے جس طرح نزول کے وقت تھا اور جو واقعات امم سابقہ اور انبیائے سابقین کے بیان کئے گئے ہیں وہ تصویر ہے انسانی عقل کے معارضہ کی جو انبیاء کرام کی دعوت کے مقابلہ میں ہمیشہ سامنے آتا رہا ہے اور جب بھی وہ دعوت اپنی صحیح روح کے ساتھ پیش کی جائے گی وہی صورت پیش آئے گی، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سامنا جب فرعون سے ہوا اس مکالمہ سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر ایک بشری جھجھک تھی کہ کہیں جھٹلا نہ دیئے جائیں اور ایک قانونی الزام بھی ان کے سر تھا آپ نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ بات بھی نہ سنے اور سر قلم کرنے کا حکم دے دے، لیکن حکم الٰہی اصرار کے ساتھ ہوا تھا، **كلا ! فاذهبا بآيا تنا انا معكم مستمعون** خوف کی قطعاً ضرورت نہیں ہے حکم ہوتا ہے کہ جاؤ اور برملا کہہ دو کہ ہم خدا کے فرستادہ ہیں اس سے مطالبہ کرو کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کرے (کہ بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو) فرعون نے بجائے دعوت حق کی طرف التفات کرنے کے پہلے اپنا احسان جتلایا" **ألم نربك فينا وليدا** " کیا ہم نے تم کو بچپن میں پالا نہیں؟ "**ولبثت فينا من عمرك سنين** " تو نے ہم میں اپنی عمر کے کئی سال گذارے۔ **وفعلت فعلتك التي فعلت وأنت من الكافرين** ۔اور تو اپنا وہ کرتوت کر جو کر گیا اور تو ناشکروں میں سے ہے (یعنی ناشکرا ہے) فرعون کی غرض یہ تھی کہ احسانات کے بعد اور ایک کھلا ہوا جرم ثابت ہونے کے بعد دربار میں بے محابا آنے کی جرأت کرنا اور اپنی پیغمبری کا دعویٰ کرنا، بڑی جسارت کی بات ہے، حاکم وقت کی متکبرانہ ادا کی یہ تصویر ہے کہ دعوت حق کو تو وہ حقیر سمجھتا ہے، اور برحق بات اس کو چال، مکر و فریب معلوم ہوتی ہے۔ کسی ظالم حکومت کو دیکھ لیجئے، جہاں آپ نے شہری حقوق کے تقاضے پورا کرنے کا نام لیا فوراً وہ کہنا شروع کریں گے کہ ہم نے تمھاری قوم پر یہ احسان کئے اور وہ احسان کئے، اور اپنے سب سے بڑے جرم کو بھول جائیں گے کہ اس نے پوری قوم کو غلام بنا رکھا ہے، حضرت موسیٰؑ کا یہ ارشاد **وتلك نعمة تمنها عليّ أن عبّدت بني اسرائيل** ۔ یہ احسان جو تو مجھ پر جتا رہا ہے کیا یہی ہے کہ تو نے (پوری قوم) بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے؟ پھر فرعون نے کہا **وما رب العالمين** اور رب العالمین کیا چیز؟ تحقیر کے ساتھ بجائے "**من**" کے "**ما**" کہہ رہا ہے جو غیر ذی روح کے لئے آتا ہے۔ یہاں واؤ عطف کا

www.abulhasanalinadwi.org

نہیں ہے۔ کیوں کہ سلسلۂ کلام میں اس سے پہلے معطوف علیہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم اردو میں یہ ہوگا، اچھا چھوڑ دو ان باتوں کو یہ تو بتاؤ کہ رب العالمین ہے کیا چیز؟ یہاں فرعون اصلی سوال سے گریز کرنا چاہتا ہے کہ "تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے" اس کو نظر انداز کر کے ایسی بات کہتا ہے جس سے دعوت دینے والے کو غصہ آجائے، اور وہ کوئی ایسی بات کہہ ڈالے جس سے بات کا رخ پھر جائے، مگر پیغمبر حق نے وہی کہا اور اسی کو دہراتے رہے جو ان کی دعوت کی روح تھی۔ **قال رب السمٰوٰت والارض وما بینھما ان کنتم مؤمنین** ۔ اگر تمھیں یقین آئے (تو کہوں) کہ وہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے اس کا رب ہے۔ فرعون اس جواب کو بھی استہزا کے انداز میں نظر انداز کرتا ہے۔ اور اپنے گرد بیٹھنے والوں (ظاہر ہے وہ سرداران حکومت، وزراء قسم کے لوگ ہوں گے) سے کہتا ہے۔ **ألا تسمعون** ؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ یا اپنی زبان میں یوں کہئے کہ فرعون نے اپنے وزراء سے کہا کہ سنتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جگہ کوئی غیر پیغمبر ہوتا تو رعب میں آجاتا، اور خاموش ہو جاتا، یا پھر کہتا کہ میں کیا غلط کہہ رہا ہوں؟ جو بات میں نے کہی اس میں کیا غلط ہے؟ مگر نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی ہی بات کہتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا گیا تھا، **قال ربکم ورب اباء کم الاولین**، کہا: تمھارا اور تمھارے باپ دادا کا رب ہے فرعون اس کا بھی جواب نہیں دیتا ہے اور موسیٰؑ کو الجھانے اور غصہ دلانے کی بات کرتا ہے **قال ان رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون**۔ یہ جو تمھارے رسول ہے جو بھیجا گیا ہے پاگل ہے۔ اس صریح ہتک اور گالی کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنا پیغمبرانہ توازن باقی رکھتے ہوئے فرماتے ہیں **قال رب المشرق والمغرب وبینھما ان کنتم تعقلون** ۔ فرمایا: مشرق و مغرب اور جو ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو۔ غرض پورا مکالمہ ظالم حکمراں اور داعیٔ حق کی اس منطقی گفتگو اور طرز کلام کا آئینہ ہے جو ہمیشہ اور ہر دور میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تفسیری سبق کی ایک تقریر کا یہ مفہوم و اقتباس ہے جس کو میں نے اپنے الفاظ میں نقل کیا ہے، لیکن طرز اور اسلوب فکر یہی ہے۔

پانچویں درجہ میں جو طرز تدریس ذہن نے قبول کیا وہ قرآن کریم کی عظمت کے ساتھ اس کے جلال و جمال کا وہ شعور ہے جو دل و دماغ پر ہمیشہ محیط رہتا ہے۔ اور اس کی آفاقیت اور ہمہ گیری غیر مرئی طور پر دل میں اتر جاتی ہے۔ دوسری اہم خصوصیت یہ دیکھی کہ کبھی مدعیانہ بات نہیں سنی مثلاً یہ کہتے، میرے نزدیک یہاں پر یہ حرف جر دوسرے حرف جر

کے معنی میں ہے، مثلاً رازی نے کہا اور کشاف میں زمخشری نے کہا اور "میں" یہ کہتا ہوں۔

قرآن کریم کے درس کے زمانہ میں تو ہم طلباء کا مطالعہ اسی محور پر گھومتا رہا جس قدر استاد نے بتا دیا، مگر جب بیضاوی اور کشاف پڑھ کر فارغ ہو چکے اور دوسری تفسیریں پڑھنے کا وقت آیا تو یہ معلوم ہوا کہ مولانا کا طرز تدریس اس نہج سے مختلف ہے جو ان کے استاد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا ہے۔ حضرت لاہوریؒ کی تفسیر کا اصل جوہر نظم آیات اور ربط معانی میں کھلتا ہے وہ ہر سورہ کے موضوعات کا تعین فرماتے ہیں اور اس کے حوالے دیتے ہیں کہ یہ موضوع فلاں اور فلاں آیات سے ماخوذ ہیں پھر ہر رکوع کا مرکزی مضمون ذکر فرماتے ہیں خود مولانا نے اپنے زمانۂ طالب علمی اور حضرت لاہوریؒ سے شاگردی کے زمانہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"۱۳۵۱ھ کے شعبان کے آخر یا رمضان کے اوائل میں (۱۹۳۲ء کے غالباً دسمبر میں) میں نے لاہور کے لئے رخت سفر باندھا اور مدرسہ قاسم العلوم کا باقاعدہ طالب علم بن گیا، اس درس میں جس میں پورا قرآن مجید پڑھایا جاتا تھا صرف مدارس عربیہ کے فارغین اور منتہی طلبہ شریک ہوتے تھے اور یہ علماء کا کلاس کہلاتی تھی۔ آخر شعبان سے شروع ہو کر وسط ذی قعدہ تک اس کا سلسلہ جاری رہتا میں جب پہونچا ہوں تو اس درجہ میں پچاس کے قریب طلبہ تھے جن میں اکثریت دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کی تھی انہیں میں ہمارے درس حدیث کے ساتھی مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاریؒ بھی تھے۔ یہ درس بڑی محنت اور قوی حافظہ کا طالب تھا کہ ہر رکوع کا خلاصہ اور اس کا ماخذ یاد کرنا پڑتا تھا اور نیا درس شروع ہونے سے پہلے پچھلے درس کا امتحان ہوتا تھا اور جس کی جس رکوع کی باری آجائے اس کا خلاصہ مولانا سندھی کے مقرر کئے ہوئے لفظوں میں اور اس کا قرآنی ماخذ سنانا پڑتا تھا میرا حافظہ خاندانی طور پر کمزور ہے اس لئے مجھے بڑی محنت پڑتی تھی۔ (اس کے بعد وہاں کی سردی، ہوسٹل کے کھانے کا ذکر اور پھر امتحان میں نمایاں کامیابی آخر میں سند کے حصول کا ذکر ہے تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کاروان زندگی صفحہ ۱۳۲۔۱۳۳ج۱)

حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ مولانا سندھی کے شاگرد تھے مولانا سندھی اور مولانا عبدالحمید فراہی کے درمیان اتحاد فکر تھا اور قرآن کریم کی تفسیر کے بارے میں دونوں کا رجحان یکساں تھا اس کا تذکرہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے حضرت مولانا احمد علیؒ کے ترجمہ کی تقریظ و تصویب کرتے ہوئے فرمایا ہے جو حضرت لاہوریؒ کے ترجمہ قرآن میں چیدہ ترین علماء کرام کی آراء کے ضمن میں چھپا ہے۔ سید صاحب علیہ الرحمہ اس تقریظ

www.abulhasanalinadwi.org

میں تحریر فرماتے ہیں۔

”قرآن پاک کے علوم میں سب سے زیادہ دقیق اور نازک علم آیات وسُور کے باہم ربط کا ہے امام رازی اور بقاعی نے اس پر بہت کچھ محنت کی ہے۔ اور دوسرے علماء نے بھی اس میں کافی غور وخوض کیا ہے ہمارے زمانہ میں مولانا حمید الدین فراہی صاحب نظام القرآن اور مولانا عبید اللہ صاحب سندھی خاص ذکر کے قابل ہیں۔ دونوں مدت تک اتحاد مذاق کے باعث کراچی میں باہم ملتے جلتے رہتے تھے۔ مولانا عبید اللہ صاحب کے درس نے متعدد باکمال پیدا کئے جن میں سب سے پہلی جگہ مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین کو حاصل ہے موصوف نے اس درس میں جو کچھ پایا۔ اس کو وقف عام کردیا ہے“۔[1]

حضرت مولاناؒ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے عزیز ترین اور ممتاز ترین شاگرد تھے حضرت لاہوریؒ سے انہوں نے جو درس لئے ان کو یاد کیا تھا اور ان کا امتحان دے کر سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے نیز حضرت لاہوری کی صحبت میں رہ کر تزکیہ وسلوک کی تربیت حاصل کی تھی صوفیہ کی اصطلاح میں یہ کہیے کہ ان کی سرپرستی میں ریاض کئے تھے مگر تفسیر میں رنگ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا قبول کیا۔ شاہ صاحب کا اسلوب تفسیر یہ تھا کہ ان کی نظر قرآن کے عمومی تذکیر اور اس کی آفاقی دعوت پر ہے اور جیسے وہ فرماتے ہیں کہ نماز کی مشروعیت (داخل شرع ہونا) اللہ تعالیٰ کے ذکر اور مناجات کے لئے ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ **واقم الصلوۃ لذکری** (الحج ۷۰-۳) یعنی نماز میرے ذکر کے لئے قائم کرو اور تاکہ انسان کے حواس وقوی رویئت باری تعالیٰ کے لئے آخرت میں تیار ہوسکیں جیسا کہ حدیث میں ہے۔

ستروں ربکم کماترون هذا القمر لا تضامون فی رؤیة فان استطعتم ألا تغلبوا علی صلوة قبل طلوع الشمس وصلاة قبل غروبها فافعلوا۔

تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو، اس رویت میں دھند لکہ نہیں ہے جہاں تک ہوسکے فجر اور عصر کی نمازوں سے غافل نہ رہو۔

اور جیسا کہ زکوٰۃ کے بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس کی مشروعیت اس لئے ہے کہ طبیعت کے اندر سے بخل کا مادہ نکلے اور ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کا جذبہ ابھرے اللہ تعالیٰ نے زکوۃ نہ ادا کرنیوالوں کے بارے میں فرمایا:

ولا بحسبن الذین یبخلون بما آتاهم اللّٰه من فضله هو خیر لهم بل هو شرلهم سیطوقون ما بخلوا به یوم القیامة (آل عمران ۱۸۰)

---

(۱) (قرآن کریم ۱۳۸۲ھ بہ خلاصہ ہرسورت وہر رکوع وماخذ وربط آیات مرتبہ حضرت مولانا حاجی احمد علی صاحب صفحہ ۸)

www.abulhasanalinadwi.org

اور جو لوگ اس مال میں بخل کرتے ہیں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دے رکھا ہے وہ ہرگز نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے بلکہ ان کے حق میں بہت برا ہے یقیناً انہیں قیامت کے روز طوق پہنایا جائے گا اس مال کا جس میں انہوں نے بخل کیا۔

یا یہ کہ حج کی فرضیت اس لئے ہوتی ہے کہ شعائر اللہ کی عظمت لوگوں کے دل نشیں کر دی جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ان اول بیت وضع للناس للذی الخ (آل عمران ۹۶) بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا جو کہ..........

یا آیت کریمہ: **إن الصفا والمروة من شعائر الله** (البقرۃ ۱۵۸) صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں ہیں۔

اسی طرح قصاص، جہاد، احکام و معاملات کی آیت میں شاہ صاحب کی نظر عمومی حقیقت کی طرف رہتی ہے۔[1] بعینہٖ یہی انداز تفسیر اپنے استاذ محترم مولانا سید ابوالحسن علی مدظلہ کے یہاں دیکھا اور طالب علمی کے زمانہ میں اب تک یہی رنگ ان پر غالب ہے یہی نہیں بلکہ تمام دینی و اختلافی مسائل میں ان کی نظر ایک عمومی حکم رہتی ہے ان کا پہلا دعوتی رسالہ "دعوتان متنافستان" دیکھئے اس میں حق و باطل کا معرکہ کسی خاص واقعہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ ایمان کی دعوت اور اس کے مقابلہ میں جاہلیت کی دعوت دونوں کے مزاج سے بحث کی ہے اور جس طرح شاہ صاحبؒ نماز روزہ حج زکوٰۃ کی مشروعیت پر کوئی آیت اور احادیث پیش کرتے ہیں مولانا بھی سیرت و سیر صحابہؓ کا کوئی واقعہ بطور استشہاد لے آتے ہیں۔[2]

حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کے طرز تدریس (ادب عربی اور تفسیر قرآن) پر اختصار کے ساتھ لے کر کسی قدر جامع تفصیل ہم نے میر کارواں سے نقل کی ہے البتہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے طرز تفسیر کو سمجھنے کیلئے حجۃ اللہ البالغہ سے فائدہ اٹھایا۔

حضرت مولاناؒ کی تدریس کا تیسرا دور وہ ہے جب آپ نے المعہد العالی للدعوۃ والارشاد کا افتتاح اپنے لکچرز سے کیا یہ خطبات (لکچرز) طلبہ نے قلمبند بھی کئے تھے اور ٹیپ کی مدد سے ان کی تصحیح بھی کی اور پھر ان کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا ہے ان محاضرات کے عناوین حسب ذیل ہیں۔

(۱) دعوت دین میں حکمت و وسعت اور ہر زبان و مکان کی ہم آہنگی

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ

[2] میر کارواں ص ۹۸-۱۰۰

www.abulhasanalinadwi.org

(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے دو نمونے

(۳) حضرت یوسف علیہ السلام کے طرز تبلیغ کا ایک نمونہ

(۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل

(۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور ان کی پیغمبرانہ حکمت کی چند نمونے

(۶) ایمان پوشیدہ رکھنے والے مومن کی دعوت غیر نبی کی دعوت کا نمونہ ہے

(۷) خاتم الانبیاء علیہ صلی اللہ کی دعوت وحکمت کے دو نمونے

(۸) سفیرانہ حکمت اور عقلی بلاغت کا ایک نادر نمونہ

(۹) حکمران حبشہ کے دربار میں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اسلام اور مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے

یہ خطبات عربی میں تھے اور ان کا مجموعہ روائع من ادب الدعوة فی القرآن والسیرة کے نام سے مطبع ندوة العلماء سے شائع ہوا اس کا اردو ترجمہ مخدومی مولانا عبداللہ عباس ندوی مدظلہ نے کیا جو تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب۔ قرآن کریم اور سیرت نبوی کے ادبی شہ پارے کے نام سے ۱۴۰۱ھ میں شائع ہوا مولانا موصوف نے عرض مترجم موضوع کا تعارف کے عنوان سے حسب ذیل سطریں تحریر فرمائیں۔

”ان خطبات کا ترجمہ شروع کرتے وقت اتنا تو مجھے یقین تھا کہ قرآن فہمی کی راہ میں کچھ نئے نکات سامنے آئیں گے جیسا کہ مخدوم ومربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی ہر تقریر وتحریر میں کوئی نہ کوئی فکر انگریز پہلو ضرور ہوتا ہے ان خطبات میں بھی یقیناً کوئی ندرت ہوگی لیکن یہ خیال نہیں گذرا تھا کہ محاضرات کا یہ مختصر مجموعہ (جو کسی مستقل تصنیف کی ضخامت نہیں رکھتا) قرآن کریم سے استفادہ کی نئی شاہراہ کھولنے والا ثابت ہوگا اور اس کی حیثیت ایک علمی ”دریافت“ کی ہوگی قرآن کریم کے وصف میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے **"لاتنقضی عجائبہ"** یعنی قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوئے۔ یہ مجموعہ محاضرات بھی اس کا بین ثبوت ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس گذرنے کے بعد بھی اور جبکہ ہزاروں نہیں بلا مبالغہ لاکھوں کام قرآن کریم کے سلسلہ میں ہو چکے ہیں اب بھی ایک ایسا موضوع نظر آتا ہے کہ گویا یہ آیتیں آج ہی اتری ہیں ان کی تازگی وشادابی میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔

دعوت الی اللہ کی اہمیت وفرضیت سب جانتے ہیں ”حکمت“ و ”موعظت حسنہ“ کے

دو کلیدی اصول سے تمام اہل علم واقف ہیں لیکن اس کی طرف کسی کی نگاہ نہیں گئی کہ قرآن کریم نے "حکمت و موعظت حسنہ" کو مبہم نہیں چھوڑا ہے بلکہ انبیاء کرام کی دعوت کے نمونے دے کر اس کے خطوط وحدود واضح کر دیئے ہیں جنکی موجودگی میں دعوت دین کا کام کرنے والوں کو کسی تحریک یا ازم سے طریق کار (Tactics) مستعار لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس لحاظ سے یہ کتاب قرآنی علوم میں ایک اہم اضافہ ہے جو اپنے اختصار کے باوجود ضخیم جلدوں پر بھاری ہے۔

یہ مجموعہ محاضرات اگرچہ انبیاء کرام کی دعوت کے نمونوں پر مشتمل ہے اور یہی اس کا موضوع ہے لیکن اس سے دو ضمنی فوائد بھی حاصل ہوں گے ایک یہ کہ قرآن کریم کی بلاغت کی چند جھلکیاں نظر آئیں گی انبیائے کرام خصوصاً حضرت ابراہیم وحضرت یوسف علیہما السلام کے تذکروں میں قرآنی بلاغت کے نازک ترین پہلوؤں کی بہت دلنشیں انداز میں وضاحت کی گئی ہے مثال کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے والد کو دین حق کی دعوت دی تو کیا لہجہ اختیار کیا کس طرح ان کی پدرانہ شفقت کو اپیل کی، حضرت مصنف مدظلہ نے جس والہانہ انداز میں اس کو واضح کیا ہے اس کی اصلی قدر تو عرب یونیورسٹیوں کے اساتذہ ادب وبلاغت ہی کریں گے یا وہ حضرات جنہوں نے شیخ عبد القاہر جرجانی کی "اسرار البلاغہ" اور "دلائل الاعجاز" امام یحییٰ بن حمزہ یمانی کی "الطراز" ابوالہلال العسکری کی "کتاب الصناعتین" اور امام سیوطی کی "معترک الاقران" کا مطالعہ کیا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر فکر اور افسوس کی ہے کہ قرآن کریم کی بلاغت جو ایک بدیہی حقیقت ہے اور جس کے بارے میں قرآن کریم نے متعدد مقامات پر تحدی کی ہے کہ کوئی اس کے مماثل چند آیات وضع نہیں کر سکتا، یہ معجزہ عربیت کا صحیح مذاق نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے "ایمان بالغیب" کے درجہ میں داخل ہو گیا اور اب ہم قرآن کریم کی بلاغت پر اس طرح ایمان رکھتے ہیں جس طرح حشر ونشر اور بعث بعد الموت پر، حالانکہ یہ حسی چیز تھی اور حق یہ تھا کہ اس کی عظمت کا ادراک ہمیں بلاواسطہ اور براہ راست ہوتا، ان محاضرات کے ذریعہ پورے قرآن کریم پر اپنی محنت وذہانت صرف کرنے والے طالبین کو کام کرنے کی ایک مستقل راہ مل جائے گی۔

ان محاضرات میں جہاں دعوتوں کے نمونے دیئے گئے ہیں وہاں دعوت دینے والوں (دعاۃ) کی سیرتیں بھی نظر آجاتی ہیں ان کی صداقت وامانت خیال وعمل کی پاکیزگی ہر

www.abulhasanalinadwi.org

حال میں اپنے مقصد اصلی دعوت توحید کو پیش نظر رکھتا، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دوہری ذمہ داری تھی اپنی قوم کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانا اور توحید کی دعوت دینا لیکن انہوں نے دعوت الی اللہ کے کام کو مؤخر نہیں کیا یہ ترتیب نہیں قائم کی کہ پہلے غلامی سے نجات حاصل کرلیں پھر اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی تبلیغ کریں گے دوسری بات یہ نظر آتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک ہر ایک نے دعوت الی اللہ کا کام انتہائی بے بسی کسمپرسی کے عالم میں شروع کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بعد میں قوت وغلبہ عطا فرمایا اور یہی دین فطرت کا تقاضا تھا۔

تمام مخلوقات کی ابتدا (وهنا على وهن) کمزوری وناتوانی سے ہوتی ہے پھر قوت وصلابت بخشی جاتی ہے، لہذا دعوت الی اللہ کی ترتیب فطرت کے مطابق اور سنت الٰہی کے موافق وہی ہے جس کی تصویر انبیائے کرام علیہم السلام کے نمونوں میں ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے اس کتاب کے ذریعہ قرآن کریم اور اسلام کی ابدیت پر یقین اضافہ کا ایک نیا سامان حاصل ہوگیا اللہ تعالیٰ حضرت مصنف مدظلہ کی عمر وصحت میں برکتیں عطا فرمائے جس کے "نفس گرم" سے علم ومعرفت کا بازار گرم ہے"۔

حضرت مولاناؒ کی تدریس آپ کی حیات کے آخری سال تک یعنی انتقال کے چند ماہ پہلے تک جاری رہی آخری دورہ وہ ہے جب تکیہ رائے بریلی میں فضیلت کے طلبہ ہفتہ عشرہ کیلئے جایا کرتے اور وہاں بھی تدریس کا سلسلہ قائم رہا اس سلسلہ میں ایک یادداشت مولانا محمد مسعود عزیزی ندوی نے مرتب کی ہے جو درج ذیل ہے۔

"دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ہر سال فارغ ہونے والے طلبہ کو ندوہ کے ذمہ داران مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی خدمت میں رائے بریلی تکیہ کلاں بھیجا کرتے تھے اور یہ سلسلہ ۱۹۸۴ء سے جاری تھا دارعرفات میدان پور میں طلبہ کا قیام ہوتا تھا اور درس واستفادہ کیلئے طلبہ حضرت کی قیام گاہ تکیہ کلاں پہونچتے تھے حضرت اولاً تو اپنی قیمتی مؤلفات کے مقدمات پڑھاتے تھے اور کتاب کی ضرورت وافادیت اور اس کی تالیف وتصنیف کے پس منظر کو بیان فرماتے تھے اس طرح یہ اسباق عام طور سے دن میں دو مرتبہ دوپہر اور مغرب بعد ہوتے تھے اس کے بعد پھر صحاح ستہ کے اوائل سنتے تھے اور اجازت حدیث اور سند حدیث دیا کرتے تھے۔

حضرت مولاناؒ کی زندگی کا جو آخری درسی سلسلہ ہوا اس میں راقم سطور شریک تھا

www.abulhasanalinadwi.org

جس کی تفصیل یہ ہے کہ ہم فارغ ہونے والے فضیلت دوم کے طلبہ ۱۶ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ ۲۷ر ستمبر ۱۹۹۹ء بروز اتوار بعد نماز عصر تکیہ کلاں رائے بریلی پہونچے دار عرفات میں قیام رہا مولانا نذر الحفیظ ازہری ندوی اور مولانا عبد القادر صاحب مظاہری ندوی ہمارے ساتھ تھے، ۱۷ر جمادی الثانیہ بروز پیر صبح ۸ بجے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کا ایک محاضرہ "تعلیم کا مقصد" کے عنوان سے ہوا جس میں مولانا نے تعلیم کی اہمیت اس کا طریقہ کار اس کے دینوی واخروی فوائد پر روشنی ڈالی اس کے بعد ساڑھے دس بجے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تکیہ حاضر ہوئے حضرت نے "**إذاهبت ريح الايمان**" کا درس دیا ایک ساتھی نے مقدمہ پڑھا اور حضرت نے تشریح فرمائی اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی وسیع اور ہمہ گیر تحریک کا اور ان کی اور ان کے اصحاب ورفقاء کی مجاہدانہ اور سرفروشانہ خدمات پر روشنی ڈالی اور کتاب لکھنے کا کیا داعیہ پیدا ہوا وہ بھی بیان کیا اور حضرت سید صاحب پر اپنے سب سے پہلے عربی مضمون کی طرف بھی اشارہ کیا جو علامہ رشید رضا نے مصر سے المسلمون میں شائع کیا اس کے بعد اسی روز بعد نماز مغرب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين [1]" سے عبارت پڑھی گئی اور اس کتاب کی اہمیت وافادیت اور مقبولیت پر جامع گفتگو فرمائی اور فرمایا لوگ نہیں سمجھے تھے کہ تاریخ سے بھی دین کی دعوت کا کام لیا جاسکتا ہے اور عربی زبان کے سیکھنے، اس میں مہارت پیدا کرنے اور اس میں دعوت دینے پر بہت زور دیا اس کے بعد ۱۸ر جمادی الثانیہ منگل کو صبح حضرت مولانا عبد اللہ عباس صاحب ندوی مدظلہ کا محاضرہ "عربی ادب اور لسانیات" کے موضوع پر ہوا جس میں موصوف نے عربی اور عجمی الفاظ کی تشریح کی اور زبان والفاظ کے بارے میں مفصل اور اہم گفتگو فرمائی ساڑھے دس بجے حضرت مولاناؒ نے "روائع اقبال" کا درس دیا، علامہ اقبال کی شعر گوئی اور ان کے کلام کی جامعیت وہمہ گیری اور ان کی دینی واسلامی حمیّت کو بیان کیا اسی روز بعد نماز مغرب "**الصراع بين الفكرة الاسلامية والفكرة الغربية**" کا درس دیا اور مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی جو کشمکش چل رہی ہے اس کو واضح کیا اور اس موضوع پر کتاب لکھنے کی کیا ضرورت پیش آئی اس کو بھی بیان کیا اس کے بعد ۱۹ر جمادی الثانیہ بروز بدھ صبح دس بجے "**الطريق إلى المدينة**" کا درس ہوا کتاب کا پس منظر بیان کیا پڑھنے والوں پر اس کے جو اثرات ہوئے ان کو جو روح ملی اس کو ذکر فرمایا، اور عجمیوں اور عربوں نے بھی کیسے بارگاہ نبوت میں خراج عقیدت پیش کیا اس کی

---

[1] الصراع بين الفكر الاسلامية والفكر الغربية، روائع اقبال، الطريق إلى المدينة، دراسات في الحديث النبوي الشريف، السيرة النبوية، رجال الفكر والدعوة، إذا هبت ريح الايمان، اس کے علاوہ اہم دعوتی وفکری رسائل کا درس ہوتا تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

طرف اشارہ فرمایا اور بدھ ہی کی شام میں مغرب بعد "**رجال الفکر والدعوۃ**" کا درس ہوا اس کتاب سے جو دینی اور علمی حلقوں میں خلا پر ہوا اور بزرگوں نے اس کو کیسے سراہا اس کو بیان کیا اور احیاء و تجدید دین کی تاریخ کو کڑی در کڑی ملایا اس کی وضاحت کی اس سے جو شکوک و شبہات اسلام کے سلسلہ میں دور ہوئے ان کی نشان دہی فرمائی اسی روز عشاء بعد مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی نے اعلان فرمایا کہ ہر طالب علم اپنے اس موضوع میں جس میں وہ متخصص ہے دس صفحات کا مقالہ لکھے چنانچہ عناوین دیدیے گئے چونکہ طلبہ مختلف اقسام سے تعلق رکھتے تھے اس لئے الگ الگ عناوین ملے احقر قسم فقہ و افتاء میں تھا ہمارا عنوان "فقہ حنفی کے مراجع اور ان کی خصوصیات" تھا احقر نے عربی میں اس موضوع پر ایک اچھا رسالہ تیار کر دیا[۱] اس کے بعد ۲۰ رجمادی الثانیہ بروز جمعرات صبح دس بجے "**الأرکان الأربعہ**" کا درس ہوا اور حضرت نے عبادات اربعہ کے اسرار و حکم سے متعلق گفتگو فرمائی بعض حلقوں میں عبادات کے سلسلہ میں جو شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے مذاہب کے تقابلی مطالعہ سے ان پر روشنی ڈالی۔ اور حضرت شیخ کے بارے میں فرمایا کہ انہوں نے کتاب کو دیکھتے ہی فرمایا کہ کاش کہ میں جوان ہوتا تو اس کتاب کو پڑھاتا غرض یہ کہ تمام اسباق میں کتاب کی افادیت و اہمیت کے ساتھ عربی زبان و ادب کو سیکھنے پر زور دیتے اور صحیح داعی بننے کی دعوت دیتے اور تلقین کرتے اسی روز بعد نماز مغرب دار عرفات میں حضرت نے شہر کے لوگوں اور طلبہ اور طلبہ ضیاء العلوم کے سامنے رائے بریلی میں اپنی آخری تقریر کی اور اہل رائے بریلی کو اپنا آخری پیغام دیا اور دعا ہوئی اسی روز بعد نماز عشاء طلبہ کا تاثراتی پروگرام ہوا سبھوں نے اپنے تاثرات بیان کئے کہ وہاں تکیہ حضرت کی خدمت میں پہونچ کر یا ندوۃ پہونچ کر کیا کیا فائدے ہوئے۔

۲۰ رجمادی الثانیہ بروز جمعہ صبح دس بجے پہلے حضرت نے مقالہ نگاروں کو انعامات تقسیم کئے نامہ سیاہ کو بھی رسالہ مذکور پر سو روپے انعام دیئے اس کے بعد صحاح ستہ کے اوائل پڑھے گئے چھ ساتھیوں نے ایک ایک کتاب کی پہلی ایک ایک حدیث پڑھی احقر نے بھی ابو داؤد شریف کی پہلی روایت پڑھی اس کے بعد حضرت نے مختصر تقریر فرمائی حدیث کی اہمیت بیان کی اور اس کے بعد اجازت حدیث اور سند حدیث تمام طلبہ کو مرحمت فرمائی اور حضرت کی زندگی کا یہ آخری درس ختم ہوا اس کے بعد کسی درس کی نوبت نہ آئی یہاں تک کہ رمضان میں آپ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے چنانچہ سبھی طلبہ بعد نماز جمعہ ندوۃ کیلئے روانہ ہو گئے"۔

---

[۱] یہ رسالہ عربی میں "**مراجع الفقہ الحنفی ومیزاتھا**" کے عنوان سے مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد سہارنپور سے شائع ہو گیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں کی سوانح نگاری

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی
معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی۔ قدس اللہ روحہ ۔ نے اپنی علمی زندگی کا آغاز سوانح نویسی سے کیا سب سے پہلے سولہ سال کی عمر میں حضرت سید احمد شہید کی مختصر سوانح عمری عربی میں تحریر کی جو مصر کے مشہور علمی و ثقافتی رسالہ ''المنار'' میں شائع ہوا اس کے ایڈیٹر علامہ رشید رضا علیہ الرحمہ تھے۔ انہوں نے اس مقالہ کو کتابی شکل میں شائع کیا جس کا ایک نسخہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مرکزی کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی میں موجود ہے۔ پھر آپ نے اردو میں سیرت سید احمد شہید لکھی جس کی ہندوستان کے تمام علمی حلقوں میں شہرت ہوئی۔ اس کی تحسین کرنے والوں میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، علامہ اجل مولانا سید سلیمان ندویؒ اور اسی قدو قامت کے اہل اللہ تھے، مشہور عالم دین مولانا منظور نعمانیؒ نے اپنی ایک تحریر میں ضمناً اس کتاب کے بارے میں لکھا کہ:۔

''اسے پڑھ کر اپنے اندر ایک آگ بھڑک گئی''۔ جب مولانا نے جب اپنی کتاب مکمل کی اس وقت آپ کی عمر ۲۶ سال تھی (۱۹۱۴ء حضرت مولانا کی پیدائش کا سن ہے اور ۱۹۳۹ء میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا)

اور یہی کتاب پورے ملک (قبل تقسیم) کے علمی و دینی حلقوں میں آپ کی شہرت و مقبولیت کا ذریعہ بنی۔

www.abulhasanalinadwi.org

کتاب پہلے ایک جلد میں شائع ہوئی تھی، پھر آپ کو اپنے خاندان کے ان افراد سے جو ٹونک میں تھے ان کے بارے میں ایک بڑی مقدار میں قلمی دستاویزیں حاصل ہوئیں، آپ نے ان کو مرتب کر کے دو جلدوں میں شائع کیا۔

سیرت سید احمد شہید کی تالیف کے عرصہ دراز کے بعد آپ نے حضرت اویس عصر مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی سوانح تحریر فرمائی اور بزرگان سلف کے کارناموں کو بیان کرنے کا سلسلہ قائم ہوگیا، دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر آپ نے جو محاضرات (لکچر) دیئے ان کا موضوع ''مشاہیر امت کے عظیم کارنامے'' تھا جسمیں آپ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز، حضرت امام حسن بصری، امام احمد بن حنبل کے سوانحی نقوش پیش کیے، اس کے بعد ہندوستان واپس آکر آپ نے جن بزرگان امت کی سیرتوں پر مفصل تحقیقی مقالات لکھے اور جن کا مجموعہ ''تاریخ دعوت وعزیمت کے نام سے پانچ جلدوں میں شائع ہوا ان میں امام ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو کار حضرات کا ذکر فتنہ اعتزال پر گہرائی کے ساتھ کیا امام غزالی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ، علامہ ابن جوزی، نورالدین زنگی، شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام مولانا جلال الدین رومی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن رجب، حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت شیخ احمد سرہندی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ، حیات عبدالحی، سوانح حیات حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، سوانح حیات شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ، ان کے علاوہ ان بزرگوں کی سیرتوں کے نمایاں نقوش آپ نے تحریر فرمائے جن کو آپ نے دیکھا یا ان سے پڑھا یا ان کی صحبت اٹھائی، جو ''پرانے چراغ'' کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں، ان کے ساتھ چند عزیز قرابت مندوں شاگردوں اور افراد خاندان کا بھی تذکرہ کیا جس کا عنوان ''سینے کے داغ'' ہے۔

والدہ ماجدہ کا نام حضرت بی بی خیر النساء تھا جنہوں نے دعاء مناجات کو نظم کیا ہے ان کا ذکر ''ذکر خیر'' کے عنوان سے کیا۔ اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کی سوانح حیات میں ایک حصہ اپنے برادر مربی حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلیؒ پر بھی لکھا ہے۔

ان تمام تالیفات میں جن کا موضوع خاصان خدا کی سیرت ہے۔ حضرت مولانا کا اسلوب

www.abulhasanalinadwi.org

خاص بہت دل آویز ہے کسی تذکرہ میں خواہ آپ کو صاحب تذکرہ سے انتہائی عقیدت مندی اور دلی شغف رہا ہو۔ایک لفظ مبالغہ کا نہیں آتا ہے اور نہ کہیں سخن سازی کا رنگ داخل ہوا ہے، یہ وہ کمال ہے جو حضرت مولانا کو سینکڑوں بلکہ ہزاروں سوانح نگاروں میں ممتاز کرتا ہے۔حضرت سید احمد شہیدؒ جن سے آپ کو نہ صرف خاندانی بلکہ روحانی، وجدانی اور مزاجی مناسبت حاصل تھی ان کا ذکر بھی جہاں کیا ہے، احتیاط کا دامن ہاتھ سے اس وقت بھی نہیں چھوڑا جبکہ طبعی امنگ اور جوش طبیعت نے قلم سے ادب وانشاء کا عطر ٹپکایا ہے۔''سیرت سید احمد شہید کا آغاز اس طرح ہوتا ہے،

''کیفیت ایمانی کے جانواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا چلے ہیں لیکن ایمان ویقین اور خلوص وللہیت کی ایسی باد بہاری ہمارے علم مین کم ازکم اس ملک میں اس سے پہلے اتنے بڑے پیانے پر نہیں چلی۔اس سے پہلے اتنے بڑے پیانے پر نہیں چلی اس سے پہلے اتنے بڑے پیانے پر عزم وتوکل جوش جہاد، ایمان واحتساب شوق شہادت اور یقین آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے آدم گری اور مردم سازی اصلاح وانقلابات کے ایسے محیر العقول واقعات بھی اصلاح وتربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں'' مصنف نے کتاب کی ابتداء ان جملوں سے کی تھی جس نے وسعت اختیار کی تو ایک کتاب بن گئی۔یہی چند جملے سیرت سید احمد شہیدؒ کا خلاصہ اور عطر ہیں پوری کتاب اسی محور پر گھومتی ہے صرف اس پر نہ جائیے کہ یہ مختصر تحریر بہت دلکش اور شگفتہ ہے قابل اہمیت بات یہ ہے کہ اس کے اندر بے انتہا توازن اور احتیاط ہے، مثلا یہ فقرے ''ہمارے علم میں'' کم ازکم اس ملک میں'' اسی طرح آخری جملہ'' اصلاح وتربیت کی تاریخ'' نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں'' راقم عرض کرتا ہے کہ تاریخ کی یہ حقیقت پسندی نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے جن حضرات نے مشائخ واکابر کی سوانح عمریاں پڑھی ہیں وہ اگر صداقت ووسعت قلبی کے ساتھ جائزہ لیں تو ان کو نظر آئے گا کہ اس توازن واحیاط کی کوئی مثال اردو لٹریچر میں نہی ملے گی۔(میر کارواں ص ۳۶۹)

احتیاط وتوازن کا تقاضہ تھا کہ کسی عظیم سے عظیم تر دینی وروحانی شخصیت جیسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور شیخ کبیر سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کے ذکر میں سب سے افضلیت ان کی خدا ترسی فیض رسانی انکارذات اور خلق خدا کی محبت ایذا پہونچانے والوں کیلئے دعائے مغفرت اور دنیا مین ان کی خوشحالی کی دعا کو نمایاں کرکے دکھاتا ہے مثلاً بعض اہل اللہ کا اذیت پہونچانے والوں حق میں یہ

دعا دینا۔

''ہر کہ مارا رنج دادہ عاقبت بسیار باد''

حضرت مولانا کی تحریر کردہ سوانح حیات میں کشف وکرامات سے کبھی نفرت نہیں دکھائی دیتی، لیکن بلا وجہ ان کا کثرت سے ذکر بھی نہیں ہے کیونکہ اصل چیز آپ کے نزدیک عقیدہ کی پختگی ،سیرت کا اسوۂ نبویہ کے مطابق ہونا ہر بات میں خوف خدا اور آخرت کی فکر اللہ تعالی سے عبدیت کا تعلق، اور اس کی بندگی میں ان بزرگوں کا ممتاز ہونا اور یہ محسوس کرنا کہ ان کی سب سے بڑی متاع عبدیت تھی اور یہی عبدیت و بندگی ان کے روح کی غذا تھی ،تصرفات روحانیہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریر کردہ سوانح حیات کو پڑھ کر حق تعالی جل شانہ کی بندگی کا ذوق پیدا ہوتا ہے ان کی عبادتوں سے ان کی روحانی لذتوں کا اندازہ ملتا ہے۔اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگان دین جن کی سیرتیں حضرت کے قلم سے مرتب ہوئی ہیں ان میں ہدایت کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے کفر وظلمت کی آندھیوں میں اسلام کا چراغ جلائے رکھا اس چراغ کو اپنے دامن میں چھپائے رکھا اور جہاں کوئی سنت مٹائی جارہی ہے یا کسی پر حق تلفی ہورہی ہے اور کہیں دنیا کے دانشور نبوت کے فیض سے محروم ہو رہے ہیں وہاں ان بزرگان دین کی غیرت کا ابھرنا اور سرفروشانہ عزیمت کا کام میں لانا ان کی سب سے بڑی کرامت تھی،

حضرت مولانا کی سیرت نگاری کی سب سے بڑی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو پڑھ کر پڑھنے والے کا تعلق اسلامی فکر سے قریب ہوتا ہے اور دین کو زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھنے لگتا ہے ان بزرگوں کی عزت وعظمت اپنی جگہ پر ہر طرح قابل احترام لیکن کتاب کے مطالعہ کا حاصل اصل دین سے وابستگی ہے۔

میرا مطالعہ تو محدود ہے جن حضرات کا مطالعہ وسیع ہے وہ اگر یہ انفرادی خصوصیت کسی اور مصنف کے یہاں پاتے ہوں تو اس کا ذکر ضرور کریں اور کچھ بعید نہیں کہ سیرت نگاری کا یہ وصف اللہ تعالی نے اپنے دوسرے بندوں کو بھی بخشا ہو۔

حضرت مولانا کی سیرت نگاری جو آپ کی تالیفات کا مرکزی موضوع رہا ہے قاری کو دین

www.abulhasanalinadwi.org

سے قریب کرنے اور دین کی طلب رکھنے دلوں کے عملی نمونے پیش کرتا ہے۔ اور دلنشیں پیرائے ہیں کہ صاحب سیرت کی عظمت و محبت پڑھنے والوں کے دلوں میں جاگزیں ہوتی ہے، اتباع سنت رسول کریم ﷺ کی ذات اقدس سے والہانہ وجذباتی تعلق قائم ہوجاتا ہے۔ اور شوق پیدا ہوجائے کہ اپنی زندگیاں دین پر قربان کریں کٹھن اور صبر آزما مرحلوں میں ثابت قدم رہنے کے نمونے افرادامت کی نگاہوں کے سامنے رہیں اور جب اللہ تعالی نے رزق کی فراوانی اور آسائش روزگار کی سہولت اپنے کسی خاص بندے کو عطا فرمائی تو اس کے دسترخوان پر اللہ کے ہزاروں بندے موجود ہوتے تھے مگر صاحب سیرت جادۂ فقر سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتے صبر اور برداشت کی اعلیٰ مثالیں چشم فلک نے حضرت احمد بن حنبلؒ کی سیرت میں دیکھی ہے اور رزق کی فروانی کا منظر جو حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کے خانقاہ میں دیکھی جاتی تھی دونوں کے درمیان بظاہر آسمان و زمین کا فرق ہے لیکن حضرت احمد بن حنبل اور سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء اور مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سیرتوں میں فقر الی اللہ انابت الی اللہ اور خشیت الٰہی کی کیفیتیں یکساں نظر آتی ہیں۔

مخدوم و مربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نوراللہ مرقدہ کی زندگی پر ان تمام نقوش کی جلوہ گری دیکھی گئی، اور آج ان صفحات کے پڑھنے والے جنہوں نے حضرت کو قریب یا دور سے دیکھا ہے گواہی دیں گے کہ لکھنے والے کا قلم ہی نہیں بلکہ دل اور خود ان کی ان سیرتوں کا جمال و کمال طبیعت اور مزاج کا جزء تھا۔ والحمد للہ وحدہ اولاً و آخراً والسلام علی عبادہ الصالحین

عالم عرب پر اثرات

محمد لئیق ندوی، کلکتہ

آیئے اس سوال پر غور کریں کہ جس شخصیت کی تعمیر کے لئے عربی زبان وادب کو بنیادی اہمیت دی گئی اور حکمت الہی نے ایسے مواقع فراہم کیئے کہ اپنے صحیح اصول اور طریقے سے ماہر عرب اساتذہ سے عرب زبان وادب سیکھنے کا موقعہ ملا اس نے خود عربی زبان وادب کو کیا دیا یا اس پر کیا اثرات چھوڑے۔

۱۹۵۷ء میں دمشق کی شہرۂ آفاق اور قدیم ترین علمی اکیڈمی نے علامہ ندویؒ کو ہندوستان کی طرف سے اپنا رکن منتخب کیا، اس موقعہ پر علامہ ندویؒ نے ایک مضمون "عربی زبان وادب کا کتب خانہ از سر نو کنگھالنے کی ضرورت" کے عنوان سے عربی ادب اوور اس کی تاریخ کے دوبارہ جائزہ لینے اور ان کے ہیرے جواہرات کو سامنے لانے کی ضرورت پر زور دیا جو خزف ریزوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور اس کے لئے ادب کے وسیع نقطۂ نظر کے پیدا کرنے کا احساس دلایا۔

۱۹۴۰ء میں "مختارات" کے نام سے ایسا مجموعہ تیار کیا جو حدیث وسیرت کے علاوہ جو حلاوت زبانی اور سلاست زبانی کا اعلی نمونہ ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں بیروت کے مکتبہ دار الفکر الحدیث نے اس کو دیدہ زیب طباعت اور اعلی کاغذ پر چھاپا، یہ کتاب دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ کے نصاب میں داخل ہوئی، علامہ ندویؒ تحریر کرتے ہیں۔

"ایک ہندی مصنف کا یہ بڑا اعزاز تھا کہ خالصاً عربی زبان وادب پر اس کی کوئی کتاب کسی عرب یونیورسٹی کے کورس میں داخل ہو"

www.abulhasanalinadwi.org

شام کے معروف ادیب اور شعبۂ ادب عربی کے سابق پروفیسر علی طنطاوی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ہم نے کچھ عرصہ پہلے ادبی منتخبات اور نمونوں کو جمع کیا تاکہ ان میں کسی کو ثانویہ شرعیہ کے طلباء کے سامنے رکھیں۔ ہماری کمیٹی کے ممبران نے (جو سب ادبا میں تھے) علیحدہ علیحدہ تلاش و جستجو شروع کی، کتابوں کا جائزہ لیا آخر میں ہم سب متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ درسی منتخبات کے مجموعہ میں سب سے بہتر ابوالحسن علی ندویؒ کا مرتب کردہ مجموعۂ مختارات ہے جو زبان کی اصناف اور ادب کے متنوع نمونوں کا سب سے جامع مجموعہ ہے۔"

علامہ ندویؒ تحریر کرتے ہیں کہ

"مجھے سب سے پہلے عربی نثر و ادب کے ایسے مجموعے کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا جو قرن اول سے لے کر عصر حاضر تک کے اعلی نمونوں پر مشتمل ہو اور جو سجع و قافیہ، تصنع و تکلف سے آزاد، دلی جذبات، صحت مند خیالات اور صالح مقاصد کا آئینہ دار ہو اور جو عربی زبان کو صرف ایک ہی رنگ و آہنگ (جس کا مثالی نمونہ "مقامات حریری" ہے جو ہندوستان کے علمی و درسی حلقوں میں چھ سو برس سے حکمرانی کرتی رہی ہے اور عربی تحریر کا واحد نمونہ ہے) پیش نہ کرے۔۔ اس بنیاد و تخیل پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں "الندوۃ العالمیہ للادب الاسلامی" کے نام سے ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا جس میں خاصی تعداد میں عرب ادباء و فضلاء نے اور متعدد اہم و ممتاز شخصیتوں اور عرب جامعات کے شعبۂ ادب کے سربراہوں نے شرکت کی۔

اس موقع پر علامہ ندویؒ نے مختارات کے مقدمہ کا یہ اقتباس پیش کیا۔

"کسی بھی ادیب کی آزمائش اور ابتلا یہ ہے کہ اس پر ایسے لوگ حاوی ہو جائیں جو ادب کو بطور فن اور پیشہ اپناتے ہیں اور اس کو صرف اپنے ساتھ مخصوص و محدود، بنا لیتے ہیں، اس کو بنانے، سنوارنے، اور عبارت آرائی کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں کہ اس طرح کمال مہارت کا سکہ جما کر اپنی مقصد بر آری

www.abulhasanalinadwi.org

کریں۔ یہ صورت حال ترقی پذیر رہتی ہے یہاں تک کہ ادب صرف انہی افراد کی میراث بن کر رہ جاتا ہے، جو محض صنعت کاری وفن کاری اور تقلیدی ادب کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس کے اندر زور ہوتا ہے نہ روح، جدت وندرت ہوتی ہے، نہ دل آویزی کا کوئی سامان"

"یہ مصنوعی اور تقلیدی ادب اس فطری، رواں اور سلیس ادب اور اس کی بلیغ تعبیرات پر انسان جھوم اٹھے اور اس کے ذہن وفکر کے اندر وسعت پیدا ہو جو کسی اسلوب کی اندھی تقلید سے روکے اور انسان کے اند خود اعتمادی پیدا کرے، وہ ادب جس سے اس قوم کا کتب خانہ بھرا پڑا ہے، اس ادب پر یہ مصنوعی اور تقلیدی ادب چھا جاتا ہے۔ حالاں کہ اس رواں اور سلیس ادب میں اس کے سوا اور کوئی عیب یا نقص نہیں کہ وہ ان افراد کے قلم سے نکلا ہے جنھوں نے ادیبوں کی وردی نہیں پہنی اور انھوں نے ادب وانشاء کی دکانیں نہیں لگائیں یا اس کو ذریعہ معاش نہیں بنایا، اور ان کی دلکشی اور دلنواز ادبی خوش بیانیوں کو کسی ادبی عنوان سے موسوم نہیں کیا گیا اور نہ اس کا ادب کے سیاق میں ذکر کیا گیا ہے، بلکہ اس کی کسی دینی بحث، عالمانہ اور فکر انگیز کتاب اور فلسفیانہ یا معاشرتی موضوع کے سلسلہ میں جلوہ نمائی ہوئی ہے۔ یہ سب ادبی شہ پارے دینی، اخلاقی اور علمی کتابوں کے انبار میں دبے ہوئے ہیں، روایتی ادب نے خود پسندی کی بنا پر اسے اپنی صف میں جگہ نہیں دی اور مؤرخین ادب نے فکر ونظر کی کوتاہی کے سبب ادھر توجہ نہیں کی اور نہ اسے وہ مقام دیا جس کے وہ شہ پارے بجا طور پر مستحق تھے۔

"یہ فطری دلآویزی اور قلب وروح کو تسخیر کر لینے والا ادب باری کے وسیع کتب خانہ میں وافر مقدار میں پایا جاتا ہے اور اس کتاب کی تاریخ مصنوعی و تقلیدی ادب سے زیادہ قدیم ہے، کیوں کہ مکاتب وخطوط اور قصہ کہانیاں اور اس طرح کے تقلید ادب کے مدون ہونے سے پہلے حدیث وسیرت کی کتابوں میں یہ فطری اور سحر انگیز ادب مدون ہو چکا تھا لیکن ادب کے مؤرخین اور تحقیق اور ریسرچ کے کام کرنے والوں

www.abulhasanalinadwi.org

نے اپنی ساری توجہ تقلیدی اور روایتی ادب پر مرکوز کردی، وہ اس زنداں کے اسیر اور اسی لکیر کے فقیر رہے جو استاذ نے کھینچ دی تھی بقول اقبال کند مکتب طے کردہ راطے"

"مؤرخین ادب، منتخبات اور درسی کتابوں کے مصنفین (اگر بے ادبی و بے ذوقی شمار نہ ہو) مکھی پر مکھی مارتے رہے اور اس ادب پر پردہ پڑا رہا جس عربی زبان کی صلاحیت وبرتری اور اس کی گہرائی ظاہر ہوتی ہے اور اہل زبان کا کمال فن، ملکہ اور زبان پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے اور در حقیقت وہی ادب کی اولین اور حقیقی تربیت گاہ ہے۔

"ہندوستان میں بھی مختارات نے جلد مقبولیت حاصل کرلی اور یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے ایم، اے کے کورس میں داخل ہوئی، قدیم مدارس اپنی شان بے نیازی اور زعم برتری میں مخمور رہے۔ البتہ عربی ادب کے سب سے بڑے معلم مولانا اعزاز علی صاحب نے اس کو پسند فرمایا اور اس کے متعلق بلند الفاظ استعمال کیے۔

یہ تھا ادب کا انقلابی تصور جس نے عربی ادب کو ایک نئی جہت دی اور ایک صالح انقلاب برپا کردیا محبوس اور اسیر ادب صدیوں کی زندانی سے آزاد ہوا، انسانی معاشرہ کے لئے دینی اور صالح ادب کا تصور ابھر ا اور اس نے صالح ادب یا ادب اسلامی کو عالمی تحریک کی شکل اختیار کرلی اور علامہ ندوی کی قیادت میں صالح عالمی ادب کا قافلہ رواں دواں رہا۔ یہ رہنمائی تو انھوں نے بڑوں کی کی

آیئے اب دیکھتے ہیں اطفال عرب کے لئے انھوں نے کیا کیا۔

عربی زبان میں انھوں نے "قصص النبین للاطفال" اور القراۃ راشدہ" لکھی مولانا عبد الماجد دریادیؒ نے "قصص النبیین" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "اس کتاب کے ذریعہ بچوں کا علم کلام تیار ہوگیا ہے" مولانا سعود عالم ندوی نے اپنے مقدمہ میں تحریر کیا کہ "اس کتاب میں زبان ودین کو اس طرح پیوست کردیا گیا ہے جیسے گوشت اور ناخن"

کتاب کا دوسرا ایڈیشن جب مصر میں چھپا تو مشہور عالم اور ادیب وباحث، فی ظلال القرآن کے مصنف، مفکر اسلام سید قطب شہیدؒ نے دل کھول کر داد دی اور

www.abulhasanalinadwi.org

انھوں نے یہاں تک لکھا کہ

"میں نے کثرت سے وہ کتابیں پڑھی ہیں جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں اور جن میں انبیاء کرام کے حکایات اور قصص بھی شامل ہیں خود ایک سلسلۂ کتب کی ترتیب میں شرکت کی ہے جو القصص الدین کے نام سے مصر میں مرتب ہوا اور جس کے لئے مواد قرآن کریم سے اخذ کیا گیا تھا لیکن میں کسی ادنی تکلف اور طرفداری کے اسی کا اعتراف کرتا ہوں کہ "قصص النبیین للاطفال کے مصنف کا کام (جس کا نمونہ حضرت موسی کے قصہ میں نظر آتا ہے) ہمارے وضع کئے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے اس لئے اس میں ایسی لطیف رہنمائیاں، قصہ کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات اور بین السطور میں ایسے اشارے آگئے ہیں۔ جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ یہ کتاب عالم عرب کے بہت سے ابتدائی مدارس کے نصاب میں داخل کی گئی۔

ان چند مثالوں سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ علامہ ندویؒ نے عربی زبان وادب کو کیا دیا یا اس پر کیا اثرات چھوڑے۔ انھوں نے زبان وادب کو وہ جہت عطا کی جس کی عالم عرب کو ضرورت تھی یہی نہیں بلکہ زبان وادب کے راستہ سے جو انحراف، ذہنی اور اخلاقی فساد پیدا ہو گیا تھا ان کا علاج امیت عربیہ کے سامنے پیش کر کے ان کی عملی رہنمائی کی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں زبان وادب اور نصاب میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی تھی اس نے عالم عرب کو بھی متاثر کیا۔ علامہ ندویؒ کی متعدد کتابوں کا وہاں کے مدارس اور جامعات کے نصاب میں داخل ہونا عربی زبان وادب میں ایک تاریخی رول سمجھا جائے گا۔

علامہ ندویؒ لکھتے ہیں "ہمارا عربی زبان وادب کا یہ نصاب بلاد عربیہ اور بلاد مقدسہ میں بھی مقبول ہوا اور بعض حیثیتوں سے فائق ہے۔ اس نصاب کی خصوصیت یہ ہے کہ زبان کی صحت وحلاوت اور معلومات عامہ کے ساتھ دین کا رنگ، عقیدہ واخلاق کی تعلیم اور اصلاح وتربیت کا مادہ اس میں غالب اور نمایاں ہے"

www.abulhasanalinadwi.org

عالم عرب کی صورت حال کا جائزہ اور رہنمائی

علامہ ندویؒ نے عرب ممالک کے طرز عمل، موقف اور وہاں کی صورت حال کا وسیع اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیا، یہ ان کے نزدیک سب سے بڑا اور حقیقی مسئلہ تھا، ایک طرف تجدد پسند یا بقول خود ترقی پسند حکومتیں ہیں جو مغربی تہذیب پر اور مغربی افکار و اقدار پر ایمان لا چکی ہیں اور انکی پورے خلوص کیساتھ وکیل اور علمبردار بن چکی ہیں اور دوسری طرف وہ سادہ دل قومیں اور عوام ہیں جن کی اسلام کے ساتھ وابستگی ختم نہیں ہوئی ہے اور جن میں قرآن وایمان کی زبان ایمان باللہ وایمان بالآخرۃ اور عشق رسول کے تذکرے کے سوا کوئی زبان اور کوئی طریقہ حرارت اور جوش پیدا نہیں کر سکتا۔ ان میں سے اکثر حکومتوں کی جنگ بیرونی دشمن کے بجائے خود اپنے ملک کے عوام اور قوموں سے ہے جن کو وہ اپنے اقتدار کیلئے سب سے بڑا خطرہ اور ملک کی مزعومہ ترقیات کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

صاحب اقتدار و حکمراں طبقہ اور مسلم عوام کی وہ محاذ آرائی جس نے حاکم طبقہ کی ساری توانائیوں کو مسلم عوام کے شعلۂ ایمان کو سرد کرنے اور اس کو بے حس بنانے پر مرکوز کر دیا ہے اور بیرونی دشمنوں سے ان کی توجہ مستقل طور پر ہٹادی ہے۔ عالم عرب میں مغربی تہذیب و تمدن کی سرپرستی کی وجہ سے وہاں کی مدنیت زبوں حالی کا شکار ہے۔

عالم عرب میں دوسری بڑی فکری اور نظریاتی یلغار سوشلیزم کی ہے ۶۰ء کی دہائی میں اس نے مصر میں بہت بڑا فتنہ برپا کیا "تاریخ الادب العربی" اور وحی الرسالہ" کے شہرۂ آفاق مصنف استاذ احمد حسن الزیات کے قلم سے جامعہ ازہر کے ترجمان مجلۃ الازہر میں "لمۃ التوحید" کے عنوان سے جمال عبدالناصر کی زندگی میں ایک مضمون نکلا تھا جس کے مندرجہ ذیل اقتباس سے عالم عرب کے بعض حصہ میں اشتراکی فکر و ثقافت کی یلغار کی ایک مہلک جھلک نظر آتی ہے۔

"وہ وحدت جس کی دعوت محمدؐ نے دی تھی ایک عام اصول تھا اس لئے اس

کی بنیاد عقیدہ پر تھی، عقیدہ کی کتنی ہی عمر ہو کمزور بھی پڑ جاتا ہے، اور بدل بھی جاتا ہے اور وہ وحدت جس کی صلاح الدین ایوبی نے دعوت دی تھی وہ ایک خاص جزئیہ تھا اس لئے کہ اس کی بنیاد طاقت پر تھی اور طاقت کو ضعف بھی عارض ہوتا رہتا ہے اور اس کا زوال بھی ہو جاتا ہے لیکن وہ وحدت جس کی دعوت جمال عبدالناصر نے دی ہے وہ باقی رہنے والی اور پھیلنے والی ہے، اس لئے کہ اس کی عمارت تین بنیادوں پر قائم ہے۔ غذا اور اسباب معیشت میں اشتراکیت، اظہار خیال میں حریت اور نظام حکومت میں جمہوریت اور یہ تین عناصر اس کی وحدت کی بقا کے لئے دائمی ضمانت ہیں۔

(الجمہوریہ محرم ۱۳۸۳ھ)

عراق کی کیا حالت ہے؟ یہ بھی فلسفہ اشتراکیت کا علمبردار ہے اور یہاں جو عربوں کو اسلام سے علیحدہ اور بے نیاز ایک مستقل حقیقت اور مستقل وحدت باور کرتا ہے۔ یہ قومیت اسلام آنے سے پیشتر بھی تھی اور اسلام کے بعد اور اسلام کے بغیر بھی ایک حقیقت اور مستقل وجود ہے جس کا نعرہ "العرب الامۃ واحدۃ ذات رسالۃ خالدۃ" عرب ایک مستقل امت ہے جو ایک دائمی پیغام رکھتی رہے۔ یہ در حقیقت عربوں کا رشتہ اسلام سے کاٹنے کی ایک سازش تھی۔

۱۹۵۰ء کے سفر حجاز میں علامہ ندویؒ کو وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں، ادیبوں اور اہل قلم سے ملنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ سب مصری ادیبوں اور وہاں کے اہل علم و مصنفین کے خوشہ چین وزلہ ربا ہیں، وہاں متعدد ایسے اہل فکر، اہل قلم زندہ و سرگرم عمل ہیں جو مخصوص اسلوب کے مالک اور پورے پورے مدرسہ عربی کے بانی اور رہنما تھے اور جن کی تقلید کو شام، عراق، حجاز نجد اور مغرب اقصیٰ کے نوجوان ادیب سرمایہ افتخار سمجھتے تھے اور ان کو ادب و فکر یہاں تک کہ اسلام کے فہم میں بھی استاذ و امام مانتے تھے

اس کے علاوہ عالم عرب میں عقیدہ و فکر کی گمراہیاں اور انحرافات پیدا ہو چکے تھے۔ بدعتیں عربی معاشرہ میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکی تھیں یہ صورت حال

www.abulhasanalinadwi.org

ایک درد مند عالم اور مفکر کے لئے نہایت اذیت ناک اور اس کی روح اور جذبات کو انتہائی، تکلیف پہنچانیوالی تھی۔ ایسی سنگین حالت میں عالم عرب کی فکری و ثقافتی رہنمائی اور اصلاح عقیدہ و معاشرہ کے لئے میدان عمل میں اترنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ مرحلہ اسی کے سر کرنے کا تھا جس کا عزم و حوصلہ اور ایمانی طاقت ہر شعلۂ بلا کو جلا کر خاک کر دینے کی طاقت رکھتی ہو اس کے لئے مرد مومن کی نگاہ کی ضرورت تھی اور عالم عرب کی سنگین صورت حال کا تقاضا اور عالم انسانیت کی ضرورت تھی کہ اس خطہ ارض کی تقدیر بدلے نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

عالم عرب کو اپنے خیال و فکر اور عمل کا میدان بنانا ایک ایسا فیصلہ تھا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ علامہ ندویؒ خود تحریر کرتے ہیں "تقدیر خداوندی اور توفیق خداوندی کے نتیجہ میں میں نے لکھنے پڑھنے اور خطابت و تحریر کی صلاحیت ہونے کے بعد اپنی محدود صلاحیتوں اور فرصتوں کا اصل میدان عالم عرب کو ہی بنایا اور مخاطب عرب اقوام و ممالک کو میری اکثر اہم تالیفات و تصنیفیں اور تحریریں اصلاً وابتداً عربی ہی میں وجود میں آئیں۔"

یہ عزم و حوصلہ ایک نرم رفتار شیریں گفتار اور درویش صفت انسان کے لئے مقدر تھا۔ عصر حاضر کے فکری و ثقافتی چیلنجز، اور اس میں برپا ازکار و نظریات اور تاریخی عوامل پر گہری نظر رکھنا لازمی شرط ہے۔ علامہ اقبالؒ کا یہ قول نظر سے گزرا ہے کہ "مسلمان ایشیا کی سیاست کو ترقی دینے میں کسی قسم کا کوئی کردار ادا کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں" ایسا ہی ایک تبصرہ انھوں نے مسلمانوں کی فلسفیانہ میراث کے بارے میں کیا تھا۔ علامہ ندویؒ بسم اللہ مجریہا ومرسہا" کہہ کر عالم عرب کی فکری، ثقافتی، لسانی، ادبی اور تہذیبی رہنمائی کا عزم کر کے میدان میں اترتے ہیں۔

علامہ ندویؒ عالم عرب کی تاریخ کے مختلف ادوار سے اچھی طرح واقف تھے، اس کے نشیب و فراز کے رمز شناس تھے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اسلام نے ان کی زندگی میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ اس لئے وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ عالم عرب کی

www.abulhasanalinadwi.org

قیادت ور ہنمائی انھیں کس طرح کرنی چاہئے۔

۱۹۵۰ء میں ان کا ایک مضمون " کیف توجه المعارف فی البلاد الاسلامیة" حجاز کے واحد اخبار " البلاد السعودیه" میں نکلا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ میں شروع سے اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ عالم اسلام بالخصوص عرب کی موجودہ صورت حال ، عقائد کا تزلزل، ذہنی انتشار اخلاقی انار کی اور اسلام کی قائدانہ صلاحیت کے بارے میں بے اعتمادی اور اس کے مستقبل سے ناامیدی اس نظام تعلیم کا نتیجہ ہے جو مغرب سے کسی بنیادی تبدیلی اور مجتہدانہ فکرو نظر کے در آمد کیا گیا ہے۔ علامہ ندویؒ نے مختلف اوقات میں تحریری و تقریری طور پر ارباب حکومت اور تعلیم و تربیت کے ذمہ داروں کو اس کی طرف متوجہ کیا ان کے نزدیک ایک عالم عرب میں سیاسی، فوجی انقلابات ، حکومتوں اور عوام کے درمیان وسیع خلیج اور ان میں عدم استقراء کا بڑا سبب یہی ہے کہ ملت کے عقائد و جذبات ، احساسات وضروریات اور ہیں اور ان حکومتوں کا باہر سے در آمد کیا ہوا نظام تعلیم نہ یہ کہ ان کے عقائد و جذبات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا بلکہ ان کی بیخ کنی کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح اس امت کی کیفیت اس سواری کی طرح ہو گئی ہے جس میں دو مخالف سمتوں میں گھوڑے جوت دیئے گئے ہوں یا انجن فٹ کر گئے ہوں۔

وہ تحریر کرتے ہیں:

"نظام تعلیم اس تیار کردہ سامان کی طرح نہیں ہے جو کسی ملک سے در آمد کر لی جاتی ہے اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو وہ قوم اپنے پورے قدیم ورثہ اور ملی تشخصات سے محروم ہو جاتی ہے۔ یا سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوتی ہے۔ انھوں نے عربوں کے احساسات اور ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ اسرائیل میں اپنی تعلیم اور اپنی ملی تشخصات کی حفاظت کا کس قدر اہتمام ہے وہ اس بارے میں کتنا غیور اور ذکی الحس واقع ہوا ہے۔ اسرائیل میں اعلی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہودی عقائد کو غذا پہنچانا اور اس کے نشو ونما اور ارتقاء کے لئے کوشش کرنا اور نئی نسل کو عمر بھر اس کا وفادار رہنا سکھا

www.abulhasanalinadwi.org

تا ہے"

علامہ ندویؒ نے جزیرۃ العرب میں صفائی سے کہا کہ جزیرۃ العرب کی یہ سرزمین اور یہ تمدن وترقی اور اس سرزمین پر قائم ہونے والی حکومتیں بعثت محمدی ﷺ کا صدقہ اور اس کی دین ہے۔ اور اس سرزمین پر اسلام کو ابدی طور پر مالکانہ اور قائدانہ حقوق واختیار حاصل ہیں، اور یہ اپنے پورے طول وعرض کے ساتھ اس کا حرم اور اس کا قلعہ ہے۔ اسی لئے یہاں کسی کو باہر سے بر آمد کئے گئے۔ فلسفوں کی تبلیغ یا ترسیخ کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور نہ ان بنیادوں پر تیشہ چلانے کی جو صحابہؓ کرام و داعیان و مجاہدین اسلام نے تعمیر کیں۔

عالم عرب کے رہنمائی کے بارے میں علامہ ندویؒ کا یہ اصولی موقف تھا کہ کسی ملک کا نظام تعلیم وہاں کے باشندوں کی فطرت اور نفسیات کے عین مطابق ہونا چاہئے، دین اسلام عربوں کی فطرت اور نفسیات مزاج میں رچا بسا ہوا ہے اگر اس سے ہٹ کر کوئی اقدام کیا جائے گا تو معاشرتی تصادم کی شکل میں سامنے آئیں گے اور عالم عرب میں حکومت اور عوام کے درمیان جو نا موافقت اور عدم ہم آہنگی، مغربی تہذیب و تمدن اور دیگر افکار و نظریات کو در آنے کا موقعہ اسی در آمد کئے ہوئے نظام تعلیم کی وجہ سے ملا ہے۔

عرب قومیت کے فتنہ کا مقابلہ :

۵ /جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل کے مقابلہ میں مصر کی شکست، بیت المقدس پر اسرائیلی قبضہ، دریائے اردن کے مغربی کنارۃ (جس میں قدس، الخلیل، نابلس وغیرہ شامل ہیں) اور سینا کے ہاتھوں سے نکل جانے "عرب محاذ" کے ڈھول کا پول کھل جانے اور قومیۃ عربیہ کے پھولے ہوئے بلند پرواز غبارہ کی ہوا نکل جانے کا اور اس کے ساتھ طویل و عریض عالم اسلام کی بے بسی اور رسوائی کا تاریخی واقعہ پیش آیا۔

علامہ ندویؒ تحریر کرتے ہیں "اسی واقعہ نے میری تمام توجہ اور لکھنے بولنے

اور اظہار خیال کی توانائی اور فرصت کو اس واقعہ کے اصل ذمہ دار صدر جمال عبد الناصر کی تنقید و مخالفت پر مرکوز کر دیا اور اس کو میرے اعصاب پر مستولی اور تحریر و تقریر کا موضوع بنا دیا اس موقع پر صاف صاف تنقید اور واقعہ پر نہایت کرب واذیت اور قلب وضمیر سے سخت احتجاج اور اضطراب کا اس تاثر و حادثہ کو اتنی اہمیت دینے اور صدر ناصر کے بارے میں (جن سے کبھی ذاتی واسطہ نہیں پڑا تھا اس موقف کے اختیار کرنے کا سبب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک اس موقعہ کے پورے پس منظر اور سیاق وسباق میں نہ دیکھا جائے پھر اس تعلق کا صحیح اندازہ نہ کیا جائے کہ جو مجھے ذہنی، فکری، ثقافتی، لسانی اور جذباتی طور پر عالم عرب سے تھا۔

مصر کے جمال عبد الناصر عالم عرب میں ایک نبیادی، ہمہ گیر اور نہایت دور رس تبدیلی کے داعی اور علمبردار تھے اور بڑی آزمائش کی بات یہ تھی کہ ان کو سویز کی کامیابی اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر نئی نسل کی مقتدائیت و محبوبیت کے مواقع ووسائل حاصل ہو گئے تھے۔ وہ عالم عربی کا رخ اس مرکزی نقطہ سے ہٹا کر جو اس کے فکر و عمل، شوق اور تمنا اور جذبہ و شوق کا قبلہ رہا ہے ہمہ گیر مادیت اور لا مذہبیت کی طرف پھیرنا چاہتے تھے۔

اس کے ساتھ قوم پرستی میں جب قدیم تہذیب کے احیاء کی سرمستی اور آباء پرستی کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے تو وہ نہ صرف اخوت اسلامی کی حریف بلکہ نبوت محمدی کی رقیب بھی نظر آتی ہے۔ اس خطرہ کو محسوس کر کے علامہ ندوی نے ایک مستقل رسالہ "عرب قوم پرستی اسلامی نقطۂ نظر سے خطرناک کیوں؟ لکھا جس میں عرب اور اسلام کے لافانی رشتوں کو نمایاں کیا اور بتایا کہ نبوت محمدیؐ اور شریعت اسلامی نے اس کے قیام ودوام کے لئے کیسے وسیع و عمیق انتظامات کئے ہیں پھر تاریخی طور پر اس کا جائزہ لیا کہ عربوں میں قومیت کے احساس کا آغاز کب سے ہوا۔ اور اس کے محرکات کیا تھے اور ثابت کیا کہ تحریک قومیت کے اولین قائد وہ عیسائی فضلاء تھے جو عربوں کا رشتہ اسلام سے کمزور کرنا چاہتے تھے اور خلافت عثمانیہ کے خلاف عورتوں کا

www.abulhasanalinadwi.org

ایک محاذ بنانا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ مرکز خلافت کے انتقال کی تحریک تھی جس کے نقیب اور داعی دانایان مغرب تھے اور جس کے نتیجہ میں عربوں نے ترکوں سے بغاوت کی۔

پھر اس قیادت نے عرب و مصر کو ایک ذہنی و اخلاقی انتشار، اسلام کی برتری اور قیادت کی صلاحیت سے مایوسی کے احساس اور عزت واستحکام کو اور فلسفہ زندگی کے سایہ میں، اور کسی مشرقی یا مغربی بلاک کے دامن میں تلاش کرنے کا راستہ، ہموار کردیا، ہر طرح کی تنقید اور اختلاف پر پابندی عائد کردی اور نفس وخواہشات کی طرح آزادی دے دی۔ اس بارہ برس کے عرصہ میں اس قیادت کے دوران عرب ممالک کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ میں ایسی تبدیلی آئی اور اولاد ابراہیم کی آزادی وبت پرستی کے ایسے نمونے کھلی آنکھوں دیکھنے میں آئے جو نہ صرف ذہنی وتہذیبی ارتداد کے مرادف تھے بلکہ اس کے حدود کہیں کہیں، اعتقادی ارتداد سے بھی جا ملتے تھے اور بہت سے نوجوانوں کی زبان سے صاف صاف کفریہ کلمات دین اور اہل دین سے بے زاری کا اظہار تبرا کے حدود تک پہنچ جاتا تھا۔

جمال عبدالناصر کے زیر قیادت عربی وحدت اور عرب قومیت کو ایمان عقیدہ کا رنگ اسلام کا بدل اور جمال عبدالصار "نبی القومیۃ العربیۃ" بنادیا گیا، علامہ ندویؒ نے اس کے خلاف پر زور تقریریں کیں مضامین، اور رسالے تحریر کئے اور اس سیلاب بلا پر بند لگایا ہے جس کے تیز و تند دھارے کو روکنا عرب علماء و مفکرین کے بس میں نہیں نظر آرہا ہے۔ عربوں کی زندگی پر نہ صرف بلاد عجم میں بلکہ عالم عربی میں بھی کسی نے اتنی تنقید نہیں کی اور اتنی صاف گوئی اور جرأت سے کام نہیں لیا، جس کی خدا نے علامہ ندویؒ کو توفیق دی تھی، اس کی تصدیق ان کے درج ذیل رسائل کے مجموعہ سے ہو سکتی ہے۔

(۱) العرب والاسلام ۔ عرب واسلام کا باہمی تعلق

(۲) إلی الاسلام جدید عربو اسلام کی طرف از سر نو توجہ کرو

(۳) المسلمون وقضیۃ فلسطین مسلمان اور مسئلہ فلسطین

www.abulhasanalinadwi.org

(۴) کیف ینظر المسلمون إلی الحجاز و جزیرۃ العرب مسلمان حجاز اور جزیرۃ العرب کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور کیا توقع رکھتے ہیں۔

(۵) حاجۃ العالم إلی مجتمع اسلامی مثالی افضلی آج دنیا کی سب سے بڑی ضرورت ایک اسلامی مثالی بہترین معاشرہ اور ماحول کی ہے۔

(۶) اسمعی یا مصر سن اے مصر

(۷) اسمعی یا سوریۃ اے سوریۃ (شام) سن

(۸) اسمعی یا زہرۃ الصحراء (الکویت) سن اے لالہ صحرائی

(۹) اسمعوھا منی صریحۃ ایھا العرب اے عرب! صاف صاف سن لو

۷ ار نومبر کو کویت کی ایک تقریر میں کہا تھا"

"عالم عرب کو اصل خطرہ اسرائیل سے نہیں اس ضمیر سے ہے جس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ثابت شدہ حقائق سے چشم پوشی، قومی ضمیر کا مفلوج ہو جانا، قومی ضمیر کا مفلوج ہو جانا، اپنے قائدین سے احتساب نہ کرنا، حادثات سے سبق نہ لینا اس سے خطرناک بات ہے اور اس وقت عالم عربی اسی خطرہ سے دوچار ہے۔"

اس حادثہ کے بعد علامہ ندویؒ نے عربوں کی رسوا کن شکست کے اسباب اور ان کی بنیادی کمزوریوں کا بے لاگ جائزہ لیا اور بتایا کہ وہ کیا تبدیلیاں کر کے اس داغ کو دھونے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد علامہ مرحوم نے عرب سربراہان مملکت اور اخبار نویسوں کے نام ایک خط لکھا جو اہتمام سے ان کے نام بھیجا گیا۔ اس میں کچھ اس المیہ کے حقیقی اسباب بیان کیے گئے تھے اور اس سلسلہ میں ان کی ذمہ داریوں اور فرائض کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔

اس موقعہ پر بعض گوشوں سے یہ سوال کیا گیا کہ آخر مجھے کیوں اس حادثہ سے اس قدر تاثر ہے۔ ایک اردو رسالہ کے ایک مضمون میں خاص طور یہ سوال اٹھایا گیا کہ ان میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ صدر ناصر اور مصر کی قیادت کی مخالفت اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

ایک مضمون میں علامہ ندویؒ نے پوری بے تکلفی کے ساتھ اس کی وضاحت کی اور فرط تاثر اور جذبات کے ماتحت درج ذیل تحریر سامنے آئی، اس تحریر کا اس وجہ سے بھی، نقل کرنا ضروری ہے کہ عربی زبان وادب اور عربی ثقافت پر اثرات اور نقوش علامہ مرحوم نے چھوڑے ہیں وہ عرب کی لسانی اور ثقافتی تاریخ میں انھیں کیا مقام دے سکتے ہیں۔ علامہ ندویؒ اس تحریر میں خود اپنا مقام متعین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ عرب کی لسانی اور ثقاقفتی تاریخ میں انھیں کیا مقام دے سکتے ہیں۔ علامہ ندویؒ اس تحریر میں خود اپنا مقام متعین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آئندہ کا مورخ جب تاریخ نویسی کرنے کے لئے قلم اٹھائے گا اس وقت ان کا مقام متعین ہو سکے گا۔

”میں نہ عربی دنیا سے بیگانہ ہوں اور نہ اجنبی، اور نہ میری معلومات سکنڈ ہنڈ ہیں اور نہ میں نے عرب رہنماؤں پر تنقید کا کام اور عربوں کی زندگی کے احتساب کا فریضہ انکے مصائب اور ان کی ناکامیابیوں کے اسباب پر بحث کا سلسلہ صرف عرب واسرائیل کی اس جنگ کے موقع پر شروع کیا اور نہ اچانک بے وقت اس میدان میں آگیا ہوں۔ میں اپنے آپ کو ایک مسلمان کے رشتہ سے بھی اور عربی ثقافت کے ناطہ سے بھی اس وسیع وعریض عرب خاندان، کا جو مراکش سے بغداد تک پھیلا ہوا ہے، ایک فرد سمجھتا ہوں۔ میں ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوں۔ میری قسمت ان کی قسمت سے وابستہ ہے۔ ان کی عزت سے میری عزت اور ان کی ذلت سے میری ذلت ہے۔ میرے تخیلات کی دنیا، میری تمناؤں کا مرکز، میرے طائر روح کا حقیقی نشیمن عرب کی محبوب سرزمین، اس کی زبان وادب اور اس کی تہذیب وثقافت رہی ہے، عربی دنیا کے اس پورے اثاثہ اور سرمایہ پر (جس کی حفاظت اوسربلندی کے لئے قومیت عربیۃ کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے) میرا حق کسی طٰہٰ حسین، کسی عقاد کسی احمد امین یا کسی کرد علی سے کم نہیں، میرا خمیر اور میرا آب وگل ہندوستان کی سرزمین ہے، مجھے اس کا اعتراف بھی ہے اور اس پر فخر بھی لیکن میں نے اردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے خیال کا ذریعہ بنایا اور

www.abulhasanalinadwi.org

مجھے اقبالؒ کے الفاظ میں یہ دعوی کرنے کا حق ہے

میر اساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہائے عجم رہا

وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا میری عربی رہی

علامہ ندویؒ جس طرح عالم عرب میں پیدا شدہ فکری انحرافات، عربی قومیت، اشتراکیت، اور عربوں کی مغربیت پسندی بلکہ فریفتگی کے مقابلہ کے لئے سیسہ پلائی دیوار بن کھڑے ہو گئے اور اس سلسلہ میں جس خلوص وللّٰہیت اور بے لوثی اور نفس انسانی کی بلندی ورفعت کا مظاہر کیا اس نے ان کو عالم عرب میں وہ مقام عطا کیا جس کی نظیر غیر عرب علماء ومفکرین تو کیا عالم عرب کے علماء ومفکرین میں بھی نہیں ملتی۔

اللہ کی دین ہے جسے دے

میراث نہیں بلند نامی

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کے اثرات۔ علامہ ندویؒ کی یہ مشہور عالم تاریخ ساز کتاب ۱۹۵۰ء میں مصر سے شائع ہوئی مرحوم تحریر کرتے ہیں کہ

" اس وقت مسلمان اہل قلم کے بحث وفکر کا عام موضوع اور مؤرخین ومصنفین کے غور وفکر اور بحث وتحقیق کا میدان یہ تھا کہ دنیا میں پیش آنے والے واقعات عظیم جنگوں، سلطنتوں کے سقوط، یورپ کی نشاۃ ثانیہ، صنعتی وسائنسی انقلاب اور مغربی سامراج سے مسلمانوں پر کیا اثر پڑا، اور انھوں نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ گویا مسلمان تاریخ کا کوئی "عامل" نہیں بلکہ "معمول" ہے اور اثر انگیز واقعات اور انقلاب زمانہ کا تختۂ مشق ہیں۔ اردو کے محاورہ کے مطابق وہ خربوزہ کی طرح ہیں کہ وہ چھری پر گرے یا چھری اس پر گرے نقصان بہر حال خربوزہ کا ہوگا۔ میرے علم میں ابھی تک کسی نے اس نظریہ کو پلٹ کر اس طرح سے سوچنے اور لکھنے کی منظم علمی اور تاریخی انداز پر سائنٹفک کوشش نہیں کی تھی کہ مسلمان تاریخ کا ایک ایکٹر (Actor) نہیں، بلکہ ایک

www.abulhasanalinadwi.org

طاقتور تاریخی بلکہ تاریخ ساز عامل کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے تقدیر انسانی وابستہ ہے۔

"حقیقۃً یہ موضوع میرے سن وسال اور میرے علم و مطالعہ اور میرے ذہنی ارتقاء سے جوڑ نہیں کھاتا تھا اس کے لئے اس سے زیادہ پختہ وبالغ نظر، اس سے زیادہ وسیع و عمیق مطالعہ اور اس سے کہنہ مشق اور تجربہ کار قلم کی ضرورت تھی۔ میرے جیسے آدمی کے لئے اس موضوع پر لکھنا ایک "جرأت رندانہ" یا "ادائے قلندرانہ" سے کم نہ تھا لیکن انسانی کوششیں اور کاوشیں (جو توفیق الٰہی سے کبھی کبھی غیر معمولی طریقہ سے کامیاب اور مقبول ہو جاتی ہیں) ہمیشہ منطق وریاضی کے تابع نہیں ہوتیں اور اسی میں خیر ہے، میں اس خیال سے ایسا سرشار اور اس کے تقاضہ سے ایسا مغلوب ہوا کہ میں نے نہ صرف اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت کی بلکہ ہی میں لکھنے کا فیصلہ کر لیا"۔

جس وقت علامہ ندویؒ نے یہ فیصلہ کیا تھا وہ بڑا مبارک وقت تھا، یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت تھی انھوں نے اسے عربی زبان میں لکھنے کا فیصلہ کیا اور یہ واضح کر لیا کہ امت عربیہ ان کی اولین ترجیح ہے۔ ان کو دینی، فکری ثقافتی، لسانی اور جذباتی طور پر عالم عرب سے جو تعلق تھا یہ اس کا مظہر ہے۔ بلاشبہ یہ ایک دانشمندانہ اور حکیمانہ فیصلہ تھا۔ علامہ ندویؒ کی یہ کتاب جب عالم عرب کے سامنے آئی تو اس نے ان کے اندر زندگی کی زبردست لہر پیدا کر دی کیا عوام کیا خواص، کیا شاہی، وحکمراں طبقہ اور کیا علماء و مفکرین سب کو اس کتاب نے متاثر کیا۔ علماء و مفکرین نے اسے تاریخ اور صدی کی بہترین کتاب قرار دیا جس نے امت مسلمہ کی رہنمائی اور قیادت کا فریضہ انجام دیا۔

علامہ ندویؒ کے قیام مصر کے دوران معروف و مشہور اہل قلم باحث اور مفکر اسلام سید قطب شہیدؒ کی ہفتہ وار مجلس مذاکرہ میں اس کتاب کی تلخیص اور اس پر بحث و مباحثہ ہوا۔ سید قطب شہیدؒ تحریر کرتے ہیں۔

"اس موضوع پر تمام قدیم وجدید لٹریچر میں چند بہترین کتابیں جو میری نظر سے گزری ہیں ان میں یہ کتاب خاص مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسلام کے اصول وکلیات کو ان کے وسیع دائرہ کے اندر اور اسلام کی

www.abulhasanalinadwi.org

صحیح روح کے مطابق سمجھا ہے اس بنا پر یہ کافی دینی واجتماعی تحقیق کا علمی نمونہ ہے بلکہ اس کا بھی نمونہ ہے کہ اسلامی زوایہ نگاہ سے تاریخ کو کس طرح مرتب کرنا چاہئے۔

مصنف کے نزدیک اس کتاب کا سب سے جاندار طاقتور حصہ، محمد ﷺ العالم العربی' ہے مرحوم اس حصہ کو بہت پسند فرماتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں میں اس حصہ کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت ونجات سمجھتا ہوں۔

عرب و عجم پر بعثت محمدیؐ کے تاریخ سازاثرات: اکیسویں صدی اور الف ثالث کی آمد پر بالکل واضح طور پر عالم انسانی کو سمجھ لینا چاہئے کہ عالم عربی ہی کی تخصیص نہیں ہے بلکہ اسے صرف ترجیح کہا جاسکتا ہے ترجیح وانتخاب خداوندی ورنہ "محمد رسول ﷺ روح العالم الانسانی" ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ دنیا سے صاف صاف کہدیا جائے کہ کسی بھی فرد، پارٹی، سیاسی و نظریاتی اور گمراہ کن فلسفہائے زندگی کو اجازت نہیں دی جاسکتی ہے کہ اب مزید عالم انسانی کو گمراہ کرے۔

بعثت محمدی ﷺ کے سب سے بڑے احسان کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

نئے خدا ہا ساختیم از گاؤ خر | نئے حضور کاہناں افگندہ سر
نئے سجودے پیش معبودان پیر | نئے طواف کوشک سلطان و میر
این ہمہ از لطف بے پایائی تست | فکر ما پروردۂ احسان تست

ترجمہ:۔ ہم نے گاؤ خر کو خدا بنایا نہ نجومیوں اور پروہتوں کے آگے سر جھکایا۔ نہ روایتی معبودوں کو سجدہ کیا نہ کسی سلطان وامیر کی بارگاہ کا چکر لگایا یہ سب باتیں آپ ﷺ کے بے پایاں لطف وکرم کے سبب ہیں اور ہماری فکر و نظر کی صلاحیت آپ ہی کی آغوش تربیت کی پروردہ ہے۔

اردو کے ایک شاعر نے کہا ہے۔

میرے افکار کو تابندگی دینے والے
تجھ پہ ہو سانس میں سوبار درود اور سلام

www.abulhasanalinadwi.org

بھوکے بھیڑیاکی پرتش کرنے والی قوم: دنیا کی تہذیب وتمدن کو برباد اور غارت کرنے والی ترک قوم جس نے خلافت عباسیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور جس کی ہلاکت اور بربادی پر شیخ سعدی علیہ رحمہ نے کہا تھا آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر آں مشیت الٰہی اور حکمت خداوندی کے ماتحت حلقۂ دین اسلام میں داخل ہوتی ہے۔ مؤرخین عالم انگشت بدنداں اور حیرت کناں ہیں کہ ایک لٹیری اور غارت گر قوم اسلام قبول کر کے عالم انسانیت کے تن مردہ میں محمد رسول ﷺ کی روح پیدا کر دیتی ہے آج براعظم یورپ اور عالم مغرب میں مسلمانوں کی جلوہ گری اور دین اسلام کی بہار انہیں کے قبول اسلام کا فیض ہے۔

قبول اسلام اور دین کی دعوت نے ترکی قوم کو وسط ایشاء کے ایک گمنام ومحدود دائرہ اور حصار سے نکال کر جہاں وہ گم نامی اور بے نشانی کی زندگی گزار ہی تھی، اور بھوکے بھیڑیا کی پرستش کر رہی تھی، اس وسیع وعریض میدان میں لاکھڑا کیا اور امت مسلمہ کی قیادت وسیادت کے منصب رفیع پر پہنچایا، حرمین شریفین کی تولیت کا شرف بخشا، حرم مکی اور مسجد نبوی کی تعمیر کا موقع دیا جو آج تک باقی ہے۔(بیت اللہ کی موجودہ عمارت سلطان مراد کی ور مسجد نبوی کی موجودہ عمارت سلطان عبدالحمید ثانی کی تعمیر ہے)

جزیرۃ العرب اور عالم عرب کے تعلق سے بعثت محمدی ﷺ احسانی کا تذکرہ، جو دنیا کی سب قوموں اور ملکوں سے بڑھکر عرب پر ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

ازدم سیراب آں امی لقب
لالہ رست از ریگ صحرائے عرب

ترجمہ۔اس نبی امی لقب کے فیض سے صحرائے عرب کے ریگزاروں سے گل لالہ لہلہا اٹھے

علامہ ندوی لکھتے ہیں "خدانخواستہ اگر اسلام نہ آتا اور عرب اس کی دعوت لے کر نہ کھڑے ہوتے تو جزیرۃ العرب کا حال کیا ہوتا، اور ان حکومتوں اور ریاستوں کو

کون کہاں تلاش کرنے جاتا جن سے ساری دنیا کے مسلمان محبت و عقیدت رکھتے ہیں اور ان کی دولت و فیاضی کے دنیا میں گیت گائے جارہے ہیں۔ اور اس چشمۂ شیریں پر مور و ملخ جمع ہو رہے ہیں، اس کے لئے کتنے ہزار سال انتظار کرنا پڑتا پھر بھی اس کے ظہور میں آنے کے کیا امکانات تھے"

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پودا انھیں کی لگائی ہوئی ہے

کتاب کے اس حصہ میں عربوں سے بڑی صفائی اور بڑی بے تکلفی سے کہا گیا ہے کہ ان کی ساری عزت و شرف ان کی تاریخ اور ان کا کارنامہ اس وجود گرامی کا صدقہ اور فیض ہے اور گر ان کو اس پر فخر و یقین نہیں تو محمد رسول ﷺ اور ان کے ذریعہ سے خدا نے جو کچھ عطا کیا ہے واپس کریں اور پھر دیکھیں کہ ان کے پاس کیا باقی رہ جاتا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں اور مولانا غلام رسول مہر کی تصانیف

سید احمد شہید کا موازنہ

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری
ڈپٹی لائبریرین، مولانا آزاد لائبریری۔ اے ایم، یو

مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی کثیر الجہات اور کثیر الابعاد شخصیت کے مالک تھے، وہ ایک بلند پایہ مصنف، بے مثال خطیب، جادوبیان مقرر، داعی و مصلح، پاکیزہ دل، پاک ذات، پاک صفات، مخصوص اور منفرد اسلوب کے حامل ادیب، مؤرخ اسلام، پیکر انسانیت وشرافت، عالم باعمل، اور بہترین سوانح نگار تھے، قسام ازل نے آپ کو غیر معمولی اور قابل صدر شک صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اشاعت دین اور خدمت خلق کیلئے وقف کردی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک وملت کے لیے مولانا علی میاںؒ کی خدمات بہت ہی وسیع اور متنوع ہیں۔ اور یوں تو آپ کے تمام کارنامے عظیم اور آب زر سے تحریر کیے جانے کے لائق ہیں، لیکن ان میں بھی سب سے زیادہ نمایاں، ناقابل فراموش اور دائمی اہمیت کے حامل ان کے تصنیفی کارنامے ہیں جن کا فیضان رہتی دنیا تک جاری وساری رہے گا۔ اور ہر کتاب اپنے موضوع اور انداز بیان کے لحاظ سے لاثانی ہے، لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم، عظیم الشان اور غالباً لافانی تالیف، میری ناقص رائے میں سیرت سید احمد شہیدؒ، ہے خود مؤلف محترم نے اس کو اپنی سب سے اچھی اور

www.abulhasanalinadwi.org

کامیاب کاوش قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

> سیرتِ سید احمد شہیدؒ اس بے بضاعت کی عزیز ترین متاع اور ایک بڑی محسن کتاب ہے۔ اس کم سواد نے ہزراوں صفحات سیاہ کیے اور بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں تصنیف کیں، لیکن جس ذوق و شوق سے یہ کتاب لکھی، کوئی کتاب نہیں لکھی، اس کتاب نے کسی اور کو کوئی فیض پہنچایا ہو، یا نہ پہنچایا ہو، اس نے خود اپنے مصنف کو حلاوت ایمانی سے لذت یاب کیا، اس نے ان اہل یقین اور ارباب عزیمت سے متعارف کیا جن کی نظیر اسلام کی پچھلی صدیوں میں آسانی سے نہیں ملتی، پھر اسی کتاب نے اس دور کے ان اہل یقین تک پہنچایا جن کو اس دولت سے حصہ ملا تھا اور ان کے دلوں میں جگہ پیدا کی اس کو مصنف کی خود غرضی کہیے یا جذبۂ شکر گزاری کہ وہ اس کتاب کو اپنے نقوشِ قلم میں اولین مقام دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ نقوش بار بار تازہ اور روشن ہوں۔[1]

سید احمد شہیدؒ (۱۷۸۶ء-۱۸۳۱ء) انیسویں صدی کے ربع اول میں ہندوستان کی اسلامی تحرک اور جہاد حریت کے بانی اور سب سے بڑے علم بردار تھے، آپ کا خاندان ولی اللہی سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ آپ کو شاہ عبدالعزیزؒ صاحب سے شرف بیعت بھی حاصل تھا، آپ کی باقاعدہ تعلیم زیادہ نہ تھی، آپ کو ابتداء میں مدرسہ میں داخل کرایا گیا، لیکن آپ کی طبیعت اپنے اسباق کی جانب مائل نہ ہوئی چنانچہ تین سال کی مدت میں صرف قرآن کریم کی چند سورتیں یاد کر سکے اور معمولی سا لکھنا پڑھنا سیکھ لیا، لیکن آپ کا قلب علم کے نور سے روشن تھا۔ بعد میں آپ نے ذاتی مطالعہ سے حدیث، فقہ اور دیگر امور دینیہ میں وسیع معلومات حاصل کر لی تھیں اس کے علاوہ شاہ ولی اللہؒ صاحب کے صاحب زادگانِ عالی مقام خصوصاً شاہ عبدالعزیزؒ صاحب، شاہ عبدالقادر

---

[1] سیرت سید احمد شہید۔ ص ۳۲

www.abulhasanalinadwi.org

"صاحب، شاہ رفیع الدینؒ صاحب اور آپ کے حلقہ کے دیگر حضرات کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور اپنے علم کو جلا بخشی۔ بقول مولانا علی میاںؒ :

"سید صاحب نے اگرچہ درسیات کی تکمیل نہیں کی، لیکن آپ کو دینی علوم سے ضروری واقفیت ہوگئی۔ آپ ہر وقت علماء، مفسرین، محدثین، فقہا کی صحبت میں رہتے تھے جہاں ہر وقت علم کا چرچا رہتا تھا جہاں کا گھر بھی مدرسہ تھا اور جہاں کی تفریح بھی درس تھی، وہاں کی ہوا بھی علم پرور تھی اور وہاں کے بچے بھی دین کی سمجھ اور شریعت سے واقفیت رکھتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا شریعت کدہ ہندوستان میں بالاتفاق علم کا سب سے بڑا مرکز تھا جس میں منتخب علماء و فضلاء حاضر ہوتے تھے۔ ایک وقت میں صرف اس خاندان میں مولانا عبدالحیٔ، مولانا اسمٰعیل، مولانا شاہ محمد اسحٰق، مولانا محمد یعقوب، موجود تھے، اور سید صاحب کی صحبت انھیں حضرات سے تھی، قرآن مجید تو آپ نے خاص طور سے پڑھا، ترجمانِ قرآن حضرت شاہ عبدالقادر کی توجہ اور صحبت نے اس کو جلا دی" [1]

سید صاحب کے دل میں اسلام کی سربلندی اور ہندوستان کو مسلم دشمن طاقتوں سے نجات دلانے کی تڑپ پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی۔ حلقۂ ولی اللہی کی صحبتوں نے اس آگ کو اور بھڑکایا۔ اس کے اثر سے سید صاحب اپنے ہمنواؤں کو ساتھ لے کر میدان عمل میں اتر آئے اور اس مقدس فریضہ کو انجام دینے کے لیے تن من دھن کی بازی لگادی۔ اس زمانے میں انگریزوں کی طاقت روز افزوں تھی اور وہ پورے ہندوستان کو اپنا محکوم بنانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اس زمانے کی بڑی طاقتوں میں نظام دکن اور سلاطین اودھ دونوں ہی انگریزوں کی شاطرانہ چالوں میں الجھ کر بے دست وپا ہو چکے

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص ۱۲۷

www.abulhasanalinadwi.org

تھے۔ان کے لیے عافیت بس اسی میں تھی کہ وہ انگریزی سرپرستی قبول کرلیں۔ چنانچہ عصری تقاضے کے تحت انھوں نے ایسا ہی کیا اور اپنی گردن میں طوق غلامی پہن لیا۔ تیسری طاقت روہیلوں کی تھی۔اس کی قیادت اس زمانے میں نواب امیر کررہے تھے۔ یہ ایک حوصلہ منداور بہادر نوجوان تھا۔اور کئی معرکوں میں انگریزوں سے ٹکرلے کر فتح مند ہوا تھا۔اس لئے سید صاحب بھی اس کے لشکر میں شامل ہوگئے اور تقریباً چھ سال تک اس کی رفاقت میں رہے اور متعدد جنگوں میں شریک ہوئے اور دادِ شجاعت دی لیکن جب حالات سے مجبور ہوکر ۱۵ر نومبر ۱۸۱۷ کو امیر خاں نے بھی انگریزوں سے صلح کرلی تو سید صاحب نے اس سے قطع تعلق کرلیا۔ اور خود جہاد کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔اس مرحلہ پرشاہ عبدالغنی صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد اسمٰعیلؒ، شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے خویش مولانا عبدالحی صاحب اور دیگر سرکردہ افراد نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اسلام ودشمن طاقتوں کے خلاف جہاد کرنے کی غرض سے ایک عظیم جماعت تشکیل دی۔ لیکن جہاد سے قبل آپ نے فریضۂ حج ادا کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ اپنے تقریباً چارسو ساتھیوں کے ہمراہ تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی سے آخری شوال ۱۸۲۱ـ۱۲۳٦ھ کو بیت اللہ کی زیارت کی غرض سے روانہ ہوئے۔ تمام ساتھیوں کے اخراجات کی ذمہ داری تنہا سید صاحب پر تھی۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے گزرتا اللہ کے مخلص بندوں کا یہ قافلہ کلکتہ پہنچا۔ راستے میں مزید افراد اس قافلہ میں شامل ہوتے گئے۔ کلکتہ سے مکہ معظمہ پہنچے اور فریضۂ حج ادا کرکے دو سال اور دو ماہ بعد یکم رمضان ۱۲۳۹ کو وطن واپس آئے اور ایک سال دو ماہ تک آبائی وطن رائے بریلی میں قیام فرمایا،اس کے بعد آپ اپنی جماعت کیساتھ جہاد کی غرض سے نکلے۔اور راجپوتانہ، سندھ، بلوچستان، قندہار اور کابل جیسے دور دراز علاقوں سے گزرتے اور اپنی فتح وکامرانی کا جھنڈا بلند کرتے رہے۔اسی زمانہ میں پنجاب کے حکمراں مسلمانوں پرمظالم ڈھارہے تھے۔انھوں نے مسلمانوں کے لیے عرصۂ حیات تنگ کردیا تھا۔اس کے سدباب کی فوری ضرورت تھی۔چنانچہ سید صاحب نے طے کیا کہ انگریزوں سے پہلے

سکھوں کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔ لہذا آپ نے پہلے اکوڑہ کے حکمراں سردار بدھ سنگھ سے جنگ کی اور ۲۰ر دسمبر ۱۸۲۲ء کو اسے شکست فاش دی۔ اس میں ۳۶ مجاہدین نے جام شہادت نوش فرمایا اور تقریباً سات سو دشمنان اسلام کام میں آئے۔ اس کے نتیجہ میں پیشاور پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا، ادھر پنجاب سے رنجیت سنگھ مسلمانوں پر مظالم ڈھا رہا تھا اور مجاہدین کے خلاف سازشیں رچ رہا تھا۔ اور بھاری رشوتیں دے کر بعض سرحدی قبایل کو مجاہدین کے مقابلہ پر کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ان قبایل کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آکر سید صاحب نے کشمیر کی جانب مراجعت کا فیصلہ کیا۔ لیکن ان افغان قبیلوں کے افراد نے سکھوں کو اس منصوبے سے مطلع کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ سید صاحب مع اپنی جماعت مجاہدین کے بالا کوٹ کے مقام پر ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں۔ بالا کوٹ شمال مغربی سرحدوں پر وادی کاغان کے جنوبی سرے پر واقع ہے۔ اس مقام پر مجاہدین کی موجودگی کی اطلاع ملتے ہی سکھ افواج نے انھیں گھیر کر بے خبری میں حملہ کر دیا۔ ان کے سپاہیوں کی تعداد مجاہدین سے کہیں زیادہ تھی۔ مجاہدین نے بڑی بہادری اور شجاعت سے دشمن کا مقابلہ کیا، لیکن تقدیر کے فیصلے کو نہ بدل سکے۔ سکھ افواج کو فتح نصیب ہوئی۔ سید صاحب نے اپنے ۳۶ ساتھیوں کے ساتھ جام شہادت نوش فرمایا۔ ان میں شاہ عبدالغنیؒ صاحب کے صاحبزادے شاہ اسمٰعیل دہلوی بھی شامل تھے۔ یہ حادثہ ۶ر مئی ۱۸۳۱ کو بروز جمعہ پیش آیا۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

بظاہر اس جنگ میں ناکامی اور سید صاحب کی شہادت کے بعد دعوت و تبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ کی یہ تحریک دم توڑ گئی، لیکن فکری اور نظری طور پر یہ عظیم تحریک آج بھی زندہ ہے، بلکہ زمانہ اور حالات کی مناسبت سے اس کی اہمیت اور معنویت پہلے سے بھی افزوں ہے۔

سید صاحب کی تحریک کیا تھی؟ اس کے محرکات کیا تھے؟ اس کے

www.abulhasanalinadwi.org

مقاصد کیا تھے؟ اس کی ناکامی کے اسباب کیا تھے؟ اور اس کے اثرات پورے ہندوستان کے سیاسی، مذہبی اور معاشی فضا پر کیا مرتب ہوے؟ اور بالخصوص مسلمانانِ ہند ان سے کس حد تک متاثر ہوئے؟ ان تمام باتوں کی تفصیلات سے کماحقہ واقفیت حاصل کرنا ہم سب کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ مزید یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اس مہتم بالشان تحریک کے بانی اور قائد کے کردار کے نمایاں پہلو کیا تھے اور اس تحریک پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ اس کے لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی اللہ کا نیک بندہ مسلمانوں کا سچا ہمدرد اور بہی خواہ، جو ادیب بھی ہو، عالم دین بھی ہو، محقق بھی ہو اور اعلی رتبے کا مؤرخ بھی، اٹھے اور ایک ایسی جامع اور مفصل کتاب تالیف کرے جس میں سید احمد شہید کی مکمل سوانح، آپ کی تحریک جہاد فی سبیل اللہ تنظیم دعوت واصلاح اور تبلیغ دین کی تاریخ، تمام ضروری جزئیات کے ساتھ صداقت اور مؤرخانہ دیانت وبصیرت کے ساتھ درج ہو، اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لیے قادر مطلق نے سید صاحب ہی کے خانوادے کی ایک عظیم شخصیت اور نامور عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی کو منتخب فرمایا، مولانا نے اس فریضہ کو ادا کیا اور حق یہ ہے حق ادا کر دیا۔ آپ نے سیرت سید احمد شہید تالیف فرمائی جو پہلی بار ۹ ۱۹۳ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی اس کو اللہ نے غیر معمولی قبول عام نصیب فرمایا، اور قلیل مدت میں اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔ فاضل مؤلف نے ہر بار اس میں اضافے کیے۔ اس طرح ہر نئی اشاعت اپنی پہلی اشاعت کے مقابلے میں زیادہ وقیع اور مبسوط ہوتی گئی، یوں تو اسی زمانے میں سید صاحب اور ان کے مجاہدانہ کارناموں پر اردو اور فارسی میں کچھ کتابیں تالیف کر لی گئی تھیں۔ جن میں سے بعض طباعت کے مراحل سے گزر کر منظر عام پر بھی آگئی تھیں۔ لیکن ان کو کسی طرح بھی جامع اور مستند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ ان میں جو اقعات مذکور ہوئے ہیں۔ ان پر یا تو عقیدت کی تہہ جمی ہوئی ہے یا مصلحت کی دبیز چادر، چنانچہ ان کے مطالعے سے نہ تو حالات کا صحیح علم ہوتا ہے، اور نہ سید صاحب کی شخصیت کے صحیح خدوخال ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ لہذا ضرورت اس بات کی تھی کہ ان

www.abulhasanalinadwi.org

ابتدائی عہد کی تمام کتابوں میں فراہم کردہ معلومات کی مکمل تنقیح کی جائے اور ان سے صحیح واقعات منتخب کر کے، اور دیگر دستیاب مآخذ کی مدد سے سید صاحب کی شخصیت کے صحیح نقوش ابھارے جائیں اور ان کے کارناموں اور ان کی چلائی ہوئی تحریکات کی تاریخ جدید اصول کے مطابق سائنٹفک انداز میں مرتب کی جائے جس میں کورانہ عقیدت، جذبات کی فروانی، مصلحت کوشی اور شخصی تعصّبات سے کنارہ کشی کر کے واقعات اور حالات اپنے صحیح پس منظر میں پیش کیے گئے ہوں، اس کام کو سیرت سید احمد شہیدؒ، نے بڑے حسین انداز میں انجام دیا۔ اس کے پہلے ایڈیشن کی ضخامت ۶۰۲ صفحات تھی۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کی رائے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا تعارف نامہ اور مولانا سید سلیمان ندوی کا مبسوط دیباچہ بھی شامل تھا۔ بعد کی اشاعتوں میں حضرت شیخ اسلام کی رائے اور مولانا دریابادیؒ کے تعارف نامہ کو حذف کر دیا گیا۔ اور صرف سید سلیمان ندوی کا مقدمہ برقرار رکھا گیا۔ پہلے ایڈیشن میں مکمل کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے باب میں سید احمد شہیدؒ کے حالاتِ زندگی، آپ کے مختلف اسفار اور محبوب مشاغل کا تذکرہ تھا۔ دوسرے باب میں لفظ جہاد اس کے معانی و مفاہیم، اس کے لوازم، اور اسلام کی رو سے اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت سے بحث کی گئی تھی۔ اس مرحلہ پر فاضل مؤلف کا جادو بیان قلم فصاحت وبلاغت، شگفتگی، دل کشی کے موتی، بکھیرتا نظر آتا ہے۔ اس کو پڑھنے سے روح میں تازگی اور حرارت ایمانی پیدا ہوتی ہے۔ اور دل جوش وولولے سے لبریز ہو جاتا ہے اس کے بعض اجزاء باربار پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں اس ضمن میں پہلے تو خود سید صاحب کی فارسی تحریروں سے طویل اقتباسات پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد اپنے الفاظ میں ان کی تشریح اور ترجمانی کی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو فرماتے ہیں۔

> مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحب کی نظر میں جہاد دین کا ایک نہایت اہم شعبہ اور تکمیلی قدم ہے۔ ان

www.abulhasanalinadwi.org

کو قرآن مجید کی صریح آیات اور واضح احادیث کے پیش نظر تعمیل کا جذبہ اس پر ابھارتا ہے۔ رضا و محبت الٰہی کا شوق دل کو گدگداتا ہے، پھر مسلمانوں کے بے بسی اور اہل کفر کا غلبہ رہ رہ کر ان کے حساس دل میں چٹکیاں لیتا ہے، ہندوستان پر کفار کے تسلط اور اسلام کے زوال کا مشاہدہ ان کو بے چین کرتا ہے۔ ان کے نزدیک اعلائے کلمۃ اللہ اور بلاد اسلامیہ کے استخلاص کی ضرورت ہر غیور اور فرض شناس مسلمان سے جہاد کا مطالبہ کر رہی ہے۔ ان کا یقین ہے کہ سلطنت کے بغیر نہ دین کا قیام ہو سکتا ہے، نہ احکام شرعی کا نفاذ ممکن ہے، نہ دعوت و تبلیغ کا کام ممکن ہے، پھر جہاد ایسا بابرکت عمل ہے جس سے ساری دنیا کو فیض پہنچتا ہے اور انسانوں کا کوئی طبقہ اس کے برکات و منافع سے محروم نہیں رہتا ان کے نزدیک حالات کی ابتری اور عالم کا فساد اس اہم فریضے کے تعطل کا نتیجہ ہے، یہ سب حقایق انکے دل میں جہاد کا عزم راسخ پیدا کرتے ہیں، اور وہ اسی راستے میں جان کی بازی لگا دینا چاہتے ہیں۔"

کتاب کا تیسرا باب امامت، تجدید اور تزکیہ، وغیرہ جیسے مسائل پر مشتمل تھا، جبکہ چوتھے اور آخری باب میں سید صاحب کی شہادت کے بعد آپ کی جماعت کی مذہبی وسیاسی خدمات، آپ کے خلفاء اور مریدین اور مسلمانوں کی اس عظیم الشان تنظیم کے کارناموں پر روشنی ڈال گئی تھی۔ بعد کی اشاعتوں میں بے پناہ اضافوں کے باعث ابواب کی یہ ترتیب برقرار نہ رہ سکی۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کتاب کو غیر معمولی مقبولیت نصیب ہوئی، جس وقت ۱۹۳۹ میں یہ پہلی بار شایع ہوئی اس وقت مؤلف محترم کی عمر ۲۴ سال کی بھی نہیں تھی، اور یہ انکی پہلی تالیف تھی، اس کے باوجود اس میں خیالات وافکار کی رفعت، تاریخ

کی بصیرت، زبان وبیان کی پختگی اور اسلوب کی چاشنی و شگفتگی، جیسی اعلیٰ صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں، اس لئے اسے فقید المثال قبول عام نصیب ہوا۔ علماء کے ہر طبقہ اور دانشوروں نے اس کی پذیرائی کی اور عقیدت واحترام سے اس کا مطالعہ اور حتی المقدور استفادہ کیا۔ اس مقبولیت کا یہ اثر ہوا کہ بہت جلد پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ تو دوسرا ایڈیشن نکالنا پڑا اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اس کے مزید ایڈیشن نکلتے رہے اب تک یہ سات بار شایع ہو چکی ہے ہر بار اس میں اضافے ہوتے رہے۔ تیسرے ایڈیشن سے بجائے ایک جلد کے اس کی دو جلدیں کر دینی پڑیں، اب پہلی جلد جو سید صاحب کی ولادت سے بیعت امامت تک کے حالات کو محیط ہے ۵۸۸ صفحات، اور دوسری جلد جس میں جنگ شید سے سید صاحب کی شہادت اور اس کے بعد کے حالات درج ہیں ۵۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس طرح چھوٹی تقطیع کے ۶۰۲ صفحات سے بڑھ کر بڑی تقطیع کے ۱۱۷۶ صفحات سے بھی متجاوز ہوگئی۔ ہر بار مؤلف محترم نے اس میں اتنی کثرت سے اضافے کیے کہ ہر اشاعت ایک آزاد اور مشتمل تالیف کی حیثیت اختیار کرتی گئی۔ مواد اور واقعات کے ساتھ مؤلف محترم کی عبارت میں روانی، جوش اور پختگی میں اضافہ ہوتا گیا، اور قلم میں توانائی اور جوانی آتی گئی۔ بقول میر انیس:

ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا　　　گھٹا زور، مشق سخن بڑھ گئی

مؤلف محترم کا یہ انکسار لایق صد رشک ہے کہ اس کی غیر معمولی مقبولیت کا سہرا انہوں نے خود سید صاحب کی مقبولیت عنداللہ کے سر باندھا اور اپنے دامن کو خود ستائی کے دلدل سے صاف بچا لیا، فرماتے ہیں:

واقعہ یہ ہے کہ موضوع کی عظمت صاحب سیرت کے مقام اور تصنیفی آداب ولوازمات کے لحاظ سے نہ میری عمر (جو اس وقت ۲۴ سال سے زیادہ نہ تھی) اس کے لیے موزوں تھی، نہ اتنی قلیل مدت اور محدود مآخذ جو مصنف کے پیش نظر رہے اس کیلئے موزوں وکافی تھے مگر یہ صاحب سوانح (مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ) کی مقبولیت عنداللہ تھی، اور وقت کی مناسبت کہ معلوم ہوا کہ کسی نے ملت کے زخم پر مرہم

www.abulhasanalinadwi.org

رکھ دیا اور اس کے خاموش ساز کو چھیڑ دیا اور ملت کی زبان اس طرح گویا ہوئی۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور عقیدت و قدر کی نگاہ سے پڑھی گئی۔ مسجدوں، مجلسوں میں پڑھ کر سنائی گئی۔ گمنام اور نوعمر مصنف کے پاس گہرے تاثر اور اعتراف و تحسین کے ایسے خطوط آئے جو اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھے۔ بعض ایسے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جو اسلام کی قوت حیات بخشی اور مسیحائی سے مایوس اور الحاد و کمیونزم کے خیالات کا شکار ہو گئے تھے، دینی رجحان اور ایمانی شعور کے بیدار ہونے کی اطلاع ملی۔ بعض لوگوں نے اس کو آٹھ، آٹھ، دس دس مرتبہ پڑھا"[1]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب بار بار پڑھے جانے کے لائق ہے۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اردو کے سوانحی ادب میں اسے ایک اعلیٰ اور منفرد مقام حاصل ہے۔ یوں تو اردو میں سوانحی کتب کی کمی نہیں، لیکن ان میں سے معدودے چند ہی ایسی نکلیں گی جو فن سوانح نگاری کے اصول پر پوری اترتی ہوں، عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ بالخصوص علماء و مشائخ اور دیگر بزرگان دین کے سوانح اس انداز سے بیان کیے جاتے ہیں کہ ان پر عقیدت و احترام کا عنصر غالب آجاتا ہے، اصلیت دب کر رہ جاتی ہے، ان کے روحانی کمالات اور فیوض و برکات کا تذکرہ زیادہ ہوتا ہے، جس سے صاحب سوانح کی اصل شخصیت آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ کوئی ماورائی کردار قاری کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ فن سوانح نگاری کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ کسی بھی مرحلہ پر صداقت اور راست گفتاری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور مبالغہ آرائی سے کلی طور پر اجتناب کیا جائے صاحب سوانح سے سوانح نگار کی عقیدت اور احترام اپنی جگہ مسلم، اور بڑی حد تک ضروری بھی، اس لئے کہ جب تک عقیدت، قلبی لگاؤ اور محبت کی کارفرمائی نہیں ہوگی، اس وقت تک سوانح

---

[1] کاروانِ زندگی۔ حصہ اول۔ ص ۱۸۹

www.abulhasanalinadwi.org

عمری ضبط تحریر میں لانے کی تحریک ہی پیدا نہیں ہوگی۔ مگر ان تمام جذبات واحساس کو حد اعتدال سے نہ بڑھنے دینا چاہئے، ورنہ سوانح عمری درجہ استناد تک نہیں پہنچ پائے گی۔ سیرت سید احمد شہید، کا جو وصف اسے دیگر کتب سوانح سے ممیز وممتاز کرتا ہے وہ اس کی اعتدال پسندی ہے مؤلف محترم کو صاحب سوانح سے بے حد عقیدت ہے انھیں ان ہی کے خاندان کے فرد فرید ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ان کی تحریک سے حد درجہ متاثر بھی ہیں، اسے "غیر منقسم ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک جہاد و تنظیم اصلاح و تجدید" بھی تصور کرتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نہ کبھی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں، نہ کہیں غیر حقیقی مداحی کا شکار ہوتے ہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جہاں سید صاحب کی سیرت، صاف و شفاف کردار، ان کے مجاہدانہ کارناموں اور اولوالعزمی کا تذکرہ آتا ہے، وہاں فطری طور پر ان کا قلم موتی اگلنے لگتا ہے اور ان کا اشہب فکر جولانیاں بھرنے لگتا ہے، لیکن اس کی لگام مؤلف محترم کے ہاتھ میں رہتی ہے وہ اسے بے قابو ہونے نہیں دیتے۔ وہ اسے مبالغہ آرائی اور شخصیت پرستی کی تنگ و تاریک وادی میں جانے سے باز رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پوری کتاب میں سید صاحب ہمیں اپنی اصلی شکل میں نظر آتے ہیں۔ نہ ان سے کوئی معجزہ سرزد ہوتا ہے اور نہ وہ انبیاء کی طرح معصوم اور ہر خطا سے پاک اور منزہ نظر آتے ہیں۔ مؤلف محترم نے خود بھی اس کی وضاحت فرمادی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "یہ بھی بتادینا ضروری ہے کہ مصنف نے کوشش کی ہے کہ صاحب سیرت اپنی اصلی صورت میں نظر آئے۔ اس نے مشرقی سوانح نگاروں کی طرح رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے، اور نہ مغربی مؤرخین کی تقلید میں خواہ مخواہ کتاب کو بے روح اور بے اثر بنانے کی کوشش کی ہے، نہ زمانے کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی ہے، اور نہ کسی خواہش و تخیل کے ماتحت تاریخ سازی کا ارادہ کیا ہے، بلکہ روایات و واقعات کی زبان میں بھی کم

www.abulhasanalinadwi.org

سے کم تغیر کیا گیا ہے۔"

مؤلف کی غیر جانبداری اور مذکورہ بالا اقتباس میں مبالغہ آرائی سے اجتناب کرنے کا جو دعویٰ کیا گیا ہے، اس کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے کتاب کے ایک مختصر سے باب کا جس میں سید صاحب کی سیرت پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے، مطالعہ ہی کافی ہے۔ اس میں انھوں نے جس ذوق و شوق، جذبے اور وجد کی کیفیت سے سید صاحب اور آپ کی جماعت مجاہدین کے کردار اور پاکیزہ سیرت پر روشنی ڈالی ہے، اس سے خود قاری پر بھی وجد اور سرمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر کسی بھی مصنف کے لیے اپنے قلم کو قابو میں رکھنا، جذبات پر قابو پانا، انصاف پسندی اور حق گوئی کی حدود سے تجاوز نہ کرنا، انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن مولانا علی میاںؒ کی سیرت نگاری اور تذکرہ نویسی کا یہ بہت بڑا وصف ہے کہ ایسے نازک مرحلوں اور خالص جذباتی مواقع پر بھی وہ اعتدال اور سلامت روی کی روش کو نہیں چھوڑتے۔

مشہور مغربی دانشور اور مصنف کارلایل کا کہنا ہے کہ سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی کی کامیابی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ اس کے موضوع اور انداز بیان دونوں دلچسپ اور معیاری ہوں۔ یہ دونوں عناصر لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی نہ تو دوسرے کی تلافی کر سکتا ہے، نہ اس کی تنسیخ و تردید، بلکہ دونوں ضروری ہیں اور اپنی اپنی افادیت اور اہمیت رکھتے ہیں۔ سیرت سید احمد شہید میں یہ دونوں عناصر بہترین انداز میں باہم شیر شکر نظر آتے ہیں۔ سید صاحب کی شخصیت آپ کا مثالی کردار، مسلمانوں اور اسلام کی سربلندی و سرفرازی کے لیے آپ کی خدمات جلیلہ، آپ کی اور آپ کی جماعت مجاہدین کی بے مثال قربانیاں اور امیر المومنین کی حیثیت سے آپ کے قائدانہ اوصاف ہر فرد اور ہر بشر، بالخصوص مسلمانوں کے لیے، بڑی کشش رکھتے ہیں ان حضرات کا اسم گرامی زبان پر آتے ہی بے اختیارانہ طور پر نطق ہماری زبان کے بوسے لینے لگتی ہے ان کے تذکرہ سے ہمارے دل جوش و ولولہ اور سوز عشق سے بھر جاتے ہیں ، ہمارا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی۔ اسی کے

www.abulhasanalinadwi.org

ساتھ ایسے پاک نفوس کے تذکار ہمارے لیے سامانِ عبرت بھی فراہم کرتے ہیں مولانا علی میاں نے یہ سوانح اتنے سوز دروں، التہاب قلب اور ذوق و شوق سے قلم بند کیے ہیں کہ پڑھنے والا ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اور تمام حواس کو مجتمع کر کے بس مطالعے میں ہی منہمک رہتا ہے۔ ہر مرحلے پر کتاب اور صاحب کتاب سے اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے یہ صرف مؤلف کے قلم کا اعجاز ہے۔

مولانا کا اپنا ایک مخصوص اسلوب نگارش ہے۔ چاشنی، حلاوت شگفتگی، سلاست اور روانی اس کے عناصر ترکیبی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا اردو کے مقابلے میں عربی زیادہ اچھی لکھتے ہیں اور ان کی عربی تحریریں فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اردو سے بہتر اور افضل ہوتی ہیں۔ مجھے اس سے اختلاف نہیں ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن سیرت سید احمد شہیدؒ اور تاریخ دعوت و عزیمت میں مولانا نے جو زبان استعمال کی ہے اور جس شگفتہ اسلوب میں واقعات بیان کیے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہے، مولانا کا ذوق شعری بھی بہت اعلیٰ ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اردو اور فارسی کے اشعار کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ ان کے ذریعہ وہ اسلوب میں چاشنی اور انداز بیان میں زور پیدا کرتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

> قوموں کی تاریخ میں، اور خود مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے اشخاص کی کمی نہیں ہے اور اس وقت بھی ہر ملک و قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے ذاتی برتری اور اقتدار یا قومی عزت و سربلندی یا ملک وطن کی آزادی کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کی، قوم کی تنظیم کی، وطن کو آزاد کرایا، عظیم الشان سلطنتیں قایم کیں، کامرانی و اقبال مندی کی زندگی حاصل کی، یا عظمت و فتح مندی کی موت مرے، یہ اپنے کارناموں کے درجے اور ترتیب کے مطابق انسانوں کے احترام انصاف کے مستحق ہیں۔ لیکن سید صاحب اس فہرست کے اشخاص میں نہیں ہیں۔ وہ ان مجاہدین میں سے ہیں جنھوں نے

www.abulhasanalinadwi.org

محض اللہ کے نام کی بلندی اور اس کی بات اونچی کرنے لئے، خالص اللہ کی خوشنودی اور رضا کے لیے "مسلمان" نام ایک قوم کے غلبے کے لئے نہیں، بلکہ "اسلام" نام ایک مکمل دین، عقیدہ و عمل اور مسلکِ زندگی کو قایم کرنے کے لیے محمد رسول ﷺ کی مظلوم شریعت کو جاری کرنے کے لیے اپنے خون کا پہلا اور آخری قطرہ بہایا۔ اس کے علاوہ کسی اور راستے میں ان کے پسینے کا بھی کوئی قطرہ نہیں بہا۔ ایسے مجاہدین و شہدائے اسلام، ایسے اکابر و قائدین اسلام کی فہرست اتنی طویل نہیں جتنی سمجھی جاتی ہے، زندگی اور موت کی یہ ترازو ایسی بلند معیار ہے، جس پر ہزاروں میں سے چند ہی پورے اترتے ہیں۔

اس کے بعد سید صاحب کی ایک اور خصوصیت پر نظر ڈالیے اور وہ یہ کہ آپ نے تھوڑے زمانے میں ایک دینی فضا قایم کردی اور ایک ایسی جماعت پیدا کردی جس کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ تیرہویں صدی میں صحابہؓ کا نمونہ تھے، ایک رنگ میں رنگے ہوئے، ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے، اللہ کے لیے جان دینے والے، شریعت پر جینے اور مرنے والے، بدعت سے نفور، شرک کے دشمن، جہاد کے نشے میں سرشار، متقی و عبادت گزار، اور بڑی بات یہ ہے کہ ہم رنگ و یک آہنگ۔ تاریخ اسلام میں ایک جگہ اتنی بڑی تعداد میں اس پختگی اور جامعیت کی کوئی جماعت صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد مشکل سے ملے گی۔ کیفیاتِ ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا چلے، لیکن ایمان و یقین اور خلوص وللّٰہیت کی ایسی بادِ بہاری ہمارے علم میں کم سے کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی اور نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر عزم و توکل، جوشِ جہاد، ایمان

واحتساب، شوق شہادت اور یقین آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے
میں آئے، آدم گری، اور مردم سازی، اصلاح وانقلاب کے ایسے
محیر العقول واقعات بھی اصلاح وتربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں
، تو کمیاب ضرور ہیں"۔[1]

سید احمد شہیدؒ کی سیرت اور حالات زندگی، آپ کی تحریک جہاد واحیائے دین اور جماعت مجاہدین سے متعلق دوسری اہم کتاب مولانا غلام رسول مہر کی 'سید احمد شہید' ہے۔ جو اصلاً چار ضخیم جلدوں کو محیط ہے۔ ابتداء میں ان کا ارداہ ایک ہی جلد میں تمام واقعات کو بیان کر دینے کا تھا۔ لیکن جوں جوں کام آگے بڑھتا گیا اور مواد دستیاب ہوتا گیا۔ ویسے ہی اس کی ضخامت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ بالآخر یہ کام چار ضخیم جلدوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اب اس کی حیثیت سید صاحب اور آپ کی جماعت مجاہدین سے متعلق خزانۂ معلومات اور دائرۃ المعارف (ENCYCLOPEDIA) کی ہو گئی ہے۔ اِن چاروں جلدوں کی تفصیل اس طرح ہے پہلی جلد ۳۹ ابواب اور ۴۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۴ اباب اس میں پہلے سید صاحب کے اجداد کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ اس کے بعد سید صاحب کی ولادت، تعلیم وتربیت اور تحریک جہاد لے کر جنگ شیدو اور اس کے بعد کے حالات کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

دوسری جلد میں ۴۶ ابواب اور ۴۵۲ (۴۱۱ تا ۸۶۲) صفحات ہیں۔ اس میں جنگ ہزارہ سے لے کر جنگ بالاکوٹ، ۶ر مئی ۱۸۳۱ء کو آپ کی شہادت اور ازواج واولاد نیز آپ کے اخلاق وعادات کا بیان ہے۔ تیسری جلد جس کا نام "جماعت مجاہدین" ہے یہ ۱۹۵۵ میں شایع ہوئی اور ۳۲۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں جماعت کی تنظیم وترتیب کے متعلق تفصیلات مرتب صورت میں پیش کی گئی ہیں جب کہ دوسرے حصہ میں بقول مؤلف، سید صاحب کے ان مجاہدوں اور رفیقوں کے سوانح درج ہیں جو ان کی زندگی میں یا ان کے ساتھ جاں بحق ہوئے، یا

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص ۵۹۔۶۰

www.abulhasanalinadwi.org

جنھوں نے بعد ازاں مجاہدانہ سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہ لیا، یا جنھیں خود سید صاحب نے دعوت و تبلیغ پر متعین کر دیا تھا اور وہ انھیں مشاغل میں زندگی گزار کر مالک حقیقی سے جا ملے" ان مجاہدین اور سید صاحب کے رفقاء کے سوانح مرتب کرنے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ " سید صاحب کی تربیت اور مردم گری کے کچھ عملی نمونے سامنے آجائیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس پاک نفس بزرگ نے تھوڑی سی مدت میں کیسی جماعت تیار کر لی تھی"

چوتھی جلد کا عنوان مہر صاحب نے سرگزشت مجاہدین، مقرر فرمایا ہے۔ یہ سلسلۂ احمد شہید کی آخری جلد ہے۔ اس پر مؤلف کی تاریخ نگاری اور تذکرہ نویسی کا وہ سفر اختتام کو پہنچتا ہے جس کا آغاز کم و بیش بیس سال قبل ہوا تھا۔ یہ جلد ۱۹۵۶ میں شایع ہوئی اور اس میں ۶۸۰ صفحات ہیں۔

مہر صاحب نے سیرت نگاری کا یہ کام ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیا۔ اس کا اندازہ اس دلچسپ حقیقت سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ کتاب کی تسوید کے زمانے میں مہر صاحب کا معمول تھا کہ ہر روز صبح میں دو رکعت نماز پڑھتے اور پھر لکھنے کا کام شروع کرتے۔ یہ ایک نادر مثال ہے۔ ایسی نظیر صرف امام بخاری کی ملتی ہے جن کے بارے میں ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ہر ایک حدیث کو ضبط تحریر میں لانے سے قبل وہ غسل فرماتے، دو رکعت نماز پڑھتے، بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہو کر دعا مانگتے پھر لکھتے، یہ سلسلہ مسلسل سولہ برس تک جاری رہا، مہر صاحب نے پہلی جلد لکھنے میں چودہ برس صرف کیے، اور بقیہ تین جلدوں کو مکمل کرنے میں چھ سال، اس کی تفصیل خود مہر صاحب نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

> ۱۹۳۹ کی برسات میں مجھ پر بخار کا حملہ ہوا۔ دو تین روز کے بعد کمر اکڑ کر تختہ بن گئی۔ کئی روز تک یہ حالت رہی کہ دو آدمیوں کی مدد کے بغیر اٹھنا بیٹھنا بھی محال ہو گیا تھا۔ بیچارگی کے اس دور میں ایک روز مولانا شہید یاد آگئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ جس تکلیف

www.abulhasanalinadwi.org

میں اب مبتلا ہوں، دراصل اس شہید سے نقضِ عہد کے جرم کی سزا ہے۔ لیٹے لیٹے عجز والحاح سے دعا کی خدایا! اگر مجھ میں اس عہد کو پورا کرنے کی کچھ بھی صلاحیت موجود ہے تو صحت عطا فرما تھوڑی سی مہلت دے اور اپنے فضل ورحمت سے تکمیل کار کے اسباب فراہم کردے۔ دیر تک حضرت علامہ اقبالؔ کا یہ شعر زبان پر جاری رہا:

حرف ناگفتہ مجال نفسے می خواہد
ورنہ مارا بہ جہانِ تو بہر وکار کجاست

سراپا جرم وخطا کی دعاء کی اور اس کا قبول کیا۔ خدا کے لطف وکرم سے دوسرے ہی دن صحت ہو گئی۔ بس اس وقت سے میں نے کمر ہمت باندھ لی اور فرصت کے بیشتر اوقات اسی کام کے لیے وقف کر دیے۔ اپنے علم کی خودمایگی اور وسایل کی قلت کا پورا اندازہ تھا۔ دل میں فیصلہ کر لیا کہ روزانہ دو نفل پڑھ کر دعاء کرتا رہوں گا کہ یہ کٹھن منزل میرے لیے آسان ہو جائے چودہ برس گزر چکے ہیں، میں سفر میں رہا، یا حضر میں، لیکن اس عہد کی پابندی کو خدا نے ہر اختلال سے محفوظ رکھا [۱]

اس طرح اس اہم کام کو انہوں نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کے معیاری ہونے میں کوئی کلام نہیں، فاضل مؤلف نے دستیاب مواد سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور جس مہارت اور عالمانہ انداز سے یہ معلومات اخذ کیے ہیں، اس سے کتاب کی وقعت اور افادیت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ کتاب کی تسوید کے دوران ہی مولانا علی میاں کی سیرت سید احمد شہید، منظر عام پر آئی، دوسرے ماخذ کے ساتھ مہر صاحب، نے اس سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا۔ جس کا بڑی وسیع القلبی سے انہوں نے اعتراف

---

[۱] سید احمد شہید۔ جلد اول۔ ص ۱۲

www.abulhasanalinadwi.org

بھی کیا ہے۔ ان دونوں حضرات کی تالیفات (یعنی سیرت سید احمد شہید اور سید احمد شہید) کے تقابلی مطالعہ سے چند دلچسپ حقایق سامنے آتے ہیں جن کا بیان کرنا یقیناً قارئین کی ضیافت طبع کا باعث ہوگا۔ ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ واقعات کو ترتیب دینے اور بیان کرنے کا انداز دونوں کا بالکل یکساں ہے۔ دونوں نے ابواب بھی یکساں قایم کیے ہیں اور ان کے ذیلی عنوانات میں بھی کوئی فرق نہیں۔ البتہ واقعات کی تفصیل مولانا مہر کے یہاں زیادہ ملتی ہے اسی لئے ان کو چار ضخیم جلدیں لکھنی پڑیں جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۸۶۰ سے متجاوز ہے جب کہ سیرت سید احمد شہید کی دونوں جلدوں کے صفحات کی تعداد صرف ۱۱۷۶ ہے ایسے عنوانات جو دونوں کتابوں میں یکساں ہیں، بلکہ جن کی عبارت بھی مشترک ہے، ان کی شناخت بآسانی کی جاسکتی ہے۔ مولانا علی میاںؒ کی سیرت سید احمد شہید کی جملہ اشاعتوں کے تقابلی مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ہر اشاعت کے ساتھ اس نوع کی یکسانیت میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا ہے۔

دونوں کے بنیادی مآخذ کم وبیش ایک ہی ہیں۔ دونوں نے کتاب کے شروع میں ان کی نہ صرف فہرست پیش کی ہے، بلکہ ان پر تفصیلی اور تنقیدی محاکمہ بھی کیا ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ مہر صاحب نے مولانا علی میاںؒ کے والد مولانا عبدالحی کی دو اہم تالیفات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ایک ان کی عربی تصنیف نزہۃ الخواطر، جو آٹھ جلدوں میں ہے یہ ہندوستان کے علماء اور مشاہیر کا تذکرہ ہے۔ اس میں اندراجات زمانی ترتیب (Chrorinological order) میں ہیں۔ اور تیرہویں صدی ہجری کے عمائد واعیان کے ساتھ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اس طرح سید احمد شہید اور آپ کی تحریکات کے سلسلہ میں یہ اہم مآخذ ہے۔ دوسری کتاب، دہلی اور اس کے اطراف، ہے۔ اصلاً یہ ایک روزنامچہ ہے۔ جسے مولانا عبدالحی نے ۱۳۱۲ھ میں دہلی، پانی پت، دیوبند، سہارنپور، نگینہ، سرہند وغیرہ کے اسفار کے دوران قلم بند کیا تھا۔ اس میں سید صاحب سے متعلق ایسی بہت سی باتیں محفوظ کر دی گئی ہیں جو عام

طور پر کتابوں میں درج نہیں ہیں۔ اس لئے سید صاحب کے حالات زندگی کے ضمن میں اس سے مدد لیجاسکتی ہے۔ یہ روزنامچہ ،ارمغان احباب، کے عنوان سے پہلے ماہنامہ معارف اعظم گڈھ میں ۱۹۳۹ کے دوران قسط وار شایع ہوا۔ بعد میں دہلی اور اس کے اطراف، کے عنوان سے کتابی شکل میں شایع ہوا۔

سید صاحب کے احوال سے متعلق ایک اہم فارسی کتاب **منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء** ہے جو مولانا سید جعفر علی نقوی کی تالیف ہے۔ یہ تاریخ احمدیہ، کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ مولانا علی میاںؒ اور مولانا غلام رسول مہر دونوں نے تاریخ احمدیہ کو کتاب کا تاریخی نام بتایا ہے۔ علی میاںؒ فرماتے ہیں۔ : تاریخ احمدیہ، تاریخی نام ہے۔ جس سے تاریخ تالیف ۱۲۷۲ھ نکلتی ہے :[1] مولانا غلام رسول لکھتے ہیں : کتاب کا تاریخی نام تاریخ احمدیہ، ہے جس سے تاریخ تالیف ۱۲۷۲ھ ۱۸۵۵ء نکلتی ہے۔"[2] افسوس دونوں حضرات سے یہاں تسامح ہو گیا۔ تاریخ احمدیہ، سے ۱۲۷۲ نہیں، ۱۲۸۰ برآمد ہوتے ہیں اور یہ اس کا سال تالیف نہیں ہے۔ ممکن ہے تاریخ نکالنے والے نے تخرجہ سے کام لیا ہو جس کا اشارہ مادۂ تاریخ لکھنے سے پہلے کر دیا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی طرف ان دونوں حضرات میں سے کسی کی بھی نظر نہیں گئی۔

اس سلسلہ کی ایک اور اہم کتاب مولوی جعفر تھانسیری کی 'سوانح احمدی' ہے۔ اور یہ سید صاحب سے متعلق اردو میں پہلی کتاب ہے۔ مولف کتاب سید صاحب کے عاشق صادق اور پرجوش معتقد تھے، بیعت کا سلسلہ بھی خلفا کے وسیلہ سے سید صاحب تک پہنچتا ہے۔ اس کے متعلق مولانا علی میاںؒ تحریر فرماتے ہیں : جس زمانے میں یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے، اس وقت اس سے زیادہ تصریح شاید خطرے سے خالی نہ تھی، اور اس وقت اس کی اشاعت ہی ایک خطرناک کام تھا۔ شاید اسی وجہ سے مصنف کتاب

---

[1] سیرت سید احمد شہید حصہ ا ۴۹ [2] سید احمد شہید جلد ا ۔ ص ۱۹

www.abulhasanalinadwi.org

کو خطوط کی عبارتوں میں بھی کہیں ردوبدل کرنا پڑا، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا تھانیسری نے اصل واقعات میں تحریف کی اور ان کو بیان کرنے میں غیر ضروری اختصار سے کام لیا۔ مولانا علی میاںؒ نے اس جانب صرف اشارہ کیا ہے، تفصیل نہیں بتائی ہے، مولانا غلام رسول مہر نے اس سلسلہ میں وضاحت سے بھی کام لیا ہے اور تحریفات کی تفصیل بھی بتائی ہے۔ فرماتے ہیں۔ :

"اس کتاب نے سید صاحب کے متعلق دو نہایت افسوس ناک غلط بیانیوں کو عام کیا: اول یہ کہ سید صاحب انگریزوں سے نہیں لڑنا چاہتے تھے، صرف سکھوں سے لڑائی پر آمادہ ہوئے تھے۔ اس غلط بیانی کو مستند بنانے کے لیے سید صاحب کے مکاتیب کی عبارتوں میں تحریف کی گئی۔ دوسرے مولوی سید جعفر علی نقوی کی کتاب کے ایک فقرے کو متن سے الگ کر کر کے سید صاحب کی غیبت کے عقیدے کو تقویت پہنچائی گئی، حالاں کہ اس فقرے کو مسئلہ غیبت سے کوئی تعلق نہ تھا اور سید جعفر علی نقوی کی کتاب میں ایک، دو نہیں بلکہ بہت سے ثبوت شہادت کے موجود تھے"۔[۱]

یہی سبب ہے کہ مہر صاحب نے مولانا علی میاں صاحب کے مقابلے میں اس پر بہت کم انحصار کیا ہے۔ آخر میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کے اسلوب بیان، اور طرز نگارش کے بارے میں بھی کچھ عرض کر دیا جائے، مولا علی میاںؒ کا انداز بیان، جیسا کہ شروع میں ہی عرض کیا گیا، بڑا شگفتہ اور رواں ہے۔ اسی لیے سریع الفہم بھی ہے۔ اس سے ہر ذہنی سطح کا قاری حسب استطاعت محظوظ اور مستفیض ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف سیرتِ سید احمد شہید کو بلکہ مولانا کی ہر تصنیف کو قبول عام نصیب ہوا، اور اسے متعدد بار شایع کرنا پڑا، مولانا غلام رسول مہر کا انداز عالمانہ ہے۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ انھوں نے مولانا آزاد کی تحریروں، بالخصوص الہلال اور البلاغ کو کامل توجہ سے لفظاً لفظاً پڑھا، اور ان سے

---

[۱] سید احمد شہید۔ ص ۲۷

www.abulhasanalinadwi.org

وہ اتنے متاثر ہوئے کہ خود ان کی تحریروں میں مولانا آزاد کا رنگ جھلکنے لگا۔ اب وہ مولانا آزاد کے کامیاب ترین مقلد اور تتبع کرنے والے مانے جاتے ہیں۔ اور اپنی تحریروں میں اشعار کے بکثرت اور برمحل استعمال کے سبب وہ مولانا آزاد کے مثنی کہے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے صرف اعلیٰ علمی سطح کے قاری ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ کی چاروں جلدوں میں یہی عالمانہ انداز ملتا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر کے انتقال (۱۹۷۱) کے بعد مولانا علی میاںؒ نے ان کے سلسلہ میں ایک مضمون تحریر فرمایا تھا۔ جس میں ان کے گوناگوں اوصاف کو اجاگر کیا گیا تھا دونوں کے باہمی پر خلوص مراسم پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس میں مولانا نے یہ بھی بتایا تھا کہ دونوں نے کس طرح سید صاحب سے متعلق معلومات ایک دوسرے کو بہم پہنچائی۔ اس میں انھوں نے مہر صاحب کی تالیف سید احمد شہیدؒ کو بہترین الفاظ میں خراج تحسین بھی پیش کیا۔ مؤلف اور تالیف دونوں کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

سید صاحب کے کام کی مقبولیت کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ اس کی تاریخ کو مرتب و محفوظ اور ان کے کارنامے کو روشن و اجاگر کرنے کے لئے مہر صاحب جیسے کہنہ مشق، شہرۂ آفاق اور پختہ کار ادیبوں اور مؤرخوں کے قلم قدرتِ خداوندی کی طرف سے مسخر کیے گئے۔ وللہ جنود السموات والارض. اور اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور انشاء اللہ آئندہ جاری رہے گا۔ بل احیاءٌ عند ربھم کی ایک تفسیر ہے ناقص معلومات اور بیگانوں کی مسلسل بے اعتنائی اور ناآشنائی کے کہر سے ان کی عظمت کا آفتاب اس طرح طلوع ہوا کہ ساری تاریکیاں چھٹ گئیں اور حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی۔"[۱]

بعینہ یہی الفاظ سیرت سید احمد شہید اور اس کے مؤلف محترم کے بارے میں بھی کہے جا سکتے ہیں۔

۱۔ پرانے چراغ۔ حصہ ۲۔ ص ۱۹۹۔ ۲۰۰

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاںؒ اور دینی و ملی قیادت

مولانا ولی رحمانی، مہتمم خانقاہ رحمانی مونگیر،
و سکریٹری مسلم پرسنل لابورڈ۔

یہ کل کی بات ہے۔ یوپی میں ’’وندے ماترم‘‘ کا معاملہ سامنے آیا۔ حکومت اتر پردیش نے سرکاری تعلیم گاہوں میں ’’وندے ماترم‘‘ کو لازمی ترانہ کے طور پر جاری کرنا چاہا، اور طے کر لیا گیا کہ طلبہ چاہے مسلم ہوں یا غیر مسلم، انہیں تعلیم گاہ کے اس صباحی ترانہ میں شرکت کرنا ہوگی۔ اس گانے میں ایک مسلم طالب علم کیلئے جو واقعی دشواری تھی، حکومت نے اسے نظر انداز کر دیا ’’ہندو، ہندی ہندوستان‘‘ کا ذہن رکھنے والوں کے لئے اس حکم میں دل کے سرور اور دماغ کی تسکین کے لئے اچھی غذا تھی۔۔ مگر مسلم نقطہ نظر سے یہ تہذیبی ارتداد کی سرکاری کوشش تھی، مسلمان بے چین ہو اٹھے، انھوں نے سنجیدگی سے مسلم رائے عامہ کا اظہار کیا، جمہوری دور میں پر امن اور قانونی دائرے میں احتجاج کے جتنے شریفانہ نسخے تھے وہ استعمال کئے گئے، مگر سرکار بر سر پیکار ہے، ٹس سے مس نہ ہوئی۔۔ دراصل ہماری جمہوریت کی جڑیں بہت گہری ہو چکی ہیں۔ اتنی گہری کہ جمہوری حکومت پر شریفانہ صدائے احتجاج کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اور جبتک معقول باتوں کو جارحانہ لہجہ اور لاقانونیت کے پیرایہ میں نہ پیش کیا جائے، اس وقت تک جمہوریت کی گہری جڑوں پر ارباب حکومت کو بڑا اعتماد رہتا ہے۔۔۔ وندے ماترم کے سلسلہ میں بھی صوبائی حکومت کا مزاج کچھ ایسا ہی نظر آتا تھا، مسلمانوں کے لئے معاملہ دینی اور تہذیبی لحاظ سے بڑا مشکل تھا۔ مسلمان مجبور تھے اور حکومت غیر

www.abulhasanalinadwi.org

ضروری کاموں میں بے حد مصروف، اتنے میں ایک درویش صفت کی آواز آئی "پھر تو مسلمانوں کو مشورہ دینا ہوگا کہ وہ بچوں کو سرکاری اسکولوں سے ہٹالیں،" سادہ لہجہ، نرم آواز، نہ زور نہ شور، نہ قبرستان آباد کرنے کا اعلان، نہ سروں کا قطب مینار کھڑا کرنیکی بات، ایسا کچھ بھی تو نہیں ہے اس جملہ میں۔۔! مگر ان دو جملوں کا وزن اڑیل حکومت نے محسوس کیا، اور حکومت کی وہ پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی،۔۔ یہ آواز تھی مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ صاحب کی، ان کی بلند قامتی نے ہلکے سے جملے میں وزن پیدا کر دیا، اور مختصر سا مشورہ لمبے احتجاج سے زیادہ پر اثر رہا۔۔۔

کچھ پیچھے جایئے۔۔ حضرت مولانا کے گھر کی تلاشی لی گئی، ظالموں کو وہاں ملتا کیا، متواضع اور معمولی سامکان، اس کے چند کمرے، تصویر بتاں کی بھی وہاں گنجائش نہ تھی، عزیزوں، فقیروں، عالموں، عقیدت مندوں کے خطوط ہوں گے اور شاہراہ حیات کو روشن کرنیوالی کتابیں۔۔۔ رات میں یہ حادثہ ہوا، دن میں مجھے اطلاع ملی، میں نے حضرت مولانا سے فون پر واقعہ کی تصدیق چاہی، ان کی شرافت کا یہ عالم کہ وہ اس حادثہ کی تصدیق میں بھی انکار واقرار کے کے درمیان تھے، میں نے محسوس کیا، کہ واقعہ واقعہ ہے، حضرت مولانا کا مزاج "اقرار کو" پسند نہیں کر رہا تھا اور انکار کی گنجائش نہ تھی، پھر اپنے مزاج کے مطابق میں نے عرض کیا کہ حضرت جب آپ کے گھر کی تلاشی ہو سکتی ہے تو رہ کیا گیا؟ پھر کون سا گھر رہ جائے گا جہاں حکومت وقت کی قوت شامہ زحمت نہ فرمائے، اس لحاظ سے غور فرمایا جائے اور ہم جیسے ناکارہ عزیزوں کو اجازت دیجائے۔ تاکہ ہملوگ جم کر کہہ سکیں کہ تلاشی ہوئی ہے۔ بعد مغرب پھر گفتگو ہوئی فرمانے لگے تمہاری تمام باتیں عقل قبول کرتی ہیں، مگر میرے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہے اس لئے اسے اچھالنا نہیں چاہئے، میں نے عرض کیا، جو ہونا تھا ہو چکا، اگر کچھ غل غپاڑہ نہ ہوا تو حکومت سمجھے گی، کہ پوری ملت لاشۂ بے جاں ہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ "واقعہ تو ہوا ہے" "تو پھر اس سچ کے اظہار میں دیر نہیں ہونی چاہئے" میں نے عرض کیا، اور حضرت مولانا نے میری اس دلیل کو قبول کیا، میں نے احباب وارباب سے رابطہ قائم

www.abulhasanalinadwi.org

کیا، اخبارات کو بیان دیا، اور لکھنؤ پہونچ گیا۔۔ میں نے دیکھا حضرت مولانا معمول کے مطابق ہیں، مگر اخبارات کو غذامل گئی، اور لیڈروں کو موضوع ہاتھ آگیا، ایسی لے دے مچی کہ حکومت کی پیشانی عرق عرق ہوگئی اور سجدہ سہو کرتے ہی بنی! اسے شخصیت کا وزن کہتے ہیں یہ ہے بلند قامتی کا ایک رخ،

ذرا اور پیچھے جائیے! سپریم کورٹ نے محترمہ شاہ بانو کے مشہور مقدمہ میں ایسا فیصلہ سنادیا۔ جس کی توقع فاضل ججوں سے نہیں کی جاسکتی، قانون کا تھوڑا سا علم اور قانون سازی کے طویل تجربہ کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں، اس وقت میں نے جلسوں میں بھی کہا تھا کہ یہ فیصلہ دل جلوں کی تسکین کا ذریعہ بن سکتا ہے، مگر دستور ہند کی دفعات سے میل نہیں کھاتا۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ملک گیر پیمانہ پر مسلم رائے عامہ کا اظہار کیا، اور ملت ہی نہیں، ملک اور حکومت کو ایجابی غور وفکر کی سمت پر لگایا، راجیو گاندھی وزیر اعظم تھے، جو سیاست کی وادی میں معصوم اور داؤ پیچ سے ناواقف تھے، اور جمہوری قدروں میں جارحانہ طریقوں کی آمیزش کو دل سے برا سمجھتے تھے، اس لئے مرحلہ گفت وشنید، افہام وتفہیم تک پہونچا، اور راجیو جی نے حضرت مولانا اور والد ماجد سے اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہی، دونوں بزرگوں میں مشورہ ہوا، حضرت مولانا کا رخ یہ تھا کہ پہلے مرحلہ میں دوسری صف کے نمائندے گفتگو کریں، انھوں نے اس کام کیلئے والد ماجد کی ٹیم کے دو افراد کا نام بھی پیش کیا، جو فقہی واقفیت کے ساتھ، قانونی آگہی، اور اس قسم کی بات چیت کا مزاج وانداز رکھتے تھے، والد ماجد کا ذہن یہ تھا، کہ یہ طویل عمل ہے، جس میں بات بگڑ سکتی ہے، حضرت مولانا نے کسی تردد کے بغیر اس رائے کو قبول کرلیا، اور دونوں بزرگوں نے کئی قسطوں میں چھ ساڑھے چھ گھنٹے راجیو جی سے طویل گفتگو کی، راجیو جی نے بعد میں ایک موقعہ پر مجھ سے کہا جتنا وقت اس معاملہ کو سمجھنے میں انھوں نے صرف کیا، وزارت عظمی کے عہد میں اس سے زیادہ وقت کسی ایک موضوع پر انھوں نے نہیں لگایا، دونوں بزرگوں نے اسلام میں عورتوں کے حقوق کی ایسی وضاحت کی، کہ راجیو جی مطمئن ہوگئے انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا: "اسلام

www.abulhasanalinadwi.org

ے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں، اسے قانونی شکل میں پورے ملک کو قبول کرنا چاہیئے،"
اور اسی "تشریح اسلام" کا اثر تھا پارلیمنٹ سے مسلم ومن پروٹیکشن ایکٹ Muslim women protection act منظور کیا گیا، قانون سازی کی تاریخ میں یہ بڑا واقعہ ہے۔

یہ واقعہ دعوت دین کے دل نشین اسلوب کا نتیجہ اور داعیانہ کردار کا اثر تھا۔ بولنے کو زبان اور اظہار کے لئے الفاظ سب کے پاس ہیں، کچھ زبانیں نفرت کی تخم ریزی اور اشتعال کی آبیاری کی کرتی ہیں، حضرت مولانا کی زبان علم کی روشنی اور ہدایت کا نور پھیلاتی تھی، انہوں نے علم وفکر کی دھدکتی آگ سے روشنی پھیلانے کا کام لیا۔ خرمن حیات اور اندوختہ علم واخلاق کو جلانے سے دور بہت دور رہے۔

دعوت دین ہی نہیں شاہراہ حیات میں بھی وہ گفت وشنید کے دروازے کھلے رکھتے تھے۔ ان کی ترجیحات متعین رہتی تھیں، اور گفتگو میں کسی بھی معاملہ پر حسب ضرورت ترجیحی بنیادوں پر اظہار رائے فرماتے تھے حضرت مولانا کی یہ سوچی سمجھی پالیسی تھی، اسے حکمت عملی کا حصہ بھی کہا جاسکتا ہے، گفتگو کا موضوع خواہ گرم ہو یا نرم، ان کا لہجہ ٹھنڈا رہتا،۔۔ لہجہ کی حدت وشدت اور الفاظ کی سختی سے بات اکثر بگڑ جاتی ہے اور اپنی رائے پر جماؤ کا اظہار مخاطب میں اخذ وقبول کی استعداد کو کم کردیتا ہے۔ ضد پیدا ہوجاتی ہے۔ اس لئے مخاطب میں فکری فاصلہ اور اختلاف رائے کے نقطے اگر زیادہ ہوتے تو وہ خاموش ہوجاتے، تاکہ افہام وتفہیم کا دروازہ کھلا رہے، اسی لئے حساس مسئلوں اور نازک مرحلوں میں بھی ان کا لہجہ متوازن اور نرم ہوتا، اور کبھی کبھی لوگوں کو محسوس ہوتا کہ وہ اپنی رائے پر جمتے نہیں ہیں۔۔۔ حضرت مولانا کی رائے یہ تھی کہ داعیانہ اسلوب یہی ہے۔۔۔

دعوت دین کے انداز اور اسلوب کو سمجھنے اور برتنے میں داعی کے مزاج وانداز، ذوق اور طبیعت کا دخل فطری چیز ہے، حضرت مولانا کی طبیعت گرم دم جستجو، نرم دم گفتگو کی تھی، اس لئے لہجہ ابو بکرؓ اور طریقہ ابو ہریرہؓ پر عامل تھے۔ تاریخ اسلام

www.abulhasanalinadwi.org

میں بزرگوں کا اپنا اپنا انداز رہا اور سبھی انداز ہم کو پیارے ہیں۔ کوئی حضرت عمرؓ کے انداز پر چلنے والے، کوئی معاذ بن جبلؓ کے رخ کو اختیار کرنے والے، کوئی حضرت علیؓ کے رنگ میں رنگے ہوئے، راہ جن کی بھی اپنائی جائے، منزل بہر حال ملے گی، "بايهم اقتديتم اهتديتم" کی بشارت اسی لئے ہے!

حضرت مولانا کی تحریریں پڑھ جائیے۔۔ وہ دماغ کو مجبور نہیں کرتے، دلیل کے سامنے چپ کر دینے والا انداز نہیں اپناتے، ان کی کوشش ہوتی کہ قرآن و حدیث سے، بزرگوں کی سیرت و سوانح سے، لفظی نکتوں اور ادبی جہتوں سے اور سوز درون سے دلوں کو چھولیا جائے، اور دل کی امانت سینوں میں اتار دی جائے، اس لئے ان کا قاری چمنستان محمدی اور بہارستان اسلامی میں محو خرام رہتا ہے، ذہنی دباؤ سے دور، فکری تشنج سے پرے، بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ از دل خیزد بر دل ریزد والی بات ہے!

وہ عوام سے مخاطب ہوں یا طلبہ سے، اہل علم کے لئے لکھ رہے ہوں، امراء اور سلاطین ان کا نشانہ ہوں یا علماء کرام سے کچھ کہنا ہو، وہ اکثر و بیشتر ان ڈائرکٹ میتھڈ (بالواسطہ ترسیل) اپناتے ہیں، پاجا سراغ زندگی، مرد خدا کا یقین، تاریخ دعوت و عزیمت، سیرت سید احمد شہید، سے لیکر (ردة ولا ابابكر لها تک، ضخیم جلدیں ہوں۔ مختصر کتابیں، یا چھوٹے رسائل عام طور پر حضرت مولانا کا آرٹ آف پریزنٹیشن (ART OF PRESENTATION) یہی ہے، بزرگوں، بڑوں اور اکابر کی تصویر انکی تحریروں میں جلوہ گر ہوتی ہے وہ آئینہ دکھا جاتے ہیں اور قاری اس روشن آئینہ میں اپنی صورت و سیرت کے زخموں، دھبوں کو کمی کوتاہی کو، درد دل کے ساتھ، اپنی کمی کے احساس کے ساتھ دیکھ لیتا ہے، اور کچھ پالینے کا جذبہ اس میں ابھر جاتا ہے، یہ ان کا قلمی کمال ہے، اور یہی چیز ان کی سیرت کا تحفہ بھی!

انہیں عرب سربراہوں اور شیوخ کو عالم عرب کے فکری، اور تہذیبی ارتداد کی طرف متوجہ کرنا تھا، تو انہوں نے عرب شیوخ پر جملوں کے گولے نہیں داغے،

www.abulhasanalinadwi.org

جلی کٹی نہیں سنائی، سرکارذی وقار علیہ ﷺ کے بعد عملی ارتداد کا واقعہ سامنے آیا، اس موقعہ پر خلیفۃ المسلمین ابوبکر صدیقؓ نے جس جرأت، ہمت اور عزیمت کا طریقہ اپنایا تھا، حضرت مولانا نے اس تاریخی کردار کا آئینہ عربوں کے سامنے رکھدیا۔اور اس طور پر رکھا، کہ عرب شیوخ کے دل نے محسوس کیا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عمل کو دہرانے کا وقت آگیا ہے۔ ان کی نگاہیں صدیق اکبر کو تلاشنے لگیں۔وہ مجلسوں میں کہنے لگے، جذبہ کے ساتھ، فکرمندی کے ساتھ، احساس ذمہ داری کے ساتھ " ردة ولا ابابکر لها".

ہندوستان کی سو سالہ تاریخ سامنے رکھئے، حالات اور واقعات کے اتار چڑھاؤ آپ کے سامنے ہیں، بار بار بڑے کٹھن مرحلوں سے یہ ملت گذری ہے، گذرے گی، زندہ ملتوں کی زندگی میں شکست، فتح کا زینہ ہوا کرتی ہے، شکست حوصلہ ہونا خطرناک بات ہے۔ ادارے بکھر جائیں، عزائم چکنا چور ہو جائیں، تو اٹھنے میں بہت دیر لگتی ہے۔ ماضی کو ذہن میں رکھئے، پھر دیکھئے حضرت مولانا نے جہاد کا فتویٰ نہیں دیا، کوئی نعرۂ مستانہ نہیں لگایا، سیرت سید احمد شہید سامنے رکھدی، اب سمجھئے!

حضرت مولانا نے یہ بالواسطہ ترسیل کی راہ کیوں اپنائی، معاف کیجئے، میں ان سے پوچھ نہ سکا، لیکن لگتا ہے کہ ان کی دوربین نگاہیں اور مومنانہ فراست نے محسوس کر لیا تھا کہ جس عہد سے گذر رہے ہیں، وہ بڑی تبدیلیوں کا عہد ہے، غلامی کی طنابیں کٹنے والی ہیں، آزادی جمہور کا زمانہ آنے والا ہے، شکست و ریخت کے بڑے مرحلوں سے اس ملک اور عالم اسلام کو گذرنا ہے، یہ تبدیلی اقتدار ہی کی نہ ہوگی۔ فکر و نظر، مزاج و انداز اور قبولیت و اطاعت کی بھی ہوگی۔ شاید انھوں نے محسوس کر لیا تھا، کہ خطرناک تبدیلیوں کا سیلاب آنیوالا ہے، پوری صدی کے ہندوستانی سماج پر اچٹتی نظر ڈالئے، تو لگتا ہے، قدریں بدلیں، روایتوں نے کروٹ لی، مزاج بدلا، انداز بدلا، اور تبدیلی ایسی آگئی، کہ تجربہ کار نگاہیں زیر لب کہہ رہی ہیں کہ محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی۔۔ صاحبان عزیمت کنارے لگ گئے، اصحاب رخصت ارباب عظمت

www.abulhasanalinadwi.org

بن گئے، کم نظر معتبر ہو گئے، اور معتبر شخصیتیں طاق نسیاں میں سجادی گئیں، ایمان ویقین کا سودا ہونے لگا، ایمانداری لازم گم ہے اچھے اچھوں کی بھیڑ میں اسے ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ مزاج ایسابدلا ہے کہ ناخوب خوب ہو گیا، صراحت کبھی مایۂ ناز تھی، منافقت اب طرہ امتیاز ہے، جرأت کبھی ایمان کا نشان تھا، مصلحت اب حرز جان ہے، رواداری اخلاق کا حصہ تھا، مکاری ترقی کا زینہ ہے کبھی کبر ترفع میں جھلکتا تھا، اب کبر بانداز تواضع سامنے آتا ہے۔ نئے دور میں کامیابی کے عجیب عجیب نسخے ایجاد ہو گئے، قلب وقلم، نگاہ ونظر میں فرق وفاصلہ کامیابی کا نسخہ سمجھا جاتا ہے، کذب لطیف کی مناسب آموزش اور منافقت کی متناسب آمیزش کے بغیر شخصیت کی تعمیر نہیں ہوتی، جیسے خالص سونے سے زیور نہیں بنا کرتا، کچھ "کھاد کا تعاون" ضروری ہے۔۔ یہ تبدلیاں محسوس ملموس حقیقتیں ہیں۔

حضرت مولانا کے فکر رسا اور نظر دور بیں نے طوفان کا احساس کر لیا تھا، اور اپنے مزاج اور افتاد طبع کے مطابق اپنی راہ متعین کر لی تھی، ایک ماہر ملاح کی طرح انہوں نے طوفان سے قبل بادبانوں کی سمت درست کر لی، ساتھ سال کے تجربہ نے بتایا، کہ وہ محفوظ بھی رہے کامیاب بھی!۔۔۔ حضرت مولانا کا یہ بالواسطہ ترسیلی طریقہ بحیثیت "نسخہ شفا" مزید گفتگو کا طالب ہے، اور یہ طریق تبلیغ اور انداز اظہار خوابیدہ ملت کے لئے کہاں تک مؤثر ہو سکتا ہے۔ گفتگو کا موضوع ابھی یہ نہیں ہے۔ بات تو حضرت مولانا کے اسلوب دعوت اور طریق اظہار پر چل رہی ہے، او واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ان ڈائرکٹ میتھڈ (بالواسطہ ترسیل) کو راہ دیکر یکسوئی کے ساتھ کتب خانہ تیار کر دیا۔۔ انہیں زبان وبیان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی جس سے انہیں بڑی مدد ملی، انہوں نے فکر جلیل کو لباس جمیل میں پیش کیا، تو قاری کو فکر کی بلندی اور روح کی تازگی کے ساتھ زبان کی چاشنی بھی ملی!

انہیں ایمان کی حلاوت یقین کی لذت، عقیدہ کی صلابت، علم کی امانت اور فکر ونظر کی وسعت ملی تھی، انہیں فراست ایمانی کا بڑا حصہ ملا تھا، انہوں نے اپنی

صلاحیتوں کا جائزہ لیا، اور نوجوانی میں اپنے ذوق و مزاج کے پیش نظر راہ عمل متعین کرلی، اور اس پر چلتے چلے گئے، ڈائی ورژن (تحویلہ) تو زندگی میں آتے رہتے ہیں، ان کی زندگی میں بھی آئے مگر انہوں نے ڈائی ورزن کو شاہراہ نہیں سمجھا، ہو لئے اور بڑھ گئے۔

حضرت مولانا خوش قسمت تھے انھیں ایسے رفقاء ملے جنھوں نے اخلاص کے ساتھ، ساتھ دیا، بہت سے تعلیمی، تنظیمی، انتظامی اور اجتماعی کاموں میں ان کا ہاتھ بٹایا، ذمہ داریاں سنبھالے رہے، ان سے عقیدت و محبت رکھی، اعتماد کا رشتہ رکھا، اور حضرت مولانا کے ذہن و مزاج کے مطابق کام کرتے رہے، یہ جہاں ان حضرات کے خلوص، جاں نثاری اور شرافت کی علامت ہے۔ وہیں حضرت مولانا کے صحیح انتخاب اور اچھی تربیت کا نتیجہ ہے، میرے خیال میں حضرت مولانا کا انداز فکر یہ تھا، کہ کام کم ہو، حرج نہیں، کام نہ ہو، تو بھی صدمہ نہیں، مگر غلط کام نہ ہو، اور ناپسندیدہ ہاتھوں سے کام نہ ہو، افراد کے انتخاب میں ان کی احتیاط، مشکل پسندی اور اپنی رائے پر جمنے اور جمے رہنے کی مثالیں میری نگاہوں میں ہیں!

دار العلوم ندوۃ ان کے حسن نظر، حسن عمل حسن انتخاب اور سوز دروں کا شہکار ہے، اور ان کی خوش قسمتی اور مقبول خدمت کی منہ بولتی تصویر! میں نے پہلے پہل سنہ ۶۱۔ ۶۲ میں دار العلوم ندوۃ کو طالب علم کی حیثیت سے دیکھا، وہاں کی فضا میں زندگی کا ایک مرحلہ گذرا، اس زمانہ کا ندوۃ آج کے جامعہ رحمانی سے بھی خاصا چھوٹا تھا، اس وقت دینی عملی جہت آج جیسی نہ تھی۔ طلبہ اپنے آپ کو مدرسہ کا طالب علم کم ندوۃ اسکول کا اسٹوڈنٹ زیادہ سمجھتے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بعض بزرگوں کے نام کے ساتھ چھپے چھپائے القاب و آداب کا طلبہ مذاق اڑاتے، تک بندی کرتے تھے، اس دور کے اکثر طلبہ اپنے اساتذہ کے ناموں کے ساتھ "مولانا" مشکل ہی سے لگایا کرتے تھے، وہ دور بیت گیا، اب ندوۃ کی پھیلتی مسجد، طلبہ سے بھری صفیں، اور تلاوت کا ذوق طلبہ دار العلوم کے سمت قبلہ کا پتہ دیتی ہیں، بزرگوں اور علماء کے ساتھ القاب آداب کے معاملہ میں بھی حلقہ ندوۃ باحوصلہ ہو چکا ہے۔ اور چند سال قبل حضرت مولانا کے نام نامی کے

www.abulhasanalinadwi.org

ساتھ "شیخ الاسلام والمسلمین" کا اضافہ دیکھ کر مجھے محسوس ہوا، کہ ہمارے حلقہ ندوۃ نے قبول کرلیا، کہ اصل قیمت تو جسم کی ہے مگر شروانی کی اپنی افادیت اور اہمیت ہے!

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی وسعت و مقبولیت طلبہ کی دینی عملی جہت اور ان کی سمت کی تعین حضرت مولانا کی خدمت کا شہکار، نالۂ نیم شبی اور آہ سحر گاہی کا اثر، جہد مسلسل اور انتخاب صحیح کا دلآویز نمونہ ہے۔

وہ کام کی نوعیت و اہمیت، وقت کی ضرورت، اور فرد کی صلاحیت ذوق و مزاج کے پیش نظر رجال کار کا انتخاب کیا کرتے تھے۔۔۔ مجھے یاد ہے بات ۹۰ء کی ہے، بابری مسجد کا قضیہ گرم تھا، جناب یونس سلیم صاحب (اس وقت کے گورنر بہار) اور جناب کرشن کانت (نائب صدر جمہوریہ ہند۔ اس وقت کے گورنر آندھرا پردیش) مسئلہ کے حل کے لئے سرگرم ہوئے، بہار بھون نئی دہلی میں مسلمانوں سے کچھ منتخب لوگوں کو جمع کیا گیا، حضرت مولانا اور والد ماجد کی موجودگی میں اس کی نشست شروع ہوئی، محترم یونس سلیم صاحب، زیادہ سرگرم تھے، والد ماجد نے اپنا موقف چند سطری تحریر میں پڑھ کر سنادیا، میں نے اور محترم مولانا احمد علی قاسمی صاحب نے جم کر حکومت کی بدنیتی پر گل افشانی کردی۔ میں نے عرض کیا کہ مرکزی حکومت نے مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں جس آئی پی ایس افسر کو آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی کی حیثیت سے لگایا ہے، اس کا مندر پریم اور مذہبی جارحیت بہت واضح ہے، میں انہیں زمانہ سے جانتا ہوں۔ وی پی سنگھ جی کیا چاہتے ہیں۔ اس کی بو اس افسر کی تعیین سے محسوس ہورہی ہے۔ پھر یہ طے ہوا کہ دونوں طرف کے مذہبی رہنماؤں کو بات چیت کرنی چاہئے، لوگوں کا ذہن گفتگو کے لئے تیار نہیں تھا۔ حضرت مولانا اور والد ماجد تھے، میں نے عرض کیا کہ گفتگو سے انکار یا گریز کی رائے مناسب نہیں ہے، یوں بھی جمہوری ملک میں گفتگو سے انکار زیادہ عجیب سا لگتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس نازک گفتگو کی ذمہ داری ایک دو نہیں چند افراد کو دی جائے۔۔ جناب یونس سلیم اور جناب کرشن کانت کے مشورہ سے طے پایا کہ دونوں طرف سے گیارہ گیارہ افراد ہوں۔ آندھرا بھون میں نشست ہوئی حضرت مولا

www.abulhasanalinadwi.org

نا تشریف فرماتھے، یہ ناکارہ بھی گیارہ میں سے ایک تھا، کچھ اخلاقی باتیں ہوئیں، ٹھنڈی چائے چلی، پھر گفتگو ذرا سنجیدہ ہوئی، مگر نتیجہ پر پہونچنے سے قبل مجلس ختم ہوئی، اور خاتمہ پر چند بزرگوں سے ایک تحریر پر دستخط کرایا گیا، طے کیا گیا کہ پانچ۔افراد دونوں طرف سے گفتگو کریں، اور ان پانچ میں ایک نام میرا بھی تھا، میں نے معذرت کی اور حضرت مولانا سے عرض کیا کہ میں سیدھا کہہ جاتا ہوں، اور میرا جواب بھی ذرا برجستہ قسم کا ہوتا ہے، وہ ڈپلومیسی جو ایسی گفتگو کے لئے ضروری ہے، مجھے چھو کر نہیں گئی، حضرت مولانا نے فرمایا: کہ اس صلاحیت کے اپنے ایک فرد کا اس مجلس میں ہونا ضروری ہے، میں نے سوچ سمجھ کر آپ کا نام دیا ہے۔۔۔اور میرے لئے بڑے حوصلہ افزاء کلمات فرمائے۔۔۔رجال کار کیلئے ان کے طریقہ انتخاب کی یہ ایک چھوٹی مثال ہے،

حضرت مولانا بھی انسان تھے، غلطیاں ان سے بھی ہوئیں، ان کی عظمت یہ تھی کہ وہ غلطی پر اصرار نہیں فرماتے تھے، اصلاح کر لیا کرتے تھے، اسی قضیہ (بابری مسجد) کے حل کے لئے جب ہم سب حضرت مولانا کی سرپرستی میں دہلی میں جمع تھے، دوطرفہ گیارہ نفری ارکان کی گفتگو ختم ہوئی، تو وی پی سنگھ جی کے بابری مسجد آرڈی ننس پر انہوں نے اور کئی حضرات نے دستخط کر دیئے، آرڈی ننس کسی نے پڑھا یا دیکھا بھی نہیں تھا، مگر اسے جس طرح "شیشہ مستور" بنایا گیا تھا، ہملوگوں کی رائے تھی کہ ہونہ ہو ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔۔اس لئے دن ہی میں محترم مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی اور میں نے الگ الگ تنہائی میں حضرت مولانا سے عرض کیا تھا، کہ کسی بھی تحریر پر قانونی مشورے اور بھرپور جائزہ کے بغیر دستخط نہ فرمایا جائے، میں نے "گیارہ نفری" کے اکثر نفر کے گوش گذار کر دیا تھا کہ دستخط سے پرہیز ضروری ہے، بعض بزرگوں نے اس گذارش کا خیال رکھا، مگر حضرت مولانا اور کئی حضرات نے دستخط کر دئے۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا، اور کئی حضرات حیران و پریشان تھے، یہ کیا ہو گیا؟ اب کیا ہوگا؟۔۔مجھے ذمہ داری دی گئی کہ اس آرڈی ننس کو کہیں سے برآمد کروں۔ دو گھنٹے

میں آرڈی ننس کی کاپی ہملوگوں کی مجلس میں تھی، پڑھا گیا تو جسکا خطرہ تھا وہ آرڈی ننس میں موجود تھا۔۔ حضرت مولانا لکھنؤ جا چکے تھے۔راتوں رات آرڈی ننس کے خلافت بیانات دیئے گئے، صبح ہوئی تو حکومت کا حسن عمل اور حسن نیت اخبارات کے صفحات سے آشکارا تھے، حضرت مولانا کو صورتحال سے باخبر کیا گیا، انھیں سخت تکلیف پہونچی۔۔انہوں نے اپنے نمائندہ کے ذریعہ اپنا بیان اور ایک خط فوراً دہلی روانہ کیا۔۔ ان کی عظمت یہ تھی کہ فون پر انہوں نے آرڈی ننس کی حمایت سے رجوع فرمایا، اور بیان کے ذریعہ عوام تک اپنی رائے پہونچادی، عوامی زندگی میں یہ بلندئ کردار بڑا مشکل مرحلہ ہے،

وہ خوش قسمت تھے، کہ عوام نے اس رجوع کو کھلے دل سے قبول کیا، ان سے عقیدت و محبت میں لوگوں کے دل فرش راہ رہے۔۔ورنہ عوامی مزاج بلاوجہ بتنگڑ بنانے کا ہے، بعض نازک مرحلوں میں یہ یقین آسان ہوتا ہے کہ خدا تعالی کے دربار سے معافی مل جائے گی، مگر بندوں کی چوپال بخشا نہیں کرتی!

واقعۃً ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کے گرد جہاں ہدایت و حکمت، نوربصیرت، تقویٰ اور للٰہیت کا ہالہ ہے، خوش بختی کی ہمر کابی اور قبولیت کی ہمسفری بھی انہیں ملی ہوئی تھی!

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پہ پہونچتے ہیں دوایک
اے اہل زمانہ قدر کرو نایاب نہیں کم یاب ہیں ہم

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں اور دینی تعلیمی کونسل

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی
جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل یوپی

صدر محترم علماء کرام دانشوران ملت معزز سامعین

مسلم یونیورسٹی سے حضرت مولانا علی میاں کا جو قلبی، روحانی، ذہنی، اور فکری تعلق رہا ہے اس نے مولانا کے افکار اور زندگی کے مختلف گوشوں کو منظر عام پر لانیکی کوشش کی ہے یہ اس کا حق تھا۔ مولانا سعود عالم قاسمی ناظم دینیات کی قابل رشک کوشش قابل ستائش ہے کہ انہوں نے حضرت مولانا علی میاں کی ۷۵ سال کی محنت اور کاوش کو دو دن کے اس سیمینار میں خوش اسلوبی کے ساتھ منظر عام پر لانیکی کوشش کی ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا کے کاموں کی ہمہ گیریت تنوع معنویت اور مقصدیت کے اعتبار سے کسی ایک موضوع کا بھی انتخاب کیا جاتا تو دو دن کا سمنار اس کیلئے کافی نہیں، الکٹرانک اتیج سے ہر کام چشم زدن مین انجام پانے لگاہے اسلئے بہر حال جن لوگوں نے بھی اس سلسلہ میں تعاون کیا ہمت افزائی کی یا سر پرستی کی ہمیں ان سب کا ممنون ہونا چاہئے کہ ایک قابل قدر کام ہوا جس کی بڑی اہمیت اور افادیت ہے۔

یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اس کام کا داعی اول اس دانش گاہ کا ہی ایک فرد تھا جنہیں لوگ قاضی محمد عدیل عباسی کے نام سے جانتے ہیں مولانا نے ان کی آواز پر لبیک کہا ۳۰۔۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ کی پہلی کانفرنس کی ضلع بستی میں

www.abulhasanalinadwi.org

صدارت کی اور مولانا نے دینی تعلیمی کونسل کی آخری صوبائی کانفرنس منعقدہ ۲۵۔۲۶ اپریل ۹۸ء مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی بھی صدارت کی چالیس سال کے طویل عرصہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی کہ دینی تعلیمی کونسل ہر قسم کے انتشار سے محفوظ رہی اس کی صف میں ہر ملک کے ممتاز ترین رہنما دانشور ماہرین قانون نظر آتے ہیں لیکن ان سب کے درمیان جو قدر مشترک تھی وہ تھا باہمی احترام اعتماد اور اخلاص یہ تحریک قانونی موشگافیوں سے محفوظ رہی اس لئے ابھی تک پٹری پر ہے ورنہ اس درمیان کتنی تنظیمیں ابھریں اور انتشار کی نظر ہو گئیں۔

اس کامیاب تحریک کے سرے پر مسلسل جو شخصیت نظر آتی ہے وہ حضرت مولانا کی ذات تھی جس نے سب کو جوڑے رکھا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا جب ذمہ داروں میں کسی عہدہ کا یا خود نمائی کا کوئی وسوسہ پیدا ہوا ہو۔

اس سے پہلے کہ میں دینی تعلیمی کونسل کی خدمات کا ذکر کروں خود مولانا کی زبان سے اس کا تعارف کرا دینا مناسب سمجھتا ہوں مولانا نے اپنی سینکڑوں ولولہ انگیز تقریروں اور کثرت سے کانفرنسوں کنونشنوں اور جلسوں میں مختلف انداز سے دینی تعلیمی کونسل کی تحریک اور اس کے مقاصد کی وضاحت کی تقریریں جو عام طور پر برجستہ ہوتی تھیں اس میں خطابت کی بجلیاں کوندتی تھیں ۔ایک ایک جملہ دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کرنے اور روح کو بیدار کرنے لئے کافی ہوتا تھا۔

"مولانا فرماتے ہیں"

"حضرات صوبہ میں دینی تعلیمی کونسل کے نام سے اور اضلاع میں انجمن تعلیمات دین کے نام سے دینی تعلیمی تحریک جاری ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو اسلامی دینی تعلیم سے روشناس کرانا، اس کی اہمیت کو ذہن نشین کرانا اور اس کا انتظام کرنا ہے اس تحریک میں صوبہ کے بہت سے ذمہ دار صاحب فکر

www.abulhasanalinadwi.org

اور سنجیدہ مسلمان شریک ہیں۔

بہت سے دلوں اور دماغوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر اس کی ضرورت کیا ہے؟ یہ سوال بجا ہے ملک میں کوئی تعلیمی تحریک چلتی ہے یا نصاب میں یا نظام تعلیم میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔ حکومت عوام کے فائدے کے لئے اور ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے کوئی نئی تعلیمی پالیسی اپناتی ہے تو اس سے مسلمانوں میں اضطراب کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اور وہ اس سے کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ بہت سے اہل علم اور صاحب فکر حضرات نے اس کو مسئلہ کیوں بنالیا ہے؟ مسلمانوں کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی پوری آزادی ہے حکومت ان میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ڈالتی، اور حکومت کی مصلحت بھی نہیں کہ مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں مداخلت کی جائے اور ان میں بے ضرورت انتشار پیدا کیا جائے مسلمان حج کو جاتے ہیں اور بہت سے ممالک کے مقابلہ میں جہاں مسلمان حاکمانہ حیثیت نہیں رکھتے ہیں ہندوستان سے حجاج زیادہ تعداد میں جاتے ہیں اور یہ تعداد روز افزوں ہے مساجد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے نمازیں آزادی کے ساتھ ادا ہوتی ہیں اور نمازیوں کی بہت بڑی تعداد ہوتی ہے۔ رمضان میں روزوں کی بہار اور مساجد کی رونق دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ یہاں حفاظ ہر سال بڑی تعداد میں تیار ہوتے ہیں اس کی مثال دوسرے ملکوں میں بھی ملنی مشکل ہے یہاں عظیم الشان عربی مدارس ہیں جن میں دوسرے ممالک کے طلبہ بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں یہی حال زکوۃ کا ہے کہ اس کے ادا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے ان تمام آزادیوں اور سہولتوں کے باوجود تعلیم کے مسئلہ کی اتنی اہمیت کیوں ہے؟ اس کو موت وحیات کا ایک مسئلہ کیوں بنالیا گیا ہے؟ بہت سے ذہنوں میں دیانتداری کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے اس بات کا صاف ہونا ضروری ہے

کیوں کہ اس کے بغیر ہماری ان کوششوں کا اصل محرک اور اس کی بنیاد سمجھ میں نہیں آتی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اسلام ایک شعوری اور ارادی مذہب ہے یہ نسلی یا ملکی مذہب نہیں کہ کوئی پٹھانوں کے یہاں پیدا ہوا ہو سادات یا شیوخ کے یہاں پیدا ہوا ہو تو آٹومیٹک طریقہ سے مسلمان ہوگا اس کے لئے شعور ارادہ اور فیصلہ کی ضرورت ہے کہ وہ اسلام کو بحیثیت دین کے قبول کرتا ہے یا نہیں؟

اسلام میں اور اس کے بہت سے احکام میں عاقل بالغ ہونے کی شرط آتی ہے اس کا راز یہی ہے کہ ایک بچہ اور بالغ میں فرق ہے بالغ ہونے کے بعد وہ مکلّف ہو گیا یہ اصطلاح خود بتلائی ہے کہ اسلام ایک شعوری مذہب ہے اس طرح اسلام کے احکام کی ادائیگی میں نیت شرط ہے کسی مذہبی نظام مین نیت کو یہ اہمیت نہیں دی گئی یہاں تک کہ روزہ نماز میں بھی نیت ضروری ہے...... اسلام کا پودا نیت کے بغیر پنپ نہیں سکتا زمین اسے قبول ہی نہیں کر سکتی اور اگر لگ بھی جائے تو پھول پھل نہیں لا سکتا۔

......اسی طرح اسلام اور علم لازم و ملزوم ہیں علم کے بغیر اسلام اسلام ہی نہیں ان دونوں کی رفاقت ایسی ہے کہ اگر علم کے سوتے خشک ہو جائیں تو اسلام اپنی طبعی موت مر جائیگا یہی وجہ ہے کہ جو طاقتیں اسلام کو گوارا نہیں کرتیں یا اس کو ختم کرنا چاہتی ہیں وہ اسلامی تعلیم پر ضرب لگاتی ہیں کہ اس کے سوتے خشک ہو جائیں میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کے کسی مذہب میں بھی علم کا مرتبہ اتنا بلند کیا گیا ہو اس کو اتنی عزت دی گئی ہو جتنی اسلام میں دی گئی ہے وحی کا آغاز ہی علم سے ہوتا ہے..... اس موقع پر یہ نہیں کہا جاتا کہ ذکر کرو یہ نہیں کہا جاتا کہ زمین بوس ہو جاؤ بلکہ حکم ہوتا ہے تو پڑھنے کا۔

بحیثیت اس مذہب کے متبع اور داعی کے ہم پر اور ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ ملک کی تعلیمی تبدیلیوں کا بغور جائزہ لیتے رہیں اور ہر وقت ان پر نظر رکھیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ ان کا اثر ہمارے مذہب ہماری نسلوں کے دل و دماغ اور ان کے دینی و اخلاقی مستقبل پر کیا پڑیگا......

ہمارا مذہب ایک پورا نظام حیات ہے وہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے

متعین ہدایات اور احکام دیتا ہے اس لئے ہمیں ہر ملک اور ہر دور میں چوکنا رہنا چاہئے کہ کیا ہمیں اپنے ذہنی اخلاقی اور روحانی نشو نما کیلئے مناسب فضا اور ساز گار ماحول میسر ہے یا نہیں اور ہماری آئندہ نسلیں صحیح معنوں میں مسلمان رہ سکیں گی یا نہیں۔

اسلام چند رسوم اور تقریبات کا نام نہیں۔ چند عادات تک بھی مخصوص نہیں بلکہ یہ مکمل زندگی گذارنے کا طریقہ اور کامل دین ہے:

یہ مستقل تہذیب ہے۔۔۔ اسلام کو اصرار ہے کہ عقائد واعمال کے ساتھ اس کا مخصوص طرز زندگی بھی اپنایا جائے۔۔

اسلام ایک خاص طرح کی زندگی اور خاص طرح کی معاشرت چاہتا ہے

ہمارے دین کا تقاضا ہے کہ ہم دنیا میں کسی جگہ بھی رہیں ہمارے وسائل کچھ بھی ہوں ہماری سیاسی حیثیت جیسی بھی ہو ہمارا فرض ہے کہ ہم وہ میدان محفوظ کرلیں جس میں دینی زندگی گذارنے جس میں اپنے مذہب اور تہذیب کے مطابق جاگنے چلنے پھرنے اور مذہبی احکام پر عمل کرنے اور ان کو باقی رکھنے کی آزادی ہو۔

صرف یہ کافی نہیں کہ فراغت کے ساتھ دو وقت تین وقت کا کھانا ملتا رہے امن وچین کی زندگی گذار سکتے ہوں۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے سکتے ہوں اور اپنے دین وتہذیب کے قیام وبقا کی ضمانت حاصل کر سکتے ہوں۔

ہم اپنے بچوں کی دینی تعلیم کو ان کی عمومی تعلیم سے ان کی خوراک سے اور ان کی دواء سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں

ہر مسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ مرنے سے پہلے وہ اس کا اطمینان کرلے کہ اس کی اولاد کا عقیدہ کیا ہوگا وہ خدا کو کس طرح مانیں گے اور کن صفات کے ساتھ مانیں گے، یہی انبیاء کرام کا طریقہ رہا ہے اور یہی مسلمان کا کردار ہے۔

کسی کو یہ حق نہیں کہ باپ اور بیٹے کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو جائے اور دانستہ یا نادانستہ ایسے اقدامات کر لے کہ بچہ باپ کا وارث نہ ہونے پائے یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ بچہ باپ کی جائداد کا وارث تو ہو لیکن اس کے عقائد جو اسے مال و دولت سے کہیں زیادہ عزیز ہیں ان کا وارث نہ ہو، یہ ہر باپ کا فطری حق ہے اور اس کا مذہبی فریضہ ہے جب سے حکومت نے تعلیم کا پورا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور یہ تصور کام کرنے لگا ہے کہ باپ اپنے بیٹے کو تعلیم نہ دے بلکہ حکومت اس کو تعلیم دے اس وقت سے اس فکری تعلیم کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے جو قدیم زمانہ سے چلا آرہا تھا۔ اور اسی نے ہمیں اور ہمارے رفقاء اور احباب کو مجبور کیا کہ مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے جدوجہد کریں"

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جس دن آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو ایمان سب سے بڑھ کر عزیز ہے ایمان کے بغیر بچوں کا جینا بھی آپ کو مطلوب نہیں اسی وقت سے آپ کے حالات میں تبدیلی آجائیگی اور مشکلات کے پہاڑ (اگر وہ مشکلات خیالی نہیں بلکہ واقعی ہیں) اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے ایمان و عقیدہ کے تحفظ کے بغیر اور اس اطمینان پر کہ ہماری آئندہ نسل بھی مسلمان رہے گی۔

ہم ایک منٹ بھی زندہ رہنا نہیں چاہتے اور یہ تحفظ اور انتظام ہمارے لئے پانی بجلی کی سپلائی راشن کی دکانوں حفظان صحت اور علاج کی سہولتوں اور جان و مال کی حفاظت سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

......اقوام متحدہ (جس کا ہندوستان بھی ایک ممبر ہے) نے جو حقوق انسانی کا جو منشور شائع کیا ہے اس کی دفعہ (٦)۔(۳) میں بالاعلان کہا گیا ہے کہ والدین کو اس کا سب سے پہلے حق پہنچتا ہے کہ وہ تعلیم کا وہ طریقہ انتخاب کریں جس کے مطابق وہ اپنے بچے کو تعلیم دینا چاہتے ہیں" اسی لئے حقیقت میں مسئلہ اقلیت اور اکثریت کا نہیں ہے والدین اور اولاد کا ہے۔

......ہمارے ملک کے رہنماؤں نے اس بارے میں اس ذہانت حقیقت پسندی

اور عملیت کا ثبوت نہیں دیا جس کی ان سے توقع تھی اور یہ قوموں تہذیبوں اور مملکتوں کی تاریخ کا پرانا المیہ ہے کہ بارہا انہوں نے اپنی سیاسی یا فوجی طاقت کے اعتماد پر حقائق سے گریز کیا اور آبادی کے کمزور طبقوں کے مطالبات سے چشم پوشی کی یونان وروما ایران اور خود عرب وترکی کی سلطنتیں اپنے اپنے دور میں اس غلطی کا شکار ہو چکی ہیں اور انہوں نے ان اقلیتوں کو غیر مطمئن اور شاکی بنا کر اپنے لئے غیر ضروری مشکلات پیدا کر لیں ان کی بیجا ضد نے بعض اوقات خود اپنے مقاصد کو بڑا نقصان پہونچایا ہے اور ملک کی ترقی کو پیچھے ڈال دیا ہے فرد کے فیصلہ اور اقدام میں ذہانت اجتہاد اور حقیقت پسندی کا عنصر اتنی اہمیت اور دوررس نتائج کا حامل نہیں جتنا قوموں اور مملکتوں کے فیصلے اور اقدام میں تاریخ کی گواہی ہے کہ افراد ہی ذہانت کی کمی شکار نہیں ہوتے قومیں اور مملکتیں بھی ہوتی ہیں

"تاریخ افراد کو معاف کر دیتی ہے قوموں کو معاف نہیں کرتی"

دینی تعلیمی کونسل کی پورے صوبہ میں زبردست پذیرائی ہوئی اور مختصر عرصہ میں ۴۶ اضلاع میں انجمن تعلیمات دین کا قیام عمل میں آگیا اسوقت تقریباً ۲۰ ہزار مدرسے حکومت کی بغیر امداد کے چل رہے ہیں جن میں دینی تعلیم اور عصری علوم کا اردو میڈیم میں اہتمام ہے۔

حکومتی سطح پر مختلف قوانین جو اردو زبان اور مسلم اقلیتی تعلیمی اداروں کے سلسلہ میں نافذ ہوئے ان کے خلاف حکومت سے نمائندگی کی گئی اور کونسل کو کامیابی حاصل ہوئی۔

مولانا علی میاں دینی تعلیمی کونسل کے کام کو اپنے تمام کاموں میں بنیادی حیثیت دیتے رہے اس سلسلہ میں صوبائی سطح کے تمام کنونشنوں کی صدارت کی بلکہ اضلاع تحصیلوں اور دیہاتوں کے جلسوں میں شرکت کو پوری اہمیت دی۔

مولانا نے دینی تعلیمی کونسل کے ایک اجلاس میں صدارتی خطبہ میں فرمایا

"صاحبوں! میں دس باتیں حکومت سے شکایت کی کر سکتا ہوں، مجھے خدا کے فضل سے دنیا کی کسی حکومت سے سچی بات کہنے میں کوئی باک نہیں، اس لئے کہ مجھے کسی

حکومت سے لینادینا نہیں، لیکن میں غلط سمجھتا ہوں کہ ساری ذمہ داری حکومت کے سر ڈال دوں، یہ میرے ضمیر، میرے علم ومطالعہ اور دیانتداری کے خلاف ہے، جب مجھے حکومت ہی سے کہنا ہوگا تو مجھے وہ زبان آتی ہے، اور میں اپنے اندر وہ جرأت پاتا ہوں کہ اس سے کہوں لیکن جب آپ سامنے ہوں گے تو میں آپ کا گریبان پکڑوں گا، آپ نے اجتماعی طور پر اور ملی سطح سے صفائی سے ابھی تک یہ بات نہیں کہی ہے کہ ایمان وعقیدہ کے تحفظ کے بغیر اور اس اطمینان کے بغیر کہ ہماری آئندہ نسل بھی مسلمان رہے گی، ہم ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہنا چاہتے"

ایک دوسرے خطبہ میں فرمایا

"جب کبھی ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی وفکری وتعلیمی تاریخ بلکہ ان کی ملی تاریخ دیانتداری کے ساتھ لکھی جائے گی تو اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا کہ اس ۴۰ رسال کی مدت میں دینی تعلیمی کونسل نے کیا فکر دیا، کیا لٹریچر پیدا کیا، کس طرح ہندوستانی مسلمانوں کے دینی تعلیمی مقدمہ کو مضبوط دلائل سے ثابت کیا"

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاںؒ اور ہندوستان کی دینی تحریکیں

جناب عبدالمجید خاں
شعبہ علوم اسلامیہ اے ایم یو علی گڑھ

بیسویں صدی میں ہندوستان کی جو تحریکیں عالمی شہرت حاصل کر چکی ہیں ان میں جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت ایک خاص مقام رکھتی ہیں اس مقالے میں حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی کے ان دو تحریکوں سے تعلق کی سرگزشت کا کچھ تذکرہ ہے۔

مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی:

جماعت اسلامی کے بانی حضرت مولانا مودودیؒ کی تحریک اور شخصیت سے واقفیت کے بارے میں مولانا علی میاں رقمطراز ہیں:۔

''مجھے مولانا کی شخصیت اور تحریروں سے واقفیت کی سعادت ۳۴-۳۵ء ہی سے حاصل ہوگئی تھی، جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں میری تدریسی زندگی کا آغاز ہوا، میں نے ان کی کتابوں اور تحریروں سے بہت استفادہ کیا اور میری تحریر میں اس کا رنگ آیا، یہ میرا عنفوان شباب تھا (مولانا کی عمر اس وقت بیس برس سے کچھ زیادہ تھی)، اسی زمانہ میں ان کے شہرۂ آفاق رسالہ ''ترجمان القرآن'' میں میرا ایک مضمون سورہ کہف کی تفسیر کے بعض اشارات پر شائع ہوا (ان اشارات کی مدد سے مولانا نے اپنی کتاب معرکہ ایمان و مادیت تصنیف فرمائی) جو مولانا مناظر احسن گیلانی نے بہت پسند کیا، اس وقت مولانا حیدرآباد میں تھے اور ترجمان

www.abulhasanalinadwi.org

الفرقان وہیں سے نکلتا تھا دوسرا مضمون ''دین وسیاست کے عنوان سے لاہور سے شائع ہوا ،میری پہلی ملاقات ان سے لاہور میں اگست ۳۹ء کی کسی تاریخ میں ہوئی (۱)

۱۹۴۰ء سے مولانا مودودیؒ کے ساتھ مولانا علی میاں کی خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جب الندوۃ'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہندوستان کے مشاہیر اہل علم واہل فکر کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ افادۂ عام اور تازہ واردان بساط علم کی رہنمائی کے لیے ان کتابوں کا ذکر کریں جنہوں نے ان کے ذہن کی تشکیل اور سیرت کی تعمیر میں خاص حصہ لیا ہے اور ان کے دماغ پر گہرے اور دیرپا نقش چھوڑے ہیں، مولانا علی میاں نے مولانا مودودیؒ کو بھی دعوت دی اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے جو جواب دیا اسمیں وہ کہتے ہیں:۔

''جاہلیت کے زمانے میں میں نے بہت کچھ پڑھا ہے قدیم وجدید فلسفہ، سائنس، تاریخ معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں مگر جب آنکھیں کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا علم کی جڑ اب ہاتھ آئی، کانٹ، ہیگل، نٹشے، مارکس، اور دنیا کے دوسرے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں بیچاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں الجھتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہ کر سکے، ان کو اس کتاب نے ایک دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے، اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے؟ میری اصل محسن بس یہی ایک کتاب ہے اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے حیوان سے انسان بنا دیا ہے، تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی، ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ زندگی کے جس معاملہ کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا مجھے دکھائی دیتی ہے گویا اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے، انگریزی میں اس کنجی کو شاہ کلید (Master key) کہتے ہیں، جس سے ہر قفل کھل جائے سو میرے لئے قرآن شاہ کلید ہے، مسائل حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں وہ کھل جاتا ہے جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔ (۲)

مولانا مودودی سے مولانا علی میاں کی دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب مولانا اس

www.abulhasanalinadwi.org

کمیٹی میں شرکت کے لیے لکھنؤ تشریف لائے جو اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرنے کے لئے نواب احمد سعید آف چھتاری کی دعوت پر ندوۃ العلماء میں منعقد ہو رہی تھی، مولانا مودودی نے پہلے ہی مولانا علی میاں کو اپنی تشریف آوری کی اطلاع دی تھی اور انہیں اپنے قیام کا ذمہ دار بنایا تھا، مولانا علی میاں اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

''مولانا جنوری ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتے میں لکھنؤ تشریف لائے یہ زمانہ مسلمانوں میں ایک طرف کانگریس کی تحریک (جس کی قیادت جواہر لال نہرو کر رہے تھے) کے زور، دوسری طرف پاکستان کا نعرہ بلند ہو جانے کی وجہ سے بڑی بے چینی اور جوش و سرگرمی کا تھا، مولانا کے پرزور فکر انگریز مضامین اور ''ترجمان القرآن'' کے مقالات نے اسلامی حلقوں میں ایک جنبش اور جرأت پیدا کر دی تھی، نوجوان اسلام کی اس ترجمانی کے دلدادہ تھے جو بلند سطح سے اور پراز اعتماد لہجہ میں کی جائے اور مسلمانوں میں امنگ، حوصلہ اور اپنے ماضی اور تہذیب پر اعتماد پیدا کرے، مولانا کا قیام دار العلوم کے مہمان خانہ میں ہوا، جہاں استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا آزاد سبحانی مقیم تھے، یونیورسٹی کے مسلمان طلباء اور شہر کے صاحب فکر مسلم نوجوان جوق در جوق آئے اور مولانا سے بڑے ذوق و عقیدت سے ملتے ایسے موقع پر مولانا ان کو لے کر مسجد میں جا بیٹھتے، جو مہمان خانہ کے متصل ہے، ندوہ کی طرف سے میں ان حضرات کی میزبانی اور رفاقت پر مامور تھا، اور مولانا لکھنؤ کے احباب میں مجھ ہی سے زیادہ مانوس اور واقف تھے، اس لئے مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا اور زیادہ رہنے کا موقع ملا، میں مولانا کی سنجیدگی، خوش خلقی، اسی کے ساتھ طبیعت کی شگفتگی، اخلاق اور اپنے مقصد کی لگن سے بہت متاثر ہوا، بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا بڑا لطیف مزاح فرماتے تھے اور طبیعت میں ظرافت تھی ...... جو زبان دانی اور دھلوی مذاق سلیم کے ساتھ مل کر بڑی لطافت پیدا کر دیتی تھی۔ خشکی ان میں نام کو نہ تھی اور وہ جلد بے تکلف ہو جاتے، مولانا چند دن قیام کر کے واپس گئے لیکن خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ (۳)

جماعت اسلامی کی تاسیس کے وقت ہی مولانا مودودیؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں مولانا علی میاںؒ بھی شامل تھے آپ نے تقریباً تین سال لکھنؤ میں جماعت اسلامی

www.abulhasanalinadwi.org

کے امیر کی حیثیت سے کام بھی کیا، آپ نے مولانا مودودی سے لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے ایک مقالہ تیار کرنے کی فرمائش کی تھی مولانا مودودی لکھنؤ تشریف لائے اور نوجوانوں نے پروانہ وار ہجوم کیا انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی یونین ہال میں ''نوع انسانی کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل'' کے ماتحت اپنا فاضلانہ خطبہ پڑھا، جوان کے مضامین مین شائع ہوگیا ہے اسی کے ساتھ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے ایک مقالہ ''نیا تعلیمی نظام'' کے عنوان سے مولانا علی میاں کی فرمائش پر لکھ کر لائے تھے جو طلبہ کی انجمن ''الاصلاح'' میں پڑھا گیا۔

مولانا علی میاں مولانا مودودی کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

''میرا رابطہ مولانا اور جماعت سے برابر قائم رہا میں نے جماعت کی اس مجلس عاملہ کے جلسہ میں شرکت کی جو فروری ۴۲ء کو لاہور میں منعقد ہوا تھا اور جس میں مولانا کی تحریروں اور بعض خیالات کی اس مخالفت کی بنا پر جو ہندوستان کے بعض مشاہیر فضلاء اور اہل قلم نے شروع کررکھی تھے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ مولانا فی الحال جماعت کی امارت سے سبکدوشی اختیار کرلیں اور مولانا امین صاحب اصلاحی کو امیر منتخب کیا جائے جماعت کی زندگی اور تاریخ میں یہ مرحلہ بہت اہم تھا میرا ووٹ اس میں مولانا کے حق میں تھا اور اس کی بنیاد یہ تھی کہ یہ ایک مصنوعی ردوبدل ہوگا، جس سے کوئی بڑا فائدہ حاصل نہ ہوگا، جماعت کا وجود مولانا کی تحریروں کے اثر سے عمل میں آیا ہے، اور اس کی وابستگی اور انتساب بدستور انہیں کی طرف رہے گا، اسی پر فیصلہ ہوا اور جماعت کا نظام وہی رہا، جماعت کی دوسری مجلس انتظامیہ میں میری شرکت اکتوبر ۴۲ء میں دہلی میں ہوئی اس موقع پر مولانا کے ساتھ علی گڑھ بھی گیا اور ایک دو دن اولڈ بوائز لاج میں ہم دونوں کا قیام رہا، میں نے یونیورسٹی کے حلقہ میں مولانا کی مقبولیت کا اندازہ کیا۔ (۴)

مولانا علی میاں جماعت اسلامی سے کچھ عرصہ بعد الگ ہوئے اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے مولانا علی میاں رقمطراز ہیں ''میرے مولانا کی تحریروں اور جماعت کے لٹریچر سے تاثر اور وابستگی کی بنیاد مولانا کے وہ فاضلانہ تنقیدی مضامین تھے، جو انہوں نے مغربی تہذیب اور اس کے فلسفہ حیات اور موجودہ مادی نقطہ نظر کے خلاف لکھے تھے اور جن کا بڑا حصہ ان کے مجموعہ مضامین تنقیحات میں شامل ہے یہاں میرے اور مولانا کے خیال میں وہی توارد

www.abulhasanalinadwi.org

تھا جو ایک چھوٹے اور بڑے، نومشق و کہنہ مشق مصنفوں کے درمیان ہوسکتا ہے دین کی اس جدید تفہیم وتشریح سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی تھی نہ ضرورت جو مولانا کی دوسری کتابوں مثلاً قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں ''تفہیمات'' اور ''رسائل ومسائل'' میں پائی جاتی ہے اس لئے کہ اس بارے میں میرا معاملہ کسی ایسے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان سے بالکل مختلف تھا جو دین کا تصور اور اس کا فہم اس کے اصل سرچشموں (کتاب وسنت اور دینی ماحول وتربیت) کے بجائے کلیۃً مولانا یا کسی دوسرے مسلمان مفکر ومصنف کی کتابوں سے حاصل کرتا ہے میں اپنے براہ راست دین کے مطالعہ اور ان متقدمین اور بعض متاخرین کی کتابوں سے استفادہ کرنے کی بنا پر جو کتاب وسنت کا وسیع وعمیق علم رکھتے تھے اور ان کے یہاں مجتہدانہ فکر ونظر اور نمایاں گہرائی ملتی ہے، مولانا کو ایسا یگانہ روزگار مفکر اسلام سمجھنے سے قاصر تھا جسکی نظیر صدیوں میں نہیں ملتی میں انکا اصل امتیاز وجوہر ذہانت، دین کی صفائی ورسائی اور نئے انداز میں تحریر وتفہیم کی امتیازی قوت وقدرت سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں لیکن کچھ عرصہ کے بعد مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ جماعت کے اس علمی اور تنقیدی حصہ کو جو مغربی تہذیب اور موجودہ مادی فلسفوں اور نظامہائے حیات سے متعلق تھا دین کی اس تفہیم وتشریح سے الگ نہیں کیا جاسکتا جو خود مولانا اور جماعت کے قائدین کی نظر میں بنیاد اور سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہے، میرا شعور جس قدر پختہ اور میرا مطالعہ اور تجربہ جتنا وسیع ہوتا گیا میری ذہنی کشمکش میں اضافہ ہوتا گیا اس کا نقطہ ارتقاء وہ تھا جب میری ہندوستان کے مشہور تبلیغی تحریک کے داعی وبانی مولانا الیاسؒ کی خدمت میں آمد ورفت زیادہ ہوئی، میں جب ان کی زندگی ان کی باطنی کیفیات اور ان کی ایمان واحتساب کی دعوت سے گہرے طور سے متاثر ہوا تو یہ ذہنی خلیج عمیق اور وسیع ہونے لگی اور مجھے احساس ہوا کہ دعوت نبوت اور اس کے حاصل کا مزاج اور اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں، اور وہ ایک ایسی تحریک و دعوت سے کتنی مختلف ہوتی ہیں جس کی بنیاد خالص مطالعہ، ذہانت اور کسی فلسفہ ونظام کے ردعمل پر ہوتی ہے...... میں نے ایک بار لکھنؤ سے جب مولانا مودودی کو اپنی اس ذہنی کشمکش کا حال لکھا اور ان کو مولانا الیاس صاحب سے میرے گہرے تأثر اور تبلیغی کام میں روز افزوں انہماک کا حال بطور خود بھی معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے اس بارے میں یکسو ہوجانے کی اجازت

www.abulhasanalinadwi.org

بلکہ مشورہ دیا۔(۴)

جماعت اسلامی میں اپنی بے اطمینانی کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا علی میاں تحریر فرماتے ہیں:

''بے اطمینانی کے اسباب ریاضی واقلیدس کے قواعد کی طرح چند بندھے ٹکے لفظوں اور ضابطوں کی شکل میں بیان نہیں کئے جاسکتے اس کے اسباب مختلف النوع ہو سکتے ہیں ان کا تعلق تعلیم وتربیت ماحول کے اختلاف، وہ شخصیتیں جن سے آدمی متاثر ہوتا ان کی رنگارنگی ذاتی تجربات، موروثی وخاندانی اثرات، دینی ارتقاء اور مطالعہ کے نتائج سے بھی ہوسکتا ہے اور ان سب کا الفاظ کی گرفت میں (خاص طور سے مختصر خطوط کی شکل میں) آنا مشکل ہوتا ہے میں عام طور پر اس کے جواب میں لکھ دیتا تھا کہ اس کے سمجھنے کے لئے آپ میری کتاب ''ارکان اربعہ ''منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین'' تاریخ دعوت وعزیمت'' اور عربی ربانیۃ لا رہبانیۃ'' (تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک) کا مطالعہ کیجئے (۶)

مولانا علی میاں کا طریقہ تنقید

مولانا فرماتے ہیں:۔

''میں نے جماعت اپنی بے اطمینانی اور اس کے اسباب کا اظہار کرنے میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیا ہے اور جماعت کے موافقین یا مخالفین نے جب خط وکتابت کے ذریعہ مجھ سے میری علیحدگی کے اسباب اور مولانا یا جماعت کے بارے میں میری رائے دریافت کی تو میں نے اس کا ایسا جواب دینے سے احتراز کیا جس کو اشاعت میں لاکر غلط مقاصد حاصل کئے جاسکتے تھے''۔(۷)

مولانا مودودی کی تصنیف ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' پر مولانا علی میاں کی اپنی تنقیدی کتاب ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح کے حوالہ سے وہ تحریر فرماتے ہیں:

......''پھر بڑے فکر وتامل اور دعا واستخارہ کے بعد ایک دینی فریضہ سمجھتے ہوئے رمضان ۱۳۹۸ھ اگست ۱۹۷۸ء میں اس موضوع پر مستقلا قلم اٹھایا اور ایک شاہد عینی اور مستفید کی حیثیت سے اس کو ضروری سمجھا کہ مولانا کی خدمات اور انکی تصنیفی انفرادیت کا پورا پورا اعتراف

www.abulhasanalinadwi.org

کرتے ہوئے اپنے خدشات اور اندیشوں کو ظاہر کیا جائے کہ جماعت میں شریک ہونے والوں کی ایک بڑی تعداد بلا شبہ دین کی طالب اور خدمت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی حریص و خواہشمند ہے اور اس کو جب کتاب وسنت کی روشنی میں مخلصانہ مشورہ دیا جائے گا تو اس سے وہ ضرور فائدہ اٹھائے گی اس لئے کہ اس کے دستور نے یہ کہہ کر کہ "رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے اور کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو" نیز مولانا کے لٹریچر نے جو اسی اصول پر مبنی ہے اس کے ذہن کی وہ تربیت کی ہے جو عصر حاضر میں کم جماعتوں کی کی گئی ہوگی" (۸)

مولانا علی میاں اپنی کتاب عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح کا ایک نسخہ مولانا مودودی کو بھیج دیتے ہیں اس کی رسید دیتے ہوئے مولانا مودودی ۲۳ جنوری ۱۹۷۹ء کے گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:

"عنایت نامہ مورخہ ۵ صفر ۹۹ھ کو ملا، اور اس کے ساتھ آپ کی تازہ کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح" کا شکر گزار ہوں کہ میری جس چیز کو آپ نے خدشات کا موجب سمجھا اس پر تنقید فرمائی مزید میری جن جن چیزوں کو آپ دین اور اہل دین کے لئے مضرت رساں یا موجب خطر سمجھتے ہوں ان پر بھی آپ بلا تکلف تنقید فرمائیں، میں نے کبھی اپنے کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا نہ میں اس پر برا مانتا ہوں، البتہ یہ ضروری نہیں کہ میں ہر تنقید کو برحق مان لوں اور ناقدین کے بیان کردہ خدشات اور اندیشوں کو صحیح تسلیم کروں" (۹)

جماعت اسلامی سے علیحدگی کے باوجود ذاتی تعلقات برقرار ہے اس تعلق سے مولانا علی میاں رقمطراز ہیں:

"۴۳ء میں میرا ضابطہ سے جماعت سے تعلق نہیں رہا تھا لیکن مولانا سے اور بیشتر رفقائے جماعت سے دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات تھے اور ایک دوسرے کے احترام اور اعتراف میں کوئی فرق نہیں آیا تھا (۱۰)

مولانا علی میاں کی مولانا مودودی سے آخری ملاقات جولائی ۱۹۷۸ء کی کسی تاریخ کو لاہور میں مولانا کے دولت خانہ پر ہوئی مولانا علی میاں اس تعلق سے اپنے تاثرات کا ذکر

www.abulhasanalinadwi.org

یوں کرتے ہیں:

''مولانا بڑے اخلاق اور تپاک سے ملے (۱۱)

مودودی صاحب کے بارے میں مولانا علی میاں کی یہ تحریر کافی اہمیت کی حامل ہے:

''واقعہ یہ ہے کہ اس جدید تعلیم یافتہ نسل پر ذہنی و علمی طور پر مولانا مودودی نے گہرا اور نہایت وسیع اثر ڈالا ہے، انہوں نے اس نسل کی صدہا بے چین روحوں، ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے بلکہ اس کا گرویدہ بنانے اور اس کے دل و دماغ میں اسلام کا اعتماد و وقار بحال کرنے کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے یہاں تک کہ اس تعلیم یافتہ اور ذہین (Intellectual) طبقہ کا تعلق ہی، اس اثر انگیزی میں (اس ربع یا نصف صدی میں) مشکل سے کوئی مسلمان مصنف و مفکران کا مقابل و ہمسر ملے گا''۔

مولانا مودودی کے بعض خیالات اور تحقیقات سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو (اور خود یہ ناچیز بھی ان لوگوں میں شامل ہے جنہوں نے اس علمی محاسبہ اور تنقید کا فرض انجام دیا ہے) اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی تحریریں اور مضامین مغرب کی تہذیب اور اس کے فلسفہ حیات کے گہرے مطالعہ اور ذاتی واقفیت پر مبنی ہیں انہوں نے ایسے مبصرانہ اور جرأت مندانہ انداز میں اس کی تنقید اور اس کے علمی تحلیل و تجزیہ کا فرض انجام دیا ہے جو خود اعتمادی سے بھرپور اور مرعوبیت اور سطحیت سے دور ہے اور جس میں نامور نو مسلم مغربی فاضل علامہ محمد اسد کے سوا ان کا کوئی نظیر و ہمسر اور ان کا کوئی پیش رو (اس قریبی زمانہ میں) نظر نہیں آتا، انہوں نے اسلام کے نظام حیات اس کی تہذیب کی بنیادیں حیات انسانی کی تنظیم کے اصول، اسلامی حکومت کے محاسن و خصائص اور اس کے قیام کے طریق و شرائط کو نئے اسلوب اور علمی زبان میں اس خوبی سے پیش کیا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ (جو مغربی طرز استدلال اور جدید علمی اسلوب کا خوگر ہے) اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا انہوں نے اسلام کے حقائق اس کے قوانین معاشرت اور اس کے اقتصادی، سیاسی نظام کو اس انداز میں پیش کیا جس میں معذرت و تاویل کا وہ رنگ نہیں تھا جو عرصہ سے ان مسائل پر لکھنے والے دانشوروں اور اہل قلم کے یہاں پایا جاتا تھا بلکہ انہوں نے بارہا مغربی تہذیب اور اس کے فلسفہ حیات کے بارے میں اقدامی

www.abulhasanalinadwi.org

پوزیشن اختیار کی اور خود اس کی بنیادوں اور جڑوں پر تیشہ زنی کی جس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے افراد کی وہ احساس کمتری اور شکست خوردگی دور ہوگی جو خالص مغربی تعلیم نے ان میں پیدا کر دیا تھا اور بہت سے نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کی سربلندی اور اسلامی حکومت کے قیام کا جذبہ اور اسکی ضرورت کا احساس بیدار ہو گیا جو اس کو نا قابل عمل بلکہ نا قابل تصور سمجھنے لگے تھے اور یہ ان کی وہ خدمت ہے جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا'' (۱۲)

<u>سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی کے ساتھ مولانا علی میاں کے تعلقات کی نوعیت۔</u>

مولانا علی میاں اور مولانا ابواللیث صاحب کے ربط و تعلق کی مدت نصف صدی سے متجاوز ہے (۱۳) مولانا علی میاں اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں :

۴۷ء کے بعد مولانا اس نازک اور پر آشوب دور میں ہندوستان کی جماعت اسلامی کے امیر منتخب ہوئے اور اس حیثیت سے وہ سالہا سال رامپور میں جہاں اس کا صدر دفتر اور اس کے زیر اہتمام چلنے والی ایک تعلیم گاہ بھی تھی مقیم رہے، لیکن ہمارا تعلق بدستور قائم رہا، میں رامپور جاتا تو انہیں کے پاس ٹھہرتا وہ لکھنؤ اور رائے بریلی بھی آتے رہتے، پھر مرکز دہلی منتقل ہو گیا، لیکن ہمارے روابط برابر قائم رہے اور اس زمانے میں بھی ان کی دارالعلوم اور رائے بریلی میں آمد و رفت رہی۔

آخر میں بڑی خواہش تھی کہ وہ کچھ دن آرام کرنے اور دوستوں سے ملنے کیلئے دارالعلوم میں آئیں اور قیام کریں، مگر ان کی علالت اور کمزوری کی وجہ سے یہ آرزو پوری نہ ہوسکی اور انہوں نے اس دنیا سے سفر آخرت کیا۔ (۱۴)

ان کے انتقال پر ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعزیتی جلسہ میں اپنی تقریر کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا علی میاں بیان فرماتے ہیں:

''میں نے اپنی تقریر میں تین باتوں کی طرف اشارہ کیا، ایک ان کی اس خصوصیت کی طرف کہ ایک عظیم و موقر جماعت کے امیر ہونے کے باوجود ان کی سادگی، تواضع و عالمانہ و مدرسانہ طرز زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا وہ اپنے قدیم دوستوں سے ایسی بے تکلفی اور خلوص

www.abulhasanalinadwi.org

سے ملتے تھے، جیسے اپنے زمانۂ طالب علمی و تدریس میں ملتے تھے، مشائخ و علماء سے بھی ان کے روابط قائم رہے، دوسرے یہ کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جماعت اسلامی جیسی جماعت کی ذمہ داری سنبھالنا، جس کے خاص نظریات بھی تھے، کانٹوں بھرا تاج سر پر رکھنا یا ہتھیلی میں انگارہ رکھنے کے مترادف تھا لیکن انہوں نے اس نازک منصب کو، صبر و استقامت اور حکمت و فراست سے نبھایا، تیسری اہم بات یہ کہی کہ ہندوستان میں چونکہ جماعت کی قیادت ایک مستند عالم اور خالص دینی و علمی حلقہ کے پروردہ اور ساختہ پرداختہ فرد کے ہاتھ میں تھی، اس لئے اس نے پاکستان کی جماعت اسلامی کی اس قیادت کے مقابلہ میں جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی وفات کے بعد ان افراد کو منتقل ہوئی (جو اپنی دوسری خوبیوں کے باوجود) مکمل عالم دین اور خالص علمی و دینی ماحول کے تربیت یافتہ نہیں تھے، زیادہ توازن، اعتدال، دینی پہلو کی رعایت اور علماء و مراکز دینی سے تعلق اور ان کے احترام کا ثبوت دیا اور وہ ان بعض غلطیوں اور بے اعتدالیوں سے محفوظ رہی جن کی پاکستان میں وہاں کے قدیم علماء اور دوسرا نقطۂ نظر رکھنے والوں کو جماعت سے شکایت ہے۔ (۱۵)

تبلیغی جماعت اور مولانا علی میاں

مولانا علی میاں کو حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی برپا کردہ تبلیغی جماعت سے ابتدائی تعارف مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ذریعہ سے ہوا۔ مولانا علی میاں اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

"جب ترجمان القرآن" میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے طاقتور قلم سے میوات کے ایک دورہ سے واپسی پر ان کا مضمون "ایک اہم دینی تحریک" کے عنوان سے نکلا (ستمبر ۱۹۳۹ء) تو میں نے اس کو بار بار پڑھا، یاد آتا ہے کہ دارالعلوم سے جو سڑک یونیورسٹی کی طرف جاتی ہے، اس پر پرچہ کھولے ہوئے ایک استغراق کی حالت میں مضمون پڑھ رہا تھا، اور آنے جانے والی سواریوں کا بھی (جو اس وقت نسبتاً کم ہوتی تھی) ہوش نہیں تھا۔ (۱۶)

مولانا علی میاں بعد میں بہ نفس نفیس حضرت مولانا الیاسؒ سے ملاقات کے لیے میوات کا سفر کیا اور بذات خود ان کے کام کا مشاہدہ کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا رقمطراز ہیں۔

''اس سفر میں ہم نے جو سب سے حیرت انگیز چیز دیکھی اور جس سے ہم کو لازوال مسرت اور شادمانی حاصل ہوئی، وہ میوات کے علاقہ میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ کا تبلیغی کام اور نظام ہے ہم نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ بیسویں صدی کا منظر نہ تھا، بلکہ پہلی صدی ہجری کا نقشہ معلوم ہوتا تھا، عہد بعثت کی اصلاح اور انقلاب حال، اور قرن اول کے نومسلموں کے جوش وجذبہ اور تبلیغ کے ذوق وشوق کے جو قصے ہم نے سیرت اور تاریخ اسلام میں پڑھے تھے، گوڑگانوں کی جامع مسجد اور قصبہ نوح اور شاہ پور کی گلیوں میں اس کا ایک نمونہ دیکھا، واقعہ یہ ہے کہ یہ چستی درویش اور مجددی عالم، قدیم غیاث پور (حال بستی نظام الدین) میں حضرت نظام الدینؒ کے پہلوں میں بیٹھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اشاعت اسلام اور حضرت مجدد سرہندیؒ اور حضرت شہید رائے بریلوی کی حفاظت سنت زندہ کررہا ہے۔'' (۱۷)

حضرت مولانا علی میاں حضرت مولانا الیاسؒ کی ذات اور کام سے کافی متاثر ہوئے اور اسکے نتیجہ میں لکھنؤ میں تبلیغی کام کا آغاز فرمایا۔ مولانا علی میاں حضرت مولانا الیاس کے انکے نام مکاتیب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

''یہ صرف دعوت کے اصول وآداب اور اس کی روح وضوابط کے لحاظ سے بلکہ اپنے بلند مضامین اور دینی حقائق کے لحاظ سے بھی ایک گراں قدر ذخیرہ ہے، جس سے مولانا کے یقین واعتماد، قوت ایمانی، حمیت اسلامی، دین کی فکرمندی، بے چینی اور بے کلی، تعلق باللہ، دین کا فہم صحیح، مقاصد شریعت اور روح دین کی معرفت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے ارو معلوم ہوتا ہے کہ ان خطوط کا لکھنے والا، اپنے وقت کا عارف ہے اور وہ دین کی جدوجہد اور ایک خاص نوع سے دین کے احیاء وتقویت کے لئے اپنے کو مامور اور ذمہ دار سمجھتا ہے۔'' (۱۸)

حضرت مولانا الیاسؒ کے وصال تک مولانا علی میاں ان کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے تھے اس دوران آپ تبلیغی جماعت کی مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ کے ساتھ بھی مولانا علی میاں ایک خاص شغف رکھتے تھے۔ البتہ کچھ عرصہ بعد تبلیغی جماعت کے تعلق سے مولانا علی میاں نے مندرجہ ذیل احساسات بیان

فرمائے۔

''حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی ذات سے گہری عقیدت، ان کے فہم دین واخلاص پر کامل اعتماد اس کام کی ضرورت اور افادیت پر یقین، اور نہ صرف عملی شرکت، بلکہ ایک داعی اور ترجمان کے فرائض انجام دینے کے ساتھ (جو مولانا کے لئے بھی مسرت اور اطمینان کا موجب تھی) واقعہ یہ ہے کہ میرے ذہن کے سانچہ کی (جو ایک خاص علمی ماحول اور مطالعہ سے تیار ہوا تھا) مکمل شکست وریخت عمل میں نہیں آئی تھی۔ اور اسکی جگہ کسی دوسرے ذہنی اور فکری سانچہ نے نہیں لی تھی، یہ صورت حال ان لوگوں کو اکثر پیش آتی ہے جن کا ذہنی و فکری سانچہ پہلے سے تیار ہو گیا ہو اور انہوں نے اپنے ذہن ومطالعہ سے کام لینا چھوڑا ہو زیادہ صحیح الفاظ میں انہوں نے دماغی سپر اندازی اور ماضی سے مکمل علیحدگی اختیار نہ کی ہو اس لیے تحریکوں اور دعوتوں کے لئے وہ لوگ زیادہ مفید اور کارآمد ہوتے ہیں جن کا سانچہ انہیں تحریکوں اور دعوتوں میں آنے کے بعد بنتا ہے اور ان کو کوئی فکری ہجرت یا سفر نہیں کرنا پڑتا۔

میرا معاملہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس سے مختلف تھا، میرا ایک فکری وعلمی پس منظر (Background) تھا اصلاحی اور تجدیدی تحریکوں اور ان کی مرکزی شخصیتوں کا میں نے نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ان کے تعارف وتذکرہ نویسی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا، میں نے ہر دور میں منصوصات وغیر منصوصات اور مقاصد و وسائل میں فرق کرتا رہا، اور میرے نزدیک خوب سے خوب تر کی تلاش اور نافع سے انفع کی جستجو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا اسی طرح میرے نزدیک ہر تحریک ہر دعوت اور ہر ادارہ میں جو دین کی خدمت اور اعلائے کلمۃ اللہ قائم ہو نمو و ارتقاء زندگی اور اس کے مسائل سے واقفیت اور جائز اور ضروری حد تک ان کی تکمیل اور زندگی سے تطبیق کی کوشش ضروری ہے ورنہ وہ تحریک اور ادارہ نمو اور زندگی کی صلاحیت سے محروم اور جمود کا شکار ہو جائے گا اور اس کی افادیت محدود سے محدود تر ہو کر رہ جائے گی (۱۹)

تبلیغی جماعت کے ذمہ داران کو مولانا نے بعض مفید مشورے تبلیغ کے نظم کے تعلق سے دیے تھے مگر وہ قبول نہ کیے جا سکے مولانا اس کو محسوس تو کیا مگر جماعت سے رابطہ قائم رکھا (۲۰)

مولانا علی میاں کی پہلو دار شخصیت پر امت مسلمہ کے اہل فکر ونظر نے کافی بصیرت

افروز تبصرے کیے، پروفیسر خورشید احمد نے بھی کافی جامعیت کے ساتھ مولانا علی میاں کی شخصیت پر روشنی ڈالی انکے مندرجہ ذیل ملاحظات بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں:۔

مولانا علی میاں کا اصل میدان تاریخ اور ردعوت ہے سیرت اور انسان سازی ہے روح کی بیداری اور امت کی ترقی کیلئے اسلاف کے نمونے کا احیا ہے انکی یہاں خانقاہ اور جہاد، تزکیہ اور انقلاب دونوں دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں کبھی وہ ایک کو نمایاں کرتے ہیں اور کبھی دوسرے کو ، پہلی تالیف سے (جو ۱۹۳۹ میں شائع ہونے والی سیرت سید احمد شہید تھی) آخری کتاب (تاریخ دعوت وعزیمت) تک تزکیہ اور جہاد کا چولی دامن کا ساتھ باقی رہتا ہے انکا ذوق اور خاندانی اور ردعوتی ماحول جب انکو دین کی جدید تعبیر و تفہیم کے باب میں کچھ خدشات اور خطرات سے دوچار کرتا ہے اور وہ کچھ تصور اور اسالیب کے بارے میں تردد اور اضطراب کا اظہار کرتے ہیں تب بھی دین اور قوت کے تعلق احیا اور اقامت کی خواہش اور طلب اسلامی حکومت کے قیام اور غلبے کی تمنا کے اظہار پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ (دعوت وعزیمت کی آخری جلد میں سیرت سید احمد شہید کے پہلے ایڈیشن کی ان عبارتوں کو جوں کا توں رکھتے ہیں جن میں قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات کا عکس دیکھا جا سکتا ہے ۱۹۷۷ میں شائع ہونے والی سیرت سید احمد شہید (سلسلہ تاریخ دعوت وعزیمت) حصہ اول میں کتاب سے اسی مقصد کا اعادہ کیا گیا ہے جو ۱۹۳۶ میں رقم کیا گیا تھا یعنی ''اسلام کی خدمت اور نوع انسانی کی سعادت کا ایک ہی لائحہ عمل ہے جو اس کتاب میں بیان کیا ہے۔اور وہ وہی ہے جسکے مطابق رسول اللہ ﷺ، آپؐ کے خلفائے راشدین اور بعض مجددین امت نے عمل کیا یعنی دنیا میں اسلامی شریعت اور خلافت کا صحیح نظام قائم کرنا اور اسلام کے اخلاقی روحانی مادی سیاسی غلبے کی کوشش کرنا (ص ۴۷) پھر سید صاحب کی سیرت پر اجمالی نظر کے باب میں دعوت دین کا کام کرنے والے تمام بزرگوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے صاف الفاظ میں لکھتے ہیں کہ ''نفس کے مجاہدے کے ساتھ کفار سے جہاد'' اور شرعی حکومت کا قیام اسوہ رسالت مآب کا جزء لاینفک ہے دعوت اور خدمت کے تمام کام اہم اور لائق تحسین لیکن ان سب کے حلقے اور عمل کے دائرے محدود ہیں اور سید صاحب نے اس نکتے کو اچھی

www.abulhasanalinadwi.org

طرح سمجھا کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی نظام قوانین وحدود کے اجراء اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوشش ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' ثابت ہوں گی (۲۱)

حواشی وتعلیقات

(۱) پرانے چراغ جلد دوم ص ۳۰۴
(۲) نفس مصدر ص ۳۰۵-۳۰۶
(۳) نفس مصدر ص ۳۰۸-۳۰۹
(۴) ایضاً ص ۳۱
(۵) ایضاً ص ۳۱۳-۳۱۴
(۶) ایضاً ص ۳۱۶
(۷) ایضاً ص ۳۱۵
(۸) ایضاً ص ۳۱۶
(۹) ایضاً ص ۳۱۷
(۱۰) ایضاً ص ۳۱۲
(۱۱) ایضاً ص ۳۱۲
(۱۲) ایضاً ص
(۱۳) کاروان زندگی حصہ چہارم ص ۳۹۰
(۱۴) ایضاً ص ۳۹۱
(۱۵) ایضاً ص ۳۹۲-۳۹۳
(۱۶) ایضاً حصہ اول ص ۲۷۹
(۱۷) ایضاً ص ۲۴۱
(۱۸) ایضاً ص ۲۸۳
(۱۹) ایضاً ص ۳۱۴-۳۱۵
(۲۰) کاروان زندگی ۱ر
(۲۱) پروفیسر خورشید احمد مولانا علی میاں ص ۶۹-۷۰، ترجمان القرآن فروری ۲۰۰۰

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں اور پیام انسانیت

مولانا عبید اقبال عاصم
دفتر ناظم دینیات۔اے ایم یو علی گڑھ

اٹھارہویں صدی عیسوی میں انگریزوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد یہاں کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور امن پسندی متاثر ہوئی۔انگریز اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے کہ اگر اس ملک پر حکمرانی کرنی ہے تو اس کے لئے یہاں کے باشندوں میں اختلاف پیدا کرنا ہوگا انہیں مختلف جھگڑوں میں تنازعات اور پیچیدہ مسائل میں الجھانا ہوگا تاکہ ہم یہاں بے خوفی کے ساتھ حکمرانی کر سکیں۔اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے یہاں کے دو فرقوں کے درمیان انہوں نے اتنی دوری پیدا کر دی کہ اسے پاٹنا مشکل ہو گیا رہی سہی کسر تقسیم ملک نے پوری کر دی ملک کی فضا میں اس حد تک فرقہ واریت کے زہریلے جراثیم داخل ہو گئے کہ ان کے اثرات ہر شعبہ زندگی میں نمایاں طور پر محسوس ہو رہے ہیں اور ملک کو شدید خانہ جنگی کا خطرہ لاحق ہے۔

۴۷ءمیں جب تقسیم کا واقعہ ہوا اس وقت مولانا علی میاں اپنے پہلے سفر حج کے سلسلے میں حجاز میں مقیم تھے اور یہاں کے حالات قدرے تاخیر اور قدرتا اختصار کے ساتھ انہیں معلوم ہو رہے تھے [۱] وہ اس بات پر مضطرب تھے کہ انسانیت کے نمائندے کہاں سو گئے؟ آج گوشت پوست کے ان انسانوں کو کیا ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے

[۱] کاروان زندگی ۱/۲۴۲

www.abulhasanalinadwi.org

ہو گئے انہی احساسات اور افکار کے ساتھ مولنا علی میاں لکھنؤ واپس پہونچے یہ بھی عجیب اتفاق کی بات ہے کہ جس دن مولانا لکھنؤ واپس تشریف لائے اسی دن مہاتما گاندھی (۳۰ جنوری ۴۸ء) قتل کردئے گئے ۲ اور قاتل وہی تھے جو مسلمانوں کے لہو سے گذشتہ چھ مہینوں سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ وہ دراصل انسانیت کے دشمن تھے اور چونکہ وہ مہاتما گاندھی کو عظیم انسان تصور کرتے تھے اس لئے ان کے اپنے فلسفہ کے مطابق گاندھی جی کا قتل ان کے لئے ضروری ہوگیا تھا اس سے اتنا ضرور ہوا کہ برادران وطن کا وہ طبقہ جو شرپسندوں کے بہکائے مین آکر ہر معاملے میں مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرا رہا تھا اس کے سامنے حقیقت منکشف ہوئی اور مسلمانوں کے تئیں قدرے ہمدردی کی فضا بنی۔

مولانا علی میاں سفر حج سے واپس تشریف لائے تو یہ صورت حال ان کے سامنے تھی انہوں نے جو کچھ اخبارات اور خطوط کے ذریعہ پڑھا اور سنا تھا اس سے کہیں بدتر حالت دیکھ کر انہیں قرار نہیں آیا اگرچہ کچھ ہندوستانی مسلم رہنما جیسے مولنا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رومی مرحوم، ڈاکٹر سید محمود، حافظ ابراہیم وغیرہ اس صورت حال کو بدلنے کی مسلسل کوششیں کررہے تھے اور وہ برادران وطن خصوصا کانگریسی رہنماؤں کو مسلمانوں کا ہم نوا بنارہے تھے لیکن فضا اس قدر بدل چکی تھی کہ غیر مسلم اکثریت کے دانشور اور زیادہ تر وہ لوگ جو حکومت کے اونچے عہدوں اور وزارتوں پر سرفراز تھے مسلمانوں کو ایسے مشفقانہ اور دانشورانہ طریقہ پر مشورہ دیتے تھے جیسے اس ملک کے سارے مسلمان طفل مکتب ہیں'' ۳

اس صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے مولانا اسکے پائیدار حل کی تدابیر کرنے لگے نفرت کے بجائے محبت کے نکتہ پر انکی نگاہیں مرتکز ہوگئیں اور وہ انسانوں کو ان کا مقام یا ددلانے کی کوششوں میں جٹ گئے۔ وہ انسانوں کو بتانا چاہتے تھے کہ فرقہ و مسلک اور مذہب سے بڑھ کر انسانوں کا انسانوں سے ایک رشتہ انسانیت کا ہے اور یہی رشتہ مضبوط اور پائیدار ہے جتنے پیغمبر و لی رشی آئے انہوں نے اس راہ کو اختیار کیا دیئے سے دیئے جلے اور انسانیت کی روشنی پھیلتی گئی۔

---

۲ ایضاً ص ۳۴۳ ۳ ایضاً ص ۳۴۳

www.abulhasanalinadwi.org

اس جذبہ اور احساس کے تحت مولانا نے ۲۰ شوال ۱۳۶۷ھ (۲۶ اگست ۱۹۴۸ء) کو مختلف مکاتیب خیال کے دردمندوں کا ایک اجتماع لکھنؤ میں بلایا جس میں اس وقت کے خطرناک پہلوؤں پر تنقید کرتے ہوئے حالات کے روشن پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا گیا۔[۴] اس سلسلہ میں مولانا علی میاں کی یہ پہلی کوشش تھی اس اجلاس میں یہ بھی طے پایا کہ دعوتی وتعارفی لٹریچر ہندی انگریزی اور دوسری زبانوں میں عام کر کے غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان بڑھتی خلیج کو روکا جائے ہندو مسلم مخلوط اجتماع کی یہ کوشش کامیاب رہی اور اس سے حوصلہ پاکر مولانا نے ان مخلوط اجتماعات کو اپنے تبلیغی مشن کا حصہ بنالیا جس میں انہوں نے مولنا منظور نعمانی کو اپنا رفیق رکھا ان اجتماعات سے ان کا مقصد ایک ایسے معاشرہ کی تعمیر تھا جس میں امن وامان ہو پیار محبت ہو بھائی چارگی ہو اور ایک دوسرے سے ہمدردی ہو۔

۱۹۴۸ء کی مولنا کی یہ تقریر ''نشان راہ'' کے نام سے دستیاب ہے اس قسم کے اجتماعات کا کام بہت نازک بھی تھا کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی سے یہ دعوت وحدت ادیان کے لئے راستہ ہموار کرسکتی تھی اس لئے اسکی باگ ڈور زیادہ تر مولنا نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی اور اکتوبر ۱۹۵۱ء میں پھر ایک کوشش کی گئی۔ لکھنؤ کے امین الدولہ پارک میں اسی نظریہ کے تحت ایک جلسہ ہوا اور بقول مولنا علی میاں اس جلسہ میں حاضرین کی اتنی تعداد تھی جو بڑے سے بڑے سیاسی رہنما حتی کہ جواہر لال نہرو کے خطاب میں بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ من جانب اللہ بات تھی کہ مضامین کی ایسی آمد اور تقریر میں ایسی روانی تھی کہ سامعین ایک سکتہ کے عالم میں تھے اور ایسی خاموشی تھی جسکو (Pin drop silence) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے''[۵]

ان اجتماعات کے اثرات مرتب ہونا شروع ہوئے اور مسلمانوں کو اپنی بات انسانیت کے عنوان سے جرات وہمت کے ساتھ کہنے کا موقع ملا ادھر لکھنؤ کے اجتماعات نے قریب کے اضلاع میں بھی اپنے اثرات دکھانے شروع کئے لیکن مولنا کی عدیم الفرصتی اسفار کی کثرت اور علمی تحقیقی کاموں کی مشغولیت کی وجہ سے باوجود دلی خواہش کے اس

---

۴ ایضاً ص ۳۴۶ ۵ ایضاً ص ۱/ ۳۹۷

www.abulhasanalinadwi.org

طرف پورا وقت نہیں لگا سکے اسکے مثبت اثرات اور احباب کے اصرار پر ۵۴ء میں مولانا نے اس اہم کام کے لئے باقاعدہ وقت نکالا اور جنوری ۵۴ء میں لکھنؤ کے علاوہ جونپور ، غازی پور ، مئو اور گورکھپور میں اجتماعات کیئے گئے جنہیں مولنا نے خطاب کیا ان اجتماعات میں مولنا نے مخاطبین سے پیغمبرانہ طرز حیات اپنانے کی طرف توجہ دلائی اور انہوں نے ان اجتماعات کے ذریعہ حاضرین وسامعین کے ذہن وفکر مین تبدیلی لانے کے لئے بار بار پیغمبروں کے اسوہ کا حوالہ دیا ایسے ہی ایک اجتماع میں آپ نے فرمایا۔

''پیغمبر قلب کی ماہیت بدل دیتے ہیں وہ انسانوں کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کردیتے ہیں کہ وہ دوسرے انسان کی فاقہ کشی کو نہ دیکھ سکے وہ اسکے اندر ایثار کی روح ، قربانی کا جذبہ اور سچی انسانی ہمدردی پیدا کردیتے ہیں اسکو دوسروں کی زندگی اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہوجاتی ہے وہ اپنی جان کھوکر دوسروں کی زندگی بچانا چاہتا ہے وہ اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر دوسروں کا پیٹ بھرنا چاہتا ہے وہ خطروں میں اپنے کو ڈال کر دوسروں کو خطرہ سے محفوظ کرنا چاہتا ہے''۔[۶]

اس تقریر میں مولنا نے پیام انسانیت کا مشن واضح انداز میں بیان کردیا ہے وہ انسانوں کی بنیادی فکر میں یہ تبدیلی لانا چاہتے تھے کہ ان کے اندر انسانی ہمدردی کا جذبہ اس حد تک پیدا ہوجائے کہ وہ من وتو سے بے نیاز ہوجائے مولانا جانتے تھے کہ یہ کام نظام میں تبدیلی کے نعرہ سے نہیں بلکہ مزاج میں تبدیلی پیدا کرنے سے ہوگا چنانچہ اسی تقریر میں خود ہی فرماتے ہیں کہ

''پیغمبر انسان کے اندر تبدیلی پیدا کرتے ہیں وہ نظام بدلنے کی اتنی کوشش نہیں کرتے جتنا مزاج بدلنے کی کوشش کرتے ہیں''۔[۷]

اسی کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں کو یہ بھی ذہن نشین کراتے رہے کہ کوئی انکا پالنہار ہے کوئی ان کا نگراں ہے جو ان کی تمام حرکات وسکنات کو دیکھ رہا ہے اور اس سے کوئی چیز مخفی نہیں یہی ایمان کا پیغام ہے اور یہی پیغمبروں کی تعلیم کا خلاصہ ،

---

۶ ۹ جنوری ۵۴ء کی لکھنؤ کی ایک تقریر کا اقتباس مطبوعہ پیام انسانیت ص ۱۸ ۔ ۷ ایضاً ص ۱۹

www.abulhasanalinadwi.org

''پیغمبروں نے انسان کو انسان بنانے کی کوشش کی انہوں نے اسے ایمانی انجکشن دیا اور کہا کہ اے بھولے ہوئے انسان اپنے پیدا کرنے والے کو پہچان اور سوتے جاگتے چلتے پھرتے اسے نگراں مان'' ۸

مولنا علی میاں نے جہاں انسانیت کے پیغام کو عام کرنے کی خاطر اور بلا تفریق مذہب و ملت سبھی فرقوں کے افراد کو اس مشن سے جوڑنے کی کوشش کی وہیں وہ مسلمانوں کے اجتماعات میں مسلمانوں کے خواص و عوام کو بھی دعوت دیتے رہے کہ وہ اپنے فریضہ کو پہچانیں اور اسلام کی تعلیمات کو عام کریں اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسان قدرت کا شاہکار ہے اور اس دنیا کے باغ کا سب سے حسین پھول۔ اس کے لئے انہوں نے قرآنی آیات سے اور احادیث نبویہ سے ثبوت فراہم کئے اور بتایا کہ انسان کو زندہ رہنے کا حق اسکا دستوری حق ہے۔

پیام انسانیت کے اسٹیج سے انہوں نے اسلامی تعلیمات کو حسن تدبیر کے ساتھ سامعین تک اس انداز میں پہونچایا کہ مجمع خواہ کیسا ہی ہو ان کے اس طرز استدلال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا چنانچہ آپ نے ایک موقع پر فرمایا

''انسانیت کی پونجی مٹ رہی ہے ہم ایک صدا لگانے آئے ہیں حق کی صدا دنیا اس صدا سے نامانوس ہے مگر ہم دنیا سے مایوس نہیں انسانون کے پاس اب بھی ضمیر ہے یہ ضمیر مردہ نہیں ہوا اس پر گرد و غبار آگیا ہے اگر وہ گرد و غبار جھاڑ دیا جائے اور اسکو آلودگی سے صاف کر دیا جائے تو اب بھی اسکی گنجائش ہے کہ وہ حق کو قبول کرے اور اس میں ایمانی شعور پیدا ہو'' ۹

اس سلسلہ کا دوسرا اجلاس ۱۵ جنوری ۵۴ء کو جونپور شہر کے ٹاؤن ہال میں ہوا جس میں تعلیم یافتہ غیر مسلمین کی تعداد خاصی تھی جن میں سرکاری ملازمین بھی تھے۔ آپ نے اس انداز سے اس مجمع کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا۔

''آج انسانیت کا واٹر ورکس خراب ہو گیا ہے جہاں سے زندگی ابلتی ہے وہ دہانہ

---

۸ ایضاً ص ۲۰ ۹ ایضاً ص ۲۸

www.abulhasanalinadwi.org

خراب ہوگیا ہے زندگی کے بجلی گھر میں خرابی آ گئی ہے جہاں سے سارے شہر میں بجلی تقسیم ہوتی ہے انسانیت گھلتی پگھلتی جارہی ہے چور بازاری، رشوت ستانی اور دھوکہ بازی کا دور دورہ ہے آج کا انسان ان سب گندگیوں میں مبتلا ہے آج کے فکر مند انسان ان نتائج پر جھنجھلا رہے ہیں لیکن غصہ کس پر اتارا جائے؟ اور اسکا ذمہ دار کس کو سمجھا جائے؟'' ۱۰ؕ

انسانیت کے ان زخموں کو کریدنے اور ان پر نشتر لگانے کے بعد اسکا اندمال اس انداز سے کیا کہ ''ہم انسانیت کا درد محسوس کریں، اپنے اس پیارے ملک کو جس پر ہمارا حق ہے جس کو ہم نے اپنے خون سے سینچا ہے ہم پیغمبروں کے راستے سے سنواریں'' اور پھر اسکی وجہ بھی بتائی کہ ''پیغمبر سسکتی ہوئی انسانیت کے مسائل کو جس انداز سے حل کرتے ہیں وہی صحیح طریقہ ہے جب اس طرز پر اس بنیاد پر کام ہوا انسانیت کے دل کی پھانسیں چن چن کر نکل گئیں''۔ ۱۱ؕ

مولنا علی میاں نے انسانیت کا پیغام جس شہر میں پہونچایا یا انسانیت کے پیام کا تعارف جس جگہ بھی کرایا اس میں انہوں نے پیغمبرانہ مشن اور پیغمبرانہ طریق کار کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور مسلمین و غیر مسلمین کو پیغمبروں کے آنے کا مقصد ان کی تعلیمات ان کا طریقہ تبلیغ ہر ہر چیز کو واضح انداز سے بتلایا۔

۵۴ء میں اس انداز کے پانچ جلسے مشرقی اتر پردیش کے اضلاع میں ہوئے جن کے ذریعہ پیام انسانیت کا ہزارہا غیر مسلمین (جن کی اکثریت تعلیم یافتہ) کے سامنے تعارف ہوا اور آزادی کے بعد یہ پہلا مثبت انداز فکر تھا جس نے غیر مسلمین کو اپنی طرف یا اسلام کے پیام یعنی انسانوں کی فلاح و بہبود کی طرف متوجہ کیا سنجیدہ اور صائب الرائے حضرات نے اس پیغام پر غور و فکر کیا اور پھر تشنگی بڑھتی گئی لیکن مولنا دوسری مصروفیات کے باعث اپنا پورا وقت ادھر نہ دے سکے اور جنوری ۵۴ء کے بعد پھر اس قسم کے اجتماعات کو خطاب کرنے کی فرصت نہ ملی۔ ادھر مولانا کے اس انداز تخاطب نے انسانیت کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کر دیا جسکی وجہ سے جگہ جگہ سے ان مخلوط اجتماعات کی ضرورت اور محبت و

۱۰ؕ ایضاً ص ۳۳ ۱۱ؕ ایضاً ص ۳۴

www.abulhasanalinadwi.org

اخوت کے اس پیغام کو عام کرنے اور شہر شہر گاؤں گاؤں پہونچانے کی خواہش ہونے لگی تاکہ انسانی واخلاقی بنیاد پر کردار سازی ہوسکے اور نفرت کے خانوں میں منقسم انسان محبت کی تسبیح میں پروئے جاسکیں۔

چنانچہ ۵۵ء کے ابتدائی مہینوں میں اسی مقصد کے تحت مولانا نے مشرقی اتر پردیش کے اضلاع لکھنؤ وجونپور کے علاوہ بلتھر اروڈ، بنارس کا بھی دورہ کیا اور جگہ جگہ اس دعوت کو عام کیا آپ نے اپنی دعوت اور تحریک کا خلاصہ لکھنؤ کی ایک تقریر میں اس انداز سے کیا

''ہماری دعوت اور تحریکب بس یہی ہے کہ نفس پرستی کے خلاف محاذ قائم کیا جائے خدا پرستی کی زندگی کا طریقہ دنیا میں عام کیا جائے ہم نے اسی مقصد کے لئے یہ خاص اجتماعات کئے ہیں اور محض اسی مقصد کیلئے ہفتہ وار اجتماع کرتے ہیں جہاں قوم کے ہر طبقہ کو جمع ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور ان کے سامنے خدا پرستی کی دعوت کے سب سے بڑے علمبردار حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات ان کے حالات زندگی اور انکے ساتھیوں کے واقعات پیش کرتے ہیں جو سچی خدا پرستی کی راہ دکھلانے والے ہیں اور ہمارے یقین کے مطابق انہیں میں انسانیت کی نجات اور دنیا کی مشکلات کا حل ہے''[۱۲]

۵۴ء و ۵۵ء کے ان مخلوط اجتماعات نے برادران وطن کے دانشوروں کے دل ودماغ کو کافی حد تک متاثر کیا اور انکی اکثریت کے ذہنوں میں مسلمانوں اور اسلام کے تئیں جو شکوک وشبہات تھے ان میں کسی حد تک کی واقع ہوئی مولنا کو جہاں کہیں اور جب کہیں موقع ملتا اور اس طریقہ کے اجتماعات منعقد ہوجاتے تو اپنی بات کہنے سے نہ چوکتے اور انسانوں کو ان کا منصب انسانیت یاد دلاتے رہتے۔

یہ اجتماعات اگرچہ ایک مقصد کے پیش نظر تھے تاہم ان کی کوئی تنظیمی شکل نہیں تھی تقریباً بیس سال تک یہ تحریک غیر تنظیمی انداز پر چلتی رہی بالآخر ۱۹۷۴ء میں اس نے باقاعدہ تنظیمی شکل اختیار کرلی۔ اور مولانا علی میاں کے مطابق۔

''اس تجربے اور اقدام نے ۱۹۷۴ء میں پیام انسانیت کی تحریک کی شکل اختیار

---

۱۲ نومبر ۵۴ء کو لکھنؤ میں کی گئی تقریر کا اقتباس، مطبوعہ مقام انسانیت ص ۷۹

www.abulhasanalinadwi.org

کر لی جس کا تجربہ پچھلے تجربوں کی طرح کامیاب رہا اور اس نے اکثریت کے طبقے، انصاف پسند غیر مسلموں اور دانش وروں میں اسلام اور سیرت کے مطالعہ کا کسی درجہ میں شوق اور جذبہ بھی پیدا کیا ہندوستان انسانی بحران، اخلاقی انتشار، انسانی جان و مال کے عدم احترام و تحفظ، خودغرضی، دولت پرستی کے جنون کی وجہ سے جس خطرہ سے دوچار ہے اسکا مہیب نقشہ پیش کرنے اور ملک کو بچانے کی جدوجہد کی دعوت دینے پر بعض ممتاز ہندوؤں نے یہاں تک کہا کہ آج معلوم ہوا مسلمانوں کو اس ملک کو بچانے کی فکر ہم سے زیادہ ہے ۱۳؎۔

حقیقت یہ ہے کہ تقسیم ملک کے ساتھ ہی ساتھ ملک جس راہ پر گامزن ہو چلا تھا فرقہ پرستی علاقائی عصبیت اور قوم پرستی کے جارحانہ تیوروں نے اس ملک کی سمت کے جو اشارے دئے تھے وہ صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ملک کے لئے تباہ کن تھے اور باشندگان وطن کو اس دہانے پر لے جا رہے تھے کہ جہاں ہلاکت کے علاوہ کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا ایسے وقت میں انسان دوستی کا فرض تھا کہ انسانوں کو جو اشرف المخلوق کا درجہ رکھتے ہیں انسانیت کے نام پر مجتمع کیا جائے یہ کام دیر طلب صبر آزما اور دشوار گذار ضرور تھا لیکن مثبت اور تعمیری تھا اس لئے مولنا بے خوف وخطر اس راہ کے راہی ہو گئے اور بقول مولانا محمد رابع ندوی صاحب

"تقسیم کے وقت جو خون خرابہ کا طوفان کھڑا کیا گیا تو اسکے بعد مولنا ہندو مسلم دوستی کا چراغ جلانے کی سعی کرنے لگے ہندو مسلمان دوش بدوش رہیں اسکی ترغیب دیتے جب ملک میں مفاد پرستی فرقہ پرستی کی سیاست کا عروج ہونے لگا تو مولنا اس سے بہت کبیدہ خاطر ہوئے ......وہ اس تحریک کے ذریعہ یہ پیغام دیتے کہ مال کی محبت دولت کی پرستش خودغرضی یہ سب باتیں ملک کو برباد کرنے کی ہیں وہ ہندو مسلمانوں کو شانہ بشانہ چل کر ملک کو بچانے کی تلقین کرتے سبھی کو اپنے مذہب کے دائرے میں رہ کر کام کرنے کی اپیل کرتے تاکہ ملک میں نفرت کے ساتھ نہیں بلکہ محبت اور انسانیت کے ساتھ رہیں ۱۴؎"

۱۳؎ کاروان زندگی ۱/۴۰۰ ۱۴؎ انٹرویو مولنا رابع حسن ندوی، از جمشید عادل علیگ، نئی دنیا، دہلی (مفکر اسلام نمبر) ۸ تا ۱۴ فروری ۲۰۰۰ء ص ۱۵

www.abulhasanalinadwi.org

مولنا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ مخلوط اجتماعات میں ہی نہیں بلکہ جب وہ مسلمانوں کے مخصوص اجتماعات کو خطاب فرماتے تب بھی وہ یہی تلقین کرتے کہ مذہب سے بالاتر ہوکر انسانی زندگی کا احترام کریں۔ وہ فرماتے تھے کہ۔

''سارے مسائل بالائے طاق رکھ کر گھر گھر، محلے محلے، گلی کوچوں میں اسکی تبلیغ کریں کہ دستور ہند کی پہلی دفعہ چاہے جو کچھ ہو مگر ہمارے دستور زندگی کی پہلی دفعہ جو سب سے اہم ہے وہ یہ ہیکہ انسان کو زندہ رہنے کا حق ہے'' ۱۵؎

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کینیڈی ہال میں ۱۹۸۳ء میں مولانا نے پیام انسانیت کے عنوان پر تقریر فرمائی اور وہاں اسی پیغام کو دہراتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو یہ کام مذہب سے بالاتر ہوکر کرنا چاہئے اس کے بعد جمعہ کے خطبہ میں یونیورسٹی کی جامع مسجد میں ناظم دینیات مولانا تقی امینی صاحب نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اگر مسلمانوں کا مذہب بالاتر نہیں ہے تو یہ گمراہی کے سوا کچھ نہیں مذہبی تعلیم سے ہی انسانیت سنور سکتی ہے۔

مولنا ابوالحسن صاحب کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ وہ ان مخلوط اجتماعات میں انسانی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے سبھی مذاہب کے تئیں احترام کا جذبہ قائم رکھتے۔ انسانی خون کے احترام کی اپیل کرتے ہوئے ہر قسم کی مذہبی، علاقائی، نسلی، لسانی تہذیبی اور معاشرتی تفریق کو انسانیت کی رسوائی سے تعبیر فرماتے اور باشندگان ہند کو بہت ہی جرأت مندانہ انداز میں سمجھاتے کہ اگر یہ فرقہ واریت کا عفریت بوتل سے باہر آ گیا تو وہ ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیگا اسی وجہ سے وہ دانشوروں سے اپیل کرتے کہ

''اسلام اور مسلمانوں کا فرق سمجھیں مسلمانوں کی عملی کمزوریوں کی وجہ سے وہ اسلام کے اعلی اصولوں کو ترک نہ کریں اور اس انتشار کو دور کریں جو اس ملک میں آزادی کے بعد سے طاری ہے ہندوستان اگر اس پیام کو سمجھتا تو ڈھاکہ اور جکارتا سے لے کر استنبول اور رباط تک پھیلی ہوئی قوموں اور ملکوں کی قیادت کا مقام پا سکتا تھا اور وہ براعظم ایشیاء وافریقہ کا

۱۵؎ ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے ص ۲۳

www.abulhasanalinadwi.org

کا مسلمہ لیڈر بن سکتا تھا۔[۱۶]

پیام انسانیت کی تحریک کے ذریعہ مولنا علی میاں صاحبؒ نے ملک کے عظیم ترین دانشوروں سیاسی وسماجی مدبروں کے یہاں ایک اعلی مقام پالیا تھا ان کی مقبولیت اور احترام اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ سیاسی تحریکوں سے الگ تھلگ رہنے اور ملکی معاملات میں مداخلت سے احتراز کرنے کے باوجود وہ تمام سیاسی جماعتوں پر اثر انداز تھے ان کی کہی ہوئی بات حکومت وقت کے یہاں وزن رکھتی تھی وہ بلا شبہ مسلمانوں کے ہی نہیں ہندوستان کے بھی رہنما تھے جو سیاسی بصیرت بھی رکھتے تھے اور سماجی شعور بھی، اسی وجہ سے ان کے انتقال پر پورے ملک نے بلا تفریق مذہب وملت اظہار تعزیت کیا جن میں بی جے پی کے صاحب اقتدار حضرات بھی تھے اور کانگریس کے اپوزیشن رہنما بھی، دائیں اور بائیں بازو والی جماعتوں کے تمام ہی سیاسی سربراہوں نے ان کے انتقال پر افسوس کا اظہار کیا اور نائب صدر جمہوریہ نے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا کہ ''انہوں نے ساری ہندوستانی پیڑھیوں کو سوچ کی نئی سمت دی''[۱۷]

یہ حقیقت ہے کہ مولنا علی میاں مسلم اور غیر مسلم میں یکساں مقبول اور غیر متنازعہ شخصیت کے مالک تھے ان کے مخلصانہ جذبہ اخوت ومحبت نے بلا شبہ تمام فرقوں کے باشعور افراد کے دل فتح کیے تھے وہ اپنے مواعظ وخطبات، مخلوط اجتماعات، نت نئے طرز استدلال، عربی اور انگریزی جیسی بین الاقوامی زبانوں پر عبور اور الفاظ پر قدرت کے باعث بڑے سے بڑے مجمعوں کے دل جیت لیتے تھے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے پیام انسانیت کی تحریک چلا کر فرقہ وارانہ اتحاد میں اہم رول ادا کیا تھا مگر یہ اجتماعات تعلیم یافتہ، غیر مسلم دانشوروں، سرکردہ سماجی ورکروں تک محدود رہنے کے باعث افادیت کے اس درجہ کو نہیں پہنچ سکے جتنے عوامی اجتماعات کی شکل میں کامیابی کے امکانات کیے جا سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ حضرات نے مولنا علی میاں کے خطبات پر سر تو دھنا اسلامی تعلیمات کو بھی سمجھا لیکن اسلام کی دعوت پر لبیک نہیں کہا اس طریقہ سے ان کی حاضری نے اجتماعات کو

---

[۱۶] ایضاً ص ۲۹ [۱۷] تعمیر حیات لکھنؤ خصوصی شمارہ ۱۰ جنوری ۲۰۰۰ء

www.abulhasanalinadwi.org

کو کامیاب کیا لیکن مقصد اجتماع جو بلاشبہ دعوت دین کا ایک جزو تھا اس پر لبیک نہیں کہا اسکے برخلاف اگر یہ تحریک عوامی انداز کی ہوتی تو اس سے اسلام کے تئیں بہت کچھ توقعات وابستہ کی جاسکتی تھیں کیونکہ اللہ تعالی نے مولنا علی میاں کو ''پھول کی پتی'' سے ہیرے کا جگر کاٹنے کا فن دیا تھا ویسے تو کہا جاسکتا ہے کہ اللہ کو یہی منظور تھا لیکن عالم اسباب پر بھی نظر رہنی چاہئے اگر ان مخلوط اجتماعات کا پیغام صرف دانشوروں تک محدود نہ رہ کر عام ہندو سماج تک پہونچتا تو یقیناً اسکے دوررس اثرات مرتب ہوتے اور مسلمانوں کو فرقہ وارانہ ذہنیت کی ان روح فرسا سازشوں کا شکار نہ ہونا پڑتا جسکے نتیجہ میں ملک نصف صدی تک کرب و بے چینی میں مبتلا رہا اور انسان دشمنوں نے انسانیت کو بر سر عام رسوا و بدنام کیا۔ اگر یہ تحریک خالص عوامی تحریک ہوتی تو ہندوستان کی قسمت میں ۶ / دسمبر ۹۲ کا سیاہ دن نہ آتا کیونکہ دانشور اور عوام میں علم و عمل کا فرق ہوتا ہے دانشور سب کچھ سننے کا عادی ہوتا ہے عمل پیرا مشکل سے ہی ہوتا ہے جبکہ عوام کی اکثریت جو کچھ سنتی ہے اگر وہ دل میں اتر جائے تو اس پر عمل کرنا ضروری سمجھتی ہے۔

تاہم مولنا کا یہ کارنامہ ایسا زندہ و جاوید ہے جس نے ہندوستان میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے یہ سب کچھ ان کے اخلاص مومنانہ صفات اور ان کی انسان دوستی کی وجہ سے ممکن ہوسکا اس تحریک سے مولنا کی وسعت نظری، دوراندیشی، عقلمندی اور ہوشمندی کا بھی پتہ چلتا ہے ایسے حالات میں جبکہ نفسا نفسی کا عالم ہو دینی توازن برقرار رکھنے کا جو پیغام حضرت مولنا علی میاں ندوی نے دیا وہ ہم سب کے لئے مشعل راہ ہے۔

مولنا انسانیت کے ''درد آشنا'' تھے اور ''زبان کے زور پہ ہنگامہ آرائی'' کو لاحاصل تصور کرتے تھے اسی لئے انہوں نے عملی پیغام محبت کی داغ بیل پیام انسانیت کی شکل میں ڈالی اس لئے مولنا کے عقیدت مندوں، محبین و مخلصین کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ انسانوں سے محبت کے اس پیغام کو عام سے عام تر کرنے کی مخلصانہ جدوجہد کریں اور اس تحریک میں جو کچھ کمی رہ گئی ہو اسے دور کرنے کی کوشش کریں یہی اس مشن کی کامیابی ہے اور یہی مولنا کے تئیں خراج عقیدت۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اور ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا محمد رابع الحسنی ۔ الندوی
ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ نے اپنی علمی زندگی کا آغاز ۱۹۳۱ـ۳۲ء میں کیا جب کہ ان کی عمر (۱۷ـ۱۸) سال کی تھی اور یہ آغاز ندوہ کی علمی ادبی و تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے ہوا۔ یہ عربی کے نامور ادیب شیخ تقی الدین ہلالی کے ندوہ میں استاد ہونے اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے یہاں کی تعلیمی و علمی سرگرمی کی خصوصی سرپرستی کرنے کا زمانہ تھا۔ مولانا اور ان کے کئی رفقاء نے جو قریب قریب کی عمروں کے تھے مذکورہ بالا دونوں علماء کی رہنمائی اور سرپرستی میں ندوہ کی علمی فضا کو گرم کیا۔ مولاناؒ کے یہ رفقاء ایک مولانا محمد ناظم صاحب ندوی تھے جو بعد میں مہتمم دارالعلوم ہوئے پھر شیخ الجامعہ العباسیہ بہاولپور پاکستان اور پھر استاد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ ہو کر ریٹائر ہوئے، اور کراچی میں مقیم ہوئے دوسرے رفیق مولانا مسعود عالم ندوی تھے جو ندوہ سے ۱۹۳۲ـ۳۳ء میں نکلنے والے مؤقر عربی مجلّے (الضیاء) کے چیف ایڈیٹر ہوئے، بعد میں دار العروبہ الاسلامیہ کے صدر ہوئے، اور ۱۹۵۴ء میں کم عمری یعنی تقریبا ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا تیسرے مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی تھے جو بعد میں جماعت اسلامی ہند کے امیر ہوئے، اور مفید دعوتی و تحریکی کاموں کی سرپرستی کرتے

www.abulhasanalinadwi.org

ہوئے گذشتہ قریبی برسوں میں انتقال کیااور مولانا عمران خاں ندویؒ جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم ہوئے اور اس منصب پر تقریباً ۱۹۶۰ء تک خدمات انجام دے کر بھوپال منتقل ہوئے اور وہاں تاج المساجد اور اس کے دارالعلوم کی ترقی وتکمیل کی خدمات انجام دی، اور چند سال پہلے انتقال کیااور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی جو دارالعلوم میں استاذ ہوئے بعد میں جامعہ اسلامیہ میں صدر شعبۂ دینیات رہے، اورعلمی دینی خدمات انجام دے کراور ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم رہنے کے بعد انتقال کیا۔

مولاناابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے علمی وعملی زندگی تین پہلوؤں میں اختیار کی ایک علمی (۲) دوسرے ادبی (۳) تیسرے دعوتی، اور یہ تینوں پہلوان کی زندگی میں برابر نمایاں اور قائم رہے، اور ان میں ترقی تواتر پذیری بڑھنے نے تعارف کو وسیع کیااور مقبولیت بڑھی، علمی وفکری پہلو میں مولانا کی مؤقر اور اثر انگیز تصنیفات منظر عام پر آئیں، جن کی شہرت عام طور پر صرف برصغیر ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں ہوئی، ان میں سے کئی تصنیفات نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں، اور ان میں سے بعض کو پوری صدی کی صرف تین چار اہم ترین کتب میں شمار کیا گیاادبی پہلو کے لحاظ سے مولانا نے ادب کو زندگی کے لئے مفیداور انسانی واسلامی فائدے کے حصول میں ایک معاون کے طور پر پیش کیا،اور اس کی اس حیثیت کو عالم اسلامی سے منوایا، جس کے اثر سے رابطہ ادب اسلامی عالمی انجمن وجود میں آئی جس کے تاحیات صدر قرار پائے،اس وقت اس کی ذیلی شاخیں دنیا کے آٹھ ملکوں میں اور صدر دفتر ابھی خود مولانا کے مستقر ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہے اس سلسلہ میں معاملہ صرف نظری اور تحریکی ہی نہیں رہا،بلکہ خود مولانا کے قلم نے ایسے ادب کے ممتاز نمونے پیش کئے جو ان کے ادبی نقطہ نظر کے عملی نمونے ہیں۔

دعوتی لحاظ سے مولاناؒ کا ربط وتعلق اغاز عمری ہی میں اپنے عہد کی دعوتی کوششوں سے قائم ہو گیا تھا، اور اس کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ مولانا نے اس ملک کی عظیم تحریک اصلاح وجہاد کے رہنما حضرت سید احمد شہیدؒ کی سوانح تیار کرنے کے دوران ان

www.abulhasanalinadwi.org

کے کام و پیغام کو سمجھا اور متأثر ہوئے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دعوتی کام کے تقاضہ ہونے پر تحریک جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودیؒ سے ارتباط ہوا پھر خصوصی ربط جماعت تبلیغ کے بانی مولانا الیاسؒ صاحب کاندھلویؒ سے ہوا، اس ربط سے مولانا نے اپنی مخصوص دعوتی راہ بنائی جو بڑی حد تک جماعت تبلیغ کے اصولوں کے مطابق تھی، لیکن اس میں فکری و نظریاتی طریقہ دعوت کی بھی آمیزش تھی مولاناؒ کا دعوتی طریقہ کار اصلاح باطن و تزکیہ نفس کے طریقہ سے بھی ہم آہنگ تھا۔ جو عہد کے عامل بالسنہ بزرگوں سے ربط اور تزکیہ باطن کے اصحاب سے تعلق و استفادہ کے اثر سے پیدا ہوا تھا، مولانا کے اس پہلو نے ان میں زہد فی الدنیا، استغناء و قناعت اور تصور آخرت کے غلبہ جیسی صفات پیدا کیں، جن کے اثر سے مولانا کے تعلق والوں میں مولانا سے محبت و عقیدت میں اضافہ ہوا، اور کام میں اثر پذیری بڑھی اور اس طرح ان کے کاموں اور کوششوں کو قبولیت حاصل ہوئی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ۳۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد تفسیر وادب کی حیثیت سے تقرر ملا اور وہ با تنخواہ تھا، یہ سلسلہ تقریباً دس سال جاری رہا، لیکن دعوتی مقصد سے مولانا کو بہت اسفار کرنے ہوتے تھے۔ جس کی وجہ سے مولاناؒ کو اپنا مفوضہ کام مع معاوضہ کرنے میں رکاوٹ محسوس ہوتی تھی چنانچہ انہوں نے ۴۴ء میں معاوضہ سے معذرت کر دی، اور ندوہ کے کاموں سے ان کا تعلق رضاکارانہ ہو گیا، ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کو مولاناؒ کی کارکردگی اور افادیت کی قدر تھی، چنانچہ ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اپنا نائب مقرر کر دیا جو ان کے پاکستان منتقل ہونے اور رحلت فرمانے کے بعد مستقل معتمد تعلیم کے منصب میں تبدیل کر دیا گیا، اور اس طرح ندوۃ العلماء کے کاموں اور ترقیات کی فکر کا بوجھ مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر بڑھ گیا۔ دوسری طرف مولاناؒ کے دعوتی کام کا اثر بھی بڑھتا چلا گیا، اور صرف برصغیر ہی میں نہیں بلکہ عرب ممالک میں بھی ان کا تعارف بڑھا، جو ۵۰ء میں ان کی معرکۃ الآرا کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کی غیر

معمولی مقبولیت کے نتیجہ میں وسیع تر ہوگیا، اور ندوۃ العلماء ان کا مرکز عمل ہونے کی وجہ سے ندوۃ العلما کے بھی وسیع تعارف کا ذریعہ بنا، اور لوگوں کو یہ احساس عام ہونے لگا کہ ندوۃ العلماء نے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی جیسا دین کا جامع اور اثر انگیز فکر والا اور پر اثر صاحب قلم پیدا کیا ہے تو وہ یقیناً ایک عظیم ادارہ ہے، عالم اسلام کے دانشور اور با اثر طبقات میں یہ ذہن بننے پر ان کی ندوۃ العلماء میں آمد بڑھی، ادھر خود مولانا رحمۃ اللہ علیہ ندوہ کے معیار اور کارکردگی کو بڑھانا چاہتے تھے، اس بناء پر انہوں نے اپنے عرب تعلقات کو ندوہ کی ترقی کے لئے استعمال کیا، وہاں کے بلند پایہ فضلاء اور اہل علم سے وقتاً فوقتاً خطبات دلوائے سیمنار اور کانفرنسیں منعقد کیں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ندوۃ العلماء کو ترقی دینے اور اس کو ظاہر و باطن دونوں حیثیتوں سے بہتر بنانے کا موقع ملا، مولانا ۶۱ء میں ندوۃ العلماء کے ناظم بھی منتخب ہوئے، اس وقت ندوہ ایک کم طلباء کا اور کم شہرت کا ادارہ تھا، مولاناؒ کی کوششوں اور ان کی باہر کی شہرت سے اس کو ترقی ملنا شروع ہوئی، اس سلسلہ میں مولاناؒ کو اپنے خاص رفقاء سے اچھا تعاون ملا، خاص طور بر ان کے رفیق خاص مولانا محمد عمران خاں ندویؒ جو مہتمم دارالعلوم تھے، پھر ان کے معاون خاص مولانا قاضی محمد معین اللہ صاحب سے ان کو خاص طور پر مدد ملی، مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ بعد میں نائب ناظم مقرر ہوئے، اور نہوں نے نہایت تندہی کے ساتھ مولانا کے عزائم کو بر سر عمل لانے کے لئے کوششیں کیں اور آخر تک مولانا کے دست راست بنے رہے، ان کو اللہ تعالیٰ نے انتظامی اور تعمیری منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی غیر معمولی صلاحیتوں عطا کی تھی، اور وہ مولاناؒ کے ساتھ پوری طرح ہم رائے اور ہم آہنگ رہے، اس سے حضرت سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر ندوۃ العلماء کو علمی و تعلیمی ودعوتی پہلوؤں سے جو ترقی تھی وہ خاصی حد تک حاصل ہوئی۔

مولانا کے ناظم منتخب ہونے کے وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دارالاقامہ کی صرف ایک عمارت تھی جو ایک منزلہ تھی، بتدریج وہ دومنزلہ ہوگئی اور اس کے پہلو

www.abulhasanalinadwi.org

میں مزید پانچ کئی منزلہ دارالاقامہ تعمیر ہوئے، طلباء کی تعداد آغاز میں صرف ڈیڑھ دوسو تھی جو ۲۰۰۰ء کے آغاز تک دوہزار احاطہ کے اندر اور ڈھائی ہزار شہر میں قائم کردہ مکاتیب میں یعنی مجموعی طور پر ۳ر۴ ہزار صرف لکھنؤ کے اندر ہوگئی، لکھنؤ کے باہر دارالعلوم کی چھوٹی،بڑی شاخیں قائم ہوئیں جن میں بتدریج اضافہ ہوا یہ اس وقت ڈیڑھ سو مدرسوں تک پہونچ چکی ہیں،اور ہندوستان کے باہر کے کئی ممالک میں بھی شاخیں قائم ہوگئی ہیں، ان تمام مدرسوں کے طلباء کی تعداد سب شمار کی جائے تو پندرہ ہزار سے زیادہ ہو جائیگی۔

نظام تعلیم کے لحاظ سے مولاناؒ کے دور کے آغاز میں دارالعلوم ندوۃ العلماء مکتب کے چار درجات اور عربی کے ۹ درجات پر مشتمل تھا،اور ہر درجہ ایک ایک سیکشن میں تھا، لیکن مولاناؒ کے عہد میں بتدریج ترقی عمل میں آئی کہ مکتب ۶ سال کا، پھر متوسطہ ۲دو سال کا پھر ثانویہ تین سال کا پھر عالیہ چار سال کا اور فضیلت دوسال کا کل ۱۷سال کا نصاب کر دیا گیا،اور عالیہ اور فضیلت کو دو بڑے شعبوں میں تقسیم کیا گیا(۱) ایک علوم دینیہ (۲) دوسرے ادب وزبان کا شعبہ ،اور ہر شعبہ میں چھوٹے مزید شعبے قائم کر دئے گئے، مثلاً علوم دینیہ میں، تفسیر حدیث، فقہ اور ادب کے شعبہ میں" ادب جدید ادب قدیم" نقد وبلاغت کے شعبے بنا دیئے گئے، عالمیت کے بعد طلباء کو ذیلی شعبوں کے اندر اختیار دیا جاتا ہے کہ جس سے مناسبت زیادہ سمجھیں اس کو اختیار کریں۔

المعهد العالی للقضاء والافتاء علوم دینیہ کے شعبہ کے طلباء کے لئے،اور المعهد العالی للدعوۃ والفکر الإسلامی دونوں شعبوں کے طلباء کے لئے ایک ایک سال کا رکھا گیا ہے تاکہ اس میں مہارت اور کام کرنیکی صلاحیت کی مشق کرائی جاسکے، عالمیت کے درجات میں طلباء کی تعداد بہت بڑھ جانے کی وجہ سے درجہ میں متعدد سکشن قائم کر دئے گئے۔

شروع میں ندوۃ العلماء میں عربی واردو میں کوئی پرچہ نہیں نکلتا تھا جب کہ اس

وقت سے پندرہ سال قبل عربی رسالہ (الضیاء) تھا اور اردو رسالہ (الندوۃ) تھا لیکن وہ دو دو تین سال چل کر بند ہو گئے تھے، لیکن مولاناؒ کی دلچسپی لینے سے عربی میں دو پرچے ایک ماہنامہ (البعث الاسلامی) دوسرے پندرہ روزہ (الرائد) ۶۰ء سے قبل نکلنا شروع ہوئے، اور آج چالیس سال سے زیاد گذرنے پر بھی برابر جاری ہیں، اور عالم عربی میں مقبول ہیں اور ان کی اشاعت معتدبہ تعداد میں ہے، اردو میں پندرہ روزہ (تعمیر حیات) نکالا گیا جو برصغیر میں اپنی مخصوص جگہ رکھتا ہے، اب ایک سال سے انگریزی سہ ماہی بھی نکلنا شروع ہو گیا ہے جو خاصا پسند کیا جارہا ہے۔

مولاناؒ کی ذمہ داری کے عہد میں ندوۃ العلماء میں تین بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں شیخ الأزہر اور عالم عرب کے بعض وزراء اور یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر کی سطح کے لوگ اور دیگر اہل علم شریک ہوئے۔ ان میں سے ایک کانفرنس دینی تعلیم کے موضوع پر اور دو ادب اسلامی کے موضوع پر منعقد ہوئیں، اور دور دور تک اہل علم ودین کی طرف سے خراج تحسین کے لائق قرار پائیں، ندوہ کے رابطہ ادب اسلامی کے مرکز سے ایک سہ ماہی علمی وادبی اردو رسالہ کاروان ادب کے نام سے نکلتا ہے، ندوہ کا کتب خانہ اس کی درسگاہ کے ہال میں تھا، مولانا کی ذمہ داری کے زمانہ میں اس کے لئے ایک علیحدہ پانچ منزلہ پرشکوہ عمارت تعمیر ہوئی، اس کے علاوہ دفتر کے لئے بھی علیحدہ عمارت تعمیر کی گئی، اساتذہ کی سہولت کے لئے رہائشی کوارٹر خاصی تعداد میں تعمیر کئے گئے، اور طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھکر بعض شعبے شہر کے مضافات میں جگہ حاصل کر کے منتقل کئے جارہے ہیں، احاطہ ندوۃ العلماء اب اپنی متعدد المقاصد شعبوں اور ضرورتوں کے لئے قائم کردہ عمارتوں کے ساتھ ایک یونیورسٹی کا علاقہ معلوم ہوتا ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ دعوت وفکر اسلامی کے تحت برابر تحقیق وتصنیف کا کام خود بھی کرتے رہے، اور دوسروں سے کراتے رہے، اس کے لئے مستقل ایک ادارہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام قائم کیا جس کی اشاعت کردہ کتابیں تاحال دو سو سے اوپر

www.abulhasanalinadwi.org

ہو چکی ہیں، مجلس کا کام تین بڑی زبانوں عربی، اردو، انگریزی میں پھیلا ہوا ہے۔

ان سب باتوں کی وجہ سے ندوۃ العلماء پورے عالم اسلام بلکہ پوری دنیا کے دانشور طبقہ میں جانا پہچانا ادارہ بن چکا ہے جو اپنے تعلیمی مدارج کے اعتبار سے یونیورسٹی کے معیار تعمیر کے مطابق ہے اور نصاب کے اعتبار سے کسی بھی بڑی دینی درسگاہ کی خصوصیات کا حامل ہے، اور مضامین نصاب کے اعتبار سے قدیم وجدید کے صالح اور ضروری مضامین کو جمع کئے ہوئے ہے، اور اس کے کام اور نام کو اب بہت وقیع سمجھا جانے لگا ہے۔

ندوۃ العلماء کے قائم کرنے والوں نے جن مقاصد کو اپنا مطمح نظر بنایا تھا، اور ندوۃ العلماء کو اس کے لئے معیاری درسگاہ بنانے کی جو کوشش کی تھی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اچھی طرح سمجھا اور اپنایا، ان کے ذہن میں درسگاہ کا تصور تربیت گاہ کا تھا، جس میں متعین مقصد کے مطابق نئی نسل کو ڈھالنا ہوتا ہے، اس اصول کی بنیاد پر نصاب اور نظام تعلیم دونوں کو دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ مطلوبہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے یا نہیں، اور اس سے مطلوبہ انسانوں کی تشکیل کی جاسکتی ہے یا نہیں اس سلسلہ میں مسلمانوں کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ خدا کی طرف سے اس پر کیا ذمہ داری ڈالی گئی ہے، اور اس کی ملی زندگی کے کیا تقاضے ہیں، اور ان دونوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس کو کن صلاحیتوں اور کس کردار کا حامل بننا ہے، مولانا کے نزدیک ہمارے تعلیم یافتہ شخص کو اپنے عہد کو سامنے رکھتے ہوئے مرد مؤمن کا مقام حاصل کرنا ہے جو ملت کی ضرورت پوری کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو، اور نصاب کے سلسلہ میں ان کا تصور الجمع بین القدیم الصالح والجدید النافع تھا، یعنی قدیم کی اچھی باتوں اور جدید کی مفید باتوں کو جمع کرنا، چنانچہ ندوہ کے نصاب میں حدیث و قرآن کی تعلیمات اور متقدر اسلاف کے اچھے علمی وادبی ورثہ کے ساتھ تجرباتی علوم و آداب کا وہ حصہ جو ہماری زندگی کے لئے ضروری اور مفید ہے شامل کرنا نصاب کا اصول طے کیا، چنانچہ ندوۃ العلماء کے نصاب میں حتی الوسع اس کی رعایت رکھی گئی اور وقتاً فوقتاً اس کا جائزہ لیا جاتا رہتا ہے، مولانا

www.abulhasanalinadwi.org

رحمۃ اللہ علیہ اس کو صرف ندوۃ العلماء کے لئے ہی ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ تمام مسلم درسگاہوں کو اسی اصول پر چلانے کا مشورہ دیتے تھے، ندو میں وہ وقتاً فوقتاً اپنی تقریروں اور ہدایات میں اور ندوہ سے باہر جہاں اس کا موقع ہوتا اس کی طرف توجہ دلاتے تھے، مولانا کے نزدیک نصاب کی کتابوں اور مضامین میں یہ خصوصیت ہونی چاہئے کہ وہ مقصد تعلیم کو پورا کرتے ہوں، اس کے لئے انھوں نے مختلف مضامین کے لئے مقصد کے لحاظ سے نصاب اور کتابوں کی تیاری پر زور دیا کہ بلکہ خود اس میں عملی حصہ لیا، چنانچہ عربی زبان وادب میں مصر کی تیار کردہ کتابوں کی جگہ ان کی متبادل کتابیں خود اپنے قلم سے تیار کیں اور اپنے کئی شاگردوں سے بھی یہ کام کرایا چنانچہ ندوہ زبان وادب میں اور بعض دیگر موضوعات میں خود کفیل ہو گیا، بلکہ اس کے پاس دوسروں کی ضرورت بھی پوری کرنے کا سرمایہ علمی ہو گیا جو آج اندرون ملک وبیرون ملک کی بہت سی دینی وسرکاری درس گاہوں میں شامل نصاب ہے مولانا نے تعلیم کو نظری حد تک محدود رکھنے کو غیر مفید سمجھتے ہوئے عملی تدبیروں سے وابستہ کرنے پر زور دیا چنانچہ عملی مشق اور تربیتی پروگراموں کو نظام تعلیم میں شامل کیا،

انہی مذکورہ امور میں ندوہ میں مولانا کے تخیل کے مطابق اس کے وسائل کے دائرے میں کوشش برابر کی جاتی رہی اور خاصا کام انجام پایا اور اس کو ساری دنیا میں قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن وسائل کی بعض دشواریوں کی بنا پر ابھی اس معیار تک نہیں پہونچا جا سکا جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر رہا ہے لیکن مولانا نے جو راہ بتائی ہے اسے ان کے شاگرد اور منتسبین جاری رکھنے اور ترقی دینے کا اپنے کو پابند سمجھتے ہیں۔

مولانا علی میاںؒ اور دار العلوم دیوبند

مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی
مفتی دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا علی میاںؒ سے میری پہلی ملاقات دار العلوم ندوہ میں اس وقت ہوئی، جب میں عربی ادب کے شوق میں ستمبر ۱۹۴۵ء میں حاضر ہوا تھا اور اس کے آخری درجہ نہم میں داخلہ لیا تھا، مولانا سے عربی ادب کی کتابوں کے سلسلہ میں مشورہ کیا کرتا تھا، شوال سے ذی الحجہ تک باضابطہ دار العلوم ندوہ کا طالب علم رہا، پھر وہاں سے نکل کر نگرام ضلع لکھنؤ کے مدرسہ معدن العلوم میں صدر مدرس بن گیا، وہاں رہ کر درس وتدریس کے ساتھ ایک کتاب نظام مساجد کے نام سے لکھی، میں چاہتا تھا کوئی پرانا عالم اسے بالاستیعاب بغرض اصلاح نظر ڈال لے مگر کوئی تیار نہیں ہوا تو میں نے حضرت مولانا علی میاںؒ کے نام ایک لمبا خط لکھا اور مولانا سے لوگوں کی شکایت لکھی۔ مولانا نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

"آپ کی شکایتیں بجا ہیں، میں بھی جب آپ کی عمر میں تھا مجھے بھی اپنے بڑوں سے یہی شکایت تھی مگر اب میرا مشورہ ہے آپ لکھتے رہیں انشاء اللہ آپ کامیابی حاصل کریں گے۔ باقی نظام مساجد کا مسودہ جب کبھی ادھر آنا ہو، لیتے آئیں، انشاء اللہ بالاستیعاب پڑھوں گا اور آپ کی منشاء کے مطابق اس کی اصلاح بھی کرونگا، میں کچھ دنوں بعد لکھنؤ گیا مسودہ ساتھ لیتا گیا، مولانا کے حوالہ کیا اور وطن چلا گیا، دو تین ہفتوں کے بعد واپسی ہوئی تو پھر حاضر ہوا اس دفعہ حضر مولانا بڑی محبت سے ملے اور بڑی حوصلہ

www.abulhasanalinadwi.org

افزا نصیحتیں کیں، اور فرمایا آپ کی کتاب بڑی عالمانہ محققانہ ہے کافی محنت کی ہے۔ قرآن وحدیث کا ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی حوالہ چھوٹنے نہیں پایا ہے، کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ زبان صاف و سلیس اور شگفتہ ہے، آپ کے مخالفین بھی اسے شوق سے اور اول تا آخر پڑھیں گے، تسلب و تشقف سے خالی ہے، پھر مسودہ لا کر واپس فرمایا دیکھیے میں نے پورا مسودہ پڑھا ہے اور کہیں کہیں ردوبدل بھی کیا ہے آپ اسی نہج پر قائم رہیں آجکل زبان کی درشتی کو پسند نہیں کیا جاتا ہے۔ اور نہ مخالف مذہب پر تیر و نشتر برسانے کو،

حضرت مولانا کی یہ باتیں دل دماغ میں اس طرح پیوست ہوئیں کہ کبھی نکلنے کا نام نہیں لیا، اور درس و تدریس کے ساتھ برابر تالیف و تصنیف کا کام کرتا رہا، خاکسار کی چھوٹی بڑی تین تیس کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ کچھ غیر مطبوعہ ہیں یہ مولانا کی حوصلہ افزائیوں کا صدقہ ہے اور حضرات اساتذہ کی دعاؤں کا ثمرہ ہے میں جب دارالعلوم دیوبند آیا تب بھی مولانا میری رہنمائی اور ہمت افزائی فرماتے رہے

مولانا علی میاںؒ ندوہ کی میعاد تعلیم پوری کرنے کے بعد اپنے بڑے بھائی اور مربی ڈاکٹر عبد العلی صاحب کی ہدایت پر جو خود فاضل دیوبند تھے۔ حدیث و قرآن کی مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند آئے، اور مولانا حسین احمد مدنیؒ سے خصوصی طور پر استفادہ کیا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے جہاں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم پائی وہیں وہ دارالعلوم دیوبند سے بھی استفادہ میں پیچھے نہیں رہے، سال بھر رہ کر پابندی سے سماعت فرمائی اور اس کے فیوض و برکات سے متمتع ہوئے، مولانا کو دارالعلوم دیوبند اور ان کے بزرگوں سے گہری عقیدت تھی، ان کا نام بڑی عقیدت و محبت سے لیا کرتے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ ملک کے تمام بزرگان دین سے عقیدت سے ملتے تھے، ان سے دعائیں کراتے تھے اور ان کی خدمت میں کچھ دن گذارتے اور ان بزرگان دین کو بھی آپ سے محبت تھی، اور آپ کا احترام کرتے تھے کہ مولانا سید احمد شہیدؒ سے خاندانی نسبت رکھتے تھے،

مولانا کا تعارف مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے برجستہ اور بہت عمدہ پیرایہ

میں کرایا ہے لکھتے ہیں " مولانا علی میاںؒ سن میں مجھ سے کہیں چھوٹے ہیں لیکن علم وفضل میں سنجیدگی فکر، اخلاص میں، اخلاق وتقویٰ میں، عبادت میں، ریاضت میں اور خشیت وطاعت میں میرے بڑوں میں شامل ہونے لائق، رائے بریلی کے سید زادے، خاندان کے اور لوگوں سے بھی واقف ہوں، ان تاروں کے جھرمٹ میں آفتاب ندوہ اور دیوبند ماشاء اللہ دونوں کے اکابر سے علم دین حاصل کیا، اپنے خاندان کے بزرگوں سے اخلاق وروحانیت کا سبق لیا، ذکاوت وفطانت کے پتلے سے ہیں چندے آفتاب چندے ماہتاب بن کر رہے، مختصر یہ کہ سیاسیات ملی اور کلام، تاریخ امت اور سوانح اکابر اسرار شریعت پر تو خاص کام کر چکے ہیں" (معاصرین)

پچاس کے دہے میں مولانا علی میاںؒ دارالعلوم دیوبند کے طلباء کو علوم نبوت کے تقاضوں کا پیغام لیکر آئے، ایک بلیغ خطاب کیا جو انکی کتاب پاجاسراغ زندگی میں شامل ہے۔ دارلعلوم دیوبند سے مولانا نے صرف علمی فیض ہی نہیں اٹھایا تھا بلکہ اس کے بزرگوں سے والہانہ عقیدت اور اس کے مسلک سے گہری وابستگی بھی تھی دارلعلوم دیوبند کے نام پر صد سالہ جشن کے موقع پر آپ نے اس مسلک کی پوری ترجمانی کی اور اپنی اس وابستگی کا اظہار کیا۔

دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں آپ نے جو تاریخی تقریر فرمائی وہ اپنی مثال آپ ہے، حضرت مولانا نے کاروانِ زندگی میں لکھا ہے۔

"میں ۲۲ر مارچ ۸۰ء جلسہ گاہ میں پہنچا تو انسانوں کا ایک جنگل نظر آتا تھا اور میدان عرفات کا ایک ہلکا سا نقشہ، ہمارے دوست ڈاکٹر عبداللہ زائد وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے، متعدد عرب فضلاء اور معززین ڈائس پر موجود تھے، جن میں ہمارے دوست ڈاکٹر شیخ عبدالمنعم النمر وزیر اوقاف مصر، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، معالی الشیخ یوسف الحجی، وزیر اوقاف کویت محبی عبداللہ العقیل وغیرہ موجود تھے اس وقت میرے عربی میں تقریر کرنے کا پروگرام تھا مگر مجھے اس عظیم الشان مجمع کے سامنے عربی زبان میں تقریر کرنا ایک مصنوعی ونمائشی عمل نظر آیا

www.abulhasanalinadwi.org

جس کیلئے میرا ضمیر تیار نہیں ہوا"

(کاروان زندگی ص ۳۰۶)

چنانچہ مولانا نے اردو میں تقریر شروع کی، تاکہ سارا مجمع سمجھے مولانا نے اپنی تقریر کا جو حصہ نقل کیا ہے اس کا کچھ حصہ نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا۔

"ہم صاف اعلان کرتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی اعلان کریں کہ ہم ایسے جانوروں کی زندگی گزرانے پر ہرگز راضی نہیں، جن کو صرف زندگی اور تحفظ چاہیئے کہ ان کو کوئی مارے نہیں ہم ہزار بار ایسی زندگی گذرانے کے اور ایسی حیثیت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں ہم اس سرزمین پر اپنی اذانوں اور نمازوں کے ساتھ رہیں گے بلکہ ہم تراویح اور اشراق و تہجد تک چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، ہم ایک ایک سنت کو سینہ سے لگا کر رہیں گے ہم رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو سامنے رکھ کر کسی ایک نقش بلکہ کسی نقطہ سے بھی دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں، مسئلہ علوم ایمانی کے باقی رکھنے کا ہے اور اسلامی تشخص کے تحفظ کا ہے، آپ دوسروں کے پیچھے چلنے کے لئے ہرگز نہیں پیدا کئے گئے اور نہ خدا نے آپ کو اس ملک میں اس لئے بھیجا ہے، ہم تو دنیا کی قیادت و امامت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں"

آگے چل کر فرمایا" میرے عزیزو اور دوستو! میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کی روح کا یہی پیغام ہے، حضرت شیخ الہندؒ اسی فکر میں پگھلتے اور گھلتے رہے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور مولانا مدنیؒ اسی کے لئے ہمیشہ سوزاں اور لرزاں رہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنی خصوصیات اور ملی تشخصات کے ساتھ اس ملک میں باقی رہیں، قرآن و سنت کو سینے سے لگائے رکھیں" (کاروان زندگی)

مختصر یہ کہ حضرت مولانا نے مسلمانوں کو دیوبند کا حیات بخش پیغام پہونچایا اور ان کو جھنجوڑ کر جگایا اور ان کو ان کا منصب و مقام یاد دلایا مولانا کی بڑی مؤثر تقریر ہوئی اور اس سے لوگوں میں زندگی کی لہر دوڑی، دراصل مولانا کا یہی مشن تھا، عرب ممالک میں بھی یہی صدا لگاتے رہے۔ مولانا عبد اللہ عباس نے لکھا ہے کہ مولانا نے عرب کو

خطاب کر کے فرمایا،

"بزرگو! اسلام جس کو سیدنا محمد ﷺ لائے ہیں یہی آپ کی زندگی کا سر چشمہ ہے، یہی آپ کی قوت ہے اور اسی سے آپ کی رگوں میں خون کی گردش ہے، اسی اسلام سے آپ کی زندگی کی صبح صادق نمودار ہوئی، آپ دنیا میں روشناس ہوئے نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی سے آپ کی سرفرازی ہے، اسی نام نامی کے صدقہ میں آپ کی نبض حیات میں گرمی ہے اور قلب میں حرارت قائم ہے اور صرف آپ کی نہیں بلکہ سارے عالم میں اگر خیر کا کوئی ذرہ ہے تو اسی ذات گرامی کا عطیہ ہے" (میر کارواں ص ۲۰۲)

ارباب دار العلوم دیوبند نے دار العلوم قائم کر کے یہاں کے مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت کا قلعہ بنایا تھا۔ کتاب وسنت کی اشاعت کا مینار قائم کیا تھا اور دنیا کو پیام دیا کہ دین محمدی صلی اللہ ﷺ کو پھیلائیں، انسانوں کو غیر اللہ کی پرستش سے بچائیں اور جس کیلئے وہ پیدا کئے گئے ہیں اس کو انجام دیں، چنانچہ اس کے اسلاف واکابر نے یہ فریضہ پوری دنیا میں ادا کیا، اور اپنے فضلاء کو مغرب ومشرق میں پھیلا دیا اور وہ ایک آبادی میں پہنچے اور دین حق کا پیغام پہنچایا اور اور پہنچا رہے ہیں اور انشاء اللہ برابر پہنچاتے رہیں گے۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ صاحب کون تھے؟ دار لعلوم دیوبند کے ایک فرزند تھے، ان کی جماعت تبلیغی دنیا کا کوئی خطہ اور گوشہ نہیں ہے۔ جہاں وہ نہ پہنچے ہوں اور وہاں کے باشندوں کو اسلام کی طرف دعوت نہ دی ہو، حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ نے پوری دنیا کا سفر کیا اور دار لعلوم دیوبند کا پیغام پہنچایا، کہ اصل کتاب وسنت ہے، جب تک اللہ تعالی کی کتاب قرآن مقدس اور رسول اللہ ﷺ کی سنت احادیث شریفہ کا مطالعہ نہیں کیا جائے گا انسانوں میں انسانیت رچ بس نہیں سکتی،

حضرت مولانا علی میاںؒ جہاں ندوہ کے فرزند تھے دار لعلوم دیوبند کے بھی فرزندوں میں داخل تھے، حضرت سید احمد شہیدؒ کا سلسلہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے ملتا ہے اور دار لعلوم دیوبند کا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے، یہ سارے علماء دراصل ایک ہی چشمۂ صافی سے مستفید ہونے والے ہیں اور سبھوں کا مطمح نظر اسلام کی

آواز کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچاتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ محمد رسول ﷺ پر نبوت کا دروزاہ بند ہوگیا اب آپ کے بعد ساری ذمہ داری امت محمدیہ ﷺ پر آگئی ہے اور بالخصوص اس امت کے علماء و مشائخ پر ذمہ دار اعلی یہی ہیں کہ دین قیم کی اشاعت میں کمر کس کر ہمہ وقت تیار رہیں اور میدان عمل میں پوری تیاری کے ساتھ کود پڑیں اور جن سے جس قدر ہو سکے کام کریں خواہ اس راستہ میں مصائب و آلام کیسے ہی آئیں برداشت کرلیں اور اور جس منصب و مقام پر کھڑے ہیں اس کے فرائض انجام دیں۔ جس طرح خلیفۂ راشد حضرت ابو بکر صدیقؓ وفات نبوی ﷺ کے بعد میدان میں اتر آئے تھے اور فرمایا تھا" أ ینقص الدین وانا حی" کیا میری زندگی میں دین اسلام میں کمی آئیگی ایسا نہیں ہو سکتا ہے اگر کوئی ذکوۃ کی ایک رسی بھی دینے سے انکار کرے گا میں اس سے جہاد کروں گا اور ایسا ہی کر کے دکھایا اور اسی سے متاثر ہو کر امام احمد حنبلؒ نے فرمایا تھا" قام ابو بکر یوم الردۃ مقام الانبیاء"

حضرت مولانا علی میاںؒ نے اسی نقطہ کو پالیا تھا اور اسی وجہ سے ہر آن بے چین رہتے تھے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا یادین مبین کیونکر خاموش وروپوش رہیگا۔ اور امت محمدؐ اس نام پر جان نہیں دے گی، اس امت کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ ملک و نسب کے تعصب میں اپنے آپ کو گرفتار کرے، اور اس میں مبتلاء ہو کر اپنی اسلامیت کو داغ لگائے بلکہ وہ علامہ اقبالؒ کی زبان میں بلند آواز سے کہے ؎

چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

قرآن کی زبان میں بچہ بچہ کی زبان پر ہو" إنما المومنون اخوۃ "سارے جہاں کے مسلمان بھائی بھائی ہیں اگر ایک مسلمان کے تلوئے میں کانٹا چبھے تو سارے مسلمان محسوس کریں کہ ان کے دل کو تکلیف پہنچی، مشرق سے لیکر مغرب تک اور شمال سے لیکر جنوب تک سارے مسلمان اسلام کے پیرو ہیں، اسلام کے جھنڈے کو بلند کرنا ان کا فریضہ ہے، کتاب و سنت سے ان کو عشق محمد رسول ﷺ کے دین قیم کے ایک ایک حکم

www.abulhasanalinadwi.org

پر جان دینا ان کا دینی و اخلاقی فرض ہے۔

مولانا علی میاںؒ اس امت مرحومہ کے ایک فرد تھے، اور جو کچھ ان کو اسلاف واکابر سے ملا تھا اسکو دنیا کے گوشہ گوشے میں پہونچانا اپنا دینی فریضہ جانتے تھے، اور الحمد للہ انہوں نے اپنے اس اہم فرض کو ادا کرنیکی سعی کی، رب العالمین ان کی خدمات کو قبول فرماتے،

حضرت مولاناؒ نے دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں ہندوستان کے متعلق فرمایا تھا "آج ملک خودکشی کے لئے قسم کھا چکا ہے وہ آگ کے خندق میں گرنے کے لئے تیار ہے، وہ بد اخلاقی اور انسانیت کشی کے دلدل میں ڈوب رہا ہے "اس کے بعد علماء دیوبند اور دیندار مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"آپ ہی ہیں جو ہندوستان کیا پورے ایشیاء میں کسی ملک کو بچا سکتے ہیں، آپ اللہ و رسولؐ کی بات کہیے آپ کو کوئی ضرورت نہیں کہ آپ نیلام کی منڈی میں اتر آئیں، اور اپنا سودا کرنے لگیں کہ بولی بولی جائے۔ آپ متاع نایاب ہیں، اللہ کے سوا آپ کی خریداری کا کوئی حوصلہ نہیں کر سکتا، اس لئے میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں کہ اس ملک کو تنہا آپ بچا سکتے ہیں اس لئے کہ آپ کے پاس عقیدۂ توحید اور انسانی مساوات کا اصول ہے، آپ کے پاس اجتماعی مول کا مکمل نظام موجود ہے جو ہر چیز سے بالاتر ہے آپ ہی ہیں جن کے پاس ایمان بالآخرۃ ہے اور جو العاقبۃ للمتقین پر یقین رکھتے ہیں، آپ ان لوگوں میں نہیں ہیں جن کی نظر طاقت اور قوت پر رہا کرتی ہے اور جن کی نگاہ میں مال و متاع اور اکثریت ہی سب کچھ ہے اور نہ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہے جو انتخاب میں کامیابی اور پارلیمنٹ پہونچ جانے ہی کو سب سے بڑی معراج سمجھتے ہیں۔"

مولانا علی میاں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

پروفیسر نفیس احمد
شعبہ بصریات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

حضرت مولانا ابو الحسن علی ندویؒ کا خصوصی وصف ان کی فکر کی ہمہ گیری اور وسعت، جرأت ایمانی اور بے نفسی ہے جس نے بہت سے تاریخی حقائق، تحریکوں اور شخصیتوں کا تجزیہ منصفانہ طور پر کرنے، درجنوں کتابوں کی تصنیف اور تحریکوں اور اداروں کے قیام کے لئے ان کو آمادہ کیا اور موجودہ دور کے پس منظر میں اللہ نے ایک تاریخ ساز عالمی کام ان سے لے لیا، ہمارے اس دور میں علماء کی عام روش درس وتدریس، تصنیف و تالیف اور اصلاح و سلوک تک ہی محدود رہی ہے۔ وہ قومی و ملی نیز حالات حاضرہ کے مسائل کی طرف توجہ بہت کم دے سکے ہیں۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب اس عام روش کے خلاف درس و تدریس کے علاوہ نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر توجہ دی بلکہ مسلمانان عالم خصوصا عالم عرب کے مسائل پر ہمیشہ متوجہ و فکر مند رہے اور ان کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مقدور بھر جد و جہد کرتے ہوئے اس دنیا کو خیر باد کہا۔

مولانا نے جہاں تعلیم و تحقیق، ثقافت و تمدن، درس و تدریس، اصلاح و سلوک، تبلیغ و دعوت میں نمایاں کارنامے انجام دئے۔ جہاں ایک طرف وہ مشہور ادارہ ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ، ایشیاء کی عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند و جامعہ اسلامیہ مدینہ کی مجالس شوریٰ کے رکن، اسلامی مرکز آکسفورڈ یونیورسٹی کے صدر، مطالعات و تحقیقات

www.abulhasanalinadwi.org

اسلامی لکزم برگ کے صدر، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے صدر، سید احمد شہید، سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریاؒ، تذکرہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری، نبی رحمت، المرتضیٰ، کاروان مدینہ، تاریخ دعوت وعزیمت، پرانے چراغ، کاروان زندگی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش، جب ایمان کی بہار آئی، عالم عربی کا المیہ، پاجا سراغ زندگی تزکیہ واحسان، معرکۂ ایمان ومادیت نقوش اقبال اور تہذیب تمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات، جیسی معرکۃ الآرا کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے نظر آتے ہیں وہیں وہ مسلمانوں کی پستی اور زوال سے بے چین بھی ہیں۔ وہ ہندوستان ہو، عالم عرب ہو یا تمام اسلام، یہی وہ فکر ہے جوان کو دینی تعلیمی کونسل، مسلم مجلس، مسلم پرسنل لابورڈ، پیام انسانیت، رابطہ عالم اسلامی، ادارہ تحقیقات ونشریات اسلام کے قیام اور ندائے ملت تعمیر حیات البعث الاسلامی وغیرہ کے اجراء پر بھی آمادہ کرتی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انیسویں صدی کی ایک قدآور شخصیت سرسید احمد خاں کے خواب جوانھوں نے مسلمانان ہند کی نشاۃ ثانیہ کے لئے دیکھا تھا کی عملی تعبیر ہے۔ سرسید نے ۱۸۵۷ء مین انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی ہزیمت اپنی آنکھ سے دیکھی تھی، لال قلعہ سے سلطنت مغلیہ کا سبز جھنڈا اتار کر برطانیہ کا یونین جیک ان کے سامنے لہرایا گیا، اس سے قبل ایک صدی سے وہ متواتر انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی شکست دیکھ رہے تھے چاہے وہ سراج الدولہ ہوں، میر قاسم ہوں، حیدر علی وٹیپو سلطان ہوں یا سید احمد شہید واسمٰعیل شہیدؒ کا جانباز لشکر ہو پچھلی ایک صدی کی تاریخ کے پیش نظر وہ اسی نتیجہ پر پہونچے کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کا وہ خواب جسمیں صدیوں تک انھوں نے دبدبہ سے حکومت کی ہے کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے ہمیں تسلیم کرکے مستقبل کی شیرازہ بندی کرنا ہوگی سرسید نے مسلمانوں کے زوال اور انگریزوں کے عروج کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا وہ سمجھتے تھے کہ ان کے عروج کا راز مادی اور عصری علوم میں ان کی ترقی ہے جس سے دنیائے اسلام اس

www.abulhasanalinadwi.org

وقت عاری ہے۔ اور یہ کہ مسلمانوں کو دوبارہ عروج اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ان علوم میں ترقی نہیں کرتے۔ انھوں نے اس کے لئے انگلینڈ کا سفر کیا، اور وہاں نظام تعلیم اور انگریزی طرز معاشرت کا بغور مطالعہ کیا۔ واپسی پر انھوں نے انھیں خطوط پر محمڈن اینگلو اورینٹیل کالج کی علی گڑھ میں بنیاد ڈالی جس کی ترقی یافتہ شکل آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی موجود ہے۔ سر سید کا یہ قدم کہ جن افراد نے ہماری حکومت چھینی ہے اور جو ہمارے بدترین دشمن ہیں انھیں کی طرز معاشرت، علوم اور زبان ہم سیکھیں ایک ایسا کڑوا گھونٹ تھا جو مسلمانوں کے حلق سے اتر نہیں رہا تھا۔ ان کی شدید مخالفت ہوئی۔ ان کے معاصرین اس مسئلہ میں تین رخ پر گئے ہیں۔ ایک وہ گروہ تھا جو انگریزی تعلیم کو غیرت قومی کے خلاف سمجھتا تھا اور شمہ برابر اس سلسلہ میں کوئی بات سننا بھی اس کو گوارا نہ تھی۔ یہ گروہ سر سید کو انگریزوں کا ایجنٹ تصور کرتا تھا۔ سر سید کی تفسیر قرآن اور ان کے ذریعہ کی گئی اسلامی عقائد کی شرح نے آگ پر پٹرول کا کام کیا دوسرا گروہ وہ تھا جو سر سید کا سو فیصد حامی تھا اور تیسرا گروہ وہ تھا جو سر سید کی تعلیمی تحریک کا تو حامی تھا لیکن ان کی تفسیر و عقائد اسلامی کی شرح سے اس کو اتفاق نہیں تھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی مولانا علی میاں کے احاطۂ فکر سے باہر نہیں رہی اور یہ ادارہ ان کی خدمات سے محروم نہیں رہا جب یہ حکومت ہند کی گرداب میں آیا تو مولانا اس کی حفاظت میں بھی سینہ سپر نظر آئے گو کہ مولانا سر سید احمد خاںؒ کی آئیڈیالوجی سے کبھی سو فیصد متفق نہیں رہے۔ ان کا اس مسئلہ میں رجحان مندرجہ بالا سر سید کے معاصرین کے تیسرے گروہ کی طرف تھا یعنی وہ سر سید کی تعلیمی تحریک کے تو قائل ہیں لیکن ان کی تفسیر و عقائد یا انگریزوں کی معاشرت کو من و عن تسلیم کرنے کے نہیں۔ چنانچہ مولانا سر سیدؒ کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"دوسری قیادت وہ تھی جس کا علم سر سید احمد خاںؒ نے بلند کیا وہ مغربی تہذیب اور اس کی مادی بنیادوں کی تقلید اور جدید علوم کو اس کے عیوب و نقائص کے ساتھ اور بغیر کسی تنقید و ترمیم کے اختیار کر لینے کی داعی تھی، وہ اسلام و قرآن کی اس طرح تفسیر

www.abulhasanalinadwi.org

و توجیہ کرتی تھی جو انیسویں صدی کے آخر کے سائنسی معلومات اور مغربی تمدن کے معیاروں کے مطابق ہو اور اہل مغرب کے ذوق و مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہو، وہ ان غیبی حقائق اور طبعی اسرار کے انکار پر قائم تھی جو حواس اور تجربہ کی دسترس سے دور ہیں، اور بادی النظر میں جدید علوم کے مطابق نظر نہیں آتے" (مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش صفحہ ۹۵) اسی کتاب میں آگے صفحہ ۹۹ پر سر سید کی انگلینڈ سے واپسی کا ذکر فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

"۱۴ / اکتوبر ۱۸۷۰ء میں وہ اس (انگریزی) تہذیب کے گرویدہ اور ہندوستان کی مسلم سوسائٹی میں ان اقدار اور اصولوں کی بنیاد پر اصلاح و تغیر کے پر جوش داعی اور مبلغ بن کر اپنے ملک واپس ہوئے، اور پورے خلوص و گرمجوشی کے ساتھ انھوں نے اس تحریک و دعوت کا علم بلند کیا اور اپنی ساری صلاحیتیں اور قوتیں اس کے لئے وقف کر دیں، ان کا نقطۂ نظر خالص مادی ہو گیا، اور وہ مادی طاقتوں اور کائناتی قوتوں کے سامنے بالکل سرنگوں نظر آنے لگے، وہ اپنے عقیدہ اور قرآن مجید کی تفسیر بھی اسی بنیاد پر کرنے لگے، انھوں نے اس میں اسقدر غلو سے کام لیا کہ عربی زبان و لغت کے مسلمہ اصول و قواعد و اجماع و تواتر کے خلاف کہنے میں بھی ان کو باک نہ رہا چنانچہ ان کی تفسیر نے علمی و دینی حلقوں میں سخت برہمی پیدا کر دی۔"

آگے اسی کتاب میں سر سید کی تعلیمی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے سر سید کے نقطۂ نظر کے دو کمزور پہلو تحریر فرماتے ہیں صفحہ ۱۰۴، ۱۰۱

پہلی بات یہ ہے کہ انھوں (سر سید) نے اس نظام تعلیم کو (جس کو مغرب میں آخری شکل دی گئی تھی) ہندوستان کے مسلم معاشرہ کے حالات اور تقاضوں کے پابند و ماتحت نہیں بنایا جہاں اس کو نافذ کرنا تھا، انھوں نے اس کو نئے سرے سے ڈھالنے اور اسلامی شکل دینے پر غور نہیں کیا، نہ اس کو مغربی اور اس کی اس مادی روح سے پاک کرنے کی طرف کوئی توجہ کی جس کی ایک مشرقی اسلامی ملک کو کوئی ضرورت نہ تھی، انھوں نے اس نظام کو مغرب سے اس کی ساری تفصیلات، خصوصیات، اس کی روح

www.abulhasanalinadwi.org

و مزاج اور اس ماحول و روایات کے ساتھ جو اس سے وابستہ تھیں جوں کا توں "در آمد" کیا، انھوں نے صرف مغرب کے تعلیمی نظام ہی پر اصرار نہیں کیا بلکہ مغربی تمدن اور روح کے قبول کرنے پر بھی شدید اصرار کیا، کالج کے قواعد میں یہ اصول قرار دیا گیا کہ کم سے کم ایک پرنسپل اور دو پروفیسر کالج میں اور ایک ہیڈ ماسٹر اسکول میں ہمیشہ یورپین ہونا چاہئے، اور جہاں تک کالج کی آمدنی میں گنجائش ہو اس تعداد میں اضافہ کیا جائے"

"دوسرا کمزور پہلو یہ تھا کہ انکا سارا زور انگریزی زبان وادب کے حصول اور اعلیٰ تعلیم پر تھا اور عملی علوم کی طرف (جو ترقی اور کامرانی کا راز ہیں، اور جن کے انقلاب انگریز اثرات و نتائج کا انھوں نے انگلستان کے قیام میں مشاہدہ کیا تھا انھوں نے خاطرہ خواہ توجہ نہیں کی، حالانکہ مغرب سے لینے کی اور اس میں کمال حاصل کرنے کی اگر کوئی چیز تھی تو یہی تھی، بلکہ انھوں نے صنعتی تعلیم کی تحریک و تجویز کی سخت مخالفت کی اور اس موضوع پر سخت اور تلخ مضامین لکھے"

اس کے باوجود مولانا علی میاںؒ صاحب سر سید کے خلوص، ان کی لگن اور اپنے مقصد میں دھن کے قائل تھے، لکھتے ہیں۔

"اس ساری تفصیل و تنقید کے باوجود اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سر سید احمد خاں صاحب، ایسی طاقتور شخصیت کے مالک تھے جس سے زیادہ طاقتور شخصیت اس دور کے قائدین میں کسی کی نظر نہیں آتی، انھوں نے ایک بڑے وسیع محاذ پر جنگ جاری رکھی، جس تحریک کی انھوں نے قیادت کی اس کو ایسی کامیابی نصیب ہوئی اور اس لئے مسلمانوں کی نئی نسل کو اتنا متاثر کیا جتنا کسی دوسری تحریک نے نہیں کیا، سر سید احمد خاں کی طاقتور شخصیت کے اثر کا ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں دائرہ بہت وسیع ہے، انھوں نے ادب و زبان، طریق فکر و اسالیب بیان سب کو کم و بیش متاثر کیا، اور ایک ایسے ادبی و فکری دبستان کی بنیاد ڈالی جس کے اندر بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔

اسی عظیم تعلیمی تحریک نے جس کی قیادت سر سید احمد خاں نے پوری نصف صدی تک خلوص و قابلیت کے ساتھ کی تھی، بعض نا قابل انکار نتائج پیدا کیے، اس نے

www.abulhasanalinadwi.org

ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں اس تعلیمی واقتصادی خلا کو بڑی حد تک پر کیا جو انگریزی اقتدار اور انقلاب حکومت کے بعد پیدا ہو گیا تھا۔ اس ادرہ میں بڑے لائق نوجوانون، صاحب فکر، صحافی، اہل قلم اور ایسے لیڈر پیدا ئے ہوئے جنھوں نے بعد میں تحریک خلافت اور تحریک آزادی ہند کی پرزور رہنمائی کی، بعد میں جب پاکستان کی تحریک شروع ہوئی اور پھر پاکستان کی اسلامی ریاست وجود میں آئی تو اس کو اسی تعلیم گاہ کے فضلاء میں متعدد رہنما اور لائق منتظم دستیاب ہوئے"

(مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش صفحہ ۱۰۲)

حضرت مولانا کی علی گڑھ آمدورفت اس وقت شروع ہوئی جب وہ ۲۲؍ سال کی عمر میں پہلی بار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جبلی تقریبات میں شرکت کیلئے ندوۃ العلماء کے نمائندہ وفد میں ایک ممبر کی حیثیت سے تشریف لائے۔ مولانا کے ایک طرف عقید تمندانہ رواسم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی۔ سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے تھے۔ تو دوسری طرف مولانا ابوبکر فاروقی صاحب اس وقت کے ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی سے کئی پشتوں کے خاندانی روابط تھے اس لئے مولانا علی میاںؒ صاحب نے پہلے مولانا ابوبکر صاحب کے گھر اور بعد میں صدر یار جنگ کے یہاں قیام فرمایا، جبلی تقریبات میں مولانا نے شعبۂ مدارس عربیہ میں شرکت فرمائی۔

متذکرہ بالا ۱۹۳۶ء کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے بعد مولانا علی میاںؒ صاحب کو ۱۹۳۸ء میں یونیورسٹی کے تعلیمی پروگرام میں عملی شرکت کا موقع ملا اس وقت کے صدر شعبۂ دینیات مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کی طرف سے مولانا علی میاںؒ صاحب کو بی، اے کلاس کی دینیات کیلئے ایک ایسی کتاب لکھنے کی ذمہ داری دی گئی جس میں اسلام کے بنیادی عقائد، ضروری مسائل، سیرت نبوی اور تاریخ اسلام کی ضروری معلومات جمع کر دی جائیے۔ مولانا نے ایک کتاب تیار کی جو مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے بہت پسند فرمائی، اس کے بعد علی

www.abulhasanalinadwi.org

میاںؒ صاحب کو علی گڑھ کچھ عرصہ قیام کے لئے، بلوایا مولانا نے خندہ پیشانی سے اس دعوت کو قبول فرمایا۔ علیگڑھ میں تقریباً تین ماہ قیام کیا اور مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کی۔ رائے مشورہ سے اس کتاب اور نصاب تعلیم کو مکمل کیا، مولانا کا قیام اس درمیان دفتر ناظم دینیات واقع جامع مسجد سرسید ہال میں رہا اور وہ مولانا ابوبکر کے مہمان رہے۔

حضرت مولانا کا اگلا سفر اکتوبر ۱۹۴۴ء میں ہوا جب وہ جماعت اسلامی ہند کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ منعقدہ دہلی کے بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے ساتھ علی گڑھ آئے اور اولڈبوائز لاج میں دودن قیام کیا۔ یہ وقت تھا کہ مولانا مودودی صاحب کی تحریک پر اسلامی دستور کا خاکہ تیار ہو رہا تھا اور اس سفر کا مقصود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نوجوانان ملت میں اس کی آمادگی، فروغ اور یہاں جماعت اسلامی کا ایک اہم مرکز قائم کرنا تھا، اس کے بعد مولانا کو جماعت اسلامی سے اختلاف ہوا اور کچھ دنوں بعد وہ اس سے علحیدہ ہو گئے، یہی وہ دور تھا جب کہ آزادی ہند کی سیاسی اتھل پتھل اپنے شباب پر تھی قیام پاکستان کی تحریک بھی زوروں پر تھی، ہندوستان آزاد تو ہوا لیکن تقسیم ملک اور قیام پاکستان کے نتیجہ میں ہولناک مسلم کش فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کھاتی پیتی اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کی کثیر آبادی پاکستان منتقل ہو گئی، مسلمان اقلیت میں آگئے اور ان پر خوف وہراس چھا گیا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء کی تعداد گھٹ کر دوہزار کے قریب رہ گئی۔ یونیورسٹی کے باہر مسلمانوں کی سراسیمگی، بدحواسی اور احساس جرم کے سیاسی حالات سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیت بھی حالات سے اس قدر دل برداشتہ ہوئی کہ اکتوبر ۴۸ء کے بعد انھوں نے بھی بولنا بند کر دیا مختصر یہ کہ تقسیم ہند سے پہلے مسلمانوں کی جو تیز تراری اور دم خم تھے اس کے مقابلہ میں تقسیم کے بعد ان کی دنیا یکسر بدل چکی تھی حسب دستور اغراض پرورں، چاپلوسوں اور ضمیر فروشوں کا ایک ایسا گروہ مسلمانوں میں اٹھ کھڑا ہوا جس کا اپنے سیکولرزم کے ثبوت میں بس کام یہ تھا کہ مسلمانوں کی تنگ نظری اور خامیوں

کو بیان کرنا ان پر قیام پاکستان کا الزام لگانا ان کو برا بھلا کہنا اور اور اپنی وفاداریاں جتا کر حکومت سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنا۔ حکومت نے بھی ان عبدالکریم بھائی چھاگلا اور حمید دلوائی جیسے لوگوں کی جم کر ہمت افزائی کی۔ چنانچہ یہ فتنہ ترقی پسندی کے نام سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی داخل ہو گیا، حکومت ہند اور اسوقت کے وائس چانسلر کی سرپرستی نے ان کی ہمتیں بہت بڑھادیں اور دیکھتے دیکھتے یہ طبقہ یونیورسٹی کی درس وتدریس اور انتظامیہ پر چھا گیا، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی میں غیر مسلم طلباء اساتذہ کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ یہ ترقی پسند یا کمیونسٹ گروہ لادینیت کا بھی داعی تھا اور اسلام و مسلمانوں خصوصاً علماء کی تضحیک اور آزاد خیالی کو بڑھاوادے رہا تھا۔ طلباء وطالبات کی مخلوط محفلیں، پارٹیاں، یوتھ فسٹول ڈارمہ وغیرہ کو کلچرل پروگرام کے نام پر عام کیا جارہا تھا جو نوجوانوں کیلئے، بڑا پرکشش تھا خصوصا اس زمانہ میں جبکہ مسلمانوں میں بے پردگی عام نہیں تھی۔ طلباء میں بھی ایس ایف آئی کے نام سے ایک تنظیم تشکیل پا گئی جس کا کام طلباء کو کمیونیٹ پارٹی کا ممبر بنانا تھا اور وہ بہت فعال تنظیم تھی۔ مسلمان تیزی سے تعلیم اور نوکریوں میں برادران وطن کے مقابلہ میں پچھڑ رہے جارہے تھے۔ فسادات میں ان پر طرح طرح کے مظالم ہوتے اور یہ ترقی پسند مسلمان اپنے جذبہ سیکولرزم میں انھیں کو برا بھلا کہتے، یہ مزاج ایک فیشن بن چکا تھا۔ یہ ترقی پسند یہاں تک دعوی کرنے لگے تھے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو عنقریب ہم ایک مثالی کمیونسٹ ادارہ بنادیں گے۔ اسی زمانہ میں ایک مطالبہ یہ بھی اٹھنے لگا کہ علی گڑھ شہر کے مقامی ہندو کالجوں کا الحاق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کر دیا جائے اور اس کا لفظ مسلم ختم کر کے اس یونیورسٹی کو عثمانیہ یونیورسٹی کی طرح سے قومیالیا جائے ' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اسلام پسند گروہ جس کی قیادت اسوقت کے پرووائس چانسلر یوسف حسین خاں صاحب کر رہے تھے ان حالات سے بہت فکر مند تھا۔ اسی درمیان مولانا علی میاںؒ صاحب کو ایک سیمینار میں جو شعبہ دینیات کی طرف سے منعقد ہوا تھا مدعو کیا گیا۔ اسی عوت پر مولانا تشریف لائے اور ۱۹؍ دسمبر ۱۹۵۹ء کو یونین ہال میں اپنا مقالہ بعنوان

www.abulhasanalinadwi.org

"نبوت کا کارنامہ" پڑھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین نے مولانا کو یونین کا لائف ممبر بھی بنایا۔ اسی موقع پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب، اور مولانا کے درمیان یونیورسٹی کے حالات پہ تفصیلی مذاکرہ ہوا۔ مولانا یہاں کے حالات سے بے چین ہوا ٹھے۔ یہ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کی وائس چانسلرس کا زمانہ تھا۔ زیدی صاحب کے بعد بدرالدین طیب جی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے باوجودیکہ یہ شہرت عام تھی کہ بدرالدین طیب جی، جواہر لال نہرو کے بہت ہی قریب ترین شخص ہیں اور یہ بھی کہ حکومت خود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے لفظ "مسلم" نکال کر اس کو ایک قومی یونیورسٹی کا درجہ دینا چاہتی ہے۔ تاہم مولانا علی میاںؒ صاحب کو شدید فکر تھی آنے والے وائس چانسلر سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حالات کے سلسلہ میں گفتگو کی جائے۔ خدا کی مرضی کچھ ایسی ہوئی کہ طیب جی کو خود مولانا علی میاںؒ سے گفتگو کرنے کی ضرورت پیش آگئی حالانکہ طیب جی اس وقت تک مولانا علی میاںؒ صاحب سے بالکل واقف نہیں تھے۔ واقعہ یہ ہوا کہ مولانا نے مصر کے کرنل ناصر کے ذریعہ پھیلائے گئے فتنہ عرب قومیت کے خلاف قلمی جہاد شروع کر رکھا تھا اور ان کی تحریروں سے نہ صرف ان کا طلسم ٹوٹ کر بکھر رہا تھا بلکہ ان کے خلاف پورے مصر اور عرب ممالک میں ایک فضا بن رہی تھی۔ کرنل ناصر نے نہرو جی سے اپنی دوستی کے ناطے چاہا کہ وہ مولانا علی میاںؒ کو اس کام سے روکیں اور اس سلسلہ میں کوئی ایسی تحریر ان سے جاری کروادیں جس سے کرنل ناصر کے نیچے سے کھسکتی ہوئی زمین پر قابو حاصل ہوسکے جوہر لال نہرو طیب جی کے ذریعہ مولانا علی میاں سے یہ کام لینا چاہتے تھے۔ دہلی میں حضرت مولانا اور طیب جی کی گفتگو ہوئی۔ پہلے تو طیب جی نے اپنا مدعا کہا اور اس مسئلہ کو قومی مفاداد اور نیشلزم سے تعبیر کیا۔ مولانا نے بہت صفائی سے فرمایا کہ نیشلزم محض یہ نہیں ہے کہ جو نہرو جی کہیں اسکی تائید کی جائے بلکہ صحیح نیشلزم یہ ہے اگر کوئی فیصلہ نہرو جی غلط لے رہے ہیں اُس کی نشاندہی کی جائے بلکہ آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کو اُس غلط کام سے روک لیا جائے۔ میں اس مسئلہ میں نہرو جی کی

www.abulhasanalinadwi.org

مدد سے معذرت خواہ ہوں۔ طیب جی مولانا کی اس گفتگو سے نہ صرف یہ کہ ناراض نہیں ہوئے بلکہ بہت زیادہ متاثر ہوئے کیونکہ یہ بات ان کی سوچ سے بالاتر تھی کہ کوئی مولوی بھی نہرو جی کی مرضی کو اپنے اصول کے واسطے اس طرح رد کر سکتا ہے اس کے بعد مولانا نے یونیورسٹی کے سلسلہ میں گفتگو کی اور ایک یادداشت بھی ان کے حوالے کی جسمیں اس یونیورسٹی کی اہمیت، ان کے عہدہ کی ذمہ داریوں اور نزاکتوں کو مفصل طور پر بیان کیا، طیب جی کے تاثر کا عالم یہ تھا کہ اس کے بعد جب انھوں نے چارج لیا اور ۱۷؍اکتوبر ۶۲ء کو سرسید ڈے کیموقع پر اسٹریچی ہال میں اپنی پہلی تقریر کی تو جن لوگوں نے اس تقریر کو سنا ہے اور وہ مولانا کی دی ہوئی یادداشت سے واقف تھے وہ حیرت زدہ رہ گئے کہ طیب جی کی تقریر من وعن انھیں نکات پر مبنی تھی جو نکات مولانا نے لکھکر ان کو دئے تھے۔ طیب جی کے آتے ہی یونیورسٹی سے کمیونزم کی آئیڈیا لوجی کمزور ہونا شروع ہوگئی اور شہر کے برادران وطن کی ریشہ دوانیاں بھی کمزور ہونے لگیں، اس وقت کے قائدین کی عام روش کے خلاف طیب جی نے مسلمانوں کے مسائل بر ملا اٹھائے اور اپنی تقریر میں انھوں نے ایسا طرز اختیار کیا کہ، نوجوان طلباء علی گڑھ میں آزادی کے بعد سے پنپ رہی پژمردگی ختم ہو کر ایک قومی جذبہ اور نیا ولولہ پیدا ہوا طیب جی کے ڈھائی سال کے قیام مین میں نے ان کی ایک بھی تقریر ایسی نہیں سنی جسمیں انھوں نے قرآن کا حوالہ نہ دیا ہو پوری یونیورسٹی میں ایک انقلابی کیفیت نظر آتی تھی۔ اس تبدیلی کے پیچھے ایک خاموش شخصیت کی کارفرمائی تھی جس سے شاید چند افراد کے علاوہ کوئی واقف نہیں ہے۔ اور وہ شخصیت مولانا علی میاںؒ صاحب کی تھی طیب جی کے بعد علی یاور جنگ وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ان کے چارج لینے کے ایک ہی ماہ میں ۱۲؍اپریل ۶۵ء کو ایک ایسا سانحہ پیش آیا کہ حکومت کو یونیورسٹی پر آرڈنٹس لگانے کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔ حکومت نے عثمانیہ یونیورسٹی کے مانند اسکو بھی قومیانے کے گویا اقدامات شروع کردئے۔ ایکٹ میں ترمیم کے ذریعہ یونیورسٹی کا ایڈمنسٹریشن ایکزیکوٹو کونسل کے ہاتھ میں دیدیا گیا جو ۹؍اشخاص پر مشتمل تھی، جو سب

www.abulhasanalinadwi.org

حکومت کی طرف سے نامزد کیئے گیئے تھے، کورٹ، اکیڈمک کونسل اور پرانی ایکزیکویٹو کونسل معطل کردی گئی تھی اور تمام اختیارات اس نئی ایکزیکوٹو کونسل کو دیدئے گیئے تھے جس کو مرکزی حکومت کی نگرانی میں کام کرنا تھا، بہ الفاظ دیگر اس خود مختار علمی ادارہ کی حیثیت اور محض حکومت کے تحت چلنے والے ایک شعبہ کی ہو کر رہ گئی۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ظفر صدیقی مرحوم جن کو اپنی اس یونیورسٹی سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق تھا بے چین ہوا ٹھے اور گنگا پرشاد میموریل ہال، لکھنؤ میں اس مسئلہ پر پہلا جلسہ ہوا جس میں مولانا نے بڑی اہم تقریر کی اس کے بعد ان حضرات نے اس مسئلہ پر ایک آل انڈیا مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز کنونشن لکھنؤ بارہ دری میں زیر صدارت ڈاکٹر سید محمود منعقد کیا اور اس کو ایک آل انڈیا تحریک کی شکل دیدی اور اسی زمانہ میں sos For Muslim University کے عنوان سے ایک مؤثر رسالہ شائع کیا جس پر ملک کے ممتاز ترین مسلمانوں کے بڑی تعداد میں دستخط تھے۔ مولانا نے اس تحریک کے ساتھ آخیر تک بھر پور تعاون کیا اور انھوں نے اس کو ایک بڑی ملی خدمت تصور کیا، خود انھیں کے الفاظ میں "میں نے اس کو ہر دور میں مسلمانوں کی ایک بڑی ملی خدمت اور وقت کا تقاضہ سمجھا" اسی پر جوش تحریک کے بعد یکم جون ۷۲ء کو لوگ سبھا میں مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ نہایت عجلت سے پاس کردیا گیا، اس ایکٹ کی رو سے جو مسلم یونیورسٹی کورٹ، ایکزیکیٹو کونسل اور ایکڈمیک کونسل بنتی تھی اور ان کے ممبروں کے انتخاب کرنے کے اختیارات جن جماعتوں اور افراد کو دئے گیئے تھے اس سے واضح تھا کہ وہ محض مرکزی حکومت اور اس کی ایجوکیشن منسٹری کے چشم وابرو پر کام کرنے والی جماعتیں ہونگی، ان میں مسلمانوں کی آزاد نمائندگی کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا اور مولانا علی میاںؒ کے الفاظ میں اس پس منظر میں یونیورسٹی کے بہی خواہوں کو یہ نظر آنے لگا تھا کہ یہ ترمیمی ایکٹ کمیونسٹوں کی آرزوں کی تکمیل، اور یونیورسٹی پر حکومت کے ذریعہ ان کے اقتدار کی ضمانت ہے" (کاروان زندگی جلد دوم صفحہ ۱۴۰) اس ایکٹ کے خلاف ۱۰، ۱۱ر مارچ ۷۳ ۱۹ء میں ایک آل انڈیا کنونشن

www.abulhasanalinadwi.org

دہلی منعقد کیا گیا اسمیں علی گڑھ کے طلباء قدیم، ممتاز فضلاء، مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور تنظیموں کے نمائندے، مسلم مجلس مشاورت اور مسلم مجلس کے ذمہ دران شریک ہوئے، مولانا علی میاںؒ صاحب نے اس کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے حکومت کی اس کلیت پسندی کی بہ بانگ دہل تردید کی خصوصاً اقلیتوں کے قائم کردہ اداروں کے ساتھ یہ سلوک کرنے کو ایک سنگین جرم سے تعبیر کیا ہے فرماتے ہیں۔

"تاریخ جدید کا شاید سب سے بڑا سانحہ اور سیاست کی انسانیت کے حق میں سب سے بڑی زیادتی یہ ہے کہ ذہن واخلاق کے سر چشمے، شخصیت وکردار کی کارگاہیں، اور زندگی کی رہنمائی کرنے والے مراکز، بے رحم بے ضمیر سیاسی مقاصد اور انتخابی مصالح کے تابع ہو جائیں اور وہ ان کے مستقبل، اور ان کی موت وحیات کے بارے میں فیصلہ کن بن جائیں، اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ قومی حکومت، غیر ملکی حکومت کے مقابلہ میں قومی زندگی، اور تعلیم وتربیت کے میدان میں رہنمائی کے زیادہ قابل، اور اعتماد کی زیادہ مستحق ہے، اور اب حکومتوں کا دائرۂ اختیار ٹیکس وصول کرنے کا اور جان ومال کی حفاظت اور ملک کے دفاع تک محدود نہیں، میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ تعلیمی مرکزوں کو صنعتی کارخانوں، فیکٹریوں اور ملکوں پر قیاس کرنا، اور ان کو یکسر اپنے نظم ونسق میں لے لینا، ان کا رشتہ اس اقلیتی فرقہ یا جماعت سے کاٹ دینا جس نے ان کو قائم کیا، اور اپنے خون پسینہ سے ان کو پروان چڑھایا، ایک بڑا سنگین اقدام ہے، جس کے نتائج بڑے دوررس اور عمیق ہیں، کسی ملک میں ایک ہی طرح کے دل ودماغ ڈھالنے، ایک ہی کی طرح کی سیرتیں اور شخصیتیں پیدا کرنے اور ایک ہی طرح کے سیاسی خیالات ومقاصد رکھنے والوں کا گروہ وجود میں لانے کی کوشش، ملک ومعاشرہ کو ایک بڑے خطرہ سے دوچار کرنے کے مرادف ہے، یہ رویہ شوگر فیکٹری اور گن فیکٹری کے ساتھ تو مناسب ہے، لیکن دانشگاہوں اور ذہنی تربیت گاہوں کے ساتھ کسی طرح مناسب نہیں" آگے فرماتے ہیں۔ اگر ہماری تعلیم گاہیں کلیتہً حکومت کے اختیار اور اقتدار میں آجائیں، وہاں ایک ہی طرح کا فلسفہ پڑھایا جانے لگے، ایک ہی

www.abulhasanalinadwi.org

طرح کے ماڈل تیار ہوں، ایک ہی سیاسی پارٹی اور اس کے مقاصد کا ان کو نقیب اور نقارچی بنادیا جائے، وہاں کے اساتذہ اور تعلیمی منتظم سرکار دربار کے چشم وابرو کے اشارے کے دیکھنے والے ہوں تو پھر اس ملک کو تباہی سے بچایا نہیں جا سکتا" (کاروان زندگی جلد دوم صفحہ ۱۴۲۔۱۴۱)

یہ تحریک زور پکڑتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۸۰ء میں حکومت ہند دوسرا بل لائی جو کہ لوک سبھا نے پاس کیا۔ اس بل کے تحت حکومت نے اس تحریک کے اکثر مطالبات تسلیم کر لئے، اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسی ایکٹ کے تحت چل رہی ہے۔

مولانا علی میاںؒ کی علی گڑھ آمدورفت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ یہاں کے سفر کو وہ خصوصی اہمیت دیتے تھے، اس کی ایک وجہ تو خود انھیں کے الفاظ میں یہ تھی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو میں ایک ایسا قیمتی اثاثہ سمجھتا ہوں جس پر مرفہ الحال اور باا ثر ہندوستانی مسلمانوں کی بہترین ذہنی صلاحیتیں اور توانائیاں صرف ہوئی ہیں" اور یہ کہ یہاں ملت اسلامیہ ہند کے نوجوانوں کا مغز اکٹھا ہے دوسرے یہ بھی کہ سر سید احمد خاں کے خاندان کو سید احمد شہیدؒ سے، جو علی میاںؒ کے جدامجد تھے، عقیدت ومحبت کا تعلق تھا، سر سید کی والدہ سید احمد شہیدؒ سے بیعت تھیں اور یہ سید احمد نام انھوں نے اپنے پیر کے نام پر رکھا تھا۔ مولانا جب علی گڑھ تشریف لاتے تو لگتا تھا کہ ایمان کی ایک بہار آگئی ہے۔ ایک رونق وچہل پہل صاف نظر آتی تھی۔ مختلف مجالس میں مولانا کا بیان لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے۔ ان کا قیام ابتدائی دور میں تو مولانا ابو بکر (اس وقت کے ناظم دینیات) یا صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ہاں رہتا لیکن بعد میں وہ ہمیشہ پروفیسر ابرار مصطفےٰ خاں صاحب، ۵ ذکاءاللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پر رہتا تھا، مولانا کے آخر دور کے علی گڑھ کے اسفار میں ایک سفر ۱۹۷۷ء میں اس وقت ہوا جبکہ وہ یونیورسٹی کی جانب سے منعقدہ ایک سیمار بعنوان " مذہب اور بدلتی دنیا (Religion and the Changing world) میں بحیثیت مہمان خصوصی تشریف لائے۔ اس موقع پر مولانا کی بڑی معرکتہ لآرا تقریر ہوئی۔ اس کے

بعد اپریل ۱۹۸۰ء میں پیام انسانیت" کے عنوان سے مولانا تشریف لائے اس موقع پر ہندو مسلمانوں کے کئی مشترک جلسے ہوئے جن میں کینڈی ہال، مدن موہن مالویہ لائبریری رسل گنج، میڈیکل کالج اور ویمنس کالج کے جلسے قابل ذکر ہیں۔ اس موقع پر یونیورسٹی گسیٹ ہاؤس لان میں ایک عصرانہ کا نظم بھی کیا گیا جس میں یونیورسٹی اور شہر کے بہت سے غیر مسلم ذمہ دار لوگ مولانا سے ملنے آئے اور بہت اچھا تاثر لیکر واپس ہوئے، مولانا کا اگلا سفر اگست ۱۹۸۱ء میں شعبۂ دینیات کے پروفیسر کی تقرری کے سلسلہ میں ہوا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کے بعد ایک سلیکشن کمیٹی میں مولانا تشریف لائے اس کا تعلق شعبۂ اسلامیات سے تھا اور یہ سفر ۱۹۸۲ء میں ہوا۔ اس موقع پر علی گڑھ برادری کے اسرار پر ایک جلسہ کینڈی ہال میں منعقد کیا گیا، جس میں اساتذہ وطلباء علی گڑھ کے علاوہ علی گڑھ کے خواص بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ پھر الحاج عبیدالرحمٰن خاں شروانی ہوسٹل کے افتتاح کے سلسلہ میں ۲۸؍ مارچ ۹۴ء کو مولانا نے اپنی معذوریوں کے باوجود تشریف لائے اس موقع پر ایک عصرانہ سر سید ہاؤس کے لان میں جہاں یونیورسٹی کے اساتذہ وطلباء بڑی تعداد میں جمع ہوئے جن سے مولانا نے خطاب فرمایا، آخری سفر مولانا کا علی گڑھ میں اس وقت ہوا جب ۲۶؍ ۲۷؍ اپریل ۹۸ء کو صوبائی کنونشن دینی تعلیمی کونسل کا انعقاد کینڈی ہال میں ہوا، یہ کنونشن

خصوصیت سے حکومت اتر پردیش کی نئی تعلیمی پالیسی کے خلاف ہوا تھا جس کے تحت حکومت نے تمام سرکاری اسکولوں میں سرسوتی وندنا، بندے ماترم کا پڑھنا بھارت ماتا کی تصویر پر پھول چڑھا کر اس کی پوجا ارچنا کرنا، وقفہ میں کھانے کے وقت بھوجن منتر پڑھنا جیسی ہندوانہ رسوم کو لازمی قرار دیا گیا تھا، مولانا کی قیادت میں اس تعلیمی پالیسی کے خلاف تحریک کا آغاز ہوا اس کے بعد دیگر دو ذیلی کنونشن مراد آباد، دہرہ دون میں جون جولائی ۹۸ء میں بالترتیب ہوئیں، مزید کئی جلسے مشرقی یوپی میں ہونے تھے کہ حکومت یوپی نے اسی پالیسی کو واپس لے لیا، مولانا کی حمیت اسلامی اور غیرت ایمانی نے بہ بانگ دہل اس موقع پر اعلان کیا کہ ہم جان دے دینگے لیکن وندے ماترم وغیرہ نہیں

www.abulhasanalinadwi.org

پڑھیں گے۔ یہ مولانا کا علی گڑھ کا آخری سفر تھا، مولانا اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو وہ جس مقام پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اور یہاں کے طلباء علی گڑھ برادری سے جوان کو توقعات تھیں وہ پیغام ایک چیلنج کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ آیئے دیکھیں وہ ہم سے کیا چاہتے تھے فرماتے ہیں۔ ”لیکن مسلمانوں کے جدید نازک ثقافتی وفکری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس ادارہ نے وہ کردار ادا نہیں کیا جس کی اس سے توقع تھی، یہ مغرب کے علمی و عملی تجربوں اور ذخیروں کو مسلم معاشرہ اور ملت اسلامیہ کے حالات وضروریات کے مطابق ڈھالنے کا عظیم اور مجتہدانہ کام تھا، یہ ایک نئی اسلامی نسل کا پیدا کرنا تھا جو عقیدہ اور اصول میں مستحکم و مضبوط اور اس اہم کردار سے واقف ہو جو اس کو تہذیب عالم کی قیادت میں ادا کرنا ہے، اس کی نظر میں وسعت اور فکر میں لچک ہو جدید علوم اور مغربی ثقافت سے اس نے اس کے اچھے پہلو اور اس کا مغز لے لیا ہو اور اس کی کمزوریوں اور غیر ضروری اجزاء سے احتراز کیا ہو، جس کے نتائج فکر و تحقیقات اپنے دماغ کا نتیجہ ہوں اور انمیں اسلامی ذہانت اور خود اعتمادی صاف جھلکتی ہو۔

اور جن کے فکر و عمل میں ”لذت کردار“ اور ”جرأت اندیشہ“ پہلو بہ پہلو ہوں، یہ وہ نئی نسل تھی، جس کا عالم اسلام بڑی بے چینی اور اشتیاق کے ساتھ عرصہ سے منتظر اور اس کے لئے چشم براہ تھا یہ نئی نسل کو اس تحیر و اضطراب سے نجات دے سکتی تھی، جسمیں وہ عرصہ سے مبتلا تھا، اور اس کو اقوام عالم کی قیادت اور تہذیب حاضر کی رہنمائی میں مرکزی مقام عطا کر سکتی تھی“ (مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش صفحہ ۱۰۵)

مولانا نے ۹۴ء میں سر سید ہاؤس میں ایک تقریر کے موقع پر علی گڑھ برادری سے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ انکی (سر سید) نظر اور ان کی توقعات اسمیں ہرگز محدود نہ تھیں کہ اس تعلیم گاہ سے وہ لوگ نکالے جائیں جو اسامیوں کے قابل ثابت ہوں،

www.abulhasanalinadwi.org

ان کو عہدے دئے جائیں، وہ اپنے محدود خاندانوں کی پرورش کریں، اور اچھی طرح کھائیں پئیں، اور زندگی گذاریں، وہ ایسی نسل پیدا کرنا چاہتے تھے جو قیادت کرے، یہی وجہ ہے کہ آپ کی یونیورسٹی نے ملت اسلامیہ ہند کو ایسے۔ افراد دیئے جن کی مثال نہیں ملتی، میں یہ عرض کرونگا کہ آپ ایسے طبقہ کو پیدا کریں جس کی طرف نگاہیں اٹھیں، کہ یہ کون جارہا ہے۔ یہ ہم سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ اس کی نگاہیں پاک ہیں، اس کے خیالات پاک ہیں، یہ انسانیت کا ہمدرد ہے، یہ ملک کیلئے باعث زینت ہے آپ ایسے فضلاء نکالیں جو نہ صرف علمی طور پر بلکہ اخلاقی وذہنی طور پر بھی ممتاز ہوں۔ کوئی قوم خاص کر اس عہد ترقی میں، عہد علم وفن میں، عہد صحافت میں، ادبیات اور عہد تحقیقات میں عزت حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اپنا ذہنی سکہ نہ جمادے، اپنا علمی تفوق، اپنی محنت وکاوش، قوت مطالعہ، اور اپنی وسیع النظری اور اخلاقی بلندی وہ دوسروں سے نہ منوالے، یہاں سے ایسے لوگ نکلیں جو علمی تحقیقی صلاحیت ہی نہیں، اخلاقی ودینی طور پر بھی ایک امتیاز رکھتے ہوں"

(کاروان زندگی جلد ششم صفحہ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴)

آیئے اس مجلس میں ہم اسکا عہد کریں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے متعلق حضرت مولانا علی میاںؒ کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے جدوجہد کریں گے۔ اور یہی ان کو صحیح خراج عقیدت ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور جامعۃ الہدایۃ، جے پور

مولانا محمد ضیاء الرحیم مجددی

حضرت مولانا شاہ محمد عبدالرحیم صاحب مجددی کی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب سے پہلی ملاقات کس وقت ہوئی بالتعیین یہ بتانا ذرا مشکل ہے، لیکن حضرت صاحب نے پہلی مرتبہ حضرت مولانا کو اس وقت دیکھا تھا جب آپ فرنگی محل لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے اور اسی زمانے میں متعدد مرتبہ لکھنؤ کے تبلیغی مرکز میں اور خود دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں حضرت مولانا کے درس قرآن میں شرکت کا موقع ملا۔ پورے زمانۂ طالب علمی میں دونوں بزرگوں میں باضابطہ ملاقات اور شخصی تعارف کا علم کسی بھی معتبر ذریعہ سے نہیں ملتا۔ باضابطہ ملاقات ایک عرصے کے بعد ہی ہو پائی تھی جب حضرت صاحب فرنگی محل سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے جدامجدؒ حضرت مولانا شاہ محمد ہدایت علی صاحبؒ سے خلافت واجازت بیعت سے سرفراز ہوئے اور پھر جدامجد کے وصال کے بعد انہیں کے مسند نشیں ہوئے۔ یہ واقعہ ۱۹۵۱ء کا ہے۔ شخصی تعارف کے بعد دونوں بزرگوں کے مابین قلبی تعلق مضبوط ہوتا چلا گیا۔ حضرت مولانا اپنی اس ملاقات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: کہ ''...... پہلی ملاقات میں ان سے ایسی مناسبت بلکہ موانست محسوس ہوئی جو اپنے خاص سلسلے کے شیوخ یا ان برادران طریقت سے محسوس ہوتی ہے جو ایک ہی سلسلے سے منسلک یا ایک ہی مرکز علم وفکر سے وابستہ اور اگلے

آئندہ سطروں میں اختصاراً اہم حضرت مولانا شاہ محمد عبدالرحیم صاحب کے لئے حضرت صاحب اور حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے لئے حضرت مولانا تحریر کریں گے

www.abulhasanalinadwi.org

تربیت یافتہ ہوتے ہیں"۔ (پرانے چراغ، حصہ سوم، ص ۲۴۶)

غالباً ۱۹۶۵ء کی بات ہے حضرت صاحب نے سفر حج کیا اس سفر میں حضرت کے ہمراہ حضرت مولانا سید سہراب علی صاحب (خلیفہ حضرت شاہ ہدایت علی صاحب) بھی تھے حضرت صاحب کو یہ علم ہوا کہ حضرت مولانا بھی حج کی غرض سے دیار حرم میں موجود ہیں۔ حضرت صاحب از خود حضرت مولانا کے پاس تشریف لے گئے۔ اس سفر میں غالباً حضرت مولانا منظور نعمانی صاحبؒ بھی حضرت مولانا کے ہمراہ تھے، ملاقات کے بعد واپسی پر حضرت صاحب نے دونوں حضرات کو کھانے پر مدعو کیا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے دونوں بزرگوں کے قلبی تعلق و میلان میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ حضرت صاحبؒ نے اپنے فرزندوں کی تعلیم و تربیت کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا انتخاب کیا۔ اس کے پیچھے سب سے اہم عامل حضرت مولانا سے قلبی تعلق ہی تھا۔ نیز حضرت صاحب کا وسیع تر نظریہ تعلیم بھی اس کے پیچھے کارفرما تھا۔ اس لیے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اس وقت دیگر مدارس دینیہ کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ علوم دینیہ کے ساتھ علوم عصریہ کی تدریس کا مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ بالآخر ۱۹۷۲ء میں حضرت صاحبؒ کے دو فرزند مولانا محمد فضل الرحیم صاحب مجددی (حال امیر جامعۃ الہدایۃ، جے پور) و جناب محمد عطاء الرحیم صاحب مجددی تعلیم کی غرض سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ گئے۔ (۱) اس طرح حضرت صاحبؒ کی دارالعلوم ندوۃ العلماء بہ تسلسل آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو عمر کے آخری حصہ تک قائم رہا۔ اور ہر مرتبہ ندوہ تشریف آوری کے موقعہ پر حضرت مولانا سے ضرور ملاقت کرتے، انہیں ملاقتوں میں ایک مرتبہ حضرت صاحبؒ نے حضرت مولانا سے فرمایا کہ حضرت مجھے اپنے قلب میں آپ کی طرف خصوصی میلان اور ایک طرح کی موانست محسوس ہوتی ہے۔ حضرت مولانا نے جواباً فرمایا کہ حضرت مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا ہے اس پر حضرت صاحب نے دریافت کیا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ حضرت مولانا نے فرمایا کہ میں اسکی وجہ نہیں بتا سکتا کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ حضرت صاحبؒ نے فرمایا: " میرا ننھیال ٹونک میں ہے اور میرے نانا حضرت سید اسماعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے زمانۂ قیام ٹونک میں انکے مصاحبین

(۱) راقم نے بھی ۱۹۷۴ء دارالعلوم میں داخلہ لیا اور پھر تخصص فی الحدیث بھی وہیں سے کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

میں تھے، ان کو حضرت سید صاحب سے اس قدر قلبی تعلق تھا کہ معرکۂ بالاکوٹ میں حضرت کی شہادت پر ان کو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے مگر اپنے فرزندوں سے کہتے تھے کہ مجھے اپنے گھوڑوں پر بٹھادو چنانچہ ایسا ہی کیا جاتا۔ انکے ہاتھ میں تلوار دے دیجاتی وہ میدان میں جا کر تلوار فضا میں ہلاتے، یہ عمل کافی دیر تک جاری رہتا پھر فرماتے حضرت سید صاحب ایک دن واپس آئیں گے اور میں انکے ساتھ جہاد میں ایسے ہی شریک ہوں گا" (۲)

اس واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد حضرت صاحبؒ نے فرمایا یہی وہ چیز ہے جس کے سبب ہمارے قلب میں آپ کی طرف خصوصی میلان ہے۔ یعنی ہمارے بزرگوں کا آپ کے بزرگوں سے قلبی تعلق اس موانست و میلان قلبی کا سبب ہے۔ انہیں ملاقاتوں میں سے ایک موقعہ پر حضرت مولانا نے حضرت صاحب کو رائے بریلی آنے کی دعوت دی۔ اور خاص طور سے اس بات کی نشاندہی فرمائی کہ ہمارے یہاں بہت سے نقشبندی بزرگ مدفون ہیں یہ گویا اس طرف اشارہ تھا کہ بیعت وارشاد کے تعلق سے اگرچہ ہمارے یہاں چشتی سلسلہ رائج ہے لیکن ہمارے بزرگ نقشبندی سلسلے کے بھی گزرے ہیں (یہ امر واضح رہے کہ حضرت صاحب کا تعلق سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ سے تھا) گویا بزرگوں کا نقشبندی سلسلے میں ہونا بھی اس قربت و تعلق کا ایک سبب ہے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت صاحب کانپور میں تشریف فرما تھے اسی دوران حضرت مولانا کا گزر کانپور سے ہوا یا شاید کانپور کسی تقریب کے سلسلے میں تشریف آوری ہوئی واپسی کے وقت حضرت صاحب خود بنفس نفیس حضرت مولانا کو اسٹیشن تک پہنچانے تشریف لے گئے۔ عین روانگی کے وقت حضرت صاحبؒ نے وفور جذبات میں حضرت مولانا کے ہاتھ کو بوسہ دیا فوراً حضرت مولانا نے بھی یہی عمل دہرایا اور حضرت صاحب کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کی ذات گرامی کو جو بزرگی اور مقام بلند اپنے فضل خصوصی سے عطا فرمایا تھا زمانہ اس کا معترف ہے۔ اور بلند پایہ عالمی شخصیات، معاصر علماء کرام اور ملی قائدین

---

(۲) "پرانے چراغ" حصہ سوم میں حضرت مولانا نے یہ واقعہ رامپور میں ہونا لکھا ہے۔ غالباً سہواً ایسا تحریر ہو گیا ہے ورنہ حضرت صاحب کا ننھیال ٹونک میں تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت کی خدمت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے لیکن ہماری ناقص معلومات کے مطابق حضرت مولانا سے کبھی یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے کسی کے ہاتھوں کو بوسہ دیا ہو، جامعۃ الہدایہ کے قیام کے بعد سے اس تعلق میں مزید پختگی اور اس رابطے میں مزید استحکام ہوا۔ بلکہ اس میں والہانہ پن اور شیفتگی اور فریفتگی کا انداز پیدا ہوگیا تھا۔ آخری مرتبہ جب حضرت مولانا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس کے موقعہ پر ۱۹۹۳ء کے آخر میں جامعہ تشریف لائے تو خدا کی مرضی کہ اس وقت حضرت صاحب سخت علیل تھے اور بمبئی ہاسپٹل میں زیر علاج تھے۔ حضرت مولانا کو حضرت صاحب کی علالت کی اطلاع پہلے ہی مل گئی تھی اپنے ایک مکتوب میں جو بمبئی ارسال کیا گیا تھا اس کا اظہار اس طرح فرمایا ہے:

"......بڑی خوشی اور خواہش تھی کہ جے پور میں پرسنل لاء بورڈ کے جلسے کے موقعہ پر زیارت وملاقات نصیب ہوگی مگر وہاں کی روانگی سے پہلے ہی یہ معلوم کر کے بڑی محرومی کا احساس ہوا کہ حضرت بمبئی میں تشریف رکھتے ہیں اور کسی ہسپتال میں قیام ہے" وکان امر اللہ قدراً مقدوراً۔" اجلاس کے اختتام پر کچھ عرصے کے بعد حضرت مولانا بمبئی تشریف لے گئے اور حضرت صاحب کی عیادت کے لئے بمبئی ہاسپٹل گئے۔ اس وقت حضرت صاحب نے حضرت مولانا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر آبدیدہ ہوکر فرمایا کہ: حضرت! میں نے رات کو ہی خواب میں دیکھا کہ آپ میری عیادت کو تشریف لائے ہیں۔ اور آپ کے ساتھ فرشتے بھی ہیں"۔ پھر فرمایا: یہ فرشتے نہ ہر ایک کے ساتھ ہوتے ہیں، اور نہ ہر ایک کو دکھتے ہیں"۔ اسی واقعہ سے ان دونوں حضرات کے علومرتبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ ملاقات ان بزرگوں کی آخری ملاقت ثابت ہوئی اس کے چند دنوں کے بعد ہی حضرت صاحب کا وصال ہوگیا حضرت صاحب کے حادثۂ ارتحال کے بعد حضرت مولانا نے جو تعزیتی مکتوب جے پور ارسال کیا اس سے ان کے قلبی رنج والم کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں تحریر فرمایا تھا۔

"......دل پر ہاتھ رکھ کر اور ذہن کو سنبھال کر یہ خط لکھا جارہا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت شاہ صاحب کی کن الفاظ میں تعزیت کی جائے کہ خود اپنا دل و دماغ متاثر ہے۔ یہ سانحہ صرف انکے خاندان اور ارادتمندوں کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری ملت کا سانحہ ہے۔ ایسی

www.abulhasanalinadwi.org

مخلص، جامع اوصاف اور باخدا ہستی اور بزرگوں کی یادگار دور دور نظر نہیں آتی''

اس کا اندازہ اس مکتوب کے بعض جملوں سے بھی ہوتا ہے جو ماہنامہ کے ''بانی جامعہ ہدایت نمبر'' کے بارے میں حضرت مولانا نے تحریر کیا ہے۔فرماتے ہیں: ''...... ماہنامہ ہدایت کا بانی جامعہ ہدایت نمبر ملا، بڑے شوق و احترام کے ساتھ اس پر نظر ڈالی دل کے داغ تازہ ہوئے اور حضرت شاہ صاحب کی شفقتوں اور عنایت خاص کا منظر سامنے آ گیا''۔(مکتوب مؤرخہ ۴/۶/۱۴۱۵ھ مطابق ۹ر نومبر ۱۹۹۴ء)

حضرت صاحب کے سانحۂ ارتحال کے بعد جب بھی حضرت مولانا سے زیارت و ملاقات کا موقعہ نصیب ہوا حضرت نے دوران گفتگو یہ بات ضرور بتائی کہ ''...... ہمارا معمول ہے کہ ہم روزانہ شاہ صاحب کو ایصال ثواب کرتے ہیں اور اسکو اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں'' اس طرح گویا حضرت مولانا نے حضرت صاحب سے قلبی تعلق اور حب فی اللہ کا حق ادا کر دیا۔

جامعۃ الہدایۃ کا قیام اور اسکے محرکات

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم مجددیؒ نے اپنے جدامجد حضرت مولانا شاہ محمد ہدایت علی مجددی صاحبؒ کے انتقال کے بعد انکے نامکمل کاموں کی تکمیل اور جن عزائم پر اب تک عمل نہیں ہو پایا تھا ان کو عملی جامہ پہنانے کا بیڑا اٹھایا ۔حضرت شاہ محمد ہدایت علی مجددیؒ جن عزائم کی تکمیل اپنے حیات مبارکہ میں کرنا چاہتے تھے ان میں سب سے اہم ارشاد و احسان اور تزکیۂ نفس کے ساتھ ساتھ تعلیمی میدان میں کام کرنے کا تھا۔حضرت شاہ ہدایت علی مجددیؒ کے تصور تعلیم کے بارے میں مختصر طور پر اتنا سمجھنا شاید کافی ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب کے یہاں تعلیم سے مراد دینی تعلیم ہے، دوئم یہ کہ حضرت کا مقصد یہ تھا کہ اس دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کو کچھ ہنر بھی سکھایا جائے تا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں اور کسب حلال کے لیے دردر کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔ بلکہ جو ہنر انہوں نے سیکھا ہے اس کے ذریعہ سے انکے حلال روزی کا نظم آسانی سے ہو سکے۔اور اس جانب سے یکسو ہو کر وہ اپنا اصل فریضہ یعنی تبلیغ و اشاعت دین اور نشر و ترویج علم ادا کر سکیں۔

حضرت صاحبؒ جب مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے تو آپ نے نامکمل کاموں کی تکمیل شروع کی جو حضرت شاہ محمد ہدایت علی مجددی صاحب کی وفات کے سبب تشنہ تکمیل

www.abulhasanalinadwi.org

رہ گئے تھے، ان میں زیادہ تر کام تعمیرات سے متعلق تھے۔(۱) اور ان سے فراغت کے بعد اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوئے، تعلیم کے سلسلے میں حضرت صاحب کو اپنے خاندانی بزرگ و روحانی پیشرو سے جو پیغام ملا تھا اس پر غور فکر شروع ہوا اور اس میں انہاک بڑھتا گیا۔ حضرت شاہ محمد ہدایت علی مجددی صاحبؒ کا انتقال ۱۹۵۱ء میں ہوا اور جامعۃ الھدایۃ کا سنگ بنیاد ۱۹۷۶ء میں رکھا گیا گویا درمیان میں ۲۵ سال کا عرصہ اسی غور و فکر میں صرف ہوا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت صاحب کے ذہن میں محض ایک روایتی قسم کے مدرسے کا قیام نہیں تھا۔ اگر مسئلہ صرف ایک دینی ادارے کے قیام کا ہوتا تو یہ کام بہت پہلے ہو چکا ہوتا، اس لیے کہ اس وقت درس نظامی کے بڑے بڑے مراکز علم موجود تھے۔ لیکن ان عظیم اداروں کی موجودگی میں بھی (جن کی اپنی تاریخ اور ناقابل فراموش خدمات ہیں) حضرت صاحبؒ کا ۲۵ سال اس سلسلے میں توقف اور غور فکر بتلاتا ہے کہ حضرت صاحبؒ کا تصورِ تعلیم ایک انقلابی تصور تھا وہ ایک آئیڈیل ادارے کا قیام چاہتے تھے جسکی حیثیت صرف ایک ادارے کی نہ ہو بلکہ ایک تحریک کی ہو۔

حضرت صاحب کے سامنے ایک طرف دور اول میں ان عظیم اداروں کی ملی و دینی و علمی خدمات تھیں تو دوسری طرف دور آخر میں عام مسلمانوں کی ان مدارس سے دوری بھی کھٹکتی تھی حضرت صاحب نے اسکے اسباب پر گہرائی سے غور فرمایا اور اسی نتیجہ پر پہونچے کہ ہمارے مدارس میں رائج موجودہ نصابہائے تعلیم میں بڑی تبدیلی اور ترمیم و اضافے کی ضرورت ہے، نصاب تعلیم میں غور و فکر موجودہ مدارس کی افادیت بڑھانے کے لئے بھی ضروری تھا اگر عصر حاضر کے تقاضوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور مدارس کا خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ ہوا تو اس بات کا خدشہ تھا کہ ملت خدانخواستہ اور دور نہ ہو جائے اور ملت کا اداروں سے دور ہو جانا یا ملت سے ان اداروں کا تعلق کمزور پڑنا کوئی فال نیک نہ تھی، حضرت صاحبؒ کے نزدیک مدارس کی افادیت کو بڑھانے اور اسکے اندر انجام دی جانے والی کوششوں کو مؤثر بنانے کے لئے چند تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ جن کو ہم مختصر طور پر یوں بیان

(۱) حضرت شاہ محمد ہدایت علی صاحب مجددی نے شہر جے پور میں مختلف اوقاف قائم کیے جو تمام تر وقف علی عامۃ المسلمین ہیں، حتی کہ آپ نے اپنا رہائشی مکان بھی وقف کر دیا تھا

www.abulhasanalinadwi.org

کر سکتے ہیں۔

☆ نصاب و نظام تعلیم پر از سر نو غور و فکر

☆ عصری علوم کا دینی نصاب میں امتزاج اور معتدبہ اضافہ اور اس سلسلے میں عصری علوم کے ماہرین سے رابطہ کیا جانا

☆ مدارس دینیہ میں پڑھنے والے طلبہ کو کوئی ایک اچھا ہنر لازمی طور پر سکھایا جائے

☆ مدارس کے طلباء میں موجود احساس کمتری کے اسباب تلاش کرنے کی سعی کی جائے اور اسے دور کرنے کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کی جائیں۔

☆ تعلیم کے سلسلے میں نئے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔

☆ مدارس کا دائرہ کار بڑھایا جائے

حضرت صاحب نے ۲۵ سال کا طویل عرصہ محض غور و فکر میں ہی صرف نہیں کیا بلکہ اس اثناء میں بڑے علماء کرام اور اصحاب فکر و نظر سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ ان ملاقاتوں کے لئے کبھی آپ نے باقاعدہ اسفار کیے اور کبھی متعلقین کے تزکیہ و ارشاد و دینی و روحانی تربیت کے لئے جو سفر ہوا انہیں کے درمیان علماء کرام سے ملاقاتیں کیں۔

تعلیمی مشن کے سلسے میں جب حضرت صاحب نے علماء کرام اور مدارس کے ذمہ داران سے گفتگو شروع کی تو اس وقت صرف نصاب تعلیم میں تبدیلی کا موضوع ہی زیر بحث ہوتا تھا۔ حضرت صاحب کی منشا یہ تھی کہ نصاب تعلیم میں حسب ضرورت تبدیلی کر لی جائے اور اس سلسلے کے ضروری اقدامات کر لئے جائیں لیکن وہ کام جس کو حضرت صاحب نے نسبتاً آسان سمجھا تھا وہ عملی طور پر زیادہ دشوار محسوس ہوا اسلئے کہ بیشتر علماء کرام نے اس سلسلے میں حضرت صاحب سے بالکل اتفاق نہ کیا۔ بلکہ قدرے انکی طرف سے سرد مہری رہی بعض اسے ناممکن اور بعض اسے بزرگوں کے بتائے ہوئے نظام کے خلاف سمجھتے تھے یہ صورت حال دشوار اور حوصلہ شکن تھی، لیکن حضرت صاحب نے ہمت نہیں ہاری۔ ہاں علماء کے اس موقف سے اتنی تبدیلی ضرور آئی کہ آپ نے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داران سے باقاعدہ رابطہ کیا جائے۔ ندوۃ العلماء کے انتخاب کی بنیادی طور پر دو وجوہات تھیں۔ اولاً اور سب سے اہم تو یہ کہ اسکے ناظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی

www.abulhasanalinadwi.org

ندویؒ سے حضرت صاحب کا دیرینہ قلبی تعلق تھا۔ اور دوئم یہ کہ ندوۃ العلماء اپنی فکر اور منہج و نصاب تعلیم کے اعتبار سے دیگر مدارس اسلامیہ کے مقابلے زیادہ توسع رکھتا تھا اور کسی قدر جدت بھی ۔ علوم عربیہ کی تعلیم و تدریس ہی نہیں بلکہ انکی ترویج کے لئے وہ اپنا ایک منفرد مقام رکھتا تھا۔ ندوۃ العلماء کے عالی مقام ناظم اور نصاب تعلیم نے ہی اس وقت حضرت صاحب کو اس معنی میں متاثر کیا تھا کہ حضرت صاحب نے اپنے فرزندوں کی تعلیم و تربیت کے واسطے ندوہ کا ہی انتخاب فرمایا اور اسکے بعد وقتاً فوقتاً حضرت صاحب کی دارالعلوم میں تشریف آوری ہوتی رہی، اور ہر مرتبہ حضرت مولانا سے ضرور ملاقات فرماتے بلکہ ندوہ آنے کے لئے ایسے ہی وقت کا انتخاب کرتے جب حضرت مولانا ندوہ میں تشریف فرما ہوتے اور انہیں ملاقاتوں میں ان دونوں بزرگوں کے درمیان دینی نصاب و تعلیم میں تبدیلی کے موضوع پر بھی تبادلہ خیال ہوتا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور حضرت مولانا شاہ محمد عبدالرحیم مجددیؒ کے مابین تعلیمی موضوع پر فکری ہم آہنگی، ایک موازنہ:

حضرت صاحب نے جب تعلیمی مسئلے پر غور و فکر شروع کیا تو حضرت صاحب کے چند احساسات تھے مثلاً

(۱) مدارس کا مطلوبہ ذمہ داری کا پورا نہ کرنا اور عام مسلمانوں کا ان سے دور ہونا

(۲) مدارس کے نصاب میں تبدیلی وقت کی ایک اہم ضرورت۔

(۳) مدارس عربیہ کے طلباء کا احساس کمتری کا شکار ہونا۔

حضرت مولانا کے خیالات بھی تقریباً یہی تھے جیسا کہ ان کے خطبات و مقالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، مدارس کا اپنی ذمہ داری بوجہ اتم پوری نہ کرنیکی بات ہی لے لیجئے۔ حضرت مولانا دارالعلوم دیوبند کے طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''عرصے سے ہمارے مدارس ان شاداب پھولوں سے خالی ہوتے جارہے ہیں۔ ان اوصاف میں روز افزوں انحطاط ہے۔ ہم کو اپنے دل پر پتھر رکھ کر سننا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ کہنے والے نے کہاں تک صحیح کہا ہے ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک ۔۔۔ نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ

www.abulhasanalinadwi.org

اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس سے جس تعداد میں فارغ ہوکر لوگ نکلتے ہیں کبھی اس تعداد میں نہیں نکلتے تھے لیکن زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈال رہے ہیں'' مزید فرماتے ہیں'' مدارس جو کبھی طاقت اور زندگی کے مقصد تھے اور جہاں انقلاب آفریں شخصیتیں پیدا ہوتی تھیں وہ مایوسی، افسردگی اور احساس کمتری کا شکار ہیں، آج مدارس کی تعداد میں ان کے طلباء کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ ہے مگر زندگی کی نبض سست ہے اور قلب کی دھڑکن کمزور ہے، کوئی حساس دردمند کبھی کبھی اس طرف نکل جاتا ہے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے (پاجا سراغ زندگی ص ۹۶-۹۵)

نصاب میں تبدیلی کے متعلق حضرت مولانا فرماتے ہیں: ''......خود آپ کا (طلبۂ دارالعلوم دیوبند) نصاب تعلیم اس حقیقت کا گواہ ہے کہ علماء اسلام نے کسی ضرورت کے تسلیم کرنے اور کسی مفید و ناگزیر چیز کو قبول کرنے میں کبھی پس وپیش نہیں کیا یہ نصاب عہد بہ عہد تبدیلیوں اور مختلف علمی وعقلی رجحانات کا نمائندہ ہے اسمیں ہر دور میں ترمیم ہوتی رہی ہے صرف یہ سو برس کا زمانہ ایسا ہے جس میں اس نصاب میں کم سے کم تبدیلی ہوئی ہے حالانکہ یہی زمانہ اپنی سیاسی وذہنی تبدیلی کی بنا پر جائز اور ضروری تبدیلیوں کا سب سے زیادہ مستحق و متقاضی تھا''۔ (پاجا سراغ زندگی ص ۱۱۲)

مدارس اسلامیہ کے طلبہ میں احساس کمتری سے متعلق مولانا فرماتے ہیں: ''آج مدارس کا سب سے بڑا فتنہ اور سب سے بڑا ذہنی طاعون بڑھتا ہوا احساس کمتری ہے جو گھن کی طرح اس درخت کو کھاتا چلا جارہا ہے۔ کسی ادارے کو اگر یہ گھن لگ جائے تو پھر اس کی زندگی محال ہے۔ (ایضاً ص ۹۸)

حضرت مولانا سے مسلسل رابطے اور گفتگو کے بعد حضرت صاحب کو نصاب میں تبدیلی کی تائید تو ملی لیکن اس معنی میں مکمل تائید نہیں ملی کہ مدارس کے مروجہ نصاب میں علوم فنیہ کی تعلیم بھی شامل کی جائے یا یہ کہ ندوہ میں ایسا کرنا ممکن نہیں، حضرت مولانا کی بعض تصنیفات میں تو ہمیں اس سلسلے میں بعض ایسی تحریریں ملتی ہیں جن میں آپ نے صراحۃً اس فکر کی مخالفت کی ہے کہ مدارس کے طلباء کی معاش کی فکر کی جائے۔ بلکہ اسلاف کی روش پر صبر و قناعت کی جائے۔ چنانچہ ایک جگہ طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''دوستو! آپ

www.abulhasanalinadwi.org

یہ خیال نہ فرمائیں کہ مجھے زمانے کی تبدیلی، ضروریات کی زیادتی، ہمتوں اور قوی کی کمزوری، حالات کے اختلاف کا کوئی احساس نہیں ...... لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کا راستہ بلاشبہ ایثار وقناعت، جدوجہد، جفاکشی اور بلند ہمتی کا ہے۔ (ایضاً ص ۱۰۳)

لیکن حضرت صاحب اس معاملے میں بھی وسعت نظر کے ساتھ غور کرنے اور اس سلسلے میں مناسب اور مؤثر اقدامات کرنے کے قائل تھے۔ حضرت صاحب کے پیش نظر اس سلسلے میں دو باتیں تھیں۔ اولاً تو یہ کہ یہ تصور کہ فنی تعلیم یا دوسرے لفظوں میں کوئی بھی ایسی تعلیم جو معاش کی ضامن ہو دینی تعلیم کے ساتھ ممکن نہیں ہے ...... یہ تصور غلط ہے۔ ہمارے علماء اسلاف مین بکثرت ایسے افراد گذرے ہیں جن کا شمار ایک طرف تو زمانے کے اکابر علماء میں ہوتا تھا تو دوسری طرف ان کی تجارتی مشغولیت بھی تھی۔ اور کبھی بھی یہ تجارت یا پیشے کی مشغولیت تحصیل علم یا نشر علم میں حائل نہیں ہوئی۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ اس طرح کا نصاب تعلیم شروع کرنے پر عام مسلمان بھی مدرسے سے جڑے گا اسلئے کہ اس کو بیک وقت تین طرح کی تعلیم حاصل ہوگی۔ (۱) اعلیٰ دینی تعلیم (۲) اعلیٰ عصری تعلیم (۳) اعلیٰ ٹیکنکل تعلیم اور سب خالص اسلامی ماحول اور مدرسے کی روایات واقدار کو باقی رکھتے ہوئے ہوگا۔ اس طرح مدرسے کی افادیت میں اضافہ ہی ہوگا۔ اسلئے کہ عام لوگ پھر سے مدرسے سے جڑ جائیں گے۔ (۱)

بالآخر حضرت صاحب نے یہی فیصلہ کیا کہ ایسا ادارہ وہ خود ہی قائم کریں گے جہاں اس نئے طرز پر تعلیم کا انتظام کیا جائے کہ علوم دینیہ وعربیہ کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اعلیٰ عصری تعلیم اور اعلیٰ ٹیکنکل تعلیم بھی طلباء کو دی جائے۔

جب یہ فیصلہ کر ہی لیا گیا کہ یہ ادارہ جے پور میں ہی قائم کیا جائے گا تو حضرت صاحب نے اس سلسلے میں کوششیں شروع کیں سب سے پہلے ایک وسیع پلان تیار کیا گیا یا یوں کہیے کہ راستے کے خطوط متعین کئے گئے تاکہ رہ نوردوں کو اس پر چلنا آسان ہو جائے اللہ تعالیٰ نے حضرت صاحب کو انتہائی نفیس ذوق انتخاب عطا فرمایا تھا اس نفاست کی جھلک اس

---

(۱) حقیقت یہ ہیکہ مدرسہ کی افادیت میں اضافہ اور اس سلسلے میں مؤثر لائحہ عمل اختیار کرنے کی سمت میں اخیر دور میں اس سے بہتر اور کوئی کوشش نظر نہیں آتی یہ ایک طرح کا فکری اجتہاد تھا جو اللہ تعالی نے اپنے ایک مقبول بندے کے ہاتھوں انجام تک پہونچایا

www.abulhasanalinadwi.org

تعلیمی منصوبے میں اول سے لیکر آخر تک جھلکتی ہے۔ اولاً اس انقلابی تعلیمی پروگرام کی تیاری پھر اسکے لئے اراضی کی خریداری اور اس سلسلے میں کی جانے والی انتھک کوششوں کی تفصیل کا یہ موقع نہیں انشاء اللہ وہ اپنے مقام و وقت پر ذکر کی جائیں گی۔ تعلیمی منصوبے کی ابتدا میں حضرت کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ مرکزی عمارت کے سنگ بنیاد کے لئے کس کو بلایا جائے۔ حضرت صاحب کی نظر انتخاب حضرت مولانا پر پڑی اس انتخاب میں حضرت مولانا کی عظیم شخصیت کے ساتھ حضرت کا قلبی تعلق اور بیشتر امور میں حضرت مولانا کی طرف سے کی جانے والی تائید کا بھی حصہ رہا۔ اور یوں وہ مبارک دن آپہونچا۔ ع

دن گنے جاتے تھے جس دن کے لئے

۱۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء کی وہ ایک تاریخی صبح تھی جب جے پور ہی نہیں راجستھان کی علمی تاریخ میں ایک زریں باب کا اضافہ ہوا۔ یہ موقع تھا جامعۃ الہدایہ کی مرکزی عمارت کے سنگ بنیاد رکھے جانے کا اس دن ایک جشن کا ماحول تھا اور اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ حضرت مولانا نے اس دن کے متعلق اپنے عربی تاثرات میں تحریر فرمایا تھا " **وکان یوما مشھودا ، قد تدفق الناس من کل صوب لحضور ھذا الحفل الکریم** "

حضرت مولانا نے اس اجتماع سے جو تاریخی خطاب فرمایا، اس میں حضرت نے فرمایا تھا " جامعۃ الہدایہ کا سنگ بنیاد میرے گنہگار ہاتھوں سے نہیں رکھا جارہا ہے محمد رسول اللہ ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے رکھا جارہا ہے اور ہادیان انسانیت کے ہاتھوں سے رکھا جارہا ہے"

جامعہ کے سنگ بنیاد کی تقریب کے موقعہ پر حضرت مولانا کی معیت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مؤقر وفد نے بھی شرکت کی، اس وقت تک دارالعلوم کے بیشتر اساتذہ حضرت صاحب سے بہت زیادہ واقف نہیں تھے اس وقت ہم دو بھائی (۱) دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے اور اس تعلق سے دارالعلوم میں لوگوں کو حضرت صاحب سے تعارف حاصل تھا۔ یہ تعارف محض سرسری تھا بیشتر حضرات حضرت صاحب سے غائبانہ ہی واقف تھے لیکن سنگ بنیاد کی تقریب میں اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ندوی برادری کے حضرت صاحب

(۱) راقم سطور اور بڑے بھائی جناب مولانا محمد فضل الرحیم صاحب مجددی

www.abulhasanalinadwi.org

سے قریب ہونے میں اہم رول ادا کیا اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعلق مستحکم ہوتا چلا گیا۔اس طرح اب تک جو تعلق حضرت مولانا اور حضرت صاحب کے درمیان قائم تھا وہ آگے بڑھ کر ندوہ کے دیگر ذمہ داران اور دارالعلوم کے بڑے اساتذہ سے بھی قائم ہو گیا۔

سنگ بنیاد رکھے جانے کے بعد حضرت صاحب کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں حضرت کے سامنے پہلا ہدف یہی تھا کہ مرکزی عمارت وہاسٹل کی تعمیر مکمل ہو جائے تا کہ تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہو سکے۔اس مرحلہ میں بہت سے حضرات کی رائے یہ تھی کہ ضرورت بھر کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع کر دینا چاہئے۔لیکن حضرت صاحب کی رائے اس سلسلے میں بھی بالکل مختلف تھی حضرت صاحب یہ چاہتے تھے کہ ہر کام پوری خوش اسلوبی اور خوش سلیقگی کیساتھ انجام دیا جائے اور تعلیم کا سلسلہ اس وقت شروع کیا جائے جبکہ تعمیرات کا کام مکمل ہو جائے۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صاحب نے تعمیرات میں خاص ذوق پایا تھا جس کا مظاہرہ جامعہ کے چپے چپے میں محسوس کیا جاسکتا ہے، حضرت صاحب کی اسی خصوصی صفت کو کسی نے ''شاہجہانی ذوق تعمیر'' (۱) سے تعبیر کیا، تو کسی نے جامعہ کو ''مدارس کا تاج محل'' (۲) قرار دیا۔بہر حال حضرت صاحب کے ذہن میں اس عالی شان عمارت کی تعمیر کے پیچھے یہ مقصد کارفرما تھا کہ ہمارے مدارس کے طلباء کسی عصری یونیورسٹی یا کسی بڑے اسکول یا کالج میں جاتے ہیں تو وہاں کی ظاہری شان وشوکت کو دیکھ کر نفسیاتی طور پر احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں اور اس احساس کو ختم کرنے کے لئے جن اقدامات کو کرنے کی ضرورت حضرت صاحب نے محسوس کی انہیں میں ایک قدم یہ تھا کہ مدرسے کے طلبہ کے لئے بھی اتنی عالی شان عمارت ہو کہ اگر یہاں کے فارغین کسی بھی بڑی یونیورسٹی یا ادارے میں چلے جائیں تو ان کو کسی قسم کا احساس کمتری نہ ہو۔جامعہ کی مرکزی عمارت کی تعمیر کے وقت حضرت صاحب کی کیفیت ان کے الفاظ میں یہ تھی ''میں جس وقت تعمیری کام شروع کرنا چاہتا تھا ہر وقت ایک اضطرابی کیفیت سے دوچار رہتا تھا، یہ اضطراب اس لئے تھا کہ جامعہ کی مرکزی عمارت آخر کس طرح تعمیر کی جائے، اس کا ظاہری

خاکہ کیا ہو؟ انہیں (۱) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۲) مولانا ولی رحمانی صاحب

www.abulhasanalinadwi.org

دنوں ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں فضا میں اڑتا چلا جارہا ہوں اچانک میری نگاہ ایک بہت ہی لق ودق اور بہت ہی خوبصورت بلڈنگ پر پڑی میں نے فیصلہ کرلیا کہ جامعہ کی مرکزی عمارت کواسی طرز پر تعمیر کروں گا'' اور پھرایسا ہی ہوا۔اس طرح اگر جامعہ کو ''خوابوں کا محل'' بھی کہا جائے تو خلاف واقعہ نہ ہوگا۔آج جامعہ کی اس پرشکوہ وپرجلال عمارت کودیکھکر بے اختیار زبان سے نکل پڑتا ہے۔

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل　　وہ بھی جلیل وجمیل تو بھی جلیل وجمیل

کوہ وصحرا کی آغوش میں آباد اس وسیع جامعہ کے درودیوار معمار کے فن مہارت سے زیادہ حضرت صاحب کی علوہمتی اور سوز دروں کی غمازی کرتے ہیں،اور بقول شخصے اس کے چپے چپے پر حضرت کے سجدوں کے نشانات صاف محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

ایک ضروری وضاحت: بہرحال یہ طے کیا گیا کہ جامعہ کے افتتاح کی مناسبت سے ایک بڑا جلسہ منعقد کیا جائے۔حضرت صاحب خودندوہ تشریف لے گئے اور حضرت مولانا کوجامعہ تشریف آوری نیز جلسہ کی صدارت کی دعوت دی۔اس موقعہ پر حضرت صاحب نے حضرت مولانا سے اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھا کہ حضرت مولانا کوصرف اپنے قلبی تعلق اوران کے بلند علمی ودینی مرتبے کی وجہ سے دعوت دے رہے ہیں اس کے پیچھے یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ وہ حضرت مولانا کی شخصیت کو جامعہ کے لیے مالی تعاون حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔خود حضرت مولانا نے بھی اپنے احساس کا اظہار یوں فرمایا کہ ہمیں یقین ہے کہ آپ کی یہ تشریف آوری ودعوت صرف اورصرف اخلاص وتعلق پر مبنی ہے۔اسکے پیچھے اور کوئی غرض نہیں ہے۔اس موقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا رقم طراز ہیں ''......دسمبر ۱۹۸۵ء میں اس جامعہ کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا،جس میں دوسری ریاستوں کے ممتاز علماء،ماہرین تعلیم اور دانشوروں کو دعوت دی گئی۔اوراس عاجز کو عام اجلاس کی صدارت کے لئے منتخب فرمایا،اس موقعہ پر جب راقم نے اس ''وادئ ہدایت'' میں قدم رکھا تو اس منظر کو دیکھ کر کہ پہاڑوں کے درمیان ایک غیر آباد علاقہ میں خدا کے ایک مخلص بندہ اور صاحب عزیمت انسان کی عالی نظری اوراولوالعزمی کے طفیل جامعہ ہدایت کی شاندار عمارت کھڑی ہوئی ہے،بے اختیار مولانا اسلم جیراجپوری کا یہ شعر زبان پر آگیا اور

www.abulhasanalinadwi.org

اسی سے راقم نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔۔۔۔۔۔۔

عزم راسخ ہے نشان قیس وشان کوہ کن   عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت وکوہسار

اب یہ وادی، وادیٔ علم وہدایت بن گئی اور جامعہ کی وسیع، شاندار اور خوبصورت عمارتوں کی وجہ سے جنگل میں منگل کا سماں ہے۔ (پرانے چراغ ج ۵ ص ۲۵۰)

اس تاریخی موقعہ پر مجمع عظیم کو خطاب کرتے ہوئے حضرت صاحب نے فرمایا تھا "......جدامجد حضرت مولانا محمد شاہ ہدایت علی صاحب کے منشاء مبارک کو میں نے پورا کرنے کا عزم مصمم کیا......تو آپ یقین جانئے کہ صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ تھا اور اس بات پر یقین تھا کہ اللہ جل شانہٗ ضرور اس میں خیر و برکت فرما کر تکمیل تک پہونچائے گا۔ اس کی تکمیل کے سلسلہ میں دشواریاں اور ناسازگار حالات پیش آئے۔ لیکن میرے پیش نظر یہی بات رہی کہ سب سے زیادہ پسندیدہ عمل اللہ کے نزدیک کسی کام کو خلوص سے انجام دینا ہے۔ اسی خلوص واستقامت کی وجہ سے اللہ نے یہ مبارک دن ہمیں اور آپ کو دکھایا۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ شہید فرماتے ہیں

براہل استقامت فیض نازل می شود مظہر   نمی دانی تجلی کوہ طوری گردد

یہ افتتاحی اجلاس بڑا تاریخی ثابت ہوا۔ شہر جے پور کے مسلمانوں میں بڑا جوش خروش پایا جاتا تھا۔ بہت بڑی تعداد میں لوگوں کی شرکت اور مختلف علاقوں سے تشریف لانے والے علماء ودانشور حضرات کی موجودگی اور ان کی طرف سے پیش کئے گئے مقالوں نے اجتماع کو کیفیت کے لحاظ سے بھی ممتاز بنا دیا تھا۔

افتتاحی اجلاس اور اس کے بعد منعقد ہونے والے سیمینار کے اختتام پر حضرت صاحبؒ کی توجہ اس نئے نصاب تعلیم کی ترتیب پر مرکوز ہوگئی۔ جس کو جاری کرنے کا خواب دیکھا تھا اور اس کی تکمیل کا عزم لے کر آپؒ کھڑے ہوئے تھے، اور جس کو آپ اپنی دور بینی و فراست کی بنا پر حالات کے تقاضے کے تحت ایک ملی ضرورت سمجھتے تھے۔

اس نئے مجوزہ نصاب تعلیم کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ علوم دینیہ وعربیہ کا۔ اور دوسرا حصہ عصری وتکنیکی تعلیم کا۔ اور دونوں حصوں کی ترتیب آپؒ اس کے ماہرین سے کرانا چاہتے تھے۔ آپ نے غور وفکر کے بعد یہ طے کیا کہ علوم دینیہ وعربیہ پر مشتمل نصاب کا جو حصہ ہے وہ

www.abulhasanalinadwi.org

دار العلوم ندوۃ العلماء کا رکھا جائے کہ اس میں توازن واعتدال ہے اور خاص طور سے علوم عربیہ کی تعلیم کے لیے اس وقت ہندوستان میں اس سے بہتر کوئی نصاب نہیں۔ اس لیے آپ نے اس نصاب کو جوں کا توں باقی رکھا۔ نصاب تعلیم کے دوسرے حصے میں جو حصہ علوم عصریہ اور علوم فنیہ پر مشتمل تھا اس کی ترتیب کے لئے آپ نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ماہرین تعلیم سے مشورہ کیا۔ اور ان حضرات نے مدرسہ کی خصوصیت وضرورت، حضرت صاحبؒ کی منشاء اور حالات کے تقاضوں کے دیکھتے ہوئے اپنی کوششیں شروع کیں۔

حضرت صاحبؒ کی خاص ہدایت یہ تھی کہ علوم دینیہ وعربیہ کے حصے میں کم سے کم تبدیلی کی جائے اور اس کا لحاظ رکھتے ہوئے دیگر علوم وفنون کا معتد بہ اضافہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہ تھا بلکہ جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اب تک اس طرح کا نصاب کم ازکم ہندوستان کی علمی تاریخ میں موجود نہیں تھا کہ غور وفکر کے وقت اس سے مدد لی جاتی۔ دوسرے یہ کہ علوم دینیہ وعربیہ کے حصے میں زیادہ ترمیم نہیں کی جاسکتی تھی۔ بہرحال ایک بہت ہی متوازن نصاب تعلیم ترتیب دیا گیا۔ جس میں اس امر کا بھی خصوصیت سے اہتمام کیا گیا کہ علوم عصریہ اور خاص طور سے علوم فنیہ کی تحصیل میں طلبہ کو الگ سے وقت نہ دینا پڑے۔ بلکہ وہ ایک ہی وقت میں ان تینوں علوم کو حاصل کرسکیں۔ جس وقت یہ نیا نصاب ترتیب کے مرحلے سے گذر کر اہل علم تک پہونچا تو تقریباً ہر طرف سے اس کی پذیرائی ہوئی۔ اسلئے کہ اس وقت تک یہ اپنے طرز کا ایک منفرد نصاب تھا۔ اور یہ کوشش ہندوستان میں اپنی قسم کی ایسی پہلی منظم کوشش تھی جو مستقبل میں انتہائی دوررس نتائج کا حامل تھی اور اس طرح حضرت صاحبؒ کا وہ دیرینہ خواب پایۂ تکمیل کو پہونچا۔

عصری اور دینی مدارس میں جو خلیج پیدا ہوگئی تھی اسے پاٹنے اور ان دونوں کو قریب لانے میں حضرت صاحبؒ کی اس فکر اور کاوش نے اہم رول ادا کیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک تیسری تحریک ہے جو دار العلوم دیوبند وندوۃ العلماء اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بعد وجود میں آئی ہے۔ دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء جیسی عظیم دانش گاہوں کا مقصد اگر علماء دین کو تیار کرنا تھا تو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا مقصد عصری تعلیم میں مسلمانوں کو آگے بڑھانا تھا۔ لیکن جامعۃ الہدایۃ کے قیام کا بنیادی مقصد ایسے علماء دین پیدا کرنا ہے جو

www.abulhasanalinadwi.org

علوم دینیہ و عربیہ میں کامل دستگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ علوم عصریہ سے بھی گہری وقفیت رکھتے ہوں اور ساتھ ہی علوم فنیہ بھی ان کی دسترس میں ہوں۔

جامعہ میں تعلیم کا آغاز اور اس سلسلہ میں حضرت مولاناؒ کا عملی تعاون:

نصاب تعلیم کی ترتیب کے بعد تعلیم کے باقاعدہ آغاز کا مرحلہ آیا۔ اس موقعہ پر حضرت مولاناؒ کی خاص ہدایت وایماء پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کبار اساتذہ پر مشتمل ایک موقر وفد جامعہ آیا۔ اوران حضرات نے اساتذہ کے انتخاب میں عملی تعاون دیا۔ اور پھر وقتاً فوقتاً حسب ضرورت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داران کا تعاون لیا جاتا رہا۔ کبھی یہ تعاون نصاب تعلیم میں پیش آنے والی کسی دقت کو دور کرنے میں بہ شکل مشورہ ہوتا۔ اور کبھی اساتذہ کے انتخاب کے عمل میں شمولیت کی شکل میں ہوتا۔ اور ہر تعاون جو دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلیمی سلسلہ میں لیا گیا اس میں حضرت مولاناؒ کی ذاتی دلچسپی اور مشورہ وہدایت کا خاص دخل رہا۔

جامعہ میں تعلیمی سرگرمی شروع ہونے کے بعد جامعۃ الہدایہ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داران اور اساتذہ میں اتنی قربت ہوگئی تھی کہ گویا دونوں اداروں میں کوئی معاہدۂ مفاہمت ہو۔ جیسا کہ آج کل کسی بھی دو بڑے اداروں میں ہوتا ہے۔ ان سب کے پیچھے دیکھا جائے تو درحقیقت حضرت صاحبؒ اور حضرت مولاناؒ کی مبارک ذاتوں کے درمیان للّٰہی تعلق کار فرما تھا۔ اسی عرصہ کی بات ہے "رابطۂ ادب اسلامی" کہ جس کا مرکزی دفتر ریاض میں ہے۔ کے تحت ایک سیمینار کا انعقاد زیر غور آیا۔ اور کس جگہ اس کا انعقاد کیا جائے، یہ بات زیر مشورہ تھی، اسی اثناء میں حضرت صاحب نے حضرت مولاناؒ سے یہ پیشکش کی کہ یہ جلسہ جامعہ میں رکھا جائے۔ حضرت مولانا نے بلا کسی تردد کے اس دعوت کو قبول فرمالیا اور یوں جامعہ کو اس جلسہ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ تعلیمی سلسلہ شروع ہونے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ کوئی بڑا علمی جلسہ جامعہ میں منعقد ہو رہا تھا۔ یہ ۱۹۸۷ء کی بات ہے۔ حضرت مولاناؒ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"......اس کے لئے متعدد مقامات زیر غور آئے، لیکن مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب مجددی کی دعوت پر (جو ان کی وسیع النظری اور علم پروری کی ایک نشانی تھی) اور ان کے احترام میں جے پور کو ترجیح دی گئی۔ اور ۱۷/۱۸ فروری ۱۹۸۷ء کو وہاں سیمینار منعقد کرنے کا

www.abulhasanalinadwi.org

فیصلہ کرلیا گیا۔اس مجلس مذاکرہ میں جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کے ادب عربی کے پروفیسر اور رابطہ کے نائب صدر ڈاکٹر عبدالقدوس ابو صالح بھی سیمینار میں شرکت کے لئے جے پور تشریف لائے ۔تقریباً پچاس کی تعداد میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذۂ ادب اور دوسرے اہل قلم شریک ہوئے ،وادیٔ ہدایت کے روح پرور ماحول اور ایک بزرگ کی سرپرستی اور توجہ نے "نور علی نور" کا کام کیا۔(پرانے چراغ ج ۳ص ۲۵۰)

اس ادبی سیمینار کے اختتام پر سبھی حضرات اور خاص طور سے حضرت مولاناؒ بڑے اچھے تأثرات لے کر جامعہ سے رخصت ہوئے۔

حضرت مولانا کا حضرت صاحبؒ سے جو قلبی تعلق تھا وہ محض اس بنا پر نہیں تھا کہ حضرت صاحبؒ ایک روحانی بزرگ اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ حضرت صاحبؒ کو ایک صاحب عزیمت انسان ،مسائل سے انتہائی دلچسپی رکھنے والا مخلص دردمند ،امت اسلامیہ کو درپیش چیلنجوں سے نہ صرف آگہی بلکہ ان کا استقامت سے مقابلہ کرنے کی جرأت رکھنے والا بلند ہمت ،عالی نظر اور وسیع الفکر امت کا بہی خواہ تصور کرتے ہیں۔اور یہ حقیقت ہے کہ حضرت صاحبؒ اپنی گوناگوں اور متنوع صفات وامتیازات کی وجہ سے معاصر علماء میں اپنا ایک خاص انفرادی مقام رکھتے ہیں۔

امت کے مسائل سے واقفیت اور اس کو درپیش مسائل کے حل کی فکر ہی تھی کہ آپؒ نے مسلم پرسنل لابورڈ جس کی صدارت حضرت مولانا فرمارہے تھے۔کا سالانہ اجلاس جامعہ میں منعقد کئے جانے کی پیش کش فرمائی۔ جسے فوراً قبول کرلیا گیا۔

یہ اجلاس ۹ر۱۰را اکتوبر ۱۹۹۳ء کو منعقد ہوا۔اس وقت ملک کی سیاسی صورتحال فسطائی طاقتوں کے ہاتھوں بابری مسجد کی شہادت اور اس کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے بگڑ چکی تھی ،مسلمانوں کی طرف سے اس وقت تک کسی متحدہ اور مثبت لائحۂ عمل کا اظہار نہیں ہوا تھا چونکہ مسلم پرسنل لابورڈ پر مسلمان ہی نہیں دیگر لوگ بھی نگاہ لگائے ہوئے تھے کہ اس سلسلہ میں اسکی طرف سے کس لائحہ عمل کو اختیار کرنے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ان حالات میں یہ اجلاس بڑی اہمیت رکھتا تھا ،اور یہ محض خدا کا فضل تھا کہ اتنی اہمیت کا حامل یہ اجلاس جامعہ

www.abulhasanalinadwi.org

الہدایۃ میں منعقد ہو رہا تھا۔

اجلاس کی تاریخوں کا اعلان کئی مہینے پہلے کیا جاچکا تھا۔ اور ابتدائی تیاریاں بھی ہو گئی تھیں کہ ایک بڑے آزمائش کا مرحلہ سامنے آ گیا۔ حضرت صاحب گزشتہ کچھ عرصہ سے علیل چل رہے تھے عین اجلاس کے وقت مرض نے شدت اختیار کر لی۔ اسوقت آپ سفر میں تھے اور حضرت کا سفر بھی مسلم پرسنل لا بورڈ کے سلسلے میں ہی ہوا تھا، جیسے جیسے اجلاس کا زمانہ قریب آتا گیا حضرت صاحب کے مرض میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حتی کے جب عین اجلاس کا دن آپہونچا اس وقت مرض اتنا شدید تھا کہ ڈاکٹر کے مشورے بلکہ اصرار پر آپ کو بمبئی ہاسپٹل میں داخل کرانا پڑا۔ یہ ایک بہت بڑا آزمائشی مرحلہ تھا لیکن یہ حضرت صاحب کی دعاؤں کی برکت اور وجہات کا ثمرہ تھا کہ ہر کام نہایت خوش اسلوبی سے اور ہر پروگرام نہایت ہی کامیابی سے انجام پذیر ہوا۔ اور اس انداز سے ہوا کہ تاریخ بن گیا حضرت صاحب کا حال یہ تھا کہ اس حالت میں بھی آپ کو اپنی کچھ پرواہ نہیں تھی۔ حضرت کا دل خدا کی طرف تھا اور ذہن اجلاس کی کامیابیوں کی طرف لگا تھا ہر پندرہ منٹ پر جے پور فون کرا کر ہر چیز کے بارے میں استفسار فرماتے، معزز مہمانوں کے آرام، ان کے قیام وطعام غرض ہر امر سے متعلق ہدایات فرمارہے تھے خدا کا فضل اور حضرت کی دعاؤں کا ثمرہ رہا کہ اجلاس ہر اعتبار سے کامیاب رہا۔

حضرت مولانا اس تاریخی موقعہ پر اپنے تأثرات بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

اس اجلاس کے سلسلہ میں ایک بڑی آزمائش یہ پیش آئی کہ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب جو اس اجلاس کے داعی اور میزبان حقیقی تھے سخت علیل ہو کر بمبئی تشریف لے گئے اور یہ اجلاس براہ راست ان کی سرپرستی اور رہنمائی سے محروم رہا۔ لیکن ان کے لائق اور عالی ہمت صاحبزادے مولانا فضل الرحیم ندوی اور مولانا ضیاء الرحیم ندوی نے اپنے والد نامدار کی پوری قائم مقامی کی اور اجلاس کو کامیاب بنانے میں ایسی سعی وجہد اور بیدار مغزی سے کام لیا کہ حضرت شاہ صاحب کے وجود کی برکت اور انکی زیارت کے علاوہ کوئی خلا اور نقص محسوس نہیں ہوا۔ خود اہل جے پور نے اس دینی وملی اجتماع کو کامیاب بنانے اور جے پور کا نام روشن کرنے کے لئے ایسا تعاون، دینی حمیت اور عملی عزیمت کا ثبوت دیا جسکی بہت کم مثال دیکھنے

www.abulhasanalinadwi.org

میں آئی'' (کاروان زندگی ج ۳ ص ۲۷۴)

اس اجلاس کے دو مہینہ بعد جنوری ۱۹۹۴ء میں حضرت صاحب کا وصال ہوگیا۔ حضرت مولاناؒ پر اس حادثۂ فاجعہ کا بڑا اثر ہوا چنانچہ اپنے ایک تعزیتی مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: ''......دل پر ہاتھ رکھ کر اور ذہن کو سنبھال کر یہ خط لکھا جا رہا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت شاہ صاحب کی کن الفاظ میں تعزیت کی جائے کہ خود اپنا دل و دماغ متاثر ہے، یہ سانحہ صرف ان کے خاندان اور ارادتمندوں کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری ملت کا سانحہ ہے۔ ایسی مخلص جامع اوصاف اور باخدا ہستی اور بزرگوں کی یادگار دور دور تک نظر نہیں آتی۔''

خود حضرت مولاناؒ کا بھی جے پور کا یہ آخری سفر ہی ثابت ہوا۔ گو کہ ایک مرتبہ آپؒ جودھپور ایک مدرسہ کی نئی عمارت کے سنگ بنیاد کے موقعہ پر تشریف لائے۔ ہم لوگ بھی حاضر خدمت ہوئے۔ اور جے پور تشریف آوری کی دعوت دی حضرت مولانا نے بڑے شفقت اور محبت سے فرمایا کہ '' جے پور کا حق یہ ہے کہ وہاں اصالۃً حاضری دی جائے ضمناً اور گزرتے ہوئے نہیں ہم انشاء اللہ صرف جے پور کی نیت سے ہی حاضر ہونگے'' اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مولاناؒ کے دل میں جے پور اور خاص طور سے جامعہ سے کتنا تعلق خاطر تھا۔ جامعۃ الہدایۃ کو تو حضرت مولانا دوسرا ندوہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس کے بارے میں اپنے ایک تاثر میں فرماتے ہیں: ''۔جامعۃ الہدایۃ کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کرنا ایسا ہی ہے جیسے دوسرے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بارے میں کچھ لکھا جائے، روز اول سے اس سے ایسا تعلق ہے کہ **فشہد شاہد من اھلھا** کا مصداق ہے، اس کے افتتاحی تاریخی اجلاس میں شرکت اور کچھ عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور اس کے بعد سے بلا واسطہ و بالواسطہ اس سے رابطہ رہتا ہے کہ وہ اسوقت ہم سب کی توقعات، نیک تمناؤں اور امیدوں کا مرکز ہے، اسکے بلند نظر، عالی حوصلہ، روشن ضمیر بانی و مؤسس حضرت مولانا شاہ محمد عبدالرحیم مجددی نقشبندی کی ذات اور ان کی توجہات خصوصی و سرپرستی اس کی کامیابی و ترقی کے لیے فال نیک اور سرمایۂ فخر و اعتماد ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسکو مزید ترقیات سے نوازے''۔

حضرت صاحبؒ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا نے حضرت صاحب کے نمانوادے سے اس تعلق کو نہ صرف یہ کہ باقی رکھا۔ بلکہ شفقت و محبت کا معاملہ پہلے سے کہیں

www.abulhasanalinadwi.org

زیادہ محسوس کیا گیا اور تعلق میں ایک قسم کا والہانہ انداز آ گیا تھا گزشتہ سال راقم سطور کی ندوہ حاضری ہوئی اور حسب معمول مہمان خانہ میں حضرت مولانا سے شرف ملاقات حاصل ہوا وہاں ایک استاد محترم نے حضرتؒ کو غالباً تذکیراً بتلایا کہ یہ ندوہ سے فارغ ہیں۔ حضرت مولاناؒ نے فوراً فرمایا ہمیں معلوم ہے اور یہ ندوہ کے لئے شرف کی بات ہے"

حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے لئے بڑے شرف کی بات ہے کہ حضرت مولانا کی سرپرستی میں ندوہ جیسے موقر ادارہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ میسر آیا لیکن یہ حضرتؒ کی انتہائی درجہ کی شفقت، اور ہم جیسے نوعمروں کے لئے تشجیع کی بات ہے۔اس سے حضرت کے تعلق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ حضرت مولانا کے خاص تعلق کی ہی بات تھی کہ آپ نے مولانا محمد فضل الرحیم صاحب مجددی (حال امیر جامعۃ الہدایۃ) کا نام مسلم پرسنل لابورڈ کی مجلس عاملہ کے لئے بہ طور ممبر تجویز فرمایا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا کو حضرت صاحب سے جامعہ سے اور حضرت کے خانوادے سے جو محبت اور تعلق تھا مذکورہ سطور میں اس کا صرف اجمالی تذکرہ ہی ہے۔ ورنہ اسے ذکر کرنے کے لئے پورا دفتر درکار ہے۔

اب جبکہ دونوں بزرگ حضرت مولانا اور حضرت صاحب اس دنیا میں موجود نہیں۔ لیکن ان کی تعلیمات وارشادات ان کے نصائح وہدایات ان کے افکار و پیغامات، ہمارے درمیان موجود ہیں۔ جو ہمارے لئے مشعل راہ اور قوت عمل کیلئے مہمیز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فانهم لم يورثوا دينارا و لا درهما و لكن ورثوا العلم

فمن اخذه اخذ لابحظ وافر

☆

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا عربی زبان وادب میں مقام

مولانا سعید الاعظمی ندوی
مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ہندوستان کی اسلامی تاریخ حضرت مولانا سید ابو الحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف الجہات وہمہ گیر شخصیت سے درخشاں وتاباں ہے، عمیق علم، وسیع فکر، تدبر، حزم اور دور اندیشی، اصابت رائے، زندگی وانسان اور کائنات کے بارے میں جامع ترین نظریہ، اسلام کا صحیح ومعتدل فہم، مقبولیت عامہ، اور اثر ورسوخ، دین کی راہ میں ایثار وقربانی اور فدائیت کا عجیب وغریب شوق، عقیدۂ حقہ کی ترسیخ، فکر سلیم کی ترویج، اسلام کے ابدی پیغام کی طرف انسانوں کی رہبری، اور پورے اخلاص ویقین کے ساتھ عملی زندگی میں اسکے نفاذ کی جدوجہد، یہ وہ اعلیٰ صفات ہیں جنہوں نے عالم اسلام کی جلیل القدر شخصیات کے درمیان آپ کو مرکزیت کا درجہ عطا کیا اور میر کارواں کا تاج آپ کے سر پر رکھا، آپ بیک وقت مفکر ومدبر، داعی الی اللہ، مربی وسرپرست، دین ودنیا کی جامعیت کا مکمل نمونہ، قرطاس وقلم اور زبان وادب کے ایک عظیم شہسوار تھے۔

اسی کے ساتھ آپ عالمی سطح پر اسلامی ادب کے علمبردار بھی تھے، محض آپ کی کاوشوں کی بدولت "عالمی رابطہ ادب اسلامی" کا قیام عمل میں آیا، جس نے آفاقیت کو اپنا نصب العین بنا کر اسلامی ادب سے عالم اسلام کو روشناس کرایا، اور تمام ادبی حلقوں میں

www.abulhasanalinadwi.org

اس کا تعارف کرایا، پھر اسلام پسند ادباء کی ایک جماعت نے آگے بڑھکر رابطہ کے اس آفاقی فکر کو قبول کیا، جس کے نتیجہ میں انھیں زبان وبیان، ادب وانشاء اور بامقصد تالیف وتصنیف کا ایک وسیع میدان ہاتھ آیا، اور وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اس ادبی فریضہ کی انجام دہی اور عقیدہ وایمان کی ضیابار کرنوں سے زندگی کو منور کرنے میں لگ گئے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ادب، طاقت وقوت کا ایک عظیم سرچشمہ ہے، یہ وہ طاقت ہے جو لوگوں کے دلوں اور ان کی عقلوں پر حکمرانی کرتی ہے اسی وجہ سے آپ نے ادب کو اپنی تمام عملی سرگرمیوں کا ایک اہم ذریعہ بنایا، دعوت اسلامی کی خدمت، بامقصد انسانی زندگی، ایمانی شخصیت اور پاکیزہ سیرت وکردار کی تعمیر میں آپ نے اپنی ادبی طاقت کو استعمال کر کے انسانی سعادت کا وہ پل تعمیر کیا جس سے آج کا انسان محروم ہے، یعنی عبد ومعبود کے درمیان ایسا مضبوط تعلق پیدا کیا جس میں طاقت وبندگی اور الوہیت وربوبیت کی کامل تصویر نظر آتی ہے۔ اور اس عظیم مقصد کی تکمیل کی راہ میں آپ نے جوہر ادب کو نکھارنے اور اس سے زندگی کو سنوارنے کا بے مثال فریضہ انجام دیا، آپ کا اسلوب بیان نہایت پاکیزہ ہے۔ اس کے اندر اعلی ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ طاقت وقوت اور فصاحت وبلاغت کا حسن پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، جیساکہ مشہور شامی نثر اد ادیب اور معروف انشاء پرداز شیخ علی طنطاوی نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”برادرم ابوالحسن! میرا اعتماد ادب کے اوپر متزلزل ہو گیا تھا کیونکہ ادباء کی تحریروں میں مجھے وہ آسمانی نغمہ نظر نہیں آیا جو اس کی روح ہے، لیکن میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے ادب پر میرا یہ اعتماد بحال کردیا“ اسی طرح رابطہ ادب اسلامی کے اہم رکن ومعروف ادیب ڈاکٹر عبدالباسط بدر صاحب یوں رقمطراز ہیں ”۱۴۰۱ھ میں رابطہ ادب اسلامی عالمی کے پہلے جلسہ میں جو شہر لکھنؤ میں منعقد کیا گیا مجھے حاضری کا شرف حاصل ہوا، اس موقع پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی مجلسوں میں بھی شرکت کی سعادت نصیب ہوئی، اس وقت میں نے آپ کی ادبی شخصیت میں بہت سی نمایاں جھلکیاں دیکھیں، عربی ادب کے متعلق آپ کی فکر

www.abulhasanalinadwi.org

اور خیالات کے سننے کا موقع ملا، آپ کی بلند نگاہی اور مسائل و مشکلات سے واقفیت نے ہمیں حیران و ششدر کر دیا، اس وقت آپ کی گفتگو کا موضوع مغربیت زدہ عربی ادب تھا، جس نے ایک طویل مدت سے مشرق کے دیار میں اپنا پنجہ جمالیا ہے، اس دن مجھے اور سامعین کو معلوم ہوا کہ یہ وہ ادیب ہے جو اپنی تالیف و تصنیف اور بات چیت میں اسلامی ادب کا خاص رنگ بھر دیتا ہے، اور یہاں بیٹھکر عربی زبان کے دور دراز نخلستانوں میں عربی سرمایہ کی حفاظت کر رہا ہے، اور ندوۃ العلماء جیسے عظیم ادارہ میں "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کی بنیاد ڈال کر اس عظیم ادبی سرمایہ کی نشر و اشاعت میں مصروف ہے"

ڈاکٹر صاحب آگے چلکر مزید تحریر فرماتے ہیں "ان عظیم ذمہ داریوں کو وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو کلمۂ طیبہ کی قدر و منزلت سے واقف ہو، اور انسانی زندگی میں زبان وبیان کے رتبہ سے آگاہ ہو، اور عربی زبان وادب کی محبت اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر گئی ہو، بلاشبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کے اندر ایک عالمی اسلامی ادیب کی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں، عربی اردو اور فارسی تینوں زبانوں کے آپ ماہر ہیں، حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے اندر ان تمام خوبیوں کو اس لئے جمع کیا تاکہ آپ آگے چلکر اس قافلے کے میر کارواں بنیں جس کے لئے دنیا ہمہ تن انتظار تھی اور جس پر ادب اسلامی کو ناز کرنے کا حق حاصل ہے، اور آپ ادب کے محافظ اور پاسبان بن کر اس وقت میدان عمل میں اترے، جب محدود قومیتوں کا نعرہ بلند کیا جارہا تھا، اور دین کو فکر وادب، سیاسیات واقتصادیات اور زندگی کے عملی شعبوں سے جدا کرنے کی ناپاک کوششیں ہورہی تھیں، چنانچہ آپ نے اپنی ایمانی فراست سے بلا تفریق رنگ ونسل اور زبان وادب، اسلامی ادباء کا پہلا کنونشن منعقد کیا، جسمیں ہندی، عربی، ترکی اور انڈونیشیائی سارے ادباء ایک متحد ادبی فلیٹ فارم پر علمی اور ادبی مقصد کی تکمیل کیلئے جمع ہوئے، اسلامی اقوام کی تاریخ میں میرے نزدیک اپنی نوعیت کا یہ ایک منفرد کنونشن تھا، ادبی جمعیتوں کا قیام گرچہ پوری دنیا کے لئے ایک نئی شئی تھی لیکن رابطہ ادب اسلامی کے

www.abulhasanalinadwi.org

قیام سے پہلے اسلامی ادباء کے کنونشن کا پتہ نہیں چلتا"

ملیشیا کی "الجامعۃ اسلامیہ" کے شعبہ عربی کے استاذ ڈاکٹر منجد مصطفیٰ، بہجہ، عربی زبان وادب کے سلسلہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے نظریات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میرا خیال ہے کہ شیخ ندویؒ نے زبان وادب کے سلسلہ میں دو کامل نظریات پیش کئے، پھر تیسرا نظریہ پیش کیا جس کا تعلق زبان کی تدریس و تعلیم سے ہے، آپ نے ایسے اصول وآداب کا استنباط کیا جو ادب اور زندگی پر اس کے اثرات کو پوری طرح بے نقاب کرتے ہیں، اکثر محققین نے کہنا شروع کردیا تھا کہ تمام نظریات کے موجدین مغرب کے فلاسفہ اور اس کے ناقدین ہیں، لیکن حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے میدان عمل میں اتر کر اس تصور کو مسترد کردیا، اور عربی زبان وادب کے حسن وجمال کو آشکارا کرنے اور اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے پر زور دیا، آپ کے اس عظیم کارنامہ پر ہمیں فخر ہے"

"ہندوستان میں اسلامی عربی ادب کے ارتقاء کی تاریخ میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا حصہ" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اگر ہم دارالعلوم ندوۃ العلماء کو مولاناؒ کی زندگی اور سرگرمیوں سے جدا کردیں تو بات تشنہ رہ جائے گی، کیونکہ آپ کو اسی ادارہ سے یہ فکری رہنمائی ملی تھی، ندوۃ العلماء نے یہ صدا لگائی کہ عربی زبان کتاب وسنت کے خزانوں کی شاہ کلید ہے، اور ہندوستانی مسلمانوں کو ان دونوں سے واقفیت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک وہ عربی زبان کو ایک زندہ وجاوید زبان کی حیثیت سے نہ پڑھیں گے، اس احساس کی بنا پر حضرت مولاناؒ نے عربی زبان میں کتابوں کے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، اور ادب اطفال سے لیکر بہت سے ادبی وعلمی موضوعات پر خالص علمی، تحقیقی اور تاریخی مطالعہ کی روشنی میں ہزاروں صفحات سیاہ کرڈالے چنانچہ آپ کی سرپرستی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی جانب سے بہت سی ایسی گرانقدر کتابیں منصۂ شہود پر آئیں جو تعلیم وتربیت، اسلامی تہذیب وتمدن کی وضاحت، مقاصد دین اور اسلامی زندگی کی تشریح، بحث وتحقیق کے معیار کی تصحیح، اور شریعت اسلامیہ کی حقانیت کو آشکار

www.abulhasanalinadwi.org

کرنے میں بنیادی کردار ادا کر رہی ہیں، آپ نے اس راہ میں عربی ادب کو ایک مؤثر ترین ذریعہ کے طور پر استعمال کیا، اور یہ کام ایسے نامساعد حالات میں انجام دیا جب لوگ عربی زبان کو ازکار رفتہ شمار کر رہے تھے، اور اسے ایک مردہ اور زندگی سے محروم زبان سمجھ کر صرف فقہی واصولی کتابوں کے تنگ دائرے میں محدود کرنے پر زور صرف کر رہے تھے، مگر آپ نے محض توفیق ربانی اور اپنی بلند حوصلگی کے ذریعہ اس زبان کے دائرہ کو وسیع کیا، حتی کہ اس کو زندگی کے مسائل، بحث و نظر، علم و فکر، تاریخ و تذکیر، تہذیب و تمدن، سماج و سوسائٹی، سیاسیات و اقتصادیات اور عالمی مجالس سے مربوط کر کے دکھایا، اس راہ میں آپ نے زبان و قلم دونوں کا سہارا لیکر سلیس عربی زبان اور واضح اور فصیح اسلوب میں کتابوں کی تصنیف فرمائی، چنانچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء آپ کے مبارک دور میں اگر ایک طرف علم وادب، اور دین و شریعت کا مینار بلند تھا تو دوسری طرف قلب و قلم، ریشم و فولاد، وسیع علم اور پختہ ایمان کی جامعیت کا یکتائے روزگار نمونہ تھا۔

اسی جامع و معتدل تخیل کی بناء پر حضرت مولاناؒ نے فکر وادب اور تمدن و ثقافت کے مراکز میں آئے دن تبدیلیوں، اور مادی افکار و نظریات والے ممالک کی جدید تہذیبوں کو مد نظر رکھتے ہوئے نصاب درس میں قدیم صالح اور جدید نافع کے اصول کو مد نظر رکھ کر تبدیلیاں کیں، تاکہ ایک عالم دین گرد و پیش کی دنیا، اور آئے دن کی فکری و علمی و تہذیبی تبدیلیوں اور چیلنجوں سے باخبر ہو کر اللہ کی شریعت کی جانب سے دفاع کا فریضہ انجام دے سکے اور اس پر لوگوں کا مکمل اعتماد بحال کر سکے، اور اسے دنیا و آخرت کی سعادتوں کے درمیان ایک رابطہ بنا سکے، چنانچہ آپ نے اسلامی ممالک کی دیگر یونیورسٹیوں کے طرز پر عربی زبان وادب کی تعلیم کے لئے کتابوں کی تصنیف کے ذریعہ اپنا مستقل تربیتی کورس تیار کر دیا، "قصص النبیین" القراءۃ الراشدۃ" مختارات من ادب العرب" منثورات من ادب العرب، جیسی مایہ ناز کتابیں زبان وادب اور بہترین اسلوب بیان کی ایسی عدیم النظیر مثالیں ہیں جنھوں نے ہندوستان کے دور اخیر کے مصنفین کے لئے مشعل راہ کا کام دیا، اور عربی زبان کے زندہ و جاوید زبان ہونے کا بین

www.abulhasanalinadwi.org

ثبوت دیگر ان کے ایمان و یقین میں اضافہ کا سامان فراہم کیا۔

آپ کے عظیم ادبی کارناموں میں یہ بھی ہے کہ آپ نے عربی ادب کو یاس و قنوطیت اور گمنامی کی فضا سے نکال کر زندگی کے متحرک شعبوں میں داخل کیا، اور ادب وانشاء کے بہترین نمونوں کو یکجا کر کے اسکے متعدد گلدستے پیش کئے، اور عربی ادب کی ہر صنف کے اصول و ضوابط متعین فرما کر اس کی فنی و تعمیری خوبیوں سے لوگوں کو روشناس کرایا، جس کی وجہ سے ہندوستان میں عربی ادب کی دنیا میں ایک انقلاب آیا، کیونکہ کچھ عرصہ قبل یہ چیز یہاں کے علمی حلقوں کے لئے نامانوس شئے اور ان کے تصور سے باہر تھی، آپ کی بڑی خواہش تھی کہ لوگ ہندوستان میں عربی زبان وادب کو سیکھیں، اور یہاں کے اسلامی تعلیمی مدارس و مراکز صرف اصول فقہ، اور نحو و صرف وغیرہ کی محدود اور تنگ فضا اور خالص نصابی کتابوں کی سطح سے بلند ہو کر کتابت و خطابت اور صحافت کے آفاقی حدود میں داخل ہوں اور عربی زبان کو ایک طاقتور ذریعہ بنا کر زندگی کے تمام حساس میدانوں میں نمایاں طور پر حصہ لیں، تاکہ اس کے ذریعہ قرآن مجید اور احادیث رسول ﷺ سے ان کا رابطہ مضبوط ہو، اور اس میں کوئی شک نہ باقی رہ جائے کہ یہ دونوں سرچشمے فصیح عربی زبان، ادب انشاء فنی جمال، حسن تعبیر بہترین، اسلوب اور اعلی طرز بیان کے شاہکار ہیں۔

اس احساس کی بنا پر آپ نے ادب اطفال سے لیکر درجات عالیہ و علیا تک کے طلبہ کے لئے نہایت مفید ادبی لٹریچر تیار کیا، جو نئی نسل کے دلوں میں عربی زبان کی مقبولیت و محبوبیت کا سامان فراہم کرنے میں بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں، چنانچہ آپ کی شہرۂ آفاق کتاب "مختارات من ادب العرب" (دو جلدوں میں) اعلی ادبی ذوق پیدا کرنے میں قدیم وجدید ادبی کتابوں کے مابین اپنے موضوع کی بہت ہی معتمد علیہ کتاب ہے جو فنی نثر اور ادبی سرمایہ کے اعلی نمونوں سے پر ہے۔

آپ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسلامی عربی صحافت کی طرف بھی ایک کامیاب انقلابی قدم اٹھایا چنانچہ اپنے بعض شاگردوں اور عزیزوں کو عربی زبان میں

www.abulhasanalinadwi.org

ایک اسلامی ادبی دعوتی مجلّہ شائع کرنیکی ترغیب دی، اللہ عزوجل نے اس اقدام کو توفیق سے نوازا، جس کے نتیجہ میں اکتوبر ۱۹۵۵ء میں "البعث الاسلامی" نامی ایک علمی، فکری ودعوتی مجلّہ ماہنامہ کی شکل میں عالم اسلام کے افق پر طلوع ہوا، اور پھر اس کے چار سال بعد جون ۱۹۵۹ء میں "الرائد" نامی ایک پندرہ روزہ جریدہ شائع ہوا، ان دونوں پرچوں نے خالص اسلامی، عربی صحافت کی بھرپور نمائندگی، چنانچہ ہندو بیرون ہند کے علماء وفضلاء ادباء اور مشاہیر نے اس اقدام کی بہت تعریف کی، ان دونوں پرچوں کے شائع ہونے سے قبل دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی کی طرف سے "الضیاء" نام کا عربی اسلامی ماہنامہ مجلّہ منصۂ شہود پر آیا تھا، اور اس نے ہندوستان میں عربی اسلامی صحافت کا بیج ڈالکر پوری دنیا کے علمی ادبی اور صحافتی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کیا تھا۔

ہندوستان میں عربی زبان وادب کی ترویج کے لئے حضرت مولاناؒ کی یہ کوششیں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ مقصدیت کی روح سے معمور تھیں اور اگر یہ کہا جائے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان میں عربی زبان وادب کی جو بھی، جس شکل میں بھی، اور جہاں کہیں بھی کوئی متاع پائی جارہی ہے وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس کے مخلص مردان حق کا فیض اور انھیں کے آفتاب علم وعمل کا پرتو ہے۔ اس موقع پر ہم اس جانب بھی اشارہ کردینا مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت مولاناؒ نے عربی ادب کا ایسا معتدل اور سنجیدہ اسلوب اختیار کیا جسے "اسلوب الدعوۃ" کا نام دینا بالکل مناسب ہے، اور عصر حاضر کا کوئی بھی مؤرخ جدید عربی ادب کی تاریخ لکھتے وقت اس اعلی اسلوب سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی نظر میں ادب کے عناصر!

حضرت مولاناؒ کی نظر میں "اخلاص وسچائی" ادب کے دو اہم بنیادی عنصر ہیں جو خصوصیت کے ساتھ دعاومناجات اور اذکار واوراد میں پائے جاتے ہیں، اور ادب کی طاقت وقوت اور تاثیر بڑھانے میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں، چنانچہ مولاناؒ

رقمطراز ہیں ''ادب کے اہم ترین عناصر میں سے اخلاص وسچائی بھی ہے مگر اس کی اہمیت سے اکثر ناقدین ادب غفلت برتتے رہے ہیں، حالانکہ یہی دونوں عنصر ادب کے اندر طاقت وقوت اور زندگی کی روح پھونکتے ہیں، اور اسے ایک ابدی حقیقت کا درجہ عطا کرتے ہیں، دعاو مناجات کے علاوہ ادِب کی کوئی صنف ان دونوں عنصروں سے بیک وقت منرین نہیں ہوتی، آپ غور کریں کہ داعی ومناجی اگر نرم دل، نرم خو، زخم خوردہ، اور حالات کا مارا ہوا ہو، نیز اپنے رنج وغم کو بیان کرنے پر اسے قدرت تامہ بھی حاصل ہو، تو کیا اس کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات کسی ادبی معجزہ سے کم ہونگے ؟ یقیناً وہ کلمات دل کے ٹکڑوں اور اشک جگر سوز سے کم نہ ہونگے جو برسہا برس تک ہزاروں انسانوں کو رلانے کے لئے کافی ہوں گے، ان کلمات کی تاثیر اور اعجاز پر ایک حیثیت سے اور غور فرمایئے جبکہ وہ اس زبان مبارک سے ادا ہوئے ہوں جو وحی الٰہی سے ہمیشہ تروتازہ رہتی تھی، اور فصاحت وبلاغت جس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، مثال کے طور پر طائف والی دعا کو دیکھئے!

اہل طائف نے آپ کی دعوت کر ٹھکرا دیا، اور آپ کے ساتھ بڑی سنگدلی کا معاملہ کیا، آپ پر پتھروں کی بارش کی حتی کہ آپ کے قدم مبارک لہولہان ہوگئے۔ اس بے کسی وکرب کے عالم میں آپ کی زبان پر وہ دعا جاری ہوئی جو طاقت وقوت اور تاثیر وصداقت سے لبریز ہے۔ آپ نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا ''اللهم اليك أ شكو ضعف قوتي وقلة حيلتي وهواني على الناس ، رب المستضعفين إلى من تكلني؟ إلى بعيد يتجّهمني أ و إلى عد وملكته أ مرى، ان لم يكن على غضب فلا أبالي، غير أ ن عافيتك هي أ وسع لي، أ عوذ بنور وجهك الذى اشرقت له الظلمات وصلح عليه أ مرالدنيا والآ خره ، من أن يحل بى غضبك أ و ينزل على سخطك ، لك العتبىٰ حتى ترضى، ولا حول ولاقوة الا بالله''

(ترجمہ) الٰہی اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں میں تحقیر کے بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں تو سب رحم کرنے والوں سے زیاد رحم کرنے والا ہے،

www.abulhasanalinadwi.org

درماندہ اور عاجزوں کا مالک تو ہی ہے۔ اور میرا مالک بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے، کیا بیگانہ ترش رو کے، یا اس دشمن کے جو میرے اوپر قابو رکھتا ہے، اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس کی پرواہ نہیں، لیکن تیری عافیت میرے لئے زیادہ وسیع ہے، میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں، جس سے ساری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و دین کے کام اس سے ٹھیک ہو جاتے ہیں کہ تیرا غضب مجھ پر اترے، یا تیری نارضامندی مجھ پر وارد ہو، مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے، اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے"

حضرت مولاناؒ کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے ادب کو مختلف اصناف میں تقسیم کیا، اور ہر صنف کی خصوصیت واہمیت کو اجاگر کیا، مثلاً خطوط نویسی کے ادب کو ادباء ناقدین کے نزدیک سادگی و حقیقت پسندی اور تکلف و تصنع سے دوری میں وہ اہمیت حاصل تھی جو کسی اور صنف کو حاصل نہ تھی، لیکن حضرت مولاناؒ نے اس کے اندر مزید اضافہ فرمایا وہ تحریر فرماتے ہیں "شخصی رسائل کو سادگی و سچائی اور تکلف و تصنع سے دوری کیوجہ سے ناقدین ادب نے بڑی اہمیت دے رکھی ہے، حالانکہ انھیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ادب کی ایک ایسی صنف بھی موجود ہے جس میں مذکورہ صفات ان رسائل کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں اور اس میں تاثیر کی وہ طاقت ہے جس کے سامنے ان رسائل کے تمام لغوی مصطلحات ہباء منثوراً ثابت ہوتے ہیں، کیونکہ اس صنف میں متکلم اپنے دل کی باتوں کو نکال کر رکھ دیتا ہے، اور اس کی زبان اس کے دل کی صحیح اور قادر الکلام ترجمان ہوتی ہے، چنانچہ وہ القاب و آداب اور مدح و تعریف سے بے نیاز ہو کر، سامع کو خاطر میں نہ لاکر اپنے قلب سے مخاطب ہوتا ہے، اور اپنے جذبات واحساسات اور ضمیر سے سرگوشی کرتا ہے ادب کی اس اعلیٰ قسم کا نام "دعا" "ومناجات" ہے۔

ادب کی ایک دوسری صنف بھی ہے جسے ہم ادب تراجم یعنی سوانح عمری کا ادب کہتے ہیں، ادباء کے نزدیک اس کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی بلکہ انکا خیال تھا

www.abulhasanalinadwi.org

کہ اس راہ میں کسی ادبی بلاغت اور فنی جمال کی ضرورت نہیں، چنانچہ جب وہ لوگوں کی سوانح عمری اور کتابوں کی تقدیم کے لئے قلم اٹھاتے تو ہر ایک کے لئے ایک ہی قسم کے اسلوب بیان اور متشابہ اصطلاحات اور ایک دوسرے سے قریب الفاظ استعمال کرتے اور وہ اس سلسلہ میں کسی جداگانہ امتیازی خصوصیت کی رعایت نہیں کرتے، بلکہ ہر شخص کی سوانح عمری اور ہر کتاب کی تقدیم کے وقت ایک ہی طرز بیان کو اپناتے، جس کی وجہ سے ادب تراجم کا دائرہ تنگ ہو گیا تھا، لیکن حضرت مولانا نے اس کو اس کے تنگ دائرہ سے نکال کر آفاقی وسعت عطا کی، اور بلا سوچے سمجھے بے محل کلمات کے استعمال پر پابندی عائد کی، اور الفاظ کے درجۂ حرارت وبرودت (TEMPERATURE) کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی تاکہ کسی بھی شخص کی سوانح عمری یا کسی کتاب کی تقدیم کے وقت بیجا الفاظ کا استعمال نہ ہونے پائے۔ اس اہم پہلو کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ رقمطراز ہیں "بہت سے ادباء مصنفین سمجھتے ہیں کہ کسی عظیم المرتبت شخصیت کی سوانح عمری کا موضوع نہایت آسان کام ہے، لہذا جب وہ اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو بڑی فیاضی اور دریادلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے القاب واوصاف کا پل تعمیر کر دیتے ہیں، جو عموماً مدح سرائی وثنا خوانی پر مبنی ہوتا ہے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان کے کلمات میں ایسا اشتراک پایا جاتا ہے کہ اس میں عالم، ادیب، صالح ومتقی، حاکم اور سپہ سالار لشکر، سب شامل ہو سکتے ہیں، ان کلمات سے کسی ایک شخصیت کی تحدید و تعین نہیں کیجا سکتی، اور نہ کسی کے حسن وجمال، کمالات وامتیازات اور آثار وعلامات کی ایسی تصویر کشی ہو سکتی ہے جس سے ایک آدمی دوسرے آدمی سے اور ایک کا چہرہ دوسرے کے چہرے سے ممتاز ہو جائے، حقیقت تو یہ ہے کہ سوانح عمری کا موضوع اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے، کیونکہ اس کے لئے چند اہلیتیں اور لیاقتیں درکار ہوتی ہیں۔ اس کے لئے سب سے پہلے تو ناقدانہ شخصی معرفت کی ضرورت ہوتی ہے، اگر یہ بات ایک ساتھ زندگی گذارنے کی راہ سے حاصل ہو جائے تو فبہا، ورنہ منصفانہ مطالعہ کی روشنی میں اس شخصیت کے حالات اور اس کی خصوصیات

www.abulhasanalinadwi.org

وامتیازات کا پتہ لگایا جائے گا اسی کے ساتھ ساتھ مافی الضمیر کی ادائیگی اور تعبیر پر قدرت، لغوی ذخیرہ اور تعارفی الفاظ کی صلاحیت بھی ضروری ہے اس کے بعد انصاف پسندی اور احساس ذمہ داری کا وہ نازک مرحلہ آتا ہے جسمیں سوانح نگار زیر بحث شخصیت کو اسی کے سانچہ وڈھانچہ کے مطابق اور اسی کے قدو قامت کے موافق الفاظ کا جامہ پہناتا ہے، لہذا وہ اسے ایسا ڈھیلا جامہ نہیں پہنا سکتا جس میں وہ شخصیت حقیر و پست قامت معلوم ہو، اور اس بات کی غمازی کرے کہ وہ جامہ کسی دوسری بڑی شخصیت کے لئے تیار کیا گیا ہے، ایسا اس وجہ سے کہ ہر انسان قامت و قیمت کے دونوں پہلوؤں کا حامل ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اکثر اوقات قامت کے مقابلہ میں قیمت کی حق تلفی بہت زیادہ ہو جاتی ہے، سوانح عمری کے اندر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا کوئی پاکیزہ محرک، اندرونی داعیہ ہو اور اس سے فکری ہم آہنگی اور قلبی تعلق ہو، یا نظر انداز کی ہوئی عزت کو بحال کرنے اور چھینے ہوئے حق کی دفاع کی خاطر ہو تو عظمت رفتہ کی بازیابی، علم دوستی یا کسی کے جمال وکمال پر فریفتگی کیوجہ سے ہو، اگر سوانح عمری مذکورہ عوامل و محرکات سے خالی ہو گی تو اس کی حیثیت اس جامد وخشک تصویر اور اس نقش ونگار کے مانند ہو گی جو محض مادی منفعت اور تجارتی مفاد کے حصول کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اس میں مصنف وشاعر اور ادیب کا کردار بالکل وہی ہو گا جو ایک پیشہ ور مغنی (گایک) اور کرایہ پر حاصل ہوئی نوحہ خواں عورت کا ہوتا ہے

اس کے ساتھ سوانح نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ الفاظ کے درجہ حرارت وبرودت سے پوری طرح واقف ہو، تاکہ وہ کسی زیادہ طاقت والے لفظ کو کم طاقت والے لفظ کی جگہ استعمال نہ کر سکے، اور کسی معتدل الفاظ والی شخصیت کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال نہ کرے جن سے کسی باعظمت وباکمال، یا کسی ذہین وفطین، یا کسی بااخلاق وباادب یا کسی صاحب علم، روشن دماغ اور حاضر جواب شخصیت کی عکاسی ہوتی ہو، اس کے بعد سوانح نگار کو چاہیئے کہ وہ زیر بحث شخصیت کو اس کے اختصاص کے طبقہ میں جگہ دے، لیکن یہ امر اسوقت دشوار گذار ہو جاتا ہے، جبکہ شخصیت مختلف علوم

www.abulhasanalinadwi.org

وفنون اور جداگانہ امتیازات وکمالات کی جامع ہوتی ہے، جیساکہ عام طور سے علماء متقدمین تھے، ایسی صورت میں شخصیت کے اختصاص کی تعین اسی وقت ممکن ہے جبکہ سوانح نگار اس کی تمام تصنیفات سے واقف اور اس کے سلسلہ میں اس کے معاصرین کی آراء سے باخبر ہو"

کتابوں کی تقدیم اور پیش لفظ کے سلسلہ میں حضرت مولاناؒ اپنے ادبی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں، "کسی معاصر یا بڑے عالم یا عزیز دوست کی کتاب کا مقدمہ لکھنا کوئی تقلیدی عمل نہیں ہے جو کسی کو خوش کرنے یا مؤلف وناشر کی خواہش کی تکمیل کرنے کی غرض سے انجام دیا جاتا ہو بلکہ وہ ایک طرح کی شہادت اور تصدیق نامہ کا درجہ رکھتا ہے، اور اس کے لئے بھی اپنی جگہ پر کچھ آداب واحکام اور ذمہ داریاں ہیں، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقدمہ نگار سچی گواہی دینے، کتاب کی علمی تقسیم کرنے، اس موضوع پر دیگر کتب کے درمیان اس کی اہمیت بیان کرنے، مصنف کی جدوجہد کا صحیح ذکر کرنے، اور تالیفی وتصنیفی میدان میں اس کی کامیابی کی حد متعین کرنے کے بجائے تعریف ومدح سرائی سے کام لیتا ہے، اور سامان تجارت سمجھ کر اس کے اندر ایک دلال کا کردار ادا کرتا ہے جس کی وجہ سے مقدمہ اپنی علمی وادبی اہمیت کو کھو کر زندگی اور روح سے محروم ہو جاتا ہے، مقدمہ میں کتاب کے موضوع اور اسکے مقاصد، مؤلف کی حیات، معاصرین علماء کے درمیان اسکے مقام ومنصب کی تعیین، اس کی عقلی وعملی نشوونما، اور تالیف کے اسباب پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔لہذا وہ تعریف وتمہید کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں ہے جسے ہر کتاب کے سرورق پر فٹ کیا جاسکتا ہو۔

اسی وجہ سے مقدمہ نگار اور کتاب کے موضوع کے درمیان علمی یا فکری تعلق کا پایا جانا ضروری ہے، اس موضوع پر اس کا مکمل مطالعہ ہونا چاہئے، کتاب اگر کسی علمی یا ادبی یا فکری یا دعوتی موضوع سے تعلق رکھتی ہو تو مقدمہ نگار کا مصنف کے عقلی وعلمی اور جذباتی رجحانات اور مزاج وغیرہ سے واقف ہونا ضروری ہے، اور اگر کتاب کا

www.abulhasanalinadwi.org

تعلق کسی دینی موضوع مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ سے ہو تب بھی مقدمہ نگار اور مصنف کے درمیان گہرے روابط کا ہونا ضروری ہے، تاکہ مصنف کے اخلاص واختصاص کا پتہ لگایا جاسکے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ مقدمہ کا محرک اندر کا داعیہ اور وہ قلبی جذبہ ہو جو کتاب کے پڑھنے کے بعد از خود دل میں پیدا ہوا ہو، اور پھر وہ مقدمہ نگار کو بے تاب کردے اور سوچنے پر مجبور کردے کہ اگر وہ مقدمہ نہ لکھے گا تو ایک اہم فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کا مرتکب ہوگا، اور جذبات وتاثرات کے اظہار کی حسرت دل ہی میں باقی رہ جائیگی، یقیناً اس طرح کے طبع زاد اور منصفانہ مقدمے اپنے جلو میں تاثیر وفوائد کا ایک بحر ناپیدا کنار سموئے ہوئے ہوتے ہیں"۔

اسی طرح حضرت مولاناؒ نے ادب کی ایک دوسری بہت ہی اہم صنف کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی ہے، اس کو ہم "اُدب الرحلات" (سفر ناموں) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یقیناً سفر نامہ میں زندگی وسماج، اور ممالک واقوام کی ایسی تصویر کشی کی جاتی ہے جس سے خود سیاح کی ذہنیت اور اس کے افکار ورجحانات کی غمازی ہوتی ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیاح بعض اہم اور بنیادی باتوں کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہے، اکثر وبیشتر سفر ناموں سے جذبات دروں اور مقصدیت کی روح اور سچی تصویر کشی کا اسلوب مفقود ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کی حیثیت ذہنی لطیفوں اور تسکین خاطر کے سامان سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔

حضرت مولانا نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عالمی طور پر سفر وسیاحت میں گذرا، اور آپ کے سفر ناموں کا اسلوب نہایت ممتاز اور حقیقت پسندی پر مبنی ہے، زندگی وسماج، طرز معاشرت اور علم وادب کے بارے میں حقائق ومعلومات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ان میں موجود ہے بعض اسفار کو آپ نے خود قلمبند کیا ہے، مثلاً "مذکرات السائح فی الشرق العربی" (شرق اوسط کی ڈائری) أسبوعان فی ترکیا) ترکی میں دو ہفتے) أیام فی المغرب الاقصی) (مغرب اقصی میں چند روز)۔

ان سفر ناموں میں بہت ہی دلکش دلچسپ ادبی انداز کی کار فرمائی ہے، یہ

www.abulhasanalinadwi.org

سفر نامے ادب واسلوب، ایمان وعقیدہ، دعوتی وتربیتی روح کے اعتبار سے تاریخ کے تمام مشہور سفر ناموں سے بالکل مختلف ہیں، بلاشبہ سفر ناموں کی دنیا میں حضرت مولاناؒ کا یہ ایک انقلابی قدم اور بے مثال ادبی اسلوب کی دین ہے، جدید ادبی تاریخ کے رائج سفر ناموں کے اسلوب اور ان کے غیر مفید پہلوؤں پر تنقید کرتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں "موجودہ زمانہ میں عربی زبان میں سفر نامے بڑی تعداد میں لکھے گئے، لیکن وہ زیادہ تر علمی جغرافیائی فوائد ومعلومات پر مشتمل ہیں، وقت گذاری اور تفریح کا مواد اس میں خاصا موجود ہے، اور باوجود اس کے کہ اس سے زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، تاہم ان کا مرکزی نقطہ سیر وسیاحت، آثار قدیمہ وقابل دید مقامات کی عکاسی ہے اور اگر زندگی کے کسی پہلو کی عکاسی ان میں ہے بھی تو بہت واجبی حد تک اور صرف اتنی جو مصنف کے دائرہ ذوق میں آتی ہو، یا اس کے سفر کیساتھ ہم آہنگ ہو، مثلاً سیاح اگر ادیب ہے تو اس نے مشاہیر ادب کے تذکرے اور اس ملک کی ادبی سرگرمیوں کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے، اور اگر کوئی مذہبی شخص ہے تو اس نے دینی حالات پر پوری تفصیل سے کلام کیا ہے، اور اگر کوئی سیاسی یا منتظم ہے تو اس نے سیاسی شخصیتوں کے تذکرے اور سیاسی تحریکوں اور مکاتب خیال کی تصویر کشی میں سفر نامہ کا بڑا حصہ صرف کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ اکثر یہ کتابیں ایمانی جذبے اور عقیدہ سے خالی اور لطیف احساسات سے عاری ہوتی ہیں، اور ان کتابوں کے مصنف کیمرہ یا رکارڈر کا رول ادا کرتے ہیں، واقعات ومشاہدات پر خود کوئی تبصرہ نہیں کرتے، اس میں انکے دل کی کوئی دھڑکن اور ان کے ضمیر کی کوئی آواز نہیں سنی جاسکتی، چنانچہ اگر کتاب کے سرورق پر ان کے نام کے بجائے کسی ایسے مصنف کا نام لکھ دیا جائے جس کا اس معاشرہ کے ساتھ نہ ثقافتی کوئی تعلق ہو، نہ عقیدہ اور مذہب اور جذبہ اور وجدان کا کوئی اشتراک ہو تو اس صورت حال میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا، ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ اس کو وجہ فضیلت سمجھتے ہوں لیکن بہت سے علمائے ادب اس کو نقص اور عیب قرار دیں گے، اس

www.abulhasanalinadwi.org

لئے کہ جس تحریر سے قاری کو مصنف کے زمانے اور ماحول کا بھی پتہ نہ لگ سکے، اور نہ اس کے مصنف کا عقیدہ اور مذہب و مسلک اس کو معلوم ہو سکے اور نہ اس کی محبوب قدروں اور آئیڈیل شخصیتوں کا اسے علم ہو نہ اس کی گرمجوشی اور قوت مدافعت کا اندازہ ہو اور نہ اس تحریر کے حزن والم کی تلخ کامی اور مسرت و شادمانی کی حلاوت محسوس ہو تو وہ ایک مصنوعی اور بے جان تحریر ہے وہ نہ کسی کے دل پر اثر انداز ہو سکتی ہے اور نہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔

حضرت مولاناؒ کی نظر میں ادب دعوت (أدب الدعوة) کو جملہ ادبی اصناف میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، آپ اگر مولانا کے مطالعۂ قرآن وحدیث کا گہرائی سے جائزہ لیں تو اسمیں ادب دعوت کا عنصر پوری طرح نمایاں نظر آئے گا، ادب کی اس صنف کا اسلوب بھی قرآن مجید اور احادیث نبویہ سے مستفاد ہے، اور دعوت و تبلیغ کے میدان آپ نے اسی کو اپنایا بھی ہے۔ لہذا اگر یہ کہا جائے کہ حضرت مولاناؒ پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے ادب کی اس صنف کے دروازے کھول کر اسے ایک مستقل ترقی پذیر اعلی ادبی صنف قرار دیا تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ اس موضوع سے متعلق آپ کے آٹھ محاضرات بھی ہیں جن میں اس ادب کی رعنائی اور حسن و جمال بھرپور طریقہ سے نمایاں ہے، آج کے مفکرین اور داعیوں کو، اس اسلوب کو اپنے دعوتی سفر میں ضرور اختیار کرنا چاہئے، ان محاضرات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ادب دعوت کے مقصود اسلوب اور اس کے مطلوبہ طریقہ کار کی ہنمائی ملتی ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) دعوت کی حکمت اور زمان و مکان کے ساتھ اس کی ہم آہنگی

(۲) سیدنا ابرہیم علیہ السلام کی دعوت کے دو نمونے

(۳) سیدنا یوسف علیہ السلام کی دعوت کا ایک اعلی نمونہ

(۴) سیدنا موسی علیہ السلام کی دعوت کی چند مثالیں اور اس کی نبوی حکمت،

(۵) سیدنا موسی علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کے ساتھ

www.abulhasanalinadwi.org

(۶) آل فرعون کے مرد مومن کی دعوت جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا۔

(۷) خاتم الرسل محمد ﷺ کی دعوت کے دو شاندار نمونے اور اس کی حکمت

(۸) حضرت جعفر بن ابی طالب کی اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی

مندرجہ بالا عناوین کی روشنی میں قاری اس نتیجہ تک پہونچ سکتا ہے کہ ادب دعوت جو کہ جملہ ادبی اصناف میں سب سے نازک اور مشکل صنف ہے، نفسیات وماحول، افکار ورجحانات اور اپنے حکیمانہ اسلوب کی رعایت کیوجہ سے وہ ایک ترقی پذیر ادبی صنف ہے۔ حضرت مولانا سب سے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اس ادب کی تعیین کے مطابق ایک زندہ اور پائندہ صنف کی حیثت سے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور اس کے چار بنیادی عناصر کی تعیین کی ہے، وہ چار اہم عناصر یہ ہیں!

(۱) عقیدہ (۲) عاطفہ (۳) اخلاص (۴) صدق

اگر داعی اپنے کلام میں ان عناصر کو اختیار کرلے تو وہ لوگوں کے نہاں خانۂ دل تک پہونچ کر ان پر اثر انداز ہو سکتا ہے اور اس کا بھی شمار ان ادباء میں ہو سکتا ہے جنھوں نے ادب کو دعوت اسلامی کو دنیا میں عام کرنے کیلئے استعمال کیا ہے۔

حضرت مولانا مرحوم نے مذکورہ بالا اصناف کے علاوہ عربی زبان وادب کے دیگر اصناف کی جانب بھی اپنی توجہ مبذول فرمائی، مثلاً شاعری، بچوں کا ادب، افسانے اور ناول وغیرہ، یہ وہ اصناف ہیں جن سے کوئی داعی جو زبان وادب کو اپنے فنی وادبی ذوق کے ساتھ حق وباطل کے معرکہ میں ایک عظیم ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہو، کسی حال میں استغناء نہیں برت سکتا ہے

ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا ابو الحسن علی ندوی

کا اسلوب نگارش

ڈاکٹر محسن عثمانی
صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی

ندوۃ العلماء کی تحریک نے متعدد ایسے عالم دین ادیب پیدا کیے، جنھوں نے علم کی جامعیت، وسعت نظری اور انشاء پردازانہ اسلوب کے ذریعہ علم دین کو فروغ دیا اور ملک کے اندر بھی امثال واقران میں ممتاز ہوئے اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی مولانا ابو الحسن علی ندویؒ کی شخصیت تھی۔ جن کی مقبولیت ہندوستان سے لے کر عالم اسلام تک پھیلی ہوئی ہے۔ جتنا عام اور ہمہ گیر اعتماد ان کو ملا ہے وہ پہلے کسی اور کو نہیں مل سکا۔ مولانا کی شخصیت جامع کمالات تھی اور دنیا کے ملکوں میں ان پر تحقیقی کاموں اور مذاکروں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔

مولانا ابو الحسن علی ندویؒ کی اپنی شخصیت بھی خود ان کے اسلوب کی طرح مختلف پھولوں کا عطر مجموعہ تھی۔ اہل دل کے دنوں کی تپش اور شبوں کا گداز، شعر وادب کے قلم کا ساز، اہل فکر وعلم کا ذوق جستجو اور مجاہدین کی روح عمل یہ سب کچھ ان کی ذات میں اس طرح جمع ہو گیا کہ ان کی اپنی شخصیت سب سے منفرد اور سب سے ممتاز ہو گئی ہے۔ اس میں جامعیت بھی ہے اور اعتدال بھی ہے۔ جمال بھی ہے اور کمال

www.abulhasanalinadwi.org

بھی ہے وہ بے ہمہ بھی ہے اور باہمہ بھی ہے۔

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

یہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت تھی جس نے گلشن دین و علم و ادب کے بہت سارے پھولوں کا عطر کشید کر لیا تھا۔ ان کی ذات میں مدرسہ بھی تھا اور خانقاہ بھی۔ علم و ادب کا سکون بھی تھا اور تحریک و اجتماعیت کی گرمی محفل بھی۔ فکر کی تابانی بھی تھی اور انشاء کی درخشانی بھی اور حسن اخلاق کی دلبری بھی۔ وہ ان سے بھی مخاطب ہوتے تھے جو اورنگ نشیں سلطنت ہیں اور ان کو بھی پیغام انسانیت دیتے تھے جو بردران وطن ہیں یہی جامعیت کا کمال ہے جو ان کی شخصیت کا امتیاز خاص ہے۔

مولانا کی عالمی مقبولیت اور شہرت کا راز صرف علم کی وسعت، تصانیف کی کثرت، عربی اور اردو دونوں زبانوں پر قدرت اور اسلوب کے جمال میں پوشیدہ نہیں۔ وہ ندوۃ العلماء، مدارس عربیہ، دینی تعلیمی تحریک، مسلم پرسنل لابورڈ، رابطہ ادب اسلامی اور بہت سے علمی اداروں کے روح رواں اور نفس ناطقہ تھے۔ ان کے کاموں اور کارناموں کا دائرہ آفاق گیر ہے۔ تصنیف و تالیف کا مشغلہ، پیرانہ سالی، عبادت و ریاضت ان سب کا تقاضہ سکون و خلوت نشینی ہے۔ لیکن یہ روح جہاد ہے جو ان کو خلوت سے نکال کر جلوت میں لاتی اور سرگرم سفر رکھتی تھی۔ قرطاس و قلم کی بساط سے لے کر کارزار عمل تک خدا اور خلق خدا دونوں کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے شب و روز ہمہ وقت مشغول رہنا اور پوری دنیا کو اپنی جولان گاہ بنالینا اور اپنی زندگی اور اعلیٰ کردار سے انسانوں سے بلا اختلاف مسلک و مذہب محبت کا باج اور عقیدت کا خراج وصول کرنا معمولی درجے کی بات نہیں۔ یہ انھیں کا کام ہے جن کے حوصلے ہیں زیادہ،

مولانا ایک مفکر ہیں اور اہل نظر نے بجا طور ان کو مفکر اسلام کا خطاب عطا کیا ہے لیکن مولانا کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ انہوں نے فکر اسلامی کے ساتھ مزاج ابراہیمی دونوں کو بہم کر لیا ہے۔ مزاج ابراہیمی دراصل ذکر و ابتہال اور تبتل سوز دروں

www.abulhasanalinadwi.org

اور آہ سحر گاہی کا نام ہے ایسے شخص کو عربی میں "اواہ کہتے ہیں (ان ابراھیم لا وّاہ حلیم سورہ ابراہم) ان ابراھیم لحلیم اوّاہ منیب سورہ ہود) فکر کے ساتھ ذکر نہ ہو اور فکر اسلامی کے ساتھ مزاج ابراہیمی نہ ہو تو ایک اُلاری شخصیت ہوتی ہے اور جامعیت اور توازن میں کمی ہو جاتی ہے بہت سے ذاکرین ہیں جو مفکر نہیں اور بہت سے مفکر ملیں گے جن کے یہاں ذکر و عبادت وابتہال اور تعلق مع اللہ میں کمی نظر آئے گی۔ مولانا علی میاںؒ کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے ساغر و سندان دونوں کو جمع کر کے دکھایا۔ تصنیف وتالیف وزبان وادب، فکر اسلامی کی بلندی، عالم اسلام کے مسائل پر گہری نظر، دینی مدارس اور عالم اسلام کی دینی تحریکات کی سرپرستی اور باطل رجحانات پر نکیر اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جدوجہد، مشرق و مغرب ہر جگہ دین کی دعوت، اسلامی تشخص کا دفاع، حکومتوں کو جھکا دینے کی روحانی طاقت، عبادت اور ریاضت اور دولت دنیا سے بے نیازی اور فقر واستغناء اور نرم دلی ودلبری ان تمام خصوصیات کو اگر ایک شخص میں ڈھونڈا جائے تو پوری ایک صدی میں بھی اس مرتبہ کے انسان کا ملنا مشکل ہے۔ مولانا نے اپنی شخصیت اور اپنے کردار سے دعوت وعزیمت کی تاریخ کا ایک جلی عنوان قائم کر دیا ہے۔ یہ جامعیت مزاج نبوی سے قرب کی دین ہے۔

مولانا کی شخصیت ہشت پہل ہیرا تھی انہوں نے بہت سی خصوصیات اور کمالات کو اپنے اندر جمع کر لیا تھا لیکن ہمارا موضوع صرف مولانا کی نگارشات اور ان کا ادبی اسلوب ہے یہ ہمارے فکر و نظر کی تہی مائیگی ہے کہ ادیب اس کو سمجھ لیا جائے جو ادیب کی وردی پہن کر یا ادب کا سائن بورڈ لگا کر سامنے آئے ادب کی ایک تعریف جاحظ کی زبان میں اخذ کل شئی بطرفہ" بھی ہے۔ ایک شخص اگر وسیع المطالعہ ہو اور اپنی بات کو موثر اور پرکشش انداز میں پیش کرے تو وہ ادیب ہے چاہے اس کا موضوع کچھ بھی ہو۔ بہت سے لوگ ادب کو زلف خمدار سے لے کر مستئی رفتار تک چند موضوعات کے اندر محدود کر دیتے ہیں اور پھر اپنے لکنت زدہ قلم سے خطوط خمدار اور مریز وکجدار کی نمائش میں مصروف رہتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ادب کی دستار عظمت

www.abulhasanalinadwi.org

ان پر زیب نہیں دیتی ہے۔ آج ادب کی زرکار کرسیوں پر چند ایسے لوگ براجمان نظر آسکتے ہیں۔ جن کی فکر مستعار اور جن کی زبان ادھار ہے، جن کے لفظوں کی زبان، ہکلاتی ہے۔ اور جن کے قلم کا اسلوب تو تلاتا ہے اور جن کے فکر کا پائے چوبیں سخت بے تمکین ہے اور لڑکھڑاتا ہوا چلتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے گنتی کی چند کتابیں، گنتی کے چند موضوعات پر پڑھ لی ہیں اور ہجے کر کر کے گنتی کے چند مضامین بھی لکھ ڈالے ہیں اور بزعم خود یہ سمجھ لیا ہے کہ انھوں نے ادب کا ہفت خواں طے کر لیا ہے۔ اگر یہ معزز حضرات صرف تاریخ دعوت وعزیمت کی پانچ ضخیم جلدیں پڑھ لیں تو ان کو اپنی تہی دامنی اور علمی بے بضاعتی اور غربت مآلی وافلاس فکر ونظر کا پورا اندازہ ہو جائے گا۔ اور یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ تاریخ دعوت وعزیمت مولانا ابوالحسن علی کے سرمایۂ علم وادب کے خرمن کی محض ایک چھوٹی سی اکائی ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی تصنیفات کا مطالعہ متنوع سمتوں میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ نگارشات کے گلدستے میں قرآنی موضوعات بھی ملتے ہیں۔ سیرت نبوی کے موضوع پر کتابیں بھی نظر آتی ہیں۔ حدیث، تاریخ، علم کلام، سوانح وخاکہ نگاری اور اصلاحیات کے علاوہ خالص فکری موضوعات پر بھی مستقل تصنیفیں ملتی ہیں۔ انھوں نے عربی اور اردو دونوں زبانوں کا دامن ادب سے مالامال کیا ہے۔ سیرت سید احمد شہیدؒ ابتدائی عہد کی تصنیف ہے۔ اس کے بعد عربی زبان میں ان کی کتاب "ماذا خسر العالم" سامنے آئی جس نے مقبولیت کا ریکارڈ قائم کیا۔ انھوں نے اقبال کے کلام کا بہت خوبصورت عربی نثر میں ترجمہ کیا۔ پھر تاریخ دعوت وعزیمت کی جلدیں اور کئی دوسری وقیع کتابیں مولانا کے قلم سے نکلیں۔ ان کے قلم کی جوئے بار اور رودبار کو دیکھکر کسی خوش خرام پہاڑی ندی کا تصور سامنے آتا ہے جو گاتی ہوئی گنگناتی ہوئی عراق دل نشیں کے ساز کو چھیڑتی ہوئی سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی نخلستان کو شاداب اور کشت زاروں کو سیراب کرتی ہوئی چلتی ہے۔

مولانا کے علمی وتصنیفی کاموں میں تاریخ اور سوانح نگاری کا پلڑا زیادہ

www.abulhasanalinadwi.org

بھاری ہے۔ یہ کتابیں بے حد موثر ہیں اور پڑھنے کے بعد مدتوں کتاب کی خوشبو مشام جاں کو معطر کرتی رہتی ہے وہ سوانح نگاری کے فن سے واقف ہیں لیکن اس میدان میں وہ مغربی نظریے کے معترف اور مقلد نہیں۔ مغرب میں سوانح نگاری کا مطلب مثالب اور معائب کے دفتر کو محاسن کے پہلو بہ پہلو بلا جھجھک طشت ازبام کرنا ہے۔ لیکن اسلام کی تعلیم اس بارے میں بہت واضح ہے۔ اذکرو اموتاکم بالخیر کے حکم نے اصول متعین کر دیا ہے یہاں نہ تو تعریف و توصیف میں مبالغہ آرائی کی گنجائش ہے اور نہ بے ضرورت عیب چینی کی کسی شخص کے بارے میں یہ دونوں باتیں معیوب ہیں۔ اس کی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی۔ البتہ خالص علمی تنقید جائز و درست ہے۔ اخلاقی عیوب کا بیان ناپسندیدہ ہے۔ مگر یہ کہ جہاں شرعی ضرورت درپیش ہو۔ اسماء الرجال کے فن میں عیب چینی نظر آئے گی لیکن وہاں معاملہ گلستاں نبوت کی شیم آرائیوں کی پرکھ اور رد و قبول کا ہے۔ مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی سوانحی کتابوں پر مدلل مداحی کا الزام درست نہ ہوگا۔ ان میں غزالی کا تذکرہ ہو یا ابن تیمیہ کا محاسن و کمالات کے پیش کرنے کے ساتھ قابل مواخذہ پہلوؤں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

زبان رسالت نے علماء حق کو ورثۃ الانبیاء قرار دیا ہے۔ اسلام کی تاریخ در اصل ان ہی نفوس قدسیہ کی عالمانہ اور مصلحانہ کوششوں کے تسلسل کا نام ہے۔ اسلام کو دربار سرکار سے وابستہ کر دینا اور اس کا نام تاریخ اسلام رکھدینا اور پھر تاریخ کی ان کتابوں میں اصلاح و دعوت کی تحریکات کو یکسر نظر انداز کر دینا ایسا نظر فریب تخیل ہے جس میں عوام و خواص دونوں گرفتار ہو چکے ہیں۔ اگر یہ بات سمجھ میں آجائے گی تو تاریخ دعوت و عزیمت کی اہمیت بھی دوچند ہو جائے گی۔ پھر مولانا نے جس شخصیت پر بھی قلم اٹھایا ہے مواد اور معلومات کا اس کے بارے میں پورا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ صرف مطبوعات سے نہیں مخطوطات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ تحلیل و تجزیہ اور مقابلہ و محاکمہ بھی پایا جاتا ہے۔ بعض افکار و نظریات پر مولانا کی تنقیدی کتابوں میں الدین النصیحۃ کا اچھوتا اسلوب ہے یہ حریر و پرنیاں کا خیر خواہانہ اسلوب بیان ہے اور شائستگی قلم کی معراج،

www.abulhasanalinadwi.org

خلاق و شرافت کے بھی درجات اور مقامات ہوتے ہیں اور اس میدان میں بلند ترین مقام تک پہنچے بغیر ایسا اسلوب اختیار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مولانا کی سوانحی تصنیفات کو، جو چیز کہ ممیز اور ممتاز کرتی ہے وہ توازن اور اعتدال کا پہلو ہے۔ حیات عبدالحئی کا وہ باب جس میں مولانا شبلی اور مولانا عبدالحی کی آویزش اور اختلاف کا تذکرہ ہے۔ یا المرتضیٰ کا وہ حصہ جہاں مشاجرات صحابہ زیر بحث آتے ہیں اعتدال اور توازن کے پہلو کا آئینہ دار ہے۔ ان کا قلم ایسے پل صراط سے بڑی خوش اسلوبی سے گذرتا ہے اور ان کے دامن پر کہیں بے احتیاطی کا داغ نہیں لگتا ہے۔

مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے سوانحی لٹریچر میں زیر تذکرہ شخصیت کے عہد و ماحول کا بیان عموماً بہت مفصل نظر آتا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ شخصیت ماحول آفریں بھی ہوتی ہے اور ماحول کی آفریدہ بھی ہوتی ہے۔ یا صرف توفیق الٰہی کی آفریدہ اور پروردہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر نبی رحمت میں بعثت سے پہلے دنیا کا حال جتنا مفصل ملتا ہے۔ سیرت کی کم کتابوں میں نظر آتا ہے۔ یا مجدد الف ثانی کے زمانہ میں ہندوستان اور عالم اسلام کیا تھا، اس کی تفصیلات اور معلومات سے کتاب کے ابواب ثمر دار درخت کی طرح زیر بار نظر آتے ہیں اور اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ شاخ پر میوہ کی طرح کہیں سطریں خود خمیدہ اور حرف کے بوجھ سے کشیدہ نہ ہو جائیں۔

مولانا اپنی نگارشات میں بیک وقت عالم دین، مفکر اسلام، محقق، مصلح ادیب اور انشاء پرداز نظر آتے ہیں۔ وہ کسی موضوع پر اظہار خیال کریں ان کا قلم جابجا انشاء کے پھول کھلاتا ہے اور ادب کے موتی لٹاتا چلتا ہے، تاریخ میں مصلحین نے ادب کو ہمیشہ وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ جو لوگ ادب سے مستغنی رہ گئے ان کی تحریریں طاق نسیاں کا گلدستہ بن گئیں۔ اس میں بہت کم استثناء پایا جاتا ہے۔ آسمانی کتابیں ادب کا شاہکار ہوئی ہیں، احادیث رسولؐ جوامع الکلم کا نمونہ ہیں، حضرت علیؓ کا کلام بلاغت کا معیار ہے۔ حسن بصری امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی اور ابن جوزی کی تحریریں اور تقریریں ادب کے جوہر سے آراستہ نظر آتی ہیں ان کا قلم اتنا جاندار اور ان کی زبان اتنی روح پرور

ہے کہ صدیاں گذرنے کے بعد بھی ان میں زندگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے اور ان میں تجلی کی سی تاثیر پائی جاتی ہے انھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں اپنے سوزدروں سے اور اسلوب کے جمال وکمال سے دلوں کی دنیا کو زیروزبر کردیا تھا۔ حسن کلام ایک خداداد نعمت ایک قابلیت اور ایک ہتھیار ہے اور اصلاح وتجدید کا کام انجام دینے والے اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتے۔ افکار وکردار کی اصلاح کا کام ایک طرح کا آپریشن ہے۔ دل اور دماغ کا آپریشن، اس کے لئے پہلے طرز تحریر اور اسلوب واداکی گلابی کو شیشۂ دل میں اتارا جاتا ہے۔ تب کہیں جاکر عنان اپنے ہاتھ میں لی جاتی ہے۔ اور توسن دل کا قبلہ درست کیا جاتا ہے۔

مولانا کی تحریر وتقریر میں ادب کی جلالت اور آبشار کی روانی پائی جاتی تھی جابجا انشاء پردازی کے موتی چمکتے اور جھلملاتے نظر آتے تھے لیکن انشاء کی گل کاریاں بذات خود ان کے یہاں مقصود نہیں۔ چونکہ وہ داعی اور مصلح اور مجدد بھی تھے اس لیے ادب کو انھوں نے ذریعہ اور وسیلہ بنایا تھا۔ ان کی شخصیت کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ۔ کاروانِ زندگی'' ان کی دعوت وعزیمت '' کا جلی عنوان ہے۔ ان کی شمع کی جلوہ فگنی '' پرانے چراغوں '' کی ضیاپاشیوں کا مجموعہ ہے، ان کی حیات، شش جہات میں '' ارکان اربعہ '' کی اقامت کی صحبت، پیغام ہے، ان کی صحبتے با اہل دل ہے '''' اسلام اور مغربیت کی کشمکش '' میں وہ سپہ سالار اور تنہا لشکر جرار ہیں۔ ان کے اخلاق میں '' نبی رحمتؐ '' کے اخلاق کا پرتو ہے۔ اور عالمی مقبولیت کے باوجود ان کی فقیرانہ اور زاہدانہ زندگی میں '' سیرت المرتضیٰ '' کا عکس ہے۔ ان کے مفکرانہ قلم سے دنیا کو معلوم ہوا کہ '' انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال '' نے کیا اثر ڈالا ہے۔

مولانا کا اسلوب تحریر عالمانہ بھی ہے۔ اور مؤرخانہ بھی داعیانہ بھی اور مصلحانہ بھی، ان کے اسلوب کے اجزائے ترکیبی میں '' گل رعنا '' کی رعنائی، بالاکوٹ کا لہو ترنگ اساطین ندوۃ العلماء کا مؤرخانہ رنگ، مولانا مودودیؒ کے افکار کا آہنگ اور مولانا الیاسؒ کے دل کی دردمندی اہل تصوف کا سوزدروں اور اقبال کی ضرب کلیمی شامل ہے۔ پھر

www.abulhasanalinadwi.org

ان اجزاء پر گل ہائے سیرت کے عطر اور چشمۂ قرآن کے پانی کا چھڑ کاؤ کیا گیا ہے۔اوراس مجموعہ نے نام پایا ہے۔ مولانا موصوف ابوالحسن علی کی تصنیفات اور نگارشات کا۔

اردوزبان کی طرح مولانا عربی زبان کے بھی ادیب اور خطیب اور سحر طراز انشاء پرداز تھے ان دونوں زبانوں پر اس درجہ کی قدرت مولانا مسعود عالم ندوی کے سوا برصغیر میں شاید ہی کسی کو حاصل ہوئی ہو جہاں تک عربی تصنیفات کی کثرت کا معاملہ ہے تو برصغیر تو کیا عرب ملکوں میں بھی کم لوگ ان کے ہمپایہ ملیں گے۔دردمندی سوز دروں اوراخلاص نے ان کے اسلوب میں ایک خاص رنگ اور ایک خاص آہنگ پیدا کردیا تھااور ان کی کتابوں کے مطالعہ کرنے والے کو فکر کی بلندی کے ساتھ روحانی بالیدگی کا احساس ہوتا تھا۔ فکر ارجمند کے ساتھ دل دردمند اور زبان ہوشمند کے حسین امتزاج کی نظیر مشکل سے ملے گی۔اوراس بات کا اعتراف عربی زبان وادب کے ماہرین نے کیا ہے جن میں سید قطب بھی ہیں اور انور الجندی بھی علی طنطاوی بھی۔ شیخ یوسف القرضاوی مولانا کی عربی تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں تعبر عن حس رقیق وفکر عمیق وبیان انیق وعن رهافة الحاسة الادبية وعمق الحاسة الروحية عند الشيخ (قيمة الامة الاسلامية بين الامم صفحة ٣٦) یعنی مولانا کی تحریورں میں احساس اور جذبہ کی رقت دلکشی اسلوب فکر کی گہرائی اور ادب کا اعلیٰ ذوق اور بے پناہ روحانی کیفیت پائی جاتی ہے) شیخ محمد غزالی اس عہد کے بلند پایہ عالم اور مصنف ہیں وہ بھی مولانا کے اسلوب اور زبان سے متأثر ہیں لکھتے ہیں۔ لقد وجدنا في رسائل الشيخ لغة جديدة والتفاتا الى اشياء لم نكن نلتفت اليها (یعنی ہم نے مولانا کی تحریروں میں ایک بالکل نئی زبان اور ایک نئی روح کا احساس کیا مولانا کی اخاذ نظر ان چیزوں پر پڑتی ہے جن کی طرف ہماری نہیں پڑتی) مولانا کی کتاب ماذا خسر العالم کے پہلے اڈیشن پر مقدمہ احمد امین نے بغیر پڑھے ہوئے لکھدیا تھا جس میں یہ بھی لکھدیا تھا کہ شیخ ابی الحسن علی ہندوستانی نژاد ہیں اس وجہ سے تعبیرات میں سقم کا بھی امکان ہے عربی زبان وادب کے فیکلٹی کے ڈین

الدکتور رجب البیومی عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ الکتاب فی المنزلۃ العلیا من الاسلوب البیانی المشرق وتعبیرہ الساحر لایبلغہ باحث کبیر کالدکتور احمد امین (حقیقت یہ ہے کہ کتاب روشن بیانیہ اسلوب اور سحر انگیزی میں اس درجہ پر فائق ہے کہ ڈاکٹر احمد امین جو صرف ایک محقق اور مؤرخ ہیں اسلوب کی اس طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں) وزیر الاعلام السعودی ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی نے عربی زبان وادب میں مولانا کے مقام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے فاتقنھا اتقان اھلھا المتخصصین فیھا بل فاق فی اتقانہ لھا اتقان اھلھا فکان فصیحا بلیغا ولہ اسلوب عذب وعبارات بلیغۃ (یعنی مولانا عربی زبان کے عرب ادباء او متخصصین کی طرح زبان پر قدرت رکھتے تھے بلکہ ان پر فائق تھے ان کے یہاں فصاحت اور اسلوب کی دلآویزی اور کلام کی بلاغت کی پائی جاتی تھی یہاں بہت زیادہ حوالوں اور اقتباسات کی ضرورت نہیں ہے مولانا کے سر پر عظمت کا تاج عرب ادباء اور شعراء اسی وقت رکھ چکے تھے جب ادب اسلامی کی عالمی تحریک (رابطہ ادب اسلامی) کی صدارت کے لیے متفقہ طور پر ان کا نام انھوں نے پیش کیا تھا۔ ہندوستان اپنے اس اعزاز پر جتنا ناز کرے کم ہے۔ انگریزی زبان میں لکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن کیا کسی ہندستانی رائٹر کو برطانیہ کے اہل ادب کے درمیان یہ مقام بھی حاصل ہو سکا ہے؟ اور کیا کسی ہندوستانی مصنف کی کوئی کتاب یورپ کے ادبی نصاب میں داخل ہو سکی ہے؟

مولانا نور عالم خلیل امینی عربی میں کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں اور ماہنامہ الداعی کے مدیر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں!

''میں نے صرف اردو میں نہیں عربی میں بھی تحریر کے بادشاہوں کو پڑھا ہے تقریر کے جادوگروں کو سنا ہے الفاظ کے شہنشاہوں کو برتا ہے، فصاحت اور بلاغت کا دریا بہانے والوں کا تجربہ کیا ہے مطالعہ اور معلومات کی گمنام اور تاریک سرنگوں میں بے خطر بہت دور تک چلے جانے والے بہت سے لوگوں کا علم ہے لیکن خدا اور رسولؐ کو گواہ بنا کر کہنے دیجئے کہ تحریر و تقریر کے لفظ لفظ نہیں حرف حرف پر اور ہر زیر و بم پر خلوص کا

www.abulhasanalinadwi.org

جو حسن ایمان ویقین کی جو مہر تابی دردِ دل کی جو لذت انسانوں سے محبت کا جو جمال کلمۃ اللہ جو جلال صداء حق کی جو دلنوازی اور سوز دروں کی جو تمازت اور فقر غیور اور زہد پر نور کی جو جاذبیت وحرارت میں نے مولانا علی میاںؒ کے یہاں محسوس کی وہ میرے محدود علم ومطالعۂ میں کسی کے یہاں نہیں ملتی۔

(ماہنامہ دار العلوم فروری ۲۰۰۰)

ترجمان القرآن (پاکستان) کے ایڈیٹر پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

مولانا علی میاںؒ ایک نامور عالم دین ایک بلند پایہ مصنف ودانشور اور ایک صاحب طرز ادیب ایک سحر انگیز خطیب ایک منفرد مؤرخ اور سیرت نگار تھے لیکن سب سے بڑھ کر وہ ایک داعی ایک مصلح اور ایک صاحب دل مزکی اور مربی تھے ان تمام اوصاف کے اجتماع نے ان کو بیسویں صدی کے اسلامی احیاء کے معماروں میں ایک درخشاں مقام پر متمکن کیا۔ ان کے یہاں علامہ اقبال کا سوز وگداز مولانا مودودی کی عقلیت اور تصور دین کی جامعیت علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کا ذوق تاریخ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ مولانا الیاسؒ مولانا عبد القادر رائپوری اور مولانا محمد ذکریاؒ کی روحانیت کا امتزاج نظر آتا ہے علی میاںؒ کے یہاں یہ سب ایک دوسرے کے ناقض نہیں ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے جسے ناقدین علم وفن نے نظر انداز کر دیا ہے۔ مولانا علی میاںؒ کا اصل میدان تاریخ اور دعوت ہے، سیرت اور انسان سازی ہے، روح کی بیداری اور ملت کی ترقی کے لیئے اسلاف کے نمونے کا احیاء ہے۔ ان کے یہاں خانقاہ اور جہاد، تزکیہ اور انقلاب دونوں دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں"

آگے پروفیسر خورشید احمد نے مولانا مودودی اور مولانا علی میاںؒ کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے لکھتے ہیں۔

"میں نے مولانا مودودی اور مولانا علی میاںؒ دونوں
کے افکار اور کارناموں سے خوشہ چینی کی ہے لیکن
دونوں کے مزاج اور اسلوب میں جو فرق تھا اسے میں

www.abulhasanalinadwi.org

کبھی کبھی اس طرح بیان کرتا ہوں کہ مولانا مودودی
انسان کے دماغ کے ذریعہ اس کے دل میں اترتے ہیں
اور قلب و نظر پر چھاجاتے ہیں جب کہ مولانا علی
میاںؒ دل کے راستہ فکر و نظر کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں
اور روح کو تازگی فراہم کرتے ہیں۔"

(ترجمان القرآن فروری ۲۰۰۰)

مولانا کی نگارشات کے ادبی حسن کی داد غلام رسول مہر، مولانا عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی اور ماہر القادری اور متعدد اہل قلم نے دی ہے لیکن یہ سارے اہل قلم وہ ہیں جن پر ستم ظریفوں نے وعظ کہنے کا یا اسلامیت کا "الزام" لگایا ہے۔ اس لئے اقتباس صرف ایک ناول نگار اور یونیورسٹی کے استاد قاضی عبدالستار کی تحریر کا پیش کیا جارہا ہے۔ جن کا نام شعر و ادب کی دنیا میں ایسے "الزام" سے اور تہمت بے نام سے "محفوظ" ہے۔

"ہمارے طاق بے نیازی پر سجے ہوئے کچھ نگار جیسے سید سلیمان ندوی، سید ابوالاعلی مودودی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایسے مشاہیر روزگار ہیں اور ان کے نقش پائے رنگ رنگ اتنے جلی اور اتنے روشن ہیں کہ معمولی تفہیم و تحسین کے لیے بھی جلدیں درکار ہیں" ایک عالم دین کے قلم کی داد میخانۂ ادب کے رند کی زبان سے بہت سے لوگوں کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے۔

حوروں کی ثنا رند جو کردیں تو سند ہے
یہ بات بری لگتی ہے واعظ کی زباں سے

رب کریم واکرم نے تعلیم بالقلم کی صفت کو اپنی کتاب میں اپنے تعارف کا ذریعہ بنایا ہے۔ اسی رب نے بے شمار انسانوں کو قلم کے ذریعہ معلّمی کے صفت سے بہرہ ور کیا۔ تاریخ کے ان خوش نصیب انسانوں میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا نام بھی لکھا جائے گا۔ افسوس کہ وہ قلم رک گیا جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک تاریخ انسانی کی

برگزیدہ شخصیتوں کے تابندہ نقوش لوگوں کو دکھلاتا رہا اور زبان حال سے کہتا رہا 'بایھم اقتدیتم اھتدیتم' افسوس کہ وہ قلم رک گیا جو تیغ اصیل بن کر اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش میں مغرب کی بالادستی کے خلاف نبرد آزما رہا۔ صرف وہ قلم ہی نہیں رکا وہ قدم بھی رک گئے جو مشرق و مغرب ہر چار سو چار دانگ عالم میں دین اسلام کا پیغام سنانے کے لئے سائیکا کے سخت تکلیف کے باوجود مسلسل سرگرم سفر رہا کرتے تھے۔ وہ زبان بھی اب رک گئی جو صور اسرافیل بن کر مردہ دلوں کو جگاتی اور حیات نو کا پیغام سناتی تھی۔ میر لشکر نے آخر دم تک مصروف جہاد رہ کر، بیسویں صدی کے مجدد نے آخر وقت مصروف تجدید رہ کر داعی اجل کو لبیک کہا موت سے کس کو رستگاری ہے۔

اب ان کے خلفاء تلامذہ اور متنسبین کی ذمہ داری ہے کہ ان کے دینی اور دعوتی مشن کو اسی جوش کے ساتھ اور اسی غیرت و حمیت کے ساتھ اور اسی عزیمت اور حمت کے ساتھ اور اسی اخلاص واحتساب کے ساتھ جاری رکھیں جو مولانا کا امتیاز خاص تھا تاکہ شاعر کا یہ شعر حقیقت بن سکے۔

گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جام آتشیں
رات دن گردش میں رندوں کی بھری محفل میں ہے

www.abulhasanalinadwi.org

ادب اسلامی کا انکشاف اور اسکی سرپرستی

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی مکۃ المکرمہ

''اگر کسی ادیب کے ذوق کا اندازہ اسکی پسند سے کیا جاسکتا ہے تو ہمارے قارئین کے علم میں یہ بات لانا کافی ہوگا کہ ابھی تھوڑے عرصہ کی بات ہے کہ ادبی منتخبات کے متعدد مؤلفات کا اہم لوگوں نے جائزہ لیا تاکہ ان میں سے کسی ایک مجموعہ کو شام (سوریہ) کے سرکاری اسکولوں کے ثانوی درجات کے لیے نصاب میں داخل کریں اس کمیٹی کے تمام ممبروں نے اس طرح کے نظم و نثر کے منتخب مؤلفات کی چھان بین شروع کی اور واضح رہے کہ اس کمیٹی کے تمام ہی ممبران ادیب اور اساتذہ ادب تھے جن کی نظر سے بیسیوں مجموعے گزر چکے تھے۔ ان ممبران نے متفقہ طور پر جس ''مجموعہ نثر'' کو پسند کیا وہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تالیف مختارات تھی''۔

عربی کے مشہور اور سربرآوردہ انشاء پرداز و ناقد صاحب اسلوب عالم سید علی طنطاویؒ نے یہ سطریں ''مختارات'' کے سلسلے میں تحریر فرمائی تھیں۔ اسی طرح ریاض کے مشہور ادیب و شاعر اور صاحب قلم علامہ عبدالعزیز الرفاعی وزارت خارجہ سعودیہ کے شعبۂ سیاسیات کے ایک زمانہ تک انچارج رہے۔ اور ''صاحب المعالی'' (آنریبل) ان کے نام کے ساتھ لکھا جاتا تھا، اور ریاض میں وہ ہر ہفتہ ایک ادبی نشست اپنے یہاں منعقد کرتے تھے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد انہوں نے ایک مکتبہ (دارالکتب) قائم کیا تھا جس میں مختصر کتابی سائز کے ادبی و تاریخی مجموعات شائع کیا کرتے تھے۔ انہی کتابوں میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی سیرت پر ایک کتاب بھی مرتب کر کے شائع کی تھی۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

''میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا ذکر بارہا پڑھ چکا تھا انکی عظمت کا قائل اور انکے صدق و صراحت کو ایک تاریخی مثال سمجھتا ہوں مگر یہ کہ وہ ادیب تھے یا انکی نثر ادبی مقام رکھتی ہے اسکا مجھے کبھی خیال بھی نہیں تھا۔ مگر سماحۃ الشیخ ابوالحسن علی ندویؒ نے 'ان کی طویل کہانی خود ان کی زبانی' حدیث سے نقل کر کے میری آنکھیں کھول دیں اور پہلی بار پتہ چلا کہ کعب بن مالکؓ کی کہانی ایک عظیم ادبی ورثہ ہے''۔

www.abulhasanalinadwi.org

بات یہ ہے کہ اب تک لوگ صرف انہی ادبی ٹکڑوں کو ادب میں شمار کرتے تھے جن کے اندر تصنع ہو، قافیہ بندی، ضلع جگت اور محاورات وامثال کا استعمال ہو، اور خاص طور پر نامانوس (غریب) الفاظ یکجا کیے گئے ہوں اور ان کو عام معمول اور روز مرہ سے ہٹ کر خاص نحوی ترکیب سے سجایا گیا ہو، یا مرادفات کی کثرت ہو۔ مگر جہاں روز مرہ کی بولی ہو، بے ساختہ گفتگو ہو، ذہنی و قلبی کیفیات کو بغیر کسی تصنع کے بے ساختہ بیان کیا گیا ہو اس کو ادب میں نہیں شمار کیا جاتا تھا، البتہ اس کے نمونے احادیث میں ملتے ہیں یا تاریخ کی مستند کتابوں میں جہاں آپس کے مکالمات نقل کیے گئے ہوں۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہ نے صحاح سے ایسے خطبات اور آپس کی گفتگو کو جمع کر دیا جو عجم کیا خود عربوں کے لیے ایک انکشاف کا درجہ اختیار کر گیا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے دور تدریس میں اس کا شدید احساس رہا کہ "ادب اپنے اندر عظیم تعمیری و تخریبی طاقت رکھتا ہے، اس سے ایک طرف عقائد صحیحہ کی استواری اور صحت مند وصالح رجحانات کی آبیاری کا کام لیا جاسکتا ہے تو دوسری طرف اخلاقی اور انسانی قدروں پر تیشہ زنی اور ذہنی و معاشرتی انتشار کا بھی۔ اور ہر دور میں اسکی روشن اور ناقابل انکار شہادتیں ملتی ہیں، لیکن اس دور میں ادب کی (اپنے وسیع معنی میں) جدید طاقتور وسائل کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے جہانگیری اور فرماں روائی بہت بڑھ گئی ہے اور عرصہ سے دیکھا جا رہا ہے کہ جس طرح کبھی فلسفہ کے راستہ سے الحاد و تشکیک کا سیلاب مسلمانوں کے علمی و فکری طبقہ میں آتا تھا، اسکے بعد سائنس (خاص طور پر علوم طبعیہ) کے راستہ سے تعلیم یافتہ طبقہ میں آنے لگا، اور کہیں کہیں نفسیات (سائیکولوجی) اجتماعیات (سوشیالوجی) اور اقتصادیات و سیاسیات کے راستہ سے آتا تھا اور بہت سی جامعات اور دانشگاہوں میں ادب کے ذریعہ سے آرہا ہے"۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"خاص طور پر یہ بات فکر و دعوت اسلامی کے حاملین کے لیے تشویش کا باعث تھی کہ بلاد عربیہ بالخصوص مصر میں تقریباً نصف صدی سے ادب و تنقید اور نوجوانوں کو ذہنی و ادبی غذا پہنچانے کے میدان پر ان ادباء اور اہل قلم کی اجارہ داری قائم ہو گئی تھی جن کے عقائد خود متزلزل، ذہن میں انتشار اور تحریروں میں تشکیکی رجحان پایا جاتا تھا۔ اس لیے ضرورت تھی کہ عربی ادب کے خزانۂ عامرہ سے وہ طاقتور اور دل آویز ادبی و تحریری نمونے نکالے جائیں اور انکو نمایاں کیا جائے جنکو

www.abulhasanalinadwi.org

سہولت پسندی اور قدیم مؤرخین ادب کی پیروی میں نظر انداز کر دیا گیا، یا اس تصور میں کہ وہ کسی عالم و داعی اور دینی شخصیت کے قلم سے نکلے ہیں انکو 'ایوانِ ادب' سے دور کر دینے کی یا الگ رکھنے کی سزا دی گئی اور صدیوں ان پر پردہ پڑا رہا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ کے سامنے یہ حقائق عیاں تھے کیونکہ نوعمری سے عربی ادب سے اور عربی انشاء پردازوں سے آپ کا ذہنی ربط رہا تھا، یہ باتیں انکے لیے سنی سنائی نہیں بلکہ ایسی چشم دید تھیں کہ وہ ان کو پڑھتے اور دل ہی دل میں کڑھتے۔ اس نام نہاد ادبی و تحقیقی کاوش کی زد جس طرح اسلامی عقائد پر پڑ رہی تھی اسکو دیکھ رہے تھے اس لیے حضرت نے عرب کے مشاہیر علم و فن کو دعوت دی کہ وہ ایک جگہ جمع ہو کر اس کا حل نکالیں اور اخلاقی قدروں کو ابھارنے کی کاوش کریں۔ یہی اس دعوت کی اصل روح تھی جو آپ نے ۱۹۸۱ء (۱۷۔۱۹ر اپریل) علمائے ادب کو دی کہ وہ ندوۃ العلماء میں آکر ایک نقشۂ عمل تجویز کریں، یہ ایک بین الاقوامی سیمینار تھا جس میں حضرت مولانا کی دعوت پر عرب کے چوٹی کے ادباء اور اہل فکر جمع ہو گئے تھے جنکی تعداد ۳۸ تھی ان میں سے ہر ایک اپنے طبقہ کا نمائندہ اور اپنے علمی و ادبی کارناموں کی وجہ سے مشہور تھا۔ ڈاکٹر احمد رافت باشا جنہوں نے "الشعر الاسلامی"، "النثر الاسلامی" اور "صور من حیاۃ الصحابہ" کے نام سے ایک کتب خانہ تیار کر دیا ہے اور چالیس پچاس اسکالرس نے انکی زیر نگرانی کسی ادبی عنوان پر پی ایچ ڈی کیا ہے۔ انکے علاوہ علامہ احمد الرفاعی جنکا اوپر ذکر آچکا ہے شام کے عظیم مؤلف شیخ عبد الرحمٰن بن حسن الحنکہ، حکومت قطر کے دینی امور کے ناظم شیخ عبد اللہ ابراہیم الانصاری اور متعدد یونیورسٹیوں کے اساتذہ جو شعبہ عربی ادب کے صدر تھے اس سیمینار میں شریک تھے، جن لوگوں نے ۱۹۸۱ء کا وہ اجتماع دیکھا ہے ان کو یاد ہو گا کہ اس وقت ندوہ کی محدود سرزمین بحر عرب کا ایک جزیرہ معلوم ہوتی تھی۔ اس موقع پر جو مقالات پیش ہوئے ان میں ڈاکٹر محمد زینی ام القری یونیورسٹی کے استاذ ادب کا رسالہ "الادب الاسلامی" تین سو صفحہ کا کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح علامہ الشیخ عبد الرحمٰن حسن الحنکہ کی کتاب "روائع الادب الاسلامی" اس سیمینار کی یادگار ہے۔ اس موقع پر عربی ادب کے صحیح رُخ کو سامنے لانے کی ایک کوشش کے طور پر ایک مستقل مجلس حضرت کی صدارت میں تشکیل پائی۔ موجودہ ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع ندوی الحسنی سکریٹری اور ان کے برادر خورد، عربی زبان کے مقبول صحافی مولانا

www.abulhasanalinadwi.org

واضح رشید ندوی جوائنٹ سیکریٹری ہوئے۔ ہندوستان کے متعدد علماء وادباء شریک تھے۔ ناچیز راقم الحروف کو یہ خوشی تھی کہ اسکے استاذ کبیر اور محسن مولانا محمد ناظم صاحب کراچی سے تشریف لائے تھے اور جس وقت ایک مصری استاذ نے جو جامعۃ القاہرۃ میں عربی کے پروفیسر تھے (نام بھول رہا ہوں) نے ندوۃ العلماء کے ادبی احسانات کا ذکر پوری کشادہ دلی کے ساتھ اور فصیح و بلیغ انداز سے پیش کیا تو ہمارے استاذ محترم مولانا محمد ناظم صاحب مدظلہ نے موصوف کو گلے سے لگالیا۔

"مختارات" کا مقدمہ اور وہ مقالہ جو حضرت مولانا نے دمشق کی "المجمع العلمی الادبی" کے رکن ہونے کے بعد لکھا تھا۔ اور یہ ان تینوں نے ادب اسلامی کی فضا قائم کردی جسکا اعتراف عرب ممالک نے اس طرح کیا کہ جامعۃ الملک عبدالعزیز جدہ نے ۱۹۸۲ء میں ادب اسلامی کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد کیا، اور یہ آواز نامانوس اور اجنبی نہیں رہی کہ دعوت دین کے لیے ادب کو ذریعہ بنایا جائے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت الباشا صدر شعبۂ ادب عربی جامعہ امام محمد بن سعود نے کئی سال پہلے شعبہ کے اساتذہ کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ادب اسلامی کی عالمی تنظیم ہونا چاہئے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے حضرت والا سے کہلوائی تھی اور وہ اسکے بڑے محرک وداعی تھے۔ ان کے مطالعہ کا حاصل یہ تھا کہ ادب اسلامی کے نقطۂ نظر سے اور ادب عربی میں اسلامی عناصر تلاش کرنے کے لیے ادب عربی اور عربی زبان کے اسلامی کتب خانہ کو دوبارہ کھنگالنے اور اسکا از سر نو جائزہ لینے کا سب سے پہلے خیال "مختارات" کے مقدمہ اور اس مضمون سے ہوا جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے دمشق کی المجمع العلمی العربی کے رکن ہونے کے بعد ۱۹۵۷ء میں لکھ کر پیش کیا تھا اور وہ مقالہ المجمع العلمی کے سہ ماہی رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر باشا نے خود سالہا سال اسی لائن پر کام شروع کر رکھا تھا اور الشعر الاسلامی کے عنوان سے اپنے طلبہ کو ڈاکٹریٹ کے مقالے لکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ چنانچہ انکی رہنمائی میں چار اساتذہ ادب نے اس پر کام کیا اور انکے رسائل (جو ضخیم کتابوں کی حیثیت رکھتے ہیں) شائع ہو چکے ہیں۔

۷ر مئی ۱۹۸۴ء کو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ عمان (اردن) سے مکہ مکرمہ واپس تشریف لائے ہوئے تھے اور یمن کا سفر ہونے والا تھا، وہاں کے مکتبۃ التوجیہ والارشاد نے دعوت دی تھی اور سعودی عرب میں مقیم علمائے یمن نے انتظامات مکمل کر لیے تھے جن میں ڈاکٹر عبداللہ قادری

www.abulhasanalinadwi.org

استاذ ادب عربی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ بھی تھے (موصوف یمن کے رہنے والے خالص سلفی عقیدہ و مزاج کے عالم وادیب تھے۔ لفظ قادری سے دھوکا ہوتا ہے کہ ہندوستانی نسل کے کسی "قادری" نسبت رکھنے والے خاندان سے تعلق ہو۔۔) اسی زمانہ میں جب کہ حضرت مولانا کا قیام مکہ میں تھا اور انکے رفیق سفر مولانا سید محمد واضح رشید ندوی تھے جو اب دار العلوم میں صدر شعبہ ادب عربی ہیں۔ حضرت مولانا سے ملنے کے لیے ممتاز علماء کا گروہ آیا یہ وفد ریاض کی امام محمد بن سعود یونیورسٹی اور مدینہ منورہ کے اساتذہ ڈاکٹر عبد الباسط، استاذ حیدر غدیر اور ڈاکٹر عبد القدوس ابو صالح پر مشتمل تھا۔ یہ حضرات ریاض اور مدینہ سے خاص اسی غرض سے مکہ مکرمہ آئے تھے۔ انہوں نے رابطہ ادب اسلامی کے اغراض ومقاصد بیان کیے اور اسکے آئین کا مسودہ پیش کیا اور حضرت سے اسکی سرپرستی قبول کرنے اور اس رابطہ کو ایک بین الاقوامی تنظیم کی حیثیت سے قائم کرنے کی اجازت دینے کی خواہش کی اور یہ بھی اس جلسہ میں طے پایا کہ عرب دانشوروں کی ایک کمیٹی بنادی جائے نیز مراکش اور الجزائر سے لیکر خلیج کی ریاستوں کے ادباء اور اہل قلم کو شرکت ورکنیت کی دعوت دی جائے اور آئندہ سال اس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہو۔ حضرت مولانا نے یہ تجویز منظور فرمائی کہ اس کا صدر مقام سر دست لکھنؤ ندوۃ العلماء میں ہو اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو اس کا سکریٹری جنرل منتخب فرمایا۔ مولانا رابع میاں اس وقت کلیۃ اللغۃ العربیہ کے صدر شعبہ تھے۔ ندوۃ میں اسکا صدر دفتر ہونے کی وجہ سے اور مولانا سید محمد رابع حسنی (موجودہ ناظم ندوۃ العلماء) کے سکریٹری جنرل ہونے کی وجہ سے اردو ادب بھی پہلے ہی دن سے اس رابطہ میں داخل ہو گئی۔ اگرچہ اسکی بنیاد مکہ مکرمہ میں پڑی تھی اس کے محرک مصر، شام اور سعودی عربیہ کے اساتذہ ادب تھے اور اس وقت تک کام عرب ممالک میں پیش نظر تھا لیکن حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کے صدر اور ندوۃ العلماء کے صدر دفتر ہونے کی وجہ سے اردو کے مذاکرے، سیمینار اس پابندی اور کثرت سے ہوئے کہ ہندوپاک کے لوگ سمجھنے لگے کہ یہ اردو ادب کو اسلامی بنانے کی تحریک ہے۔ کچھ لوگوں نے سمجھا کہ کمیونسٹوں نے "نیا ادب" کے عنوان سے جو پروپگنڈائی لٹریچر اور مخرب فکر واخلاق حماقتیں شروع کررکھی تھیں اس کا جواب ہے۔ حالانکہ اس کی ابتدائی فکر جو "مختارات" اور مجمع علمی دمشق کے لیے تحریر کردہ مقالہ اور ندوہ کے سیمینار ۱۹۸۱ء سے ہوئی۔ اس کا مقصد عربی لٹریچر سے ایسے عناصر کو جمع کرنا تھا جن سے فکر کی دینی تربیت ہو سکے۔

www.abulhasanalinadwi.org

بہر حال اس رابطہ ادب اسلامی کی مجلس عاملہ کے جلسے مدینہ منورہ میں ہوتے رہے اور اب بھی ہوتے ہیں۔ عربی ادب کا ایک معیاری رسالہ "الادب الاسلامی" ریاض سے، مراکش سے "المشکاۃ" (مشکوٰۃ) نامی ماہنامہ نکلتا ہے۔ اور اردو میں "کاروانِ ادب" ندوہ لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے جلسے ہندوستان کے متعدد صوبوں اور بڑے بڑے شہروں میں ہو چکے ہیں۔ ہندوستان سے باہر بنگلہ دیش اور پاکستان میں بھی ہوئے ہیں۔ عربی سیکشن کی طرف سے ترکی میں دو اجلاس ہوئے۔ ایک اجلاس خاص حضرت مولانا کی حیات و کارنامہ پر سیمینار کے طور پر ہوا۔ قاہرہ میں کامل کیلانی کو بچوں کا اسلامی لٹریچر تیار کرنے پر ایوارڈ دینے کے لیے ایک جلسہ منعقد ہوا اور ہندوستان میں منعقد ہونے والے جلسوں میں شعبہ عربی کے نائب صدر اور ناظم ڈاکٹر عبد القدوس صالح، استاذ جامعۃ الملک سعود یونیورسٹی، اساتذہ ادب میں ڈاکٹر عبد الباسط بدر، استاذ بریغش اور دوسرے عظیم مہمانوں میں استاذ محمد محمود حافظ، استاذ ابو طعمہ اور اسلامیات کے پروفیسر اور صاحب قلم ادیب احمد محمد جمال دوبار یہاں آئے ان جلسوں کی روداد یں اگر مرتب کی جائیں تو ایک مستقل کتاب بن جائے۔ بہر حال اب یہ ایک منظم تحریک ہے اور اپنا کام کر رہی ہے۔ اس کے نمائندوں میں ڈاکٹر عبد القدوس صالح اور الاستاذ بریغش اور متعدد اساتذہ نے ادبی کتابیں لکھی ہیں ان کا احاطہ کرنا ایک مستقل کام ہے۔

صدر مجلس رابطہ ادب الاسلامی عالمی کی وفات کے بعد اس رابطہ کے نائب صدر ڈاکٹر عبد القدوس نے تعزیتی مقالہ الشرق الاوسط میں لکھا۔ اور رابطہ کی طرف سے نعی[1] شائع کی۔ ایک اہم رکن ڈاکٹر عبد الباسط بدر کو تعزیت کے لیے تکیہ رائے بریلی بھیجا جنھوں نے حضرت کے قائم مقام مولانا سید محمد رابع حسنی اور آپ کے افراد خانہ اور تمام مسلمانانِ ہند سے تعزیت پیش کی۔

حاشیہ:

(۱) 'نعی' موت کی خبر دینے کو کہتے ہیں مگر عرب ممالک میں ایک صحافتی اصطلاح ہے کہ تعزیتی کلمات پر مشتمل بیان شائع کیا جائے، اور ایک شخص کے لیے (حسب حیثیت) متعدد بار مختلف الفاظ میں 'نعی' شائع ہوا کرتی ہے، کوئی بڑا تاجر یا شاہی خاندان کا فرد وفات پاتا ہے تو ہفتوں "نعی" مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہوتی رہتی ہے، حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کے لیے رابطہ عالم اسلامی اور رابطہ ادب اسلامی کی طرف سے متعدد بار مقامی اخبارات میں نعی شائع ہوئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رح اور نصابی ادبیات

ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی
شعبہ عربی اے ایم یو علی گڑھ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے علم وفن کے مختلف محاذ پر کام کیے تعلیمی میدان میں ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے مشہور ہوئے عربی کا ایک ایسا نصاب تیار کیا جو ہندوستانی طلبہ کے لئے حددرجہ مفید ہے اس سے قبل ہندوستان میں عربی پڑھنے والے طلبہ کے لئے کوئی ایسا نصاب نہیں تھا جس کے خطوط پر طلبہ کی عربی زبان وادب کے ساتھ ساتھ دینی تربیت بھی ممکن ہو، مولانا ندوی کا خیال یہ ہے کہ بچوں کی ذہنی اور فکری تربیت کا سب سے قیمتی سامان یہ ہے کہ قصص الانبیاء، مختلف دینی اور اسلامی تاریخ کے واقعات اور مسلم مفکرین اور اصحاب علم وفن کی فکری کاوشوں کو اس ڈھنگ سے پیش کیا جائے کہ زبان وادب کی تہذیب وتربیت کے ساتھ ساتھ طلبہ کی روحانی اور وجدانی فکر کو بھی پوری پوری غذا ملتی رہے ۔

مولانا نے نصاب تعلیم کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کی پہلی کڑی علامہ شبلی نعمانی کا سفرنامہ روم ومصر وشام ہے جس کا آغاز ۱۸۹۲ء میں ہوا تھا، وہاں جاکر مولانا کو یہ احساس ہوا کہ مسلمانوں کا ایسا نصاب ترتیب دیا جائے جس میں ایک طرف یورپ کے تمام جدید علوم وفنون کی تعلیم ہو اور دوسری طرف خالص اسلامی علوم کی اور طریقۂ تربیت اور درسگاہوں

www.abulhasanalinadwi.org

کا ماحول تمام تر مذہبی ہو، اگر ساری قوم کی تعلیم کا یہ بندوبست نہ ہو تو کم از کم عربی درسگاہوں میں ایسی اصلاح کی جائے[۱] دوسری طرف مولانا نے فرمایا کہ بلاد عربیہ میں بولی جانے والی عربی زبان میں کافی تبدیلیاں آچکی ہیں، اگر ہندوستان کے علماء ان تبدیلیوں سے ناواقف رہے تو وہاں سے شائع ہونے والے اخبارات و مجلات اور تصانیف سے استفادہ کرنا ممکن نہ ہوگا، چنانچہ مولانا کی کوششوں سے بہت سے اخبارات اور مجلات ندوہ میں آنے شروع ہوئے ان میں شائع ہونے والے بہت سے مقالات کو علامہ نے اردو میں منتقل کرا کے الندوہ اور دیگر مجلات کی زینت کا سامان بنایا، اپنے سفرنامہ میں جدید عربی ادب کے بہت سے الفاظ نقل کر کے یہ بتایا کہ اب یہ الفاظ ان معانی کے لئے مستعمل ہیں[۱] ۔ چنانچہ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے یہ طے کیا کہ عربی زبان کو ایک زندہ اور جیتی جاگتی زبان کی حیثیت سے پڑھا پڑھایا جائے تاکہ عربوں کے اندر دعوت و تفہیم کا کام کیا جاسکے اور طلبہ کے اندر عربی خطابت کا اور تحریر کا ملکہ پیدا کیا جاسکے علامہ شبلی مولانا سید عبدالحی سے فرماتے ہیں کہ "چند طلبہ کو عربی تقریر کی مشق کا حکم دیجئے"[۲] علامہ شبلی نے ۱۹۰۵ء میں جب باقاعدہ معتمد دارالعلوم کا عہدہ سنبھالا اور ندوہ میں قیام کر کے جدید نصاب کا اجراء کیا جسمیں علوم اسلامیہ، علوم قرآنی، عقائد، فلسفہ اور اسرار شریعت سے متعلق بعض نئی کتب داخل نصاب ہوئیں اور اسی کے ساتھ ساتھ عربی ادب اور فن بلاغت پر خصوصی زور دیا گیا، چنانچہ مولانا کے دور معتمدی میں جو تعلیمی ترقیات ہوئیں انہی میں یہ چیز بھی شامل تھی کہ جدید عربی کی تعلیم، اس میں تحریر و تقریر کی مشق، جدید عربی ڈکشنری کی تیاری اور علمی موضوعات پر لکھنے اور بولنے کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے[۳] اور ۱۹۰۸ء میں جدید عربی تعلیم کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی کا انتخاب ہوا اور علامہ شبلی نعمانی کی تجویز کے مطابق جدید عربی الفاظ اور اصطلاحات کو عام کرنے کے لئے دو ابتدائی رسالے دروس الادب کے نام سے لکھے اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں ندوہ کی قرارداد کے مطابق جدید الفاظ و لغات کی ایک ڈکشنری تیار کی جسے ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں پیش کیا گیا جس کے صدر علامہ رشید رضا مصری تھے[۴] جو اس وقت "لغات جدیدہ"

www.abulhasanalinadwi.org

کے نام سے علمی دنیا کے سامنے موجود ہے اس لغت کا عربی مدارس میں جدید عربی زبان و ادب کے نشو ونما میں نمایاں کرادار رہا ہے ۵ؔ

۱۹۳۱ء میں ندوۃ العلماء کی نظامت جب مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی کے کاندھوں پر آئی تو ایک بار پھر نصاب تعلیم کی طرف پورے عزم کے ساتھ توجہ کی گئی اور آپ کے تیس سالہ دور نظامت میں اصلاح نصاب کے سلسلے میں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں، ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے عربی زبان اور قواعد کی تعلیم میں تبدیلی کی اور اس پورے دور میں صرف ایک نئی کتاب ''دروس الادب'' (۱-۲) منظر عام پر آسکی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لیکن ایسی کتابوں کی ترتیب روبعمل نہ آسکی جو عربی نثر و ادب کے نصاب کی تکمیل کریں اور عربی ادب کے مختلف عنوان اور اسالیب بیان کو پیش کریں اور ان سے طلبہ کے اندر تقریری اور تحریری ملکہ پیدا ہو اس وقت تک نصاب میں اخوان الصفا، تاریخ دول العرب والاسلام، سیرۃ مغلطائی، اطواق الذہب پڑھائی جاتی تھیں اور نظم میں دیوان ابوالعتاہیہ داخل تھا اس کے بعد نثر میں حریری اور نظم میں حماسہ اور معلقات کا دور آجاتا تھا لیکن مذکورہ نصاب سے تحریری اور تقریری صلاحیت کا پیدا ہونا ممکن نہ تھا، اس کو بروئے کار لانے کیلئے مولانا علی میاں نے ندوۃ العلماء کی ایک مجلس انتظامی میں یہ تجویز پیش کی کہ ''مصری القرأۃ الرشیدۃ'' کو نصاب میں داخل کرنا چاہئے۔ چنانچہ اسے منظور کرلیا گیا اور اس کے کچھ دنوں کے بعد مصر کے بچوں کے نامور مؤلف کامل کیلانی کی کتاب ''حکایات الاطفال'' داخل نصاب ہوئی اس کتاب میں بچوں کی سطح اور نفسیات کا پورا پورا خیال کیا گیا تھا۔ دل چسپ قصوں کو آسان و سلیس زبان، تدریجی ارتقاء، اور تصاویر سے مزین کیا گیا تھا لیکن مولانا ندوی کا خیال ہے کہ یہ کتاب دینی روح، اخلاقی تعلیمات، ذکر خدا و ذکر رسول سے خالی تھی سر ورق پر کسی عیسائی مصنف کا نام آسانی سے لکھا جاسکتا ہے۔ ان تمام عیوب و نقائص کے باوجود زبان کی تعلیم میں بچوں کے لئے حد درجہ مفید ہے۔ ۶ؔ

انہی تمام چیزوں کو مد نظر رکھتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر

www.abulhasanalinadwi.org

سید عبد العلی کی تحریک نصاب تعلیم کو آگے بڑھانے میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے گراں قدر خدمات انجام دیں اور ندوۃ العلماء کے مشن کو سامنے رکھتے ہوئے آپ نے سب سے پہلے "مختارات من ادب العرب" (۱-۲) کے عنوان سے نثر کا ایک قیمتی اور معیاری نمونہ پیش کیا جس میں قرن اول سے لیکر عصر حاضر تک کے نثر وادب کے اعلیٰ نمونوں کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ نثر تصنع وتکلف اور سجع وقافیہ سے پاک ہے دلی جذبات، صالح خیالات اور تعمیری مقاصد کی بھرپور عکاسی ہے۔ اس سے ایک ہی رنگ وآہنگ کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ ے

مولانا مختارات کی ترتیب دینے کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ادب پر ایسے لوگوں کے نام چسپاں ہیں جنہوں نے اسے بطور فن اور پیشہ کے اختیار کیا ہے اور ادبی آرائش اور زیبائش اور عبارت آرائی کی بنیاد پر دوسرے سے آگے نکل جانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں، ادب انہیں کی نگارشات قلم تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے جو محض صنعت، فن کاری اور تقلیدی ادب کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ ادب جدت وندرت اور روح وفطرت اور دل آویزی سے خالی ہوتا ہے اور یہی ادب نگارشات کو منظر عام پر آنے سے روکتا ہے جس میں بلیغ تعبیرات، فطری جذبات، خود اعتمادی کے اثرات قدم قدم پر پائے جاتے ہیں، اس میں کوئی عیب نہیں ہے صرف اس کے کہ یہ ان لوگوں کی تخلیقات ہیں جنہوں نے ادباء کی وردی نہیں پہنی ہے۔ ان کی کاوشوں کو ادبی عناوین سے موسوم نہیں کیا گیا بلکہ انہیں دینی، معاشرتی اور فلسفیانہ زمرے میں رکھا گیا اس طرح روایتی ادب نے ان تخلیقات کو قابل توجہ گردانا ہی نہیں۔

یہ فطری اور حقیقت پسندی کی تصویر کشی کرنے والا ادب کتب خانوں میں وافر مقدار میں موجود ہے، اور موجودہ تقلیدی اور روایتی ادب سے قبل یہ فطری ادب احادیث اور سیر کی کتابوں میں مدون ہو چکا تھا لیکن مورخین ادب، منتخبات اور درسی کتابوں کے مصنفین مکھی پر مکھی مارتے رہے اور یہ حقیقی ادب نظروں سے اوجھل رہا ۸

www.abulhasanalinadwi.org

اسی حقیقی اور فطری ادب کو منظر عام پر لانے کے لئے مولانا نے الضیاء کے پہلے شمارے میں ''الادب النبوی'' کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا اور جب المجمع العلمی کے رکن ہوئے تو اس کی روایت کے مطابق عربی زبان کا کتب خانہ از سر نو کھنگالنے کا محتاج ہے'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ان ہیرے جواہرات کو منظر عام پر لانے کی اشد ضرورت ہے جو خزف ریزوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں ۔

چنانچہ مولانا نے انہی تمام وجوہ کے سبب ۱۹۴۰ء میں مختارات کی تالیف کی، اس میں طویل روایات حدیث اور سیرت کے علاوہ ان شخصیتوں کی چیزوں کو جگہ دی گئی ہے جنکا ادباء اور صاحب طرز مصنفین میں شمار نہیں ہوتا مثلاً محی الدین بن عربی، حسن بصری، ابن السماک مسعودی ، امام غزالی، ابن جوزی،، ابن حیان البستی ، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ ۹ ۔

۱۹۴۲ء میں یہ کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہوئی اور اب دار العلوم ندوۃ العلماء سے نکل کر یہ جامعات کلیات اور مدارس تک پہنچی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اسے عرب جامعات اور کلیات نے اپنے یہاں نصاب میں داخل کیا اور استاذ علی طنطاوی نے اس کتاب کے متعلق بتایا کہ ایک بار ثانویات شرعیہ کے طلباء کی تدریس کے سلسلے میں ادباء کی میٹنگ ہوئی اور اس میں متعدد ادبی منتخبات کو پیش کیا گیا لیکن طے یہ پایا کہ ان میں سب سے بہتر مجموعہ مختارات ہے ۱۰ ۔ اور اس میں یہ تنقید کی گئی کہ مورخین ادب اور مصنفین کتب ادب چند ادباء اور انشاء پردازوں کے غلام بن کر رہ گئے ہیں اور ادب واردات قلبی کی ترجمانی کے علی الرغم ادبی پینترے بازی اور کرتب دکھانے کا اکھاڑہ یا نمائش گاہ بن گیا ہے ۔

مختارات سے قبل نفحۃ الیمن ۱۱ اور نفحۃ الطرب میں ایک خاص حلقے کی ترجمانی کی گئی تھی ۔ بات حکایتوں اور مواعظ و حسنات سے آگے نہیں بڑھتی تھی مولانا نے مختارات میں اس عہد کی نثر کی نمائندگی کی ہے، لیکن اس سے صرف اس حلقے کی تائید ہوتی ہے جس کا تعلق مسلمانوں سے ہے اور مسلمانوں میں بھی ایک خاص طبقہ کی نمائندگی ہوتی ہے ۔

مولانا نے مختارات کے مقدمہ میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ اب تک ادب کے مطلع پر کچھ خاص قسم کے لوگ چھائے ہوئے تھے اور بہت سے خالص فطری اور سچے جذبات پر مبنی خیالات کو اس فہرست سے خارج قرار دیا گیا جو سراسر ناانصافی ہے مولانا نے اپنے اس مجموعہ میں اس کمی کو پورا کیا۔ لیکن وہیں پر بہت سے عیسائی مصنفین اور مہجری فنکاروں کی ان تحریروں کو شامل نہ کرنے کا شدت سے کمی کا احساس ہوتا ہے جو اخلاقیات کا درس دیتی اور ظلم و تشدد، استعماریت اور معاشرتی برائیوں کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں نیز ان کے یہاں افکار تصوف بھی پائے جاتے ہیں اس سلسلے میں امین ریحانی، جبران، میخائیل نعیمہ، نسیب اور رشید ایوب وغیرہ کی تحریریں دیکھی جاسکتی ہیں اس پہلو سے شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی ترتیب کردہ ''نخبۃ الادب'' میں اس کمی کا احساس نہیں ہوتا ان کی بہت سی ایسی تحریریں ہیں جن میں حالات اور اخلاقیات کی سچی ترجمانی کی گئی ہے، یہ ادب تصنع اور تکلف سے پاک ہے، ان میں انہوں نے نہ تو اپنے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور نہ ہی دین اسلام کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ اس حیثیت سے دیکھا جائے تو اس مجموعہ میں ایک بڑی کمی کا احساس ہوتا ہے۔

تجدید نصاب کے سلسلے میں مولانا کی دوسری ایک بڑی خدمت ''القراءۃ الراشدۃ'' ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے، مولانا نے ۱۹۴۴ء میں اس کا آغاز کر کے دو سال کے اندر اس کام کو پورا کر لیا، مولانا نے اس میں یہ اہتمام کیا ہے کہ کوئی سبق دینی موعظت، اخلاقی و دینی اثرات اور دینی تعلیم و تربیت سے خالی نہ ہو اور ہندوستانی طلبہ کے سامنے اسباق میں ہندوستانی مناظر میں گفتگو کی گئی ہو،

القراءۃ الراشدۃ سے قبل ندوہ میں ''القراءۃ الرشیدۃ'' پڑھائی جاتی تھی جس میں بچوں کی نفسیات اور سطح کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے، اخلاقیات اور دینی روح بھی اس میں موجود ہے، لیکن اس کی ترتیب میں مصری بچوں اور مصری ماحول اور مصری تاریخ کو پیش نظر رکھا گیا ہے مثلاً الذہاب الی جزیرۃ الروضۃ، مصر العزیزۃ، الآثار القدیمۃ، عید وفاء النیل،

www.abulhasanalinadwi.org

القاہرہ والاسکندریہ، القناطیر الخیریۃ ، ملوک المصریین القدماء اور دولۃ المما لیک فی مصر میں مصر کی خصوصیات اور اسکی تاریخ سے بحث کی گئی ہے ان کے علاوہ بھی بہت سے اسباق ہیں جن کا ہندوستانی طلبہ سے کوئی تعلق نہیں ہے انہی چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا نے القرأۃ الراشدۃ کی تالیف کی۔ یعنی اس میں ایک طرف مولانا نے جہاں یہ پیش نظر رکھا ہے کہ بچوں کی ذہنی وفکری تربیت ہو وہیں دوسری طرف اس کا بھی اہتمام کیا ہے کہ ان کے سامنے ہندوستانی ماحول، ہندوستان میں موجودہ اسلامی تاریخ اور اسلامی شخصیات بھی ہوں مثلاً عمر بن عبدالعزیز، امام مالک، محمود گجراتی، شیر شاہ سوری، سلطان مظفر حلیم، اورنگ زیب، امام غزالی، ابن تیمیہ، ملا نظام الدین فرنگی محلی اور شاہ عبدالعزیز وغیرہ کو لیا گیا ہے اس کے علاوہ اس میں معلومات عامہ، تاریخی واقعات اور اسلامی اداروں کا ذکر کیا گیا ہے اس تالیف سے مولانا کا مقصد یہ تھا کہ زبان پر قرآن وسنت کے اثرات ہوں خالص عربی الفاظ کو جدید عربی زبان کے طور پر استعمال کیا جائے عجمی اور دخیل الفاظ سے گریز کیا جائے، موضوعات اور مواد میں تنوع ہو تا کہ طالب علم کو گرانی محسوس نہ ہو علمی اور تاریخی چیزوں کو دلچسپ انداز میں پیش کیا جائے، حکایات کے لئے آسان ترین زبان ہو اسباق اخلاق عالیہ پر مبنی ہوں، ماثور دعاؤں اور دینی تعلیمات کو اسباق میں اس طرح جڑ دیا جائے کہ بغیر کسی اذیت کے بچے انہیں حفظ کرلیں یہ کتاب انہی چیزوں کے پیش نظر لکھی گئی [۱۲]۔

مولانا نے مصری القرأۃ الرشیدہ کی ہر طرح سے تعریف کی ہے، اگر اس کے کچھ ایسے اسباق اپنی تالیف میں شامل کر لیتے جن کا تعلق کسی خاص ماحول، خاص تہذیب اور خاص تاریخ سے نہیں ہے تو تعلیم زبان کے نقطۂ نظر سے بہتر ہوتا، آگے چل کر تحریر و تقریر میں اس کے بہتر نتائج منظر عام پر آتے، جیسا کہ مولانا کا خود اس نصاب سے یہی مقصد و مدعا ہے

اسی سلسلے کی ایک کڑی ''قصص النبیین'' ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے۔
مولانا نے اس کی ترتیب میں بچوں کی سطح کا خصوصی خیال رکھا ان کی تعلیم ولیاقت

www.abulhasanalinadwi.org

سے عدم توجہی نہیں برتی اور قصص النبیین کو ایسے دلنشیں اسلوب میں پیش کیے کہ بچوں کو مزا آنے لگا مصر کے اعلیٰ کردار مصنف احمد شرباصی نے اس کی مقصدیت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے کہ اس سے بچوں کے اندر اعلیٰ کردار اور روحانیت پیدا ہوتی ہے، جذبات و احساسات کو رفعت و بلندی نصیب ہوتی ہے۔ اور ان کے اندر عربی زبان کے اصول وقواعد مستحکم ہوتے ہیں اور آگے چل کر انہیں قرآن کریم اور احادیث کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

بچوں کے سامنے قصص کو وضاحت کی ساتھ پیش کیا گیا ہے الفاظ کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے تا کہ الفاظ ان کے اذہان میں مستحضر ہوتے جائیں، جملے آسان سے آسان لائے گئے تا کہ واقعات کے فہم میں بچوں کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ۱۳

یہ مجموعہ اگر بچے ابتدائی ہی میں پڑھ لیں گے تو ان کی نشو ونما دینی خطوط پر ہوگی انہی تمام خوبیوں کے سبب بلاد عربیہ میں اسے عام کرنے پر زور دیا گیا ہے اس مجموعہ میں بہت سے تفسیری اور تاریخی مسائل بھی مذکور ہیں اور بہت سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات بھی موجود ہیں ۱۴ ان انبیائی قصص میں صداقت کے ساتھ ساتھ ادبی شان بھی ہے، علم و عرفان اور حسن و جمال کا ایسا عنصر موجود ہے کہ اس کی وجہ سے وجدانی کیفیت میں عظمت پیدا ہوتی ہے۔ سید قطب کا اس کے متعلق خیال ہے کہ بچوں کے ساتھ ساتھ بہت سے بڑوں کے لئے بھی غیر معمولی طور پر مفید ہے۔ ''القصص الدینی للاطفال'' کے عنوان سے ایک مجموعہ مصر میں مرتب کیا گیا جس میں سید قطب خود شامل تھے، لیکن مولانا کا یہ مجموعہ اس سے کہیں زیادہ مفید ہے ۱۵ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اسے بچوں کا علم کلام قرار دیا۔ اور مولانا مسعود عالم ندوی نے بتایا کہ اس مجموعہ میں زبان اور دین کو گوشت اور ناخن کے مانند پیوست کر دیا گیا ہے۔ ۱۶

مولانا ندویؒ نے خود اپنی زبان میں اس کی خصوصیات اس طرح بیان کی ہیں

۱- الفاظ کا ذخیرہ کم سے کم ہو لیکن اعادہ اور تکرار سے اس کو ذہن میں نقش کر دیا جائے۔

www.abulhasanalinadwi.org

۲- کتاب قرآن کی زبان میں لکھی جائے اور آیات قرآنی جگہ جگہ نگینہ کی طرح جڑدی جائیں ۔

۳- اسلام کے بنیادی عقائد (توحید رسالت ،معاد) کی تلقین اور تعلیم ضمناً ہوجائے ۔

۴- قصوں کو پھیلا کر لکھا جائے اور ان میں ایسی رہنمائی کا سامان ہو کہ بچوں کے دلوں میں کفر وشرک کی نفرت ، ایمان وتوحید کی محبت اور انبیاء کرام علیہم السلام کی عظمت راسخ ہوجائے اور یہ سب غیر شعوری طریقہ پر ہو گا

قصص النبیین کا سلسلہ ''السیرۃ النبویۃ'' پر جا کر تمام ہوا۔ جسے بیروت کے ادارہ ''موسسۃ الرسالۃ'' نے شائع کیا۔ جو سعودی عرب اور بعض دوسرے ممالک کے کلیات اور جامعات کے نصاب میں داخل ہے۔

آخر میں اس کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے کہ قصص النبیین سے قبل ندوہ میں کامل کیلانی کی کتاب ''حکایات الاطفال'' داخل تھی جس میں بچوں کی نفسیات اور سطح کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا تھا، زبان آسان ترین استعمال کی گئی تھی اور دلچسپ قصے تصاویر سے مزین تھے لیکن پوری کتاب دینی روح اور اخلاقی تعلیمات سے خالی تھی اور کتاب اللہ اور ذکر رسول کا کوئی اہتمام نہ تھا لیکن زبان کے اعتبار سے یہ مجموعہ طلبہ کے لئے حد درجہ ممد ومعاون ہے۔ یہی وجوہ ہیں جس کی وجہ سے مولانا قصص النبیین کے لئے کمر بستہ ہوئے اس سے قبل بے شمار مصری مؤلفین کی تصانیف داخل نصاب تھیں ۔ جو مختلف حیوانات حتی کہ کتوں اور خنازیر کی تصاویر سے آراستہ تھیں ،عربی زبان میں طلبہ کو فرنگی تہذیب کا درس دیا جاتا تھا، انہیں ہر وقت حکایات حیوانات کا عادی بنادیا گیا تھا، چنانچہ قصص النبیین نے اس کمی کو پورا کیا۔

مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی......مولانا کی تدریسی زندگی کا آغاز درس قرآن سے ہوا ۱۹۳۴ء میں بحیثیت استاذ تفسیر اور ادب کے ندوۃ العلماء میں تقرر ہوا ، جہاں جلالین ، بیضاوی اور کشاف داخل نصاب تھیں ۔ اس کے مختلف درجات میں معیار لیاقت کو د

یکھتے ہوئے قرآن مجید کا مکمل متن بھی شامل تھا، جس کی تدریس و تفہیم کے فرائض اساتذہ انجام دیتے، مولانا بھی مختلف درجات میں قرآنی اسباق کی تدریس کے فرائض انجام دیتے، اسی دوران مولانا کو احساس ہوا کہ طلبہ پورے طور سے تدبر قرآن کا پورا حق اس وقت تک ادا نہیں کر سکتے ہیں جب تک کہ اس کے بہت سے بنیادی نکات سے واقف نہ ہوں یعنی طلبہ کو قرآن کریم سے متعارف کرایا جائے، اس کے مقاصد اور مرکزی مضامین کو اجاگر کیا جائے اور طلبہ کو ان غلطیوں، کمزوریوں اور بیماریوں سے آگاہ کیا جائے جو تفکر قرآن کے باب میں سد راہ بنتی ہیں، انہی احساسات کو بنیاد بناتے ہوئے مولانا نے یہ کتاب تصنیف کی، بہت دنوں تک اسے درجات میں لکھواتے رہے ۱۹۸۱ء میں یہ زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ۔[20]

مضامین کتاب میں مولانا نے جو مباحث اٹھائے ہیں وہ قرآن کریم پر تفکر تدبر کرنے والے طلبہ کے لئے حد درجہ مفید ہیں، مثلاً ایک طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ اسے یہ معلوم ہو کہ قرآن کریم اپنی حقیقت کی تعیین کس انداز میں کرتا ہے اسے یہ بھی معلوم ہو کہ قرآن کریم تمام شکوک، شبہات سے بالاتر ہے، وہ محکم مفصل ہے، اس طرح یہ چیز بھی طلبہ کے سامنے آنی چاہیے کہ قرآن کریم کا سب سے بڑا اعجاز دین اسلام ہے، دوسرا اعجاز اس کے علوم و معارف اور تیسرا اعجاز اس کی غیبی واقعات کی طرف رہنمائی ہے، اسے یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ قرآن کریم اور دیگر آسمانی صحیفوں میں کیا فرق ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں قرآن کی بعض پیشین گوئیوں پر بڑی اچھی بحث کی ہے۔ اس پہلو پر بھی اظہار خیال کیا کہ تکبر، مجادلہ، انکار آخرت اور انبیاء پرستی قرآنی حکم و معارف کی راہ میں موانع ثابت ہوتی ہیں۔ ان صفات کے حاملین قرآنی موتیوں سے محروم رہیں گے اور اس پر روشنی ڈالی کہ قرآن کریم سے استفادہ کے لئے لازمی ہے کہ طلبہ کے اندر طلب دین ہو، قرآنی تعلیمات کو غور سے سنا جائے، دلوں میں خوف خدا ایمان بالغیب تدبر قرآنی کا جذبہ اور اسکی حکمتوں تک پہنچنے کے لئے مصائب و آلام اٹھانے کی ہمت ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی

www.abulhasanalinadwi.org

عظمت کا ہر وقت خیال رہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے" فی صحف مکرمة ، مرفوعة مطهرة ،بایدی ، قابل ادب ورقوں میں (لکھا ہوا) جو بلند مقام پر سفرة کرام بررة (سورة عبس :۱۵) رکھے ہوئے (اور) پاک ہیں (ایسے) لکھنے والے کے ہاتھوں میں جو سرداراور نکوکار ہیں۔

یہ کتاب طلباء قرآن کے لئے مفید ہے، اس سے قرآنی تفکر و تدبر کی راہیں منکشف ہوتی ہیں، یہ کتاب تفاسیر کی ورق گردانی کے بجائے تفکر فی القرآن کی دعوت دیتی ہے، اس کا یہ پیغام بھی ہے کہ مختلف مکاتب تفسیر اور متعدد مسالک و مذاہب کے خیالات اور رجحانات میں الجھنے کے بجائے براہ راست قرآن پر غور کیا جائے یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جس سے اختلافات امت مفقود ہو سکتے ہیں۔

"الارکان الاربعۃ" بھی تجدید نصاب ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں "نماز، زکوۃ، روزہ اور حج کی حقیقتوں اور حکمتوں سے بحث کی گئی ہے، اس میں ان کی شرعی حقیقت وقانونی پہلو، دینی نظام اور انفرادی واجتماعی زندگی میں ان کے احکام اوران کے ان مقاصداوراسرار کی تشریح کی گئی جو قرآن وحدیث سے ثابت ہیں۔ ۲۱

اس کتاب کی ترتیب میں اصلاً مولانا نے شاہ صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب حجۃ اللہ البالغۃ سے استفادہ کیا ہےاوراس میں ارکان اربعہ سے متعلقہ جو ہر وعطر کونہایت جدید انداز میں جدید نسل کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ اسکے علاوہ دیگر ائمہ اسلام کی کتابوں کو بھی بنیادی مآخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، لیکن ان تمام مصادر و مآخذ کے ساتھ ساتھ مولانا نے اولیت قرآن وحدیث کو دی ہے اور خود اپنی بساط فکر کے مطابق ارکان اربعہ کی اصل حقیقت کی تعیین کی۔

اس کتاب میں مولانا نے ان مذاہب کی عبادات اور تعلیمات سے اسلامی عبادات اور تعلیمات کا موازنہ کیا ہے جو اپنا رشتہ آسمانی شریعت سے جوڑتے ہیں۔ اس موازنہ سے طلبہ کے ذہن میں اسلامی عبادات کے سلسلے میں ایک استحکام پیدا ہوتا ہے نیز

www.abulhasanalinadwi.org

دین اسلام کی حقانیت اور خداوند قدوس کی وحدانیت منظر عام پر آتی ہے ۔
مولانا علی میاں ندویؒ نے فرمایا کہ "الحمدللہ کہ نصاب جدید کی ترتیب کا جو سلسلہ بغیر کسی منصوبہ بندی کے انفرادی طور پر شروع کیا گیا تھا وہ کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا" آگے چل کر ایک دوسری کوشش کے ضمن میں مولانا سید محمد رابع ندوی کی منثورات (مختارات کے نمونوں کے مقابلہ میں نسبتاً آسان) اور الادب العربی بین عرض ونقد" (اس میں عربی نثر کے منتخبات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے محاسن اور خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے) مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی معلم الانشاء کے دونوں حصے اور اس کا تیسرا حصہ مولانا رابع ندوی کے قلم سے ترتیب دیا گیا۔ اسی طرح محمد واضح رشید ندوی نے احمد حسن الزیات کی تاریخ ادب عربی کی جگہ ایک نئے انداز سے تاریخ ادب عربی پر کتاب تیار کی، مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری نے ابتدائی درجہ کے لئے "المحاورۃ العربیۃ" کی تالیف کی، قواعد نحو وصرف کے لئے جدید اصول کے پیش نظر اردو میں تمرین النحو مولوی مصطفیٰ اور مولوی عبدالماجد دریابادیؒ کے قلم سے منظر عام پر آئی، تمرین الصرف مولوی معین اللہ کے قلم سے اور علم التصریف مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کے قلم سے شائع ہوکر نصاب میں داخل ہوئی اور اسی جدید نصاب کی ترتیب کے ضمن میں مولانا محمد رابع ندوی نے "جغرافیہ ممالک اسلامیہ" کے نام سے ایک کتاب تیار کی۔ مولانا نے اپنے بعد اسے دوسرا مرحلہ قرار دیا، جبکہ اسے تیسرا مرحلہ قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے کیونکہ پہلا مرحلہ علامہ شبلی سے شروع ہوکر مولانا سید سلیمان ندویؒ پر ختم ہوتا ہے، دوسرا مرحلہ مولانا ندویؒ سے شروع ہوتا ہے اور تیسرے مرحلہ کا آغاز مولانا محمد رابع ندوی صاحب سے ہوتا ہے۔ بہرکیف تاریخ ندوہ اور اس کے متعدد اجلاسوں سے یہ بات پوری طرح نمایاں ہے کہ ترتیب وتجدید نصاب کے اصل محرک علامہ شبلی نعمانیؒ ہیں۔
آخر میں اپنی بات ان کلمات پر ختم کرنا چاہوں گا کہ مختارات، القرأۃ الراشدۃ، قصص النبیین، السیرۃ النبویۃ، مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی اور ارکان اربعہ سے طلبہ کے

www.abulhasanalinadwi.org

اندر دو باتیں پیدا ہوتی ہیں ایک تو ان کے اندر اسلامی کردار پروان چڑھتا ہے۔ دوسرے انکے اندر تحریر و تقریر کی صلاحیتیں ایک ایسی زبان و ادب کے ذریعہ نمو پاتی ہیں جو قرآن و حدیث کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ جس کا خود مولانا نے بار بار اعتراف کیا ہے اور اس سے ندوے کا طرہ امتیاز قرار دیا ہے، ندوے کی پوری تاریخ میں حضرت مولانا پہلے وہ شخص ہے جنہوں نے کافی حد تک علامہ شبلی نعمانی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا ہے علامہ شبلی قرآنیات اور کلامیات کے سلسلے میں ندوے کا ایک نمایاں کردار دیکھنا چاہتے تھے جو ابھی تک غالبا پورا نہیں ہوا۔

دوسرے یہ کہ مصری مصنفین نے نصاب کے سلسلے میں جو کتابیں ترتیب دی ہیں ان میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو قابل مذمت اور خلاف شرع ہیں۔ اسے جوں کا توں داخل نصاب نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن انکی بہت سی ایسی چیزیں ہیں جنہیں زبان و بیان اور تحریر و تقریر کی قدرت پیدا کرنے کی غرض سے داخل کیا جا سکتا ہے اور دوسرے مختارات میں بہت سے مہجری ادباء اور بلاد عربیہ کے کچھ ان عیسائی مصنفین کی تحریریں شامل ہونی چاہیئے تھیں جو اخلاق عالیہ اور متصوفانہ صفات کی حامل اور طرز بیان میں انفرادیت کا اعلیٰ نمونہ ہیں چونکہ مولانا نے خود مقدمہ میں دعویٰ کیا ہے کہ ہم اس مجموعہ میں ایسی تحریریں شامل کرنا چاہتے ہیں جن میں اخلاق کی بلندی اور رعنائی بیان کی رفعت ہو۔

حوالے ۱۔ حیات شبلی۔ سید سلیمان ندوی دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء ص ۲۱۶

۱۔ سفرنامہ روم و مصر و شام۔ (باہتمام مولوی مسعود علی صاحب ندوی) مولانا شبلی نعمانی۔ مطبع معارف اعظم گڑھ۔ ۱۹۴۳ء ص ۲۳۲

۲۔ مکاتیب شبلی (مرتبہ سید سلیمان ندوی) مطبع معارف اعظم گڑھ۔ طبع دوم۔ ۱۹۳۸ء ۱/۳۱۲

۳۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: علامہ شبلی کا نظریۂ تعلیم۔ ڈاکٹر عبید اللہ فراہی۔ فوٹو لیتھو ورکس سیماپوری، دہلی ۱۹۸۸ء ص ۱۴-۲۰

۴۔ حیات شبلی۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ مطبع معارف اعظم گڑھ۔ طبع ثانی۔ ۱۹۷۰ء ص ۴۲۲۔

www.abulhasanalinadwi.org

۴۲۳

۵ حیات سلیمان۔ شاہ معین الدین ندوی مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء ص ۳۳-۳۴

۶ وضاحت کے لئے دیکھئے: کاروان زندگی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ مکتبہ اسلام لکھنؤ بار اول ۱۹۸۳ء ۱/۱۹۹-۲۰۴

۷ ایضاً ۱/۲۰۵-۲۰۶

۸ وضاحت کے لئے دیکھئے: مختارات دوسرے حصہ کا دوسرا مقدمہ (مطبعہ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، الدکن، الہند)

۹ کاروان زندگی ص ۲۰۹-۲۱۰

۱۰ مقدمہ کتاب المسلمون فی الہند بحوالہ کاروان زندگی، ۱/۲۱۲

۱۱ نفحۃ الیمن، مطبع فتح الکریم، ۱۸۹۷ء، یہ کتاب ۲۱۴ صفحات پر مشتمل ہے

۱۲ وضاحت کے لئے: کلمۃ عن الکتاب الاستاد السید ابی الحسن علی الندوی۔ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۷۲ء ص ۵-۱۶

۱۳ قصص النبیین (مقدمۃ الاستاذ الشیخ احمد الشرباصی) السید ابوالحسن الندوی۔ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (بدون تاریخ) ۱/۳-۴

۱۴ قصص النبیین، السید ابوالحسن علی الندوی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ (بدون تاریخ) ۲/۷

۱۵ قصص النبیین (مقدمۃ الاستاذ سید قطب) فوٹو آفسیٹ پریس۔ کانپور بدون تاریخ ۳/۱۱

۱۶ تاریخ ندوۃ العلماء۔ مولوی شمس تبریز خاں۔ بار اول لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۴ ۲/۴۴۹

۱۷ کاروان زندگی ۱/۲۱۶-۲۱۷

۱۸ ایضاً، ۱/۲۱۹

۱۹ کاروان زندگی ۱/۲۲۱-۲۲۳

۲۰ وضاحت کے لئے کاروان زندگی، ۱/۲۲۰-۲۲۱، نیز دیکھیے مقدمہ مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی بار اول۔ مکتبہ اسلام، گوئن روڈ لکھنؤ، ۱۹۸۱ ص ۹-۱۴

۲۱ مقدمہ ارکان اربعہ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، بار اول، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۶۹ء ص ۱

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں اور کلام اقبال کی باز آفرینی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی
شعبہ اردو اے ایم یو علی گڑھ

علامہ اقبال کو اردو شاعری کی پوری تاریخ میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے ایک فلسفی شاعر ہونے کے باوجود شاعری اور فن کے ان تمام تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جن کے باعث فکر کو محسوس فکر سے اور فلسفیانہ تصورات کو فنی اسالیب اور شاعرانہ تدبیر سے ہم آہنگ ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اقبال کے کلام میں مرزا غالب یا بعض دوسرے اور فارسی اور اردو شاعروں کی طرح جستہ جستہ فلسفیانہ تصورات اور رویے نہیں ملتے، بلکہ ان کے طفیل اردو شاعری میں پہلی بار مربوط اور منضبط فکر و فلسفہ کو شعری قالب میں ڈھلنا نصیب ہوا ہے۔ اس اعتبار سے اقبال دو طرح کے تجربے سے گزرے ہوں گے پہلا تو یہ کہ انہوں نے عالمی سطح پر رونما ہونے والے فکر و فلسفہ کو کچھ اس انداز سے مرتب کرنے کی کوشش کی کہ خود اقبال کے مذہبی سرچشمے ان کے فلسفے میں نمایاں طور پر کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ فلسفہ کو انسانی جذبہ اور احساس سے کیوں کر اس طرح ہم آہنگ اور مربوط کیا جا سکتا ہے کہ شاعری محض تعقل اور غور و فکر کا منظوم اظہار بن کر نہ رہ جائے۔ یہ ایک ایسا مرحلہ ہے جس

www.abulhasanalinadwi.org

میں شاعر کی سانس پھولنے لگتی ہے اور اس کے لئے مفکرانہ موضوعات کو شعری جمالیات میں ڈھال کر پیش کر دینا آسان نہیں رہتا۔ اس فکر اور شعری طریقہ کار کی آمیزش ہمیں عالمی سطح پر گوئٹے کی فاؤسٹ میں، دانتے کی طربیہ خداوندی میں اور جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی میں تو ضرور ملتی ہیں، تاہم اردو شاعری کا دامن اقبال سے پہلے تقریباً خالی نظر آتا ہے۔ مذاہب عالم نے انسانی تہذیب اور اقدار کے لئے ایسی بنیادیں فراہم کی ہیں جن کا نعم البدل انسانی سماج اور مجرد فکر میں تلاش کرنا آسان نہیں۔ اردو میں جن اصناف شاعری کو فروغ ملا ان میں ہر چند کہ مذہبی اور اخلاقی فکر کے عوامل جگہ جگہ کارفرما دکھائی دیتے ہیں، مثلاً غزل میں انسان کی محبت سے لیکر محبوب حقیقی تک سے براہ راست ربط و تعلق کی نوعیت اور مدارج پر غور کرنے کا رجحان شروع سے دکھائی دیتا ہے اس طرح قصائد اور مثنویوں میں کہیں تشبیہ اور تمہید کی سطح پر اور کہیں عقائد کی روح کے کارفرما ہونے کے باعث متعدد مقامات پر قابل توجہ حد تک مذہبی رجحانات اور انکے محرکات نمایاں معلوم ہوتے ہیں، تاہم حمد و نعت اور منقبت کو اقدار اور اخلاقیات کی سطح پر لاکر پیش کرنے کا رجحان بہت واضح نہیں اسلئے مذہبی وجدان کی شاعری کو میلاد خوانوں کی بیانیہ اور غیر شاعرانہ سطح سے بلند کر کے شاعرانہ جمالیات کا ارتفاع بخش دینے کی مثالیں ہمارے یہاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ علامہ اقبال نے اس نقطہ نظر سے اپنے مفکرانہ اور شاعرانہ، دونوں منصب اور ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا ایسا ثبوت پیش کیا ہے جس کی تحسین اور ترجمانی کی خاطر کسی ایسے ہی متبحر دانشور اور شعریت کے اسرار و رموز سے واقف کار مرد دانا اور متعدد زبانوں کے شعری سرمایے سے باخبر اور بیدار مغز عالم کی ضرورت تھی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی میں چونکہ ایک ساتھ قدرت سے فلسفہ و شعر کی تفہیم و تحسین کا ملکہ ودیعت ہوا تھا اسلئے انہوں نے کئی سطحوں پر اپنی اسی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا کامل ثبوت روائع اقبال، اس کے ترجمے، نقوش اقبال کے ذریعہ فراہم کرنے کی کوشش کی۔ مولانا علی میاں نے نقوش اقبال کا مقدمہ لکھتے ہوئے کلام اقبال سے اپنی

www.abulhasanalinadwi.org

دلچسپی اور انکی شاعری سے حسی اور جذباتی سطح پر مغلوب ہونے کا حال کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے گویا وہ اپنی یادداشت اور جمالیاتی تجربے کی باز آفرینی کے عمل سے گزر رہے ہیں۔

''اقبال کو پسند کرنے کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں، اور ہر شخص اپنی پسند کے مختلف وجوہ بیان کر سکتا ہے۔ انسان کی پسند کی وجہ یہی ہوتی ہے وہ کسی فن پارے کو اپنے خوابوں کا ترجمان اور اپنے دل کی زبان پانے لگتا ہے انسان بہت خود بین و خود پسند واقع ہوا ہے۔ ان کی محبت اور فطرت تمناؤں اور دلچسپیوں کا مرکز و محور بڑی حد تک اسکی ذات ہی ہوتی ہے۔ اس لئے اسے ہر وہ چیز اپیل کرتی ہے جو اس کی آرزوؤں کا ساتھ دے سکے۔ اور اس کے احساسات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ میں بھی اپنے کو اس کلیے سے الگ نہیں کرتا۔ میں نے کلام اقبال کو عام طور پر اسی لئے پسند کیا ہے کہ وہ میری پسند کے معیار پر پورا اترتا ہے اور میرے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے وہ میرے فکر و عقیدہ ہی کے ساتھ ہم آہنگ ہی نہیں بلکہ اکثر میرے شعور اور احساس کا بھی ہم نوا بن جاتا ہے۔

یہ پس منظر محض علی میاں کی علامہ اقبال سے والہانہ دلچسپی کو نہیں پیش کرتا بلکہ اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مذہبی تصورات انسان کی کردار سازی ضرور کرتے ہیں مگر اس کو ذہنی اور فکری غذا کے طور پر جس جمالیاتی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے، مجرد فکر یا پیغام سے اس کی تسکین نہیں ہو پاتی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حسی اور جذباتی سطح پر عرفان حقیقت کو ہم محض صوفیوں کے لئے چھوڑ دیتے ہیں اور ہمارے پاس خشک اور یبوست زدہ پیغام کے سوا کچھ اور باقی نہیں رہ جاتا۔ جب کہ حقیقت یہ کہ قرآن کریم میں زبان کے استعمال کے جتنے غیر معمولی فن اسالیب سے ہمارا واسطہ ہوتا ہے اس کی تفہیم کے بغیر محض اوامر و نواہی کی تعلیم و تبلیغ کو مکمل قرآن فہمی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عبدالقاہر جرجانی کی کتابیں اسرار البلاغۃ اور دلائل الاعجاز کے علاوہ بعض مفسرین کی وہ تعبیریں اور تفسیریں قرآن فہمی کی ایک مخصوص لہجے اور سطح متعین نہیں کرتیں، جن کی مدد سے قرآن کریم کی بلاغت اور اعجاز کا پورا خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس پس منظر میں اگر ہم برصغیر ہندو پاک میں مسلمانوں کی

دانشورانہ اور عالمانہ سرگرمیوں پر ایک نگاہ ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم نے علم، دانش، ادب، تہذیب، مذہب اور شاعری کے مطالعے اور ان پر غور وخوض کے الگ الگ دائرے بنا رکھے ہیں۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ تہذیبی زندگی کے عوامل اور مظاہر کی حیثیت سے ان تمام دانش ورانہ، علمی، مذہبی اور فنی یا ادبی اقدار کا مطالعہ ایک بڑے دائرۂ کار کے طور پر کیا جائے۔شاید یہی وجہ رہی ہے کہ ہم نے علوم وفنون کو انسانی وجود اور کائنات کے رشتوں کے محور پر مرتکز عناصر کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش بہت کم کی ہے۔رشید احمد صدیقی نے نقوش اقبال کے ابتدائی کلمات کے طور پر اس صورت حال کو بڑی خوبی کے ساتھ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

میرا خیال ہے کہ مولانا پہلے عالم دین ہیں، جس نے موجودہ صدی کی اردو شاعری کے سب سے بڑے نمائندہ اور عظیم شاعر اقبال کی شاعری اور شخصیت کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور بصیرت کے ساتھ کیا ہے ورنہ بیش تر علماء ہر جدید کو بالعموم مشتبہ ورنہ بڑی احتیاط سے دیکھنے کی طرف مائل رہے ہیں۔علمائے کرام کو اقبال کے سمجھنے کی کوشش کرنا خود ان کے لئے نہایت ضروری اور نیک فال ہے۔اس لئے کہ اب مذہب اور زندگی کی تفہیم اس طرح اور اسی سیاق وسباق میں کی جائے گی جو ہم کو اقبال کے یہاں ملتی ہے۔سید صاحب کا ذہن جدید ذہن کے تقاضوں سے آشنا ہے اور اس کا لحاظ رکھتا اور احترام کرتا ہے۔یہی انداز ندوہ کے ایک دوسرے مایۂ ناز فرزند سید سلیمان ندوی مرحوم ومغفور کا تھا......دوسری طرف مذہب واخلاق سے دلچسپی رکھنے والے ایسے ابھی کافی تعداد میں مل جائیں گے جو جدید ذہن اور اپنی ذہنیت میں فرق نہیں دیکھ پاتے۔

سید سلیمان ندوی اور علامہ اقبال کی خط وکتابت جن لوگوں کی نگاہ سے گزر چکی ہے ان کو بخوبی اندازہ ہوگا کہ اقبال نے محض مذہبی اور اصولی معاملات میں ہی نہیں بلکہ اپنی شاعری اور تخلیقی عمل کے مختلف مراحل میں بھی انہوں نے سید سلیمان ندوی کو شریک رکھا، اور مذہب اور شاعری،) دونوں معاملات میں افہام وتفہیم کا دوطرفہ عمل دونوں دانش وروں کے

www.abulhasanalinadwi.org

مابین جاری رہا۔ اسی ضمن میں سب سے نمایاں مثال اقبال کی نظم ''خضرِ راہ'' کے مختلف مسودوں پر سید سلیمان ندوی سے مراسلت میں ملتی ہے۔

مولانا علی میاں نے اقبال کے سلسلے میں اس روایت کو محض قائم رکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اقبال کو کسب فیض کا وسیلہ بنایا اور عربی اور اردو میں اقبال کی شاعری کی ناقدانہ تحسین وترجمانی کر کے عرب دنیا میں اقبال فہمی کی داغ بیل ڈالی اور مذہب کے حوالے سے اقبال کی اہمیت کو ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کے ساتھ ہم آہنگ کر کے دوچند کر دیا۔ علی میاں کی پوری کتاب عالمانہ افہام وتفہیم کے ساتھ تاثراتی تنقید بلکہ تحسین کی بہترین مثال ہے۔ زیر بحث کتاب میں اقبال کو ان کے پورے سیاق وسباق میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علی میاں نے اقبال فہمی کے لئے صرف ان کی شاعری کو اپنا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ اقبال کی نثری کاوشیں مذہبی فکر کی تشکیل جدید، اور فارس میں مابعد الطبعیات کا ارتقاء، جیسی اہم فلسفیانہ کتب بھی ان کے پیش نظر رہیں۔ مزید برآں یہ کہ اقبال کے اردو کلام کیساتھ ان کے فارسی کلام کے پورے ذخیرے کو کھنگالنے کے بعد شاعر اور فلسفی کی حیثیت سے اقبال کی قدر وقیمت متعین کرنیکی کوشش کی۔

زیر بحث کتاب میں اقبال فہمی کو دو حصوں میں منقسم کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ان ابواب پر مشتمل ہے جو اقبال کی شخصیت کے تشکیلی عناصر کے علاوہ فکر اقبال کے متعدد پہلوؤں سے ہماری آشنائی کراتے ہیں۔ علی میاں نے اقبال کی مزاج فہمی کے طور پر شخصیت کے تخلیقی عناصر کی حیثیت سے ایمان ویقین، قرآن کریم، عرفان نفس اور پیر رومی کی تعلیمات کی کارفرمائی دکھلائی ہے، اور بعض اشعار کی مدد سے تخلیقی محرکات کو نشان زد کیا ہے۔ علی میاں اقبال کے ان اشعار کی گرہ کشائی کرتے ہوئے ان کے مزاج میں شاعر مشرق اور اسلامی اقدار کا ذکر تو ضرور کرتے ہیں مگر موضوع سے والہانہ لگاؤ کے باعث فنی تہہ داری اور شاعرانہ رموز اور طریق کار سے بسا اوقات رواروی میں گزر جاتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر کہ:

www.abulhasanalinadwi.org

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ　　سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اور

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں　　کہ میں اسی آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

اس نوع کے غیر معمولی فنی طور پر مرصع اشعار کا حوالہ موضوع اور مواد کی سطح پر تو ضرور آتا ہے مگر مشرق اور مغرب کی تہذیب یا مغرب کی عیسائی فکر سے اپنی نبرد آزمائی کے عمل میں اقبال کے عقیدے کا رسوخ اور یقین جس طرح انہیں مزاحمت کی قوت فراہم کرتا ہے اس کی شاعرانہ تہہ داری اور جامعیت سے ہم پوری طرح باخبر نہیں ہو پاتے۔ اگر اقبال کو جلوۂ دانش فرنگ خیرہ نہ کرسکا تو اس کی وجہ صرف سیرت نبوی سے وابستگی نہیں بلکہ وہ اس پورے عمل کو ایک مخصوص شاعرانہ پیکر تراشی میں تبدیل کرتے ہیں اور خاک مدینہ و نجف کو چونکہ اپنی آنکھ کا سرمہ قرار دیتے ہیں اور خاک مدینہ و نجف کی گرد راہ کو اپنی بصارت و بصیرت اور صلابت رائے کا نعم البدل بنا کر پیش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے شعر میں جس طرح اقبال نے دانش حاضر کو ایک نوع کا عذاب الٰہی قرار دیا ہے اس کے برعکس وہ تلمیحی طور پر ابراہیم خلیل اللہ کی روایت سے استفادہ کرتے ہیں اور عذاب دانش حاضر کا شکار ہونے کے باوجود اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی طرح محفوظ و مامون پاتے ہیں۔ اور ان دو اشعار پر ہی کیا منحصر ہے، نقوش اقبال میں ایسے ان گنت اشعار زیر بحث آئے ہیں جن کے مضامین اور موضوعات مصنف کو متحرک تو ضرور کرتے ہیں مگر شاعری بحیثیت شاعری خیالات کو جن دائمی اقدار اور آفاقی منظر نامے میں تبدیل کردیتی ہے ان کو زیر بحث نہیں لا پاتی۔ اقبال کی شاعری کے حوالے اس نوع کی نکات کی اہمیت اس لئے زیادہ قابل توجہ اور مزید ارتکاز کی متقاضی معلوم ہوتی ہے کہ اقبال کے مطالعے کی ایک سطح تو یہ ہوسکتی ہے کہ فلسفہ اور فکر کی بنیاد پر اقبال کی عظمت اور اہمیت کو سمجھا جائے جو بجا طور پر علی میاں کے طریق مطالعہ میں شامل ہے، مگر شاعر فلسفی کی بڑائی بڑی حد تک اس طریق کار میں مضمر ہے جس کی مدد سے اس کے زمانہ اور جغرافیائی حالات اور فکری طور پر اتفاق یا عدم اتفاق کے

www.abulhasanalinadwi.org

باوجود ہمہ گیر ہے اس نوع کی شاعری کے تخلیقی عقیدے ہر زمانے میں نت نئے معنوی امکانات اور سرّی تجربے کی عقدہ کشائی کا تقاضہ کرتے اور اس میں موجودہ فکر کو تازگی اور حظ وانبساط کا وسیلہ بنائے رکھتے ہیں۔علی میاں نے اقبال کے مطالعہ کا جو انداز اختیار کیا ہے اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ زیر بحث کتاب میں شامل تحریروں کو عرب دنیا میں متعارف کرانے کے فریضے کے طور پر لکھا گیا تھا، اور لسانی بعد چونکہ ایک زبان کے لسانی اور فنی رموز ونکات سے زیادہ فکر وخیال کو منتقل کرنے کی طرف توجہ مرکوز رکھتا ہے، اس لئے فنی یا شاعرانہ صنعت گری اور تدبیر کاری کما حقہ زیر بحث نہیں آپاتی، ورنہ ظاہر ہے کہ شعری ہنرمندی کی عقدہ کشائی کا کام علی میاں سے بہتر اور کون شخص انجام دے سکتا تھا۔

مولانا علی میاں ندوی نے اقبال کی فکر سے بحث کرتے ہوئے جس باب میں اقبال اور مغربی تہذیب کو موضوع گفتگو بنایا ہے، اس میں نہایت بصیرت کے ساتھ ایسے نکات جمع کردیئے ہیں جن کی بنیاد پر اقبال کو شاعر مشرق اور شاعر اسلام قرار دینے کا جواز موجود ہے۔علامہ اقبال نے "Development of Metaphysic in Persia" میں جس طرح ایران سے لے کر ہندوستان تک کے مسلمانوں کے انفعالی انداز اور عدم تحریک کے اسباب وعلل کی تلاش کی ہے۔اور ہندوستان کی بھگتی تحریک کے زیر اثر دنیا کو فریب اور مایا قرار دینے اور وحدۃ الوجودی فکر کے باعث انسان اور کائنات کو مجازی وجود یا التباس سمجھے جانے کو دنیا کو ''مزرعۃ للآخرۃ'' قرار دیئے جانے کے اسلامی تصور کے منافی بتایا ہے، اور اس دریافت کے ردعمل کے طور پر حرکت وعمل اور خودی یا عشق کا بالکل منفرد تصور پیش کیا ہے، وہ بالآخر وحدۃ الشہود کے نقطۂ نظر کی توثیق اور حضرت مجدد الف ثانی کے مکتب فکر سے اتفاق کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔اقبال کی فکر کی اس نہایت نامکمل اور مجمل تلخیص سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تہذیبی اور مذہبی سطح پر اقبال کا زاویہ نظر کیوں کر آفاقی سیاق وسباق حاصل کرتا ہے، اور یہ طرز فکر بجائے خود انفس وآفاق کی کن گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔علی میاں نے درحقیقت اس پورے فکری پس منظر کو اپنے سامنے رکھا ہے

www.abulhasanalinadwi.org

اور اس پس منظر میں اقبال کے حوالے سے مغربی تہذیب کو بجزیاتی اور استیصالی طریق کار سے گزارا ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات، تشکیل جدید الہایات اسلامیہ میں شرقی اور مغربی تہذیب کا جو موازنہ پیش کیا ہے، مولانا علی میاں بجا طور پر ان سے رجوع کرتے ہیں اور اقبال کے ان خیالات کو تہذیبی کشمکش کی تفہیم کی کلید قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے الفاظ ہیں کہ :۔

عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے۔ خیالات و تصورات کی جہت سے دیکھئے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے، سیاسی اعتبار سے نظر ڈالئے تو افراد افراد سے دست و گریباں ہیں اس میں اتنی سکت نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابل تسکین جوع زر پر قابو حاصل کر سکے۔ لہذا اس کا تعلق اپنے اعماق وجود سے منقطع ہو چکا ہے۔

عصر حاضر کی لادینی اشتراکیت کا مطمح نظر بیشک نسبتاً زیادہ وسیع ہے اور اس کے جوش و سرگرمی کا بھی وہی عالم ہے جو کسی نئے مذہب کا۔ لیکن اس کی اساس چونکہ ہیگل کے مخالف نظر متبعین پر ہے، لہذا وہ اس چیز ہی سے برسر پیکار ہے جو اس کے لئے زندگی اور طاقت کا سرچشمہ بن سکتی تھی۔ جب تک انسان کو اپنے آغاز و انجام کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آ سکتا، جس میں باہم گرم مقابلے اور مسابقت نے ایک بڑی غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے، یہ اس تہذیب و تمدن پر جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے گرد و پیش سے جس حد تک سروکار رکھا اور جس طرح ہر تہذیبی، سیاسی، فلسفیانہ اور سماجی یلغار پر اپنے ردعمل کا ہر دور میں اظہار کیا اس کی کوئی دوسری مثال برصغیر کے مسلم دانش وروں میں مشکل سے تلاش کی جا سکتی ہے۔ علی میاں کا خیال ہے کہ اقبال جہاں جہاں عصری نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہیں اس سے ان کی مراد جدید مغربی تعلیم کے علاوہ اور کچھ نہیں، علی میاں فرماتے ہیں کہ :۔

www.abulhasanalinadwi.org

وہ جہاں مدرسہ اور طالب علم کے جرم کا ذکر کرتے ہیں وہاں اس سے مراد مغربی مدارس اور اس کے طلبہ ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس نظام دانش نے نئی نسل کے حق میں سب سے بڑا جرم کیا ہے۔

اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ مغرب کے نظام تعلیم کے کھوکھلے پن کو اقبال یقیناً بے نقاب کرتے ہیں مگر ہمیں اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے کہ ان کے نزدیک ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان میں جو فرق ہے یا اقبال کے ان اشعار میں جس انداز کی درسگاہوں کو ہدف بنایا گیا ہے، اس کے سلسلے میں ہمیں خود احتسابی کے عمل سے بھی گزرنا چاہئیے اور اپنے مخصوص قدیم نظام تعلیم اور اس کے زائیدہ حضرات کو بھی زیر بحث لانا چاہئے۔

واعظ اندر مسجد و فرزند او در مدرسہ | او بہ پیری کودکے ایں پیر در عہد شباب
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا | قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں کہتا

اقبال کے ایسے اشعار سے جن میں تہذیب کو اقدار کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے، ان کی اس بالغ نظری کا اندازہ ہوتا ہے جس کے باعث ان کی نگاہ تہذیب اور کلچر کے ظاہر کے بجائے اس کی روح پر پڑتی ہے، اور وہ پیچیدہ سے پیچیدہ تہذیبی صورت حال یا تہذیب و ثقافت کی متصادم قوتوں کا نہایت وضاحت سے دوٹوک انداز میں بیان کر جاتے ہیں۔

مولانا علی میاں نے اقبال کی شاعری میں انسان کامل کے تصور پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اقبال کی نثر و نظم میں بکھرے ہوئے ان عناصر کو مجتمع کرنے پر توجہ صرف کی ہے جن کی مدد سے انسان کامل کے تصور کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ اقبال کے کلام میں مرد مومن، مرد کامل، مرد خدا یا انسان کامل جیسے تمام مرکبات اس مثالی انسان کے لئے استعمال کئے گئے ہیں جو عرفان ذات کی صفت سے متصف ہو، عشق کے جذبے سے سرشار ہو خودی کی حقیقت سے آشنا ہو اور جس کی ذات جلال و جمال کے متوازن امتزاج و اشتراک کا بہترین نمونہ ہو۔ یوں تو اقبال کی غزلوں اور نظموں میں متفرق اور منتشر انداز میں مرد مومن کے تشکیلی عناصر کا

www.abulhasanalinadwi.org

جگہ جگہ ذکر آیا ہے مگر انکی نظم، مسجد قرطبہ، میں اس تصور کو زیادہ منضبط اور مربوط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔علی میاں نے بجا طور پر اس نظم کا جائزہ لیتے ہوئے مسجد قرطبہ کے بانیوں اور اسپین کے فاتحین کو انسان کامل اور مرد مومن کی حیثیت سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔اقبال کی پوری شاعری میں عشق رسولؐ کا جو دریا موجزن ہے اور جس طرح انہوں نے رسول کریمؐ کی ذات کو واحد مثالی شخصیت کے طور پر تقریباً انہیں صفات کے ساتھ پیش کیا ہے جو مرد مومن کے تشکیلی عناصر بن جاتے ہیں۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا آئیڈیل اور مرد مومن کے تصور کی کلید انہیں رسول عربی کی ذات ہی میں ملتی ہے۔اقبال کی نظم مسجد قرطبہ اس اعتبار سے انکی نمائندہ ترین کہی جاسکتی ہے کہ اس نظم کے حوالے سے تصور وقت کے سلسلے میں انہیں اپنا زاویہ نظر پیش کرنے کا موقع بھی ملا، اور مسجد کے وسیلے سے انہوں نے ایک ایسے معروض کو پیش کرنے کی سبیل پیدا کرلی جو وقت کی دست و برد اور ہلاکت ریزی سے بڑی حد تک محفوظ ہے اور وقت کی چیرہ دستیاں بالآخر انکو فنا کے گھاٹ اتار تو دینگی مگر چونکہ اس مسجد میں اسکے بنانے والوں کی مومنانہ صفات موجود ہیں اسلئے ان صفات کے عکس نے مسجد کو بھی غیر معمولی مزاحمت کی قوت سے مالا مال کردیا ہے۔علی میاں نے اس نظم کے جائزے کی تمہید کے طور پر جو فقرے لکھے ہیں وہ نظم کے مالہ و ماعلیہ کو بخوبی اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

اقبال نے اس (نظم) میں فن و زندگی کے بہت سے نظریات واقدار سے پردے ہٹائے ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ یہ زوال پذیر دنیا فانی ہے......لیکن اس اسم عام سے وہ آثار اور تعمیرات مستثنیٰ ہوتی ہیں جنہیں کسی بندۂ باخدا اور مرد مومن کا دست مسیحا اور پنجۂ اعجاز نما چھو جاتا ہے، اور وہ اپنے ایمان و زندگی، اپنے مومنانہ جذبات اور اپنی بقائے دوام کے اثر سے ان میں جان ڈال دیتا اور لافانی بنا دیتا ہے، اپنے عشق و محبت کی قوت و تاثیر سے انہیں زندگی جاوداں عطا کرتا ہے۔

علی میاں نے چند فقروں میں جس طرح مسجد قرطبہ کی روح کو سمیٹ لیا ہے وہ یقیناً

قابل تحسین ہے، مگر غور طلب بات یہ ہے کہ کیا محض یہ مرکزی تصور ہی اس نظم کی عظمت کی ضامن ہے؟ تو اس سلسلے میں دوسرے تصورات کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ ہمیں اقبال کے تصورِ وقت سے رجوع کرنا ہوگا جو زیر بحث نظم کی بنیاد اور کلید ہے۔ سلسلۂ روز و شب کی ترکیب میں اقبال نے جو رات اور دن، اجالے اور اندھیرے، طلوع و غروب اور زمانی تسلسل کو قید کر دیا ہے وہی دراصل اس نظم کا مرکزی حوالہ ہے۔ اس حوالے کے پس منظر میں لا تسبوّ الدھر والی حدیث قدسی اور وقت کا اسلامی تصور کارفرما ہے۔ نظم کے ابتدائی دو بند میں ذات اور صفات کے رشتے کو جس طرح الوحی منبع تخلیق اور تخلیق کے عمل کے لامتناہی تسلسل کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے، اور اس فلسفیانہ تناظر کو مستحکم کرنے کے بعد فنا اور بقا کے مسئلے کا احاطہ کیا گیا ہے اور اس پہلو پر خاص توجہ کی ضرورت تھی۔ تاہم اس نظم کے فکری جائزے میں مصنف نے عشق، خودی، جلال، جمال اور فنون لطیفہ میں خون جگر کی نمود جیسے مسائل نہایت بالغ نظری کے ساتھ اس طرح ایک تسلسل اور تخلیقی نمو کے پس منظر میں پیش کر دیئے ہیں کہ مسجد قرطبہ جیسی غیر معمولی اور مکمل نظم کی تحسین کے ساتھ تعبیر و تجزیہ کا بھی حق ادا ہو گیا ہے۔

علامہ اقبال کے فلسفے کو اگر محض ان کی اردو اور فارسی شاعری کے موضوعات اور نقطۂ نظر سے مرتب کرنے کی کوشش کی جائے تو اس فکر و فلسفہ کے بیش تر عناصر کو مجتمع کرنا قدرے دشوار تو ہے مگر ممکن ہے۔ اسی لئے اقبال کو ان کی کلیت میں سمجھنے کیلئے ان کے خطبات، تحقیقی مقالہ اور مکتوبات کو پس منظر کے طور پر استعمال کرنا زیادہ کارآمد اور صحیح طریقہ ہے۔ علی میاں نے اسی باعث اقبال پر مضامین لکھتے ہوئے تمام مآخذ و مصادر سے رجوع کیا اور خاصے رد و قبول کے عمل سے گزرنے کے بعد ایک مخصوص رائے قائم کی ہے۔ ایسا بالکل نہیں ہے کہ علی میاں نے پر مشروط طور پر اقبال کو قابل تقلید مان لیا ہو۔ اس کا ثبوت ان کے ان جملوں سے واضح انداز میں ملتا ہے کہ:

اقبال ان معدودے چند خوش نصیب افراد میں سے ہیں جو مغربی تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر ابھر آئے، اور نہ صرف یہ کہ صحیح سلامت ساحل تک پہنچے، بلکہ اپنے

www.abulhasanalinadwi.org

ساتھ بہت سے موتی بھی تہہ سے نکال کر لائے۔اوران کی خوداعتمادی اسلام کی ابدیت اور اس کے وسیع مضمرات پران کا یقین اور زیادہ مستحکم ہوگیا۔اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انہوں نے مغربی تعلیم اور فلسفہ کا مطلق اثر نہیں قبول کیا اوران کی دینی فہم کتاب وسنت اور سلف امت کے بالکل مطابق ہے۔

اپنے آخری جملے کی وضاحت علی میاں نے حاشیہ میں اس طرح کی ہے ''جس میں کہیں کہیں حقائق غیبی کی فلسفیانہ تعبیر وتاویل کا شدید رنگ جھلکتا ہے'' ......ان معروضات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علی میاں نے اپنے موقف اور مطمح نظر کا پورا احترام کرتے ہوئے اقبال کی فلسفیانہ اور شاعرانہ عظمت کو مدلل انداز میں سمجھنے کی کوشش کی ہے اور افہام وتفہیم کا یہ عمل جہاں اقبال اور اقبالیات کے ذخیرے میں ایک اضافہ بن گیا ہے وہیں علی میاں کی تصانیف میں روائع اقبال کو صحیح اور مناسب ترین سیاق وسباق میں متعارف کرانے اور تعبیرات سے گزارنے کے ناقدانہ کارنامہ کی حیثیت بھی حاصل ہوگئی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں ندوی کے اخلاق و عادات

مولانا برہان الدین سنبھلی
استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حضرت مولانا علی میاں کی سخاوت بہت معروف ہے۔اپنے پرائے سب اس کے معترف وقائل ہیں،کون واقف نہیں جانتا کہ حالیہ چند برسوں میں جب ان پر مادی دولت کی بارش ہوئی (مختلف ایوارڈوں کی شکل میں) تو انہوں نے اسے لٹا کر ہی دم لیا،وہ خواہ فیصل ایوارڈ کی صورت میں ملنے والی لاکھوں کی رقم ہو،یا ابوظبی سے ملنے والا ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کا انعام،یا برونائی سے حاصل ہونے والے بیس لاکھ روپیہ سے زیادہ۔سب سے دامن جھاڑ کر اس طرح کھڑے ہوگئے جس طرح ان کے اور ہر مسلمان کے حقیقی مقتدا علیہ ﷺ ہوجاتے تھے (حوالوں اور تفصیل کے لئے دیکھئے راقم کا مقالہ۔حضرت مولانا پر شائع شدہ ''نئی دنیا'' خصوصی شمارہ اور تعمیر حیات شمارہ ۲۵ر جنوری ۲۰۰۰ء) اور جس طرح ھادیٔ برحق کی یہ صفت (جود وسخا) ماہ مبارک میں نقطۂ عروج پر پہونچ جاتی (اجود من الریح المرسلۃ)۔تیز ہوا سے بھی زیادہ سخی (بخاری) اسی طرح ان کے اس پیرو کا بھی کم وبیش یہی حال ہوتا کہ اس کے دستر خوان پر روزانہ سینکڑوں بلکہ اخیر دور میں بعض دن ایک ایک ہزار،یا شاید اس سے بھی زیادہ روزہ افطار کرتے۔سیر ہوکر کھاتے اور سحری تناول کرتے۔یہ تو موجودینکی ساتھ برتاؤ تھا اور جو حاضر نہ ہوسکتے ان میں نہ جانے کتنے (جن کی تعداد بھی سینکڑوں سے کم نہ ہوگی)

www.abulhasanalinadwi.org

نقد کی شکل میں حصہ پاتے) راقم ایک مرتبہ خود حضرت مولاناؒ کے پاس ایک رمضان میں منی آرڈر فارموں کی ایک بڑی تعداد رکھی دیکھی ، ظاہر ہے کہ ان کے ذریعہ غائبین کو حصے پہنچائے جارہے تھے ۔ ایسا ہی حال کم وبیش دوسرے وصف (سچائی) میں بھی تھا ۔ اور تیسرے وصف (نرم طبیعت) میں تو ان کا اس عصر میں شاید ہی کوئی ہم پلہ ہو ۔ ان کی طبیعت کی نرمی کا یہ حال سارے وقف جانتے ہیں کہ ان کے یہاں سفارش کرانے والوں کا ، بالخصوص عرب ممالک سے متعلق امور میں تانتا لگا رہتا تھا ۔ اور وہ کسی کو بھی مایوس نہ کرتے ، حتیٰ کہ ایسے افراد بھی جنہیں حضرت مولانا ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے پسند نہ کرتے وہ بھی ناکام نہیں لوٹتے ، بلکہ باربار کے تلخ تجربوں کے باوجود در پر کسی آنے والے کو نامراد واپس نہ کرتے ۔

چوتھے وصف (سب سے زیادہ شریف گھرانے والے تھے) میں بھی ان کا امتیاز سب کو معلوم ہے (اگرچہ اختیاری وصف نہیں ہے مگر اللہ تعالی نے اپنے فضل وکرم سے انہیں یہ وصف بھی عطا کیا تھا) کہ وہ براہ راست سلالۂ نبوی میں سے تھے ۔ اور انکے آباء اجداد نے اس شرف (نسب) کی پوری حفاظت کی تھی ۔ ان سے ملنے پر اچانک مرعوبیت طاری ہوجانا ہر نئے آنے والے کا تجربہ ہے ، لیکن میل جول رکھنے اور کثرت سے آمد ورفت میں ہی نہیں ایک نشست میں وہ تعلق انکی محبت میں تبدیل ہوجاتا ۔ اسی کتاب میں آنحضرت ﷺ کے کچھ اور اوصاف حسنہ دوسرے راوی کے حوالے سے یہ بتائے گئے ہیں ۔۔

کان رسول اللہ ﷺ یخزن لسانہ الا فیما یعنیہ و یؤلفھم و لا ینفرھم ویکرم کریم کل قوم ......و یحذر الناس و یحترس منھم من غیر –ان یطوی علی احد بشرہ و لا خلقہ و یتفقد اصحابہ و یسال الناس عما فی الناس و یحسن الحسن ویقویہ و یقبح القبیح و یوھیہ ،معتدل الامر غیر مختلف ......و من سالہ حاجۃ لم یردہ الا بھا او بمیسور من القول ،قد وسع الناس بسطہ و خلقہ فصار الھم أبا ......مجلسہ مجلس علم وحلم و حیاء وصبر و امانۃ ،لا ترفع فیہ الاصوات ،و لا تؤبن فیہ الحرم ، ولا تنثی فلتاتہ......الخ

(ایک آدھ لفظ کے تغیر کے ساتھ) اسکا ترجمہ بھی حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ کے قلم سے ہی پیش کیا جارہا ہے:۔ضروری امور (ضروری باتوں) کے علاوہ اپنی زبان کو محفوظ رکھتے، فضول تذکروں میں وقت ضائع نہیں فرماتے تھے، آنے والوں کی تالیف قلوب فرماتے، متوحش نہیں بناتے تھے (یعنی تنبیہ وغیرہ میں ایسا طرز اختیار نہ فرماتے جس سے ان کو حاضری میں وحشت ہونے لگے یا ایسے امور ارشاد نہ فرماتے تھے جن کی وجہ سے دین سے نفرت ہونے لگے) ہر قوم کے کریم اور معزز کا (خاص) اعزاز و اکرام فرماتے، لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتے (یا مضر امور سے بچنے کی تاکید فرماتے)......اور خود اپنی بھی، لوگوں کے تکلیف پہنچانے یا نقصان پہونچانے سی حفاظت فرماتے لیکن باوجود خود احتیاط رکھنے اور احتیاط کی تاکید کے کسی سے اپنی خندہ پیشانی اور خوش خلقی کو نہیں ہٹاتے تھے (یعنی ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آتے) دوستوں کی خبر گیری فرماتے، لوگوں کے حالات، آپسی معاملات کی تحقیق فرما کر ان کی اصلاح فرماتے، اچھی باتکی تحسین فرما کر اسکی تقویت فرماتے اور بری بات کی برائی بتا کر اس کو زائل فرماتے اور روک دیتے......ہر امر میں اعتدال اور درمیانہ روی اختیار فرماتے......جو آپ سے کوئی چیز مانگتا آپ اس کو مرحمت فرمادیتے (اگر نہ ہوتی) تو نرمی سے جواب دیتے، آپ کی خندہ پیشانی اور خوش خلقی تمام لوگوں کے لئے عام تھی، آپ تمام لوگوں کے حق میں باپ کی طرح شفیق تھے ......آپ کی مجلس علم و حیاء اور صبر و امانت کی مجلس ہوتی تھی، نہ اس میں شور و شغب ہوتا تھا نہ کسی کی عزت و آبرو اتاری جاتی تھی، اس مجلس میں اگر کسی سے کوئی لغزش ہو جاتی تھی تو اسکو شہرت نہیں جاتی تھی''۔

جن لوگوں نے حضرت مولاناؒ کو برابر دیکھا اور برتا ہے نیز ان کی مجلسوں اور صحبتوں سے طویل مدت تک فیض اٹھایا ہے، (جنہیں براہ راست اللہ کے رسول ﷺ کی صفات مذکورہ کا علم نہیں) بعید نہیں وہ ان سطروں کو پڑھ کر انہیں۔اللہ کے رسول ﷺ کے۔اس امتی کی صفات سمجھ بیٹھیں، کیونکہ آقا کے طرز و انداز کی اتباع و نقل میں ان کے اس شیدائی و فدائی نے اپنے آپ کو ایسا ڈھال لیا تھا کہ گویا وہ نقل مطابق اصل کا مصداق بن گیا تھا، اس

www.abulhasanalinadwi.org

اجمال کی تفصیل کرنے کی ۔ واقفین کے لئے تو کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، البتہ جنہوں نے آں مخدوم کو قریب سے نہیں دیکھا ہے اور نہ برتا ہے ان کے واسطے کچھ وضاحت بے محل نہ ہوگی:

حضرت مولانا کی مجلسوں کا خاص امتیاز بھی یہی تھا کہ لایعنی اور فضول باتیں نہ فرماتے کسی کی غیبت اور عیب جوئی نہ کرتے، بلکہ اگر کوئی مولاناؒ کے مزاج سے ناواقف، دوسروں کی مجلسوں کا عادی، کبھی کسی کی برائی خواہ مولانا کے کسی شدید مخالف کی برائی، کا ذکر چھیڑنا چاہتا، مولانا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تو موصوف اول وہلہ میں ہی اسکی بات کاٹنے کے لئے موضوع سخن اس طرح بدل دیتے کہ وہ اپنا سا منہ لیکر رہ جاتا، آنے والوں جن ہر طبقہ، ہر خیال، ہر مذہب اور ہر فکر کے لوگ ہوتے اور بکثرت آتے رہتے، ان سب کی دلداری اور تالیف قلوب اس طور پر کرتے جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی، زبان وقلم اسکے بیان سے عاجز ہی لگتے ہیں۔

ہر قوم کے کریم (معزز ومختار) افراد کی توقیر کا یہ اندازہ تھا کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر، شیعہ، بوہرہ، بریلوی، اور اہل حدیث وغیرہ ہی نہیں، غیر مسلموں کے ممتاز افراد سے بھی اس طرح برتاؤ کرتے کہ وہ سب ان کے اخلاق کریمانہ کے اسیر بن کر اور پھر ملنے کی تمنا لیکر جاتے، بایں ہمہ موصوف کسی کے بھی غلط فکر سے متاثر ہونا تو کجا ہر کج فکر کو سیدھی راہ دکھانے کی فکر کرتے مگر اس انداز سے کہ اس پر گراں گذرنے کے بجائے اس میں ممنونیت کا جذبہ پیدا کردیتے۔ دوستوں عزیزوں اور اہل تعلق کی خبر گیری کا تو یہ حال تھا کہ اگر ذرا پتہ چل جائے کہ فلاں......عزیز یا فلاں......صاحب تعلق کو کسی قسم کی پریشانی ہے، خواہ وہ تعلق کسی نوعیت کا ہو اس میں ادارۂ ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والوں کا خاص مقام ولحاظ تھا۔ تو وہ اس کی پریشانی دور کرنے کے لئے اپنی توجہات اور امکانات بروئے کار لانے سے دریغ نہ کرتے، پھر پریشانی دور ہونے تک برابر فکر مند رہتے۔

اگر اہل تعلق کے درمیان کبھی کوئی بدمزگی ہوجاتی تو اسے دور کرنے کی پوری سعی کرتے اور جب تک دور نہ ہوجاتی چین نہیں آتا، ہر اچھے کام اور قول پر تشجیع اور حوصلہ افزائی

کرتے اور اس میں پوری فراخ دلی کا مظاہرہ فرماتے بالخصوص اچھی تحریر (اچھی کتاب یا مقالہ) پر بہت جی کھول کر داد دیتے اور برابر اس کا تعریفی انداز میں تذکرہ فرماتے رہتے ، بلکہ بسا اوقات انعام بھی دیتے ۔ بری بات کی نشاندہی اور اس پر نکیر اس طرح فرماتے کہ سننے والے میں ممنونیت کا احساس اور امتثال امر کا جذبہ بیدار ہو جاتا، کڑوی سے کڑوی بات بھی ایسے شیریں انداز میں کہتے کہ کڑواہٹ دب رہ کر جاتی اور شیرینی کے چٹخارے ہر ذوق سلیم رکھنے والا لینے لگتا۔ ہر معاملہ میں اعتدال وتوازن مولانا کا وہ وصف امتیازی تھا جسکے قائل ۔ موافق ومخالف ۔ سب ہیں ۔ سائل کے سوال کو رد کرنا تو گویا جانتے ہی نہ تھے ۔ خندہ پیشانی اور ہر آئندورووند کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے میں ان کی عادت تو شہرہ آفاق ہے ہی، جس نے ایک مرتبہ بھی ملاقات کی وہ ان کے اس وصف کے گن گاتا رہا۔

آنحضرت ﷺ کی تمام صفات کا تو اس جگہ تذکرہ کرنا نہ مقصود ہے نہ آسان (بلکہ انسان کے لئے بھی آنحضرت ﷺ کے اوصاف حمیدہ کا احاطہ ممکن نہیں) بس یہاں چند اور ایسی صفات کا تذکرہ کرکے بات ختم کی جاتی ہے، جن سے حضرت مولانا کے کچھ اور اوصاف پر روشنی پڑتی ہے۔

"کان رسول اللہ ﷺ یقبل بوجھہ وحدیثہ علی اثر القوم یتالفھم بذلک ......لم یکن فحشا ولا متفحشا ولا صخابا فی الاسواق و لا یجزی بالسیئہ السیئۃ ولکن یعفو ویصفح ......دائم البشر سھل الخلق لین الجانب لیس بفظ و لاغلیظ ...... کان لا یذم احدا ولا یعیبہ ولا یطلب عورتہ "۔

ترجمہ (حضرت شیخ الحدیثؒ کا کیا ہوا)

قوم کے بدترین شخص کی طرف بھی حضور اقدس ﷺ تالیف قلب کے لحاظ سے اپنی خصوصی توجہ مبذول کرتے اور گفتگو بھی خاص توجہ سے فرماتے تھے (جسکی وجہ سے اسکو اپنی خصوصیت ۔ کہ اللہ کے رسول اس پر خاص توجہ فرمارہے ہیں ۔ کا خیال ہوتا) حضور اکرم ﷺ نہ تو طبعا فحش گو تھے، نہ بتکلف فحش بات فرماتے تھے اور نہ بازاروں میں چلا کر (خلاف وقار) باتیں کرتے ، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے ، بلکہ معاف فرمادیتے تھے اور اس کا ذکر

www.abulhasanalinadwi.org

تذکرہ بھی نہ فرماتے تھے، آپ ہمیشہ خندہ پیشانی اور خوش خلقی کے ساتھ متصف رہتے تھے یعنی چہرۂ انور پر بشاشت اور تبسم کا اثر نمایاں رہتا تھا آپ نرم مزاج تھے یعنی کسی بات میں لوگوں کو آپ کی موافقت کی ضرورت ہوتی تھی تو آپ سہولت سے موافق ہو جاتے تھے نہ آپ سخت گو تھے اور نہ سخت دل تھے......نہ عیب گیر تھے کہ دوسروں کے عیوب پکڑیں نہ کسی کی مذمت فرماتے تھے نہ کسی کو عیب لگاتے تھے نہ کسی کے عیب تلاش فرماتے تھے"۔

جن لوگوں کا حضرت مولانا سے ربط و تعلق اور ملنا جلنا رہا ہے وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے کہ حضرت مولاناؒ نے نبی اکرم ﷺ کے ان تمام اوصاف حسنہ اور صفات حمیدہ کو ایسا اپنا لیا تھا کہ وہ اسوۂ نبوی کی عملی تفسیر بن گئے تھے۔ اللھم ارحمہ واکرم نزلہ وارفع درجاتہ وادخلہ فسیح جنانہ۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں کاروان زندگی کی روشنی میں

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

استاد شعبہ دینیات، اے ایم یو علی گڑھ

مولانا سید ابو الحسن ندوی کی تصنیفات اور تالیفات میں کاروان زندگی کو انفرادیت کی شان حاصل ہے۔ اس تالیف میں ایک طرف مولانا کی ہمہ جہت شخصیت کے نشیب و فراز، خاندان اور اس ضمن میں اعزہ واقرباء کے مختصر احوال وکوائف کا تذکرہ ہے اور دوسری طرف اسلامیان ہند بلکہ پورے عالم اسلام کے عروج واقبال اور غلبہ و تفوق کے لئے جا بجا نقوش راہ ملتے ہیں۔ یہی وہ مقصد عظیم ہے جس کے محور پر مولانا کا زور قلم صرف ہوتا ہے۔ اس ضمن میں کاروان زندگی کے صفحات میں مصنف کی سرگذشت حیات سے زیادہ مختلف تحریکوں اور تنظیموں کے احوال، مسائل و مشکلات اور ان کے اسباب کا تجزیہ، قوموں کے عروج و زوال اور اس کے محرکات نیز انسانی زندگی سے متعلق دیگر امور و مسائل اور ان کے عینی مشاہدات و ملاحظات پر سیر حاصل مواد ملتا ہے جو بلا شبہ اقوام و ملل کی فلاح و کامرانی میں توشۂ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''مصنف نے ایسا قصد اکیا ہے کہ اس کو اپنے حالات سے زیادہ اپنے خیالات عزیز ہیں اور وہ ان میں زیادہ افادیت سمجھتا ہے۔ اس کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ اس کے حالات زندگی میں کوئی ندرت و رفعت نہیں، لیکن اس کے خیالات، احساسات و جذبات، زندگی اور ماحول کا مطالعہ، عالم انسانی اور اقوام و ملل کے عروج و زوال کے

www.abulhasanalinadwi.org

اسباب کا تجزیہ، موجودہ مصائب و مشکلات اور ان کے حقیقی اسباب تک رسائی، ہندوستان اور معاصر دنیا کے لئے صحیح راہ عمل کا تعین، اس کے مطالعہ قرآن اور مطالعہ سیرت کا فیضان اور اس شمع ہدائت کے ساتھ تاریخ انسانی کے بے لاگ جائزہ کا نتیجہ اور سب سے بڑھ کر توفیق الٰہی کا کرشمہ ہے"[۱]

اگرچہ مولانا مرحوم کے سامنے خودنوشت سوانح عمریوں کے نمونے موجود تھے۔ ڈاکٹر احمد امین کی الایام، عباس محمود عقاد کی انا، محمد کرد علی کی مذاکرات گاندھی جی کی تلاش حق، جواہر لعل نہرو کی میری کہانی خود نوشت سوانح عمری کے باب میں سمت سفر کی نشاندہی کر رہی تھیں مگر اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے اس سلسے میں تردد کی کیفیت سے دو چار رہے تاہم رشید احمد صدیقی، حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد زکریا اور مولانا عبدلماجد دریابادی جیسے ہمعصروں کی خودنوشت حالات زندگی نے تردد و کشمکش کے طوق و سلاسل توڑ دئے اور پھر رخت سفر باندھنے میں کوئی چیز مانع و مشکل نہیں بنی[۲]

خود نوشت سوانح عمری کے مرتب کرنے میں بڑے حزم و احتیاط کی ضرورت تھی اور مولانا نے اس کا خیال رکھا اپنے بچپن، جوانی، بڑھاپا کو بے کم و کاست واضح کیا، اپنی کوتاہیوں کو سپرد قرطاس کرنے میں جھجک محسوس نہیں کی اور اپنے وصف و کمال کو بھی اجاگر کیا لیکن ایک ایسے بندۂ مومن کی طرح جس کی ایمانی شان و عظمت پر آنچ نہیں آتی اور وہ شکر و سپاس کے جذبۂ صادق سے معمور ہو کر کامل اطاعت و سرافگندگی کا ثبوت فراہم کرتا ہے اپنے خاندان اور اعزہ و احباب کے احوال و کوائف بھی جابجا دیانتداری کے ساتھ رقم کرتے ہیں۔ سوانح نگار کی تصنیف میں تحقیق، ایمانداری اور عدل و انصاف کا بدرجہ اتم وصف، موجودہ دور کے سماجی، معاشی، تہذیبی اور علمی حالات کی منظر کشی ان پر ان کے انتہائی اہم ملاحظات مولانا کو دوسرے سوانح نگاروں سے ممتاز بنا دیتے ہیں۔ اور در حقیقت یہی وصف ایک مورخ یا سوانح نگار کے اپنے مخصوص میدان میں طبع آزمائی کے لئے قیمتی سرمایہ ثابت ہوا کرتا ہے۔ مولانا کی

www.abulhasanalinadwi.org

بے تکلفی اور دیانتداری ان جملوں سے عیاں ہے :

"میرا بچپن درخشاں نہیں تھا بلکہ مایوس کن اور ہندی محاورہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، کے بالکل برعکس تھا۔ میری عمر اور خاندان کے بچوں میں بھی عام طور پر جتنا شعور اور سلیقہ پایا جاتا تھا وہ بھی مجھ میں نظر نہیں آتا تھا۔ قدرتی طور پر والدہ صاحبہ کو اس کا رنج تھا اور خاندان کی عزیز خواتین اور بعض بزرگ بھی اس احساس کو اپنے تبصروں سے تازہ اور زندہ کرتے رہتے تھے" (۳)

مولانا کی زندگی کے دیگر پہلوؤں میں دعوت و تبلیغ کا پہلو بڑا درخشاں ہے اور اسے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام کی عالمگیریت وآفاقیت کا یقین اور اس کے امانت عظمیٰ ہونے کا احساس و یقین ہی وہ محرک تھا جس نے مولانا کو ہمہ آن سرگرم عمل بنا رکھا تھا۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور پھر حضرت مولانا محمد زکریا اور ان کی دینی دعوت سے آگہی اور ربط و تعلق کے بعد ان کی داعیانہ زندگی مزید انقلاب آشنا ہو گئی۔ چنانچہ مولانا کی دعوتی زندگی برصغیر تک ہی محصور نہیں رہی بلکہ ایران، عراق، افغانستان، لبنان، دمشق، اور مشرق وسطیٰ کے بعض دوسرے ممالک یوروپ، امریکہ اور افریقہ کے متعدد ممالک میں بھی دعوت حق کی آبیاری کی۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کی زبانی ؎

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں۔ خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دی اذانیں کبھی یوروپ کے کلیساؤں میں۔ کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں ؏

دعوت و تبلیغ کی راہ میں مولانا کی برپا کی ہوئی تحریک پیام انسانیت کی معنویت وطن عزیز ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں دوچند ہو جاتی ہے۔ چونکہ ہندوستان کے مخصوص حالات اور وقت کی انتہائی ناگزیر ضرورت پر مولانا نے لبیک کہا اور بلا تفریق مذہب و ملت اس ملک کے تمام باشندوں کے دلوں پر دستک دینے کا عزم مصمم کیا اس لحاظ سے مولانا کا یہ مستحسن اقدام داعیٔ حق کے علاوہ ایک سچے اور مخلص وطن

www.abulhasanalinadwi.org

دوست ہونے پر ایک بین شہادت بھی ہے۔ کاروان زندگی کی ذیل کی عبارتیں مولانا کے اضطراب و بے چینی اور تحریک پیام انسانیت کی اہمیت پر شاہد وناطق ہیں :

"کسی ملک اور کسی دور میں بھی تعلیمی و تعمیری کاموں کے لئے خواہ وہ کتنے مقدس ضروری اور مفید ہوں، شرط یہ ہے کہ اس ملک میں معتدل حالات ہوں۔ جہاں کوہ آتش فشاں بار بار پھٹتا ہو، سائیکلون جلد از جلد آتے ہوں، سیلاب اپنی قہر سامانیوں کے ساتھ پورے پورے شہروں اور صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہو وہاں تعلیمی و تعمیری کام کے لئے دماغی سکون اور ولولہ عمل کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ تو غیر اختیاری امور ہیں اور ان پر کسی کا کوئی قابو نہیں، لیکن جہاں فرقہ وارانہ فسادات، انسان کشی اور انسانیت سوزی کے جنون کی لہریں اٹھتی ہوں اور اچھے پڑھے لکھے انسانوں کو اعصابی ہسیٹریا کے دورے جلد جلد پڑتے ہوں، جہاں دولت و قوت کے سوا کوئی اور حقیقت زندہ اور مسلم نہ مانی جاتی ہو........ وہاں کسی تعلیمی و تعمیری کام یا کسی ادارے کی بقا کی ضمانت کب تک دی جا سکتی ہے اور اس غیر یقینی اور ہیجانی فضا میں کوئی تصنیفی یا فکری کام کیسے ہو سکتا ہے" ؎۵

کلمہ طیبہ کے انقلابی کلمہ کے اعتراف و اقرار کے بعد ایک شخص اس عظیم المرتبت گروہ کا معزز فرد بن جاتا ہے جسے خیر امت، امت وسط اور شہداء علی الناس کے قرآنی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ ربانی القاب و عنایات مشروط ہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جامع فریضہ کی انجام دہی سے۔ مولانا امت مسلمہ کے تمام افراد کو جھنجوڑتے ہوئے نور نبوت کو عام کرنے اور اسلام کی آفاقیت کو طشت ازبام کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ دعوت حق کو عام کرنے میں ہی اپنی بھلائی، ملک و قوم کی عظمت اور اسلام کی عالمگیریت کا راز پنہاں ہے۔ مولانا امت مسلمہ سے ہمکلام ہوتے ہیں :

اگر امت نے احتساب کائنات کا فریضہ چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو عالم انسانی کی علمی و فکری قیادت سے سبکدوش کر لیا تو یہ نوع انسانی کے حق میں جرم اور خود اپنے

www.abulhasanalinadwi.org

اوپر ظلم عظیم ہوگا ، اس لئے آج اگر ہماری جامعات کے فضلاء، ہمارے ادباء، شعراء، اہلِ قلم اور اہلِ فکر اپنے گوشہ عافیت میں ہو جائیں یا اپنے حصار کے اندر مطمئین ہو جائیں اور نوع انسانی کی علمی و فکری قیادت کا کام چھوڑ دیں تو نوع انسانی کا بھی خسارہ ہوگا، وہ ملک بھی نقصان اُٹھائے گا اور خود وہ بھی اپنی دعوت ایمانی اور صدائے اصلاح کو محدود سے محدود تر بنا دیں گے"۲؎

سنگین سے سنگین تر حالات سے فرار و اجتناب اور گوشہ عافیت اختیار کرنا مولانا کی ملی غیرت اور قومی بین الاقوامی قیادت ور ہنمائی کے شایان نہیں تھا۔ اس لئے ملت اسلامیہ ہند کا معاملہ ہو یا عالم اسلام کے کسی بھی ناپتے اور خطے کا، ناگفتہ بہ حالات میں بھی کسی قسم کا مفاد اور بے جا مصلحت اعلان صداقت اور اظہار حق میں مانع نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف فسادات کا سدباب کرنے کے لئے خوف خدا اور خشیت الٰہی کو موثر ضابط و حکمراں سمجھتے ہیں اور دوسری طرف بڑی جرات و بے باکی کے ساتھ انتظامیہ اور اساطین حکومت کو نامساعد و ناسازگار حالات کا ذمہ دار ٹھراتے ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں جب وطن عزیز کو فرقہ واریت اور تشدد کی آگ میں جلتے ہوئے دیکھا تو بے قرار و مضطرب ہو گئے اور انتظامیہ کو اس کوتاہی و ناعاقبت اندیشی سے خبردار کیا:

"ملک میں اس وقت فرقہ پرستی اور تشدد کی جو لہر آئی ہے وہ بے حد تشویشناک ہے، مجھے افسوس ہے کہ انتظامیہ کی تساہلی اور ضرورت سے زیادہ مصلحت اندیشی نے بابری مسجد، رام جنم بھومی کے مسئلہ کو حل کرنے میں نہ صرف تاخیر کی، بلکہ احیاء پرست تنظیموں کو من مانے ڈھنگ سے اپنے پروگرام پر عمل کرنے کا موقع دیکر ملک کی یکجہتی اور ہم آہنگی کو سخت صدمہ پہنچانے کا موقع فراہم کردیا۔ اس سلسلے میں بھاگلپور، بدایوں، بنارس اور اندور وغیرہ میں جو کچھ پیش آیا وہ سخت تکلیف دہ اور قابل شکایت ہے۔ لوگوں کی جان و مال کی حفاظت اور امن قائم رکھنا حکومت کا اولین فریضہ ہے"۳؎

۔ دینی تعلیم کے فروغ و اشاعت کا مسئلہ رہا ہو یا نصاب تعلیم میں ہندو میتھالوجی کے

www.abulhasanalinadwi.org

انضمام کا معاملہ، متبنی بل کا مسئلہ ہو یا وندے ماترم کا قضیہ، شاہ بانو کیس رہا ہو یا مسلم پرسنل لاء کی کسی شق میں دخل اندازی کا مسئلہ مولانا کبھی بھی مسائل سے چشم پوشی اختیار کر کے کسی گوشہ عافیت میں پناہ گزیں نہ ہوئے بلکہ زبان و قلم کی پوری طاقت کے ساتھ مسائل سے نبرد آزمائی کی اور ملت کے زخموں کا مرہم بنے۔ ۶/ دسمبر ۹۲ء کو انتہائی المناک اور سنگین ترین حادثہ کے بعد جو روح فرسا مناظر اس ہندوستان میں نظر آئے ان حالات میں بھی مولانا مرحوم کا دل مضطرب و بے قرار ہو اٹھا اور جرأت رندانہ کے ساتھ اس سازش میں ملوث ذہنیتوں کی گرفت کی اور فرقہ پرست جماعتوں کے ساتھ ساتھ ریاستی اور مرکزی حکومت کو ذمہ دار ٹھہرایا، مولانا فرماتے ہیں :

''اس کی ذمہ داری سب سے پہلے ان فرقہ پرست جماعتوں پر ہے جنھوں نے پورے ملک میں کار سیوا کے نام پر ایک اندھا مذہبی جوش پیدا کر دیا ہے، پھر اس اتر پردیش کی حکومت پر ہے جو اسی وعدہ اور بنیاد پر قائم ہوئی تھی اور جس نے مسجد کی حفاظت کے بار بار کے وعدوں اور عدالت کے فیصلے کے احترام کے اپنا فرض پورا نہیں کیا اور وہ اس پورے ڈرامہ میں تماشائی بنی کھڑی رہی........ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مرکزی حکومت پر بھی اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔''[۸]

کاروان زندگی کے ہر ہر حصے میں ان دوروں اور اسفار کا بھرپور تذکرہ ملتا ہے جن میں دعوت کی روح ہی ناطق نظر آتی ہے مغربی ممالک ہوں یا مشرق وسطی کے ممالک جہاں بھی مولانا تشریف لے گئے سیر و سیاحت کے مقصد سے نہیں بلکہ اسلام کے آفاقی پیغام کی امانت کو ان حضرات تک منتقل کرنے کے لیے جو دین اسلام جیسی نعمت غیر مترقبہ کی لذت و شیرینی سے ناآشنا تھے یا دعوت و تبلیغ کا مخاطب خاص ان لوگوں کو بنایا جو یورپ کے علم و تحقیق اور تہذیب و ثقافت سے مدہوش و حیراں تھے اور جن پر مرعوبیت کا غلبہ ہو گیا تھا۔ جہاں تک عامتہ الناس کی بات ہے خواہ ان کا تعلق ہندوستان سے ہو یا بیرون ہندوستان سے اور ان کا واسطہ کسی بھی مذہب سے ہو ہر

www.abulhasanalinadwi.org

ایک مولانا کی دعوت حق کی شیرینی اور پیام انسانیت کی خوشبو سے محفوظ ہوا۔ مولانا ببانگ دہل اسلامی معاشرہ کے قیام واستحکام پر لب کشا ہوتے ہیں اس لئے کہ قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی قانون ہی دراصل خیر وفلاح کے فروغ اور ملک و قوم کے امن و سلامتی کی ضمانت بن سکتا ہے اسلئے کہ یہ قانون دلوں کی دنیا پر حکمرانی کرنے کا سبق سکھاتا ہے۔ حجاز مقدس کے سفر میں عربوں کے سامنے دعوت حق کی عالمگیریت اور قرآن و سنت پر مبنی معاشرے کی عظمت پر گویا ہوتے ہیں :

''حضرات آج دنیا کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے ایک مثالی معاشرہ، نمونہ کا معاشرہ جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ پسند فرمائے اور نوع انسانی کے لئے سراپا خیر وبرکت بھی ہو جو عقائد میں، اخلاق میں، معاملات میں اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی تعلیمات کا آئنہ دار ہو ایسا معاشرہ نمایاں طور پر کہیں نظر نہیں آتا، ایسا مثالی معاشرہ دنیا کی اہم ترین ضرورت ہے، دنیا اس کی محتاج و منتظر ہے۔ موجودہ حالات میں اگر کسی طرح کی تبدیلی لائی جاسکتی ہے تو ایک مثالی معاشرہ ہی کے ذریعہ لائی جاسکتی ہے۔'' ۹

مولانا نے عہد حاضر کے تقاضوں اور عصری علوم کی افادیت سے چشم پوشی نہیں کی بلکہ اسلام کی ہمہ گیریت و معنویت منصّہ شہود پر لانے اور اقوام عالم میں وقت کی زبان میں اس چشمۂ صافی کو عام کرنے کے پیش نظر حالات حاضرہ کے تقاضوں کی تکمیل کو مستحسن فریضۂ وقت اور مئوثر ترین حربہ قرار دیا۔ جدید تعلیم کی راہ سے آنے والے الحاد و بے دینی کی آندھیوں کے بارے مین ہمیشہ فکر مند رہے اس سلسلے میں مولانا کے حساس قلب و ضمیر کی ترجمانی شاعر مشرق کی زبانی ہوتی ہے ۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم۔
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما۔
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ ۱۰

www.abulhasanalinadwi.org

چنانچہ کبھی ام القریٰ، کبھی الجامعۃ الاسلامیہ، کبھی جامعۃ الازھر کے نو نہالان ملت کے ذہن و قلب پر دستک دی تو کبھی آکسفورڈ، کیلیفورنیا، اسلامک سینٹر، کیمبرج اور کبھی بین الاقوامی شہرت کی حامل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کے اذہان و قلوب کو گرمایا۔ مولانا کا موقف تھا کہ اغیار و معاندین اسلام کی یلغاروں، سازشوں اور ان کی دسیسہ کاریوں کا مقابلہ فکر و عمل کی طاقت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ عصری علوم و فنون سے متعلق مولانا مرحوم کا موقف وہی تھا جو کاروان علی گڑھ سے متعلق بانی درسگاہ علی گڑھ سر سیدؒ علیہ رحمہ کا تھا اور وہ یہ کہ چاہے دنیا چاند پر بسا لی جائے، ستاروں پر کمندیں ڈال دی جائیں اور خلاؤں اور فضاؤں پر فتح و ظفر کے پرچم لہرا دیئے جائیں لیکن تشخص و انفرادیت کی شان مجروح نہ ہونے پائے اور ہر خطۂ ارض اور شعبۂ حیات میں کلمۂ طیبہ کے انقلابی بولوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ا یوم وفات سر سیدؒ کے موقع پر طلبہ، اساتذہ اور انتظامیہ کو مشترک پیغام میں فرزندان ملت اور نو نہالان قوم کو نشان راہ دیا:

آپ ایسا طبقہ پیدا کریں جس کی طرف نگاہیں اٹھیں.....آپ ایسے دانشور اور فضلاء نکالیں جو نہ صرف علمی طور پر بلکہ اخلاقی اور ذہنی طور پر بھی ممتاز ہوں۔ یہ سمجھا جائے کہ علی گڑھ کا گریجویٹ اور علی گڑھ کا تعلیم یافتہ رشوت نہیں لیتا، وہ نا انصافی نہیں کرتا وہ کسی خاندان اور خاندان اور قوم کے درمیان خط امتیاز نہیں کھینچتا، اسی طرح ذہنی طور پر بھی اپنا سکہ جمائیں۔ کوئی قوم خاص کر اس عہد ترقی میں، عہد علم و فن میں، عہد صحافت و ادبیات اور عہد تحقیقات میں عزت حاصل نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنا ذہنی سکہ نہ جما دے۔ یہاں سے ایسے لوگ نکلیں جو علمی تحقیقی صلاحیت ہی نہیں اخلاقی اور ذہنی حیثیت سے بھی ایک امتیاز رکھتے ہوں ۱ا

مولانا کے رشحات قلم میں کاروان زندگی ایک انسائیکلو پیڈیائی تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا کی زندگی کے ۸۵ سالہ روزنامچوں، خاندان کے نشیب و فراز کی تفصیلات اور اعزہ و احباب کے احوال و کوائف سے زیادہ ان

www.abulhasanalinadwi.org

کے روشن اور حیات بخش افکار و خیالات، دیار خویش اور دیار غیر میں انقلاب آفریں مواعظ و خطبات، اقوام و ملل کے عروج و اقبال اور تخلف وادبار، مختلف تحریکوں اور تنظیموں کے منشور اور ان کے طریقہ عمل پر اصلاحی اور معنی آفریں تنقیدات احوال و کوائف کے مدوزجر، ان کے عینی مشاہدات و ملاحظات اور مثبت و منفی اثرات وعواقب سے آگاہی، ملت اسلامیہ ہند کے لئے بالخصوص اور تمام عالم اسلام کے لئے بالعموم لائحہ عمل کا مرقع ہے مولانا کی یہ نابغہ روزگار تصنیف۔ مولانا اگرچہ کل نفس ذائقة الموت کے فرمودۂ ربانی اور قانون الٰہی کے مطابق لازوال اور ابدی دنیا کے لئے رحلت فرما گئے۔ لیکن ان کا علم و فضل، زہد و تقوی، عزت و نفس، خودداری، کیفیت استغناء شان قلندری، جرأت و بے باکی اور اس سے بڑھ کر ایک صالح معاشرے کے قیام و استحکام کے لئے دیا گیا مولانا کا عملی و فکری اثاثہ، ملک و قوم کے روشن مستقبل کی تعمیر و تشکیل کے لئے نقشہ کار کی علمی تفسیر اور پورے عالم اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے منشور حیات کی فکری اور علمی توضیح آج بھی زندہ و تابندہ ہے اج بھی کوئی قوم و ملت مولانا کے دیئے گئے فکری اور علمی نقوش راہ کو اپنے روزنامچہ حیات کی زینت بنالے تو وہ خود اپنے ہاتھوں اپنا نوشتۂ تقدیر لکھ سکتی ہے۔

حوالہ جات:

(۱) ابوالحسن علی ندوی، کاروان زندگی ج ۲، پیش لفظ، ص ۱۰، طبع اول ۱۹۸۴ء، لکھنؤ

(۲) کاروان زندگی

(۳) کاروان زندگی، ج ۱ ص ۸۳، طبع دوم، ۱۹۹۴ء

(۴) ڈاکٹر محمد اقبال کلیات اقبال، بانگ درا "شکوہ" ص ۱۶۴ اصدی ایڈیشن، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

(۵) کاروان زندگی، ج ۲، ص ۱۱۲۔۱۱۱

(٦) کاروان زندگی، ج ۳، ص ۲۳۰

www.abulhasanalinadwi.org

(۷) کاروان زندگی، ج ۴، ص ۱۳۹

(۸) کاروان زندگی، ج ۵، ص ۱۱۱

(۹) کاروان زندگی، ج ۴، ص ۱۷۱

(۱۰) کلّیات اقبال، بانگ درا، ص ۲۰۹

(۱۱) کاروان زندگی، ج ۶، ص ۲۴۔ ۲۳

www.abulhasanalinadwi.org

there for a day or two only and before Ramzan he had gone there a few times and came back either the same day or the next day. When Ramzan approached he insisted again to spend the month at Raibareily as he had done for last more than forty years. He stayed back on the advice of his personal physician Dr. Mohammed Nazar.

He wanted to observe the whole month's fasts. Doctors told him not to observe all but leave a few and observe some. He started Ramzan with usual excitement and joy. Against the requests of doctors he started observing all the fasts. He had a small appetite. People who sat with him on meals wondered where from he got all that energy to follow an unaltered schedule, minute to minute, from much before first light to about ten in the night? In Ramzan his appetite was almost nil his attendants were worried how will he be able to withstand the stress? But a eclat had appeared in his personality. He had become more cheerful. The tiredness of fasting was never observed. Beside his daily routine he used to sit after long taraweeh prayers which were usually for one hour. In this sitting the students of higher classes some teachers and distinguished visitors came to listen to answers. Maolvi Saeed Murtaza or some teacher asked the questions and he used to answer. During the last few days of his stay at Lucknow he was extra ordinarily happy. On the last evening at exactly 9:20, which were the time he was reminded to take rest and audience was told to disperse, he himself requested audience to take leave. He then smilingly told his attendants " Look I have myself told them to take leave before you could." saying so he had a smile of a child on his face who had won a race. For some it was the last innocent smile of the grand old man who had to beat all in the race, with in forty-eight hours, to meet his Master.

Every body has to taste the death-Amazing End.

He reached Raibariely in the forenoon of Wednesd day the 29 Dec 1999. His contented expression, of a man who has reached his home after a long journey, was not hidden from his dear ones. He was home for the last Ashra of Ramzan He took to his normal routine. On Friday mooring he woke as usual. He had taken his usual quantity of Sahri and was in fasting state. He completed his morning chore. He greeted Dr. Abdul Mabood Khan of Green Cross Hospital with a cordial embrace and a smile. Dr. Abdul Mabood Khan had come with all the emergency drugs and oxygen to be used in case of any eventuality. Hazrat Maulana took his Friday bath. Changed into fresh clothes. Applied *Attar* and asked, " today is Friday? What is the time? It was exactly twenty minutes to twelve before noon. I wonder if the Juma Prayers can be delayed for half an hour?" "If you so desire, why not!" Was the reply of those present there? This was an unusual question, as never earlier he had asked to delay any prayer and that too for his sake. He then asked Maulvi Bilal to bring the Quran so to read Suratul Kahif, which was his unbroken routine for last seventy-five years. By the time the Quran was brought he sat on his bed reclining on a big pillow behind his back. He started reciting Suratul Yaseen. There was no indication of what is going to befall the Umah. He would have recited only seven or eight ayat when his neck rolled on one side. He was no more. ***Innalillahe Wa inna ilaihi rajioon.***

www.abulhasanalinadwi.org

In about three weeks times very rapidly rather miraculously he retained lost power in the limbs. Up to now his close attendants assisted him to eat but now he started holding the glass and cut morsels by his own hands. Maulvi Bilal and Hafiz Abdul Razzak Sahib his valet fed him all the meals since the time of his attack of paralysis. He insisted again to follow his routine of about sixty years, to sit on Dastarkhwan in the company of his visitor guests. Here also, though still assisted by close ones, he was concerned not for his food but the care and looking after of the guests. He used to gesture towards the guest who came from far and near and joined in for the meals, to pass one or the other article to them and at times he used to pass himself with trembling hands some special item to some important guest. People were awe struck by his hospitality and caring attitude for those at Dastarkhwan. Every body at the Dastarkhwan felt that he was the center of his attention and affection. His physical state was benumbed by stroke but his hospitable nature was warmer then before.

Tablighee Ijtima and unbelievable speech

He was on the path of recovery but still too week to sit for more than ten minutes at a stretch. The summer of Lucknow was at its peak. His host, Mohammed Bhai Patni at Mumbai where he had spent many a summers, was insistent that he should go there. It was decided that he might go by 10 or 11 June to Mumbai. When remembered that a Tablighi Ijtima was fixed for 12, 13, and 14 June. "Guest will come from all over, they would feel hurt and it will be dishonor of the guests. More over I was closely associated with this movement for along time, my absence will lead to misunderstanding and loose talk." He thought loudly. The trip for his personal comfort to Mumbai was sacrificed to avoid inconvenience to people and any possible misunderstanding. He not only stayed but he delivered a forceful address.

He was requested by the persons from Tblighi Ijtama just to visit the venue. He prevailed on the doctors against their wish to let him go. At the ijtima he was asked to say a few words to the expectant gathering of more than one lack people. H e spoke for 45 minutes his voice was clear loud and forceful no body believed that it was a voice of a person who had not yet come out totally from the attack of paralysis. He urged Muslims to enter in full Islam and completely to attain a position of distinction. He reminded them to fulfill their duties to their parents, relatives, spouses and the duty to their country. He implored them to develop such qualities in them as to stand out distinctly and become an example to emulate. How Muslims should become respected people, how they should become loveable, how they should regain their glorious leadership of the world has always been his concern. He might not get a better chance than this. He delivered the message with out any reservation and consideration of his weak physical condition.

The jolting night.

In October one night he developed breathlessness doctors struggled almost whole night to maintain his blood pressure which was not measurable for about two hours he had developed acute congestive cardiac failure. Every body had lost hope. By noon next day, when he had not yet recovered completely, at lunchtime he was advising some people, who had come for *bayet*, to depend only on Allah, to obey His prophet and not to miss five times prayers.

The month of Ramzan.

During his illness he had so many times desired to go to Raibariely and stay there for some time but he was advised by his doctors to stay at Lucknow. He was permitted to go

www.abulhasanalinadwi.org

and under a great deal of pressure. When it was informed that the airplane is ready on tarmac at the airport. Maulana Rabey went in the room and told Hazrat Maulana that he was being taken to Delhi in State airplane. Even in that condition he vehemently refused and insisted that he will not go. He asked Maulana Rabey annoyingly, "who has taken this Decision? No! I will not go." This could only be said by a person of unmatched self esteem, a person who had courage to decline the invitation from a King, a person who could refuse the offer of the highest civil honor of the country because he never agreed with the policies of the Government and for a person for whom material wealth and temporary honor of this world had no value. His body might be week but his will was as strong as ever. He had never taken any obligation from any body, how could he take obligations at this juncture that too from a government with whom he had ideological difference.

Visit of Prime Minister Mr. Atal Bihari Bajpai.

Mr. Atal Bihari Bajpai, Prime Minister of India, who wanted to meet Hazrat Maulana and had extended invitation several times and had even offered him plane to visit Delhi, took this opportunity to visit and ask about his welfare. Governor and Chief Minister of UP accompanied him. Here again the heart of a patriot, a heart full of compassion for down trodden, a heart weeping on the bankruptcy of the nation, a heart apprehensive on the future of the motherland spoke out, painfully stammering but sending the message clearly and forcefully. " Our country is in great danger. The very existence and unity of this great loveable country depends on three pre-conditions as told by some great thinkers particularly Gandhi Ji, first is that this should be a democratic country the second is that it should be secular and the third is that it should be non-violent these values have to be guarded, if any one of these condition is lost the country will be lost. " Said Hazrat Maulana. Mr. Atal Bihari Bajpai replied, " I will not allow the country to be lost. The values will be guarded". He was suffering but not sick, incapacitated but not bound he considered it his moral duty to apprise the Prime Minister of his country of the dangers the country was facing and he did with out mincing the words.

A near fatal error averted.

In the second week of his illness one-day he started pulling his right leg with a jerk with out even uttering a word. This was taken to be a bad manifestation of the disease, a dangerous turn. Before going in for further investigation of the cause of the jerks it was decided by the physicians attending on him that he should be sedated. This decision was opposed vehemently by his close associate Mr. Mohammed Usman "We will loose communication with him if he was sedated" Said Mr.Usman. His opinion was discussed in the meanwhile it was found that he is withdrawing his leg with a jerk because of pain in his heel. It was found that he had developed acute gout with swelling, redness, and pain. He was lying prone on the bed with pillows under his feet. Due to change in position the tender spot in his right heel used to touch the pillow bringing out excruciating pain which made him withdraw his leg. He never moaned and never exclaimed. His silence and exemplary endurance almost led the attendants and physicians to make a wrong diagnosis and only the blessings of Allah ta'ala in the form of the intervention of a cordial well wisher averted a catastrophic situation.

Back at Dastarkhwan.

www.abulhasanalinadwi.org

normal person would not have dared even to move. He not only traveled further but also addressed well-attended gathering for about 30 minutes. Talking on religion, giving the message of the Qurn, invoking the Muslims to "to enter wholly into the complete Islam" used to act as a rejuvenator, as an instant tonic for him. It was seen time and again that suffering from one ailment or other, before addressing a gathering, he used to get infused with a fresh energy with every passing moment and by the time he finished his address, he was as fresh as if he was never ailing.

Attack of Cerebral Ischaemea – miraculous recovery – Convalescence – Amazing End.

He had come back from a tour of Karnataka where he has traveled long distance in car. He was feeling unduly week. He was thoroughly checked at Manglore where CT scan revealed ischaemia (reduced supply of blood) of a portion of cerebrum (Brain). Seeing his active condition it was considered an old episode and further investigation could not be done, also because he had to leave for Lucnow the same day. On reaching Lucknow he felt exhausted .On the fourth day of return while taking a cup of tea, cup slipped out of his hand. It was taken as an accident and no importance was given to this occurrence.
Next morning when he was awoken for his tahajjud prayers He could not get up and tumbled down. He had a severe stroke. He had paralysis of right side. He could not speak. His sentences were mere noises and cold not be understood. He could however made gestures, which to certain extent could be followed. Mr. Ishrat Ali Siddiqui Ex-Editor of the Qaumi Awaz, an old daily Urdu newspaper and a close associate of long duration had come as usual on the breakfast. He did not know of the incidence. When he saw the condition of Hazrat Maulana he tried to leave the room. Hazrat Maulana saw that he was going back. (How an old associate who often came at breakfast could go without taking even a cup of tea must have come to his mind) With great difficulty he could explain in gestures and insisted that Mr. Siddiqui will not leave without having the break fast. To obey his wishes controlling his emotions and tears Mr. Siddiqui had to take a cup of tea. When he saw him taking the tea in spite of his physical condition an expression of satisfaction and serenity came on his face.
Everybody around him was worried, the scan report of brain was not satisfactory, and other vital functions were with in normal limits. The Neurophysician Dr. Devika Nag was of the opinion that only after four weeks any opinion would be possible and next few days are critical in which extensive medical and nursing care had to be catered for. Every Doctor who came to examine him directed that he must be shifted to some good hospital. Dr. Mansoor Hasan the cardiologist was of the opinion that though his heart function was normal yet it was a hair line case and would require monitoring and resuscitation in case of crisis. He also emphasized that he should be shifted to Apollo Hospital at Delhi by Air. Dr. Khalilullah PADAMSHRI was consulted on phone; he got the room ready at Apollo hospital.

Refusal to U.P. state's offer for plane.

Somehow the news that he had to be taken to Delhi reached District administration and District Magistrate who had come to ask the welfare of Hazrat Maulana offered the services of state Aircraft the consent of which he had taken from the Chief Minister on telephone. This was a difficult decision for Maulana Rabey, which he took reluctantly

www.abulhasanalinadwi.org

be moved with the help of wheel chair in the last about ten years of his life even for shorter distance.

The Hidden Power –The Indomitable energy.

His great grand ancestor Shah Alam Ullah waged Jihad against skirk and Bidah his ancestor Syed Ahmed Shaheed waged Jihad against the British for freedom of India. He inherited the qualities of both. He was full of concern about the general condition of Muslims all over the world. He had taken up on himself as a crusade, to stimulate the Muslims to stir them up from the slumber and he never missed a chance to convey the message and exhort them to realise their responsibility as Khair-ul-ummah. This he did at times at risk to his health and at times even to his life. This was seen through out his life particularly in the last two decades. Often just before a travel, a visit or a literary function where he had to preside or address a gathering, he often got exhausted and it was thought that his address even his presence in the function had to be cancelled and yet at the very last moment as though by some divine force, some miraculous energy, he not only attended the function put delivered powerful, provoking, jolting, stirring addresses. This happened at Jordan, this happened at Istanbul, this happened at Dhaka, this happened at Lahore and at Dubai.

At Lahore when he got down the plane two persons who were literally carrying him supported him. One of the organizers seeing his poor physical state asked, " can he sit to attend the function? Will he be able to speak?" He not only sat and attended but also spoke powerfully telling Pakistan to mend its ways cast off unislamic practices that have permeated into the Muslim society there.

He never wanted to take the journey to Dhaka due to his failing physical condition but his politeness and his courteousness did not permit him decline the invitation from some close associates and he went to Dhaka. After reaching there he was unable even to sit and said that he may not be able to go to the function, people urged him to only show his presence there. It was decided that he would be carried on a chair that will be lifted and carried by four people, as platform for the dais was quite high. That great soul refused to be carried and mustered his hidden power and walked up the dais. He saw the excitement and the expectation on the face of the crowd. This spurred his feelings he spoke with the energy of an exited child delivering the message of a heart full of suffering on the plight of the Muslim ummah

At Jordan he was so unwell that his further itinerary had to be cancelled but was requested to say a few words to the people who had gathered there to listen to him. He spoke like a person possessed he said "...listen O Arabs! Islam which was brought by the prophet Mohammed (SAW) is source of your existence...if the connection of Arabs per chance severed or even weakened with Islam you will become like a dried bed of a river.... It is the duty of the Arab world to deliver the world from the clutches of the west if they fail they will not be able to show their faces to Allah on the Day of Judgment."

His strong will power was demonstrated at the air port of Samarkand where no wheel chair was available the plane was parked at quite a distance at the tarmac and he had to walk on foot. Others were apprehensive if he would be able to withstand the ordeal. He walked up to the plane though he was totally exhausted.

Once earlier he had to travel in car from Lucknow to Azamgarh and back to Raibariely in between he felt exhausted so much that he could not move at all, doctors examined him and found that he had developed low blood pressure. The condition was such that a

www.abulhasanalinadwi.org

activities. One day while he was in Damascus his cough, which had come from nowhere and had become his distinctive identity, vanished as though it was never there.

Cataract, Glaucoma: Repeated operations- Bombay-Sitapur–America

He developed Glaucoma he was in agony with the pain in his left eye. He was operated at Bombay and was advised rest. The doctors told him that he would strain only at the peril of his eyesight. But rest was not his nature. He had to dictate a welcome address for the delegates of '*All India Mashawurati Ijtama*' He developed pain in the eye, which subsided later. He traveled to riot affected area of Jamshedpur and Rourkela and delivered speeches. He went to Geneva in spite of his eye condition where he was advised to get another operation done urgently lest he loses his eyesight because of earlier deficient operation. He had to come back to India and operation was not done. Later while touring western U.P he had to wait at bus stands some times for long hours that too in hot weather. The Deeni Taleem (Religious education) of the younger generation was much more important for him than his own health and even his eye sight He slept during the night to wake up next morning, finding complete loss of eye sight in left eye. He had to abandon the tour came back. At Sitatpur eye hospital it was diagnosed as Hemorrhage and was vigorously treated with quick recovery. He came back from hospital but got busy dictating the books and articles. He got an attack of Glaucoma in Dec.1965 the water from the eye had to be taken out repeatedly to alleviate his pain. This eye was so much affected that it had to be taken out to save the other eye. The other eye developed cataract it was operated in America. It is during this fourteen years when he was unable to take full use of his eyes that most of his classical works was done particularly the volumes of "TAREEKH-E-DAWAT-O-AZEEMAT" "ARKAN-ARBA'A" etc. He used to dictate and Maulvi Saeedurrahman Aazmee used to write. During this period he at times became so pensive and lied so quietly that those who were near to him. had to check if he was alive.

Attacks of Gout pain swelling and fever at times.

He started getting attacks of gouts. It started from the toe of his right foot. It was so severe that he developed fever and effected his tour schedules. His timetable of the day was ever as unaltered as the day itself. Slowly the attacks effected his shoulder and other limbs. Starting from tahajjud to well after isha not a moment was wasted. Break fast was with visitors where some very close associates and guest of honor and at times delegates of other Muslim institutes were present. A glimpse at any news paper of the day and he used to go to bath room to do wuzoo and prepare himself of a very engrossing schedule in which he recited the Quran, dictated reply to the letters received previous day, portion of his articles or some or the other books. Round about 11 in the morning he used to get the letters from post, which were browsed through quickly to be disposed of next day. He used to receive visitors who wanted private audience or attended the official matters related to Nadwa or other institutions. While working and attending to various matters the pain was totally forgotten and was only felt when he moved that part, after he finished what he was doing. Unlike other persons he never told anybody about his pain unless the person has come specially to ask his welfare.

Gradually the attacks of gout became lesser with longer duration between two attacks. These attacks of gout left him physically weak, particularly in the lower limb. He had to

www.abulhasanalinadwi.org

Hazrat Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadwi(Rah) As A Patient

Col. Mohsin Jaleel Shamsi

The real nature of a person becomes apparent in journey, in affluence, in anger and in illness. Hazrat Maulana Syed Abul Hasan Nadwi had an episode of some or the other very serious illness at almost a regular interval of every twenty years. He had a large stone in his right kidney that was almost non-functional, his heart used to miss beats, he had second degree heart block, his lungs were prone to repeated infections ranging from mild to severe Pneumonia. He actually never had a good health yet he took all this as if it was all-normal. His nature, his concern for others, his politeness, even in the worst of situation remained unaltered. The illness used to pass with the same rapidity with which it used to appear and after which it was difficult to say that he had just come out of such a serious illness. Ailments, discomfort, pain, travels or stay did not make any deviation in his daily routine. He used to get up an hour and a half before sunrise and used to go to sleep by 10 p.m. This was his routine till his last day.

Lahore: Koch's disease and Tuberculosis of Bones.

He had gone to Lahore in his youth to study Tafseer under Maulana Ahmed Ali there he started loosing weight and had lost his appetite, all the medicines and treatment did not work. A particular Hakeem Sahib diagnosed that he was suffering from Koch's abdomen and tuberculosis of the bones and that he will not survive for long. Those days no modern medicines were available for the treatment of tuberculosis. It must have rattled him but it did not show at all either in his studies that remained unaffected nor in his general behavior. In this illness in spite of weakness he never missed his studies and his daily schedule which started well before first light. He finished his studies with flying colours. The supplications of his mother came to his rescue and he became all right. Some years later when he went to Lahore he met the same Hakeem Sahib who met him with aqiedat. (Adoration) Though Hazrat Maulana Rahmatullah Alaih remembered that this Hakim Sahib had given his verdict of an early death yet he did not utter a single word to him. No residual effects were ever seen of that disease if it was there at all.

Tableegh and Dawah Tours and his distinctive cough and cold.

After he resigned from the lectureship of Nadwatul ulama and plunged himself whole heatedly in Tableegh activities he developed almost incessant cough and which could not be cured with any medicine. He used to get attacks of coryza in which he developed fever, sore throat weakness. He was at times advised by his elder brother Dr. Abdul Ali to go slow and take a break. The association of Hazrat Maulana Mohammed Ilyas had infused in him such a spirit, which compelled him to ignore the words of his loving respected elder brother. His cough was so distinctive that it had become almost "trade mark" –it is Ali Mians Cough—people used to know by his cough that Ali Mian was some where near. At one time his elder brother was so much worried about this ailment and Ali Mian's insistence for dawah work that out of frustration he said, " Kiya Apko is Rastey mien Shhadat Ka Shauq Hai?" ("Do you want to attain Shadat this way?") But even this did not make him change his mind and he continued his Tableegh and Dawah

www.abulhasanalinadwi.org

الشيخ الجليل أبو الحسن الندوی

فی ذمۃ اللہ

شعر الدکتور محمد الشیخ محمود صیام

(مولانا علی میاں جوار رحمت میں)

ضَمَّ الثرى.. بَعدَ الجِهادِ طَوِيلاَ　　عَلَماً مُحِباً للجِهادِ جَلِيلاَ
رجُلاً وَلاَ كُلُّ الرِّجالِ إذا انبَرَى　　لِيَصُولَ فِي سَاحِ الْهدَى وَيَجُولاَ
صَقَلَتْهُ تَجْرِبَةُ الحَيَاةِ فَإذْ بِهِ　　يُمْسِي وَيُصبِحُ صَارِماً مَصْقُولاَ

طویل جدو جہد کے بعد زمین نے ایک ایسی عظیم شخصیت کو اپنی آغوش میں چھپا لیا جو جہاد کی شوقین تھی، جس نے میدان حق میں اپنی جولانیاں دکھائی تھیں اور جس کو تجربات زندگی نے صیقل کر دیا تھا چنانچہ اس کی صبح و شام شمشیر بے نیام کے مثل گزرتی تھیں۔

ولَقِيتُهُ .. وهُمُو منا تجتاحُهُ　　فإذا بهِ يَغْدو..بِهِنَّ ..عَلِيلاَ
أضْناهُ هَمُّ شُعوبنا فأحَالَه　　جسماً أرقَّ مِنَ النَّسِيمِ نجيلا
وهوَ الذی. بجهادِ و جهُودِهِ　　قدْ كانَ كالطَّودِ الأشمّ ثقيلا

میں نے ان سے ملاقات کا شرف حاصل کیا تو پایا کہ ہمارے مسائل نے انہیں جھنجھوڑ رکھا ہے، انہیں بیمار کر دیا ہے، اور گھلا کر رکھ دیا ہے چنانچہ ان کا جسم نحیف، لاغر اور نسیم سے بھی زیادہ لطیف ہو گیا ہے، حالانکہ اپنے جہاد اور جدو جہد کی

www.abulhasanalinadwi.org

بدولت ان کی شخصیت بڑی بھاری بھر کم اور بلند ٹیلے کے مثل تھی

جاءَ الحياةَ طريةً أ عوادُهُ ثمَّ استحَالَ مُهنَّداً مَسْلولاً
جَلداً لَدَى مَدِّ الخطوبِ وجزرِهاَ سيْفاً أ مامَ الحَادِثاتِ صَقِيلاً
مانالَ منهُ خصومُ هَدى المصطفَى رَغم الهُجُومِ المستمرِّ فَتيلاً
ومَضَى وفِي أُذُن الزَّمانِ عَلَى المَدَى نَغمٌ يُحَدِّث عنهُ جيلاً جيلاً
وبأ عينِ الدُنْيَا تَرَاقِصُ صُوْرَةِ رَسَمْتُهُ في هذا الدجى قنديلاً
هَذا أبوا لحَسَنِ ولنْ تَجِدُو الَهُ في يومنا هذا البئيس مَثِيلاً

ابتداء میں ان کی زندگی تروتازہ تھی پھر وہ تیغ بے نیام بن گئی۔ انہوں نے مصائب کے مدوجزر کے موقع پر بڑی جواں مردی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور حوادث کے سامنے صیقل شدہ تلوار بن گئے، شاہراہ مصطفیٰ ﷺ کے دشمن مسلسل حملوں کے باوجود ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ وہ اس جہاں فانی سے کوچ کر گئے لیکن ان کے نغمے زمانہ کے کانوں میں رس گھول رہے ہیں اور ان کا تذکرہ نسل در نسل باقی رہے گا۔ دنیا کی نگاہوں میں ان کی صورت گھوم رہی ہے جو اس شب تاریک میں قندیل کے مثل تھی۔ میری مراد ابوالحسن (علی ندویؒ) سے ہے جن کا آج کے مغموم دن کوئی بدل نہیں ہے۔

كنّاوكانَ لَنا إماماً عَالِماً فَطِناً وَفِياَ ماجِداً وأصيلاً
أحي الهدَى للنَّاسِ بعد ذبو لِهِ وَمضَى يشق بِهمْ إلَيهِ سَبِيْلاً
وسَقَى غِرَاسَ الحقِّ مِن أ فِكاره وسواهُ يَسْقِي البَاطِل المَخْذُوْلاَ

وہ ہمارے امام تھے جو علم دین، ذہانت وفطانت، وفاداری اور عزت وشرف سے بہرہ ور تھے۔ انھوں نے حق کے مرجھائے ہوئے پودے میں دوبارہ زندگی کی روح پھونک دی۔ لوگوں کو اسکا راستہ دکھایا اور اپنے افکار سے حق کو سیراب کیا جبکہ دوسرے لوگ رسواکن باطل کو سینچنے میں لگے ہوئے تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

فبعَصرِنا اِنْطَلَقَتْ شَيَاطِيْنُ الْهَوىٰ وزَمَاننا أ ضحى وكَــانَ ظلـيلاَ

وتَلبَّدَتْ سحب الظَّلاَمِ كَثِيفَةً والبَاطِلُ استشرَى وكانَ خَجُولاَ

حَتّٰى الرَّجَال.إذا عَدَدْتَ. أ قِلَّةٌ وجِهَادُ هُم في الله صارَ قَلِيْلا

والعِلْمُ لِلْعُلَمَاءِ صارَ وَظيفةً وأ داؤهُمْ في النَّاسِ صَارَ هَزِيلاَ

ہمارے زمانے میں شیاطین نفس سرگرم تھے اور چلچلاتی دھوپ میں کوئی سایہ نہ تھا، تاریکی کے بادل گہرے ہوگئے تھے اور باطل کھل کر میدان میں آگیا تھا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے والے مردان کار بہت کم رہ گئے تھے اور اللہ کی راہ میں ان کا جہاد بھی سمٹ گیا تھا۔ علم علماء کا پیشہ بن گیا تھا اور لوگوں کے درمیان ان کے فریضہ منصبی کی ادائیگی بھی کمزور پڑ گئی تھی۔

ويكاد يأ س الناس يقتلهم ولا يجدون للهمّ المقيم حلو لا

وإذا بفجر للدعاةِ يشقه (البناء) فيند حر الظلام كليلا(١)

وإذا (أ بو الأ على) يغذّ من الخطى حتى يهذّب أ نفسا وعقولا(٢)

وإذا أ بو الحسن الأ بيُّ ومذْ أ تى يبني رعيلافاضلاً ورعيلا

لوگوں کی مایوسی جان لیوا ہورہی تھی اور جن مسائل کا وہ شکار تھے انکا کوئی حل نہ پاتے تھے۔ کہ اچانک (حسن البناء (شہیدؒ) نے داعیوں کے لئے راہ دعوت روشن کی اور تاریکی پیٹھ پھیر کر بھاگ گئی، پھر جلد ہی ابوالاعلیٰ (مودودیؒ) میدان میں آگئے اور انھوں نے لوگوں کی اصلاح وتربیت کی اور عقلوں کو تابانی بخشی۔ اور غیرت مند ابوالحسن (علی ندویؒ) بھی منظر عام پر آئے اور انھوں نے علم وفضل کی حامل ایک نسل تیار کردی۔

والكل يتّخذ النّبيَّ إمامه وكتابَ ربِّ العالمين دَليلا

متمثلا بالغرمن آياته (أ و بالحديث مفصلاً تفصيلا)

حتّٰى بَنوا للمسلمين بِفِكرِهِم مَجداً.إذا هم حققوه.. أ ثيلا

ـ١ الامام الشهيد حسن البناء رحمه الله ـ٢ الاستاذ ابوالاعلى المودودى رحمه الله

www.abulhasanalinadwi.org

یہ سب حضرات نبی ﷺ کو اپنا امام اور رب العالمین کی کتاب کو اپنا رہنما مانتے ہیں۔ کتاب اللہ کی روشن آیات یا نبی ﷺ کی مفصل احادیث کی تشریح و تبیین کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی فکر سے مسلمانوں کے لئے عزت و عظمت کا ایک عظیم قلعہ تعمیر کر دیا۔

فالی أولئکم الجھابزرحمة	تسقی ثراھم بکرة وأ صیلا
وإلی أ بی الحسن التحیّةُ کلّما	مَرّالنسیم عَلَی الرُّبوعِ عَلیلا
والمُسلِمونَ اللهَ یُلھم جمعھم	صبراًعلی ھذا المصاب جمیلا
فمصا بنا جلل لأنا لانری	لفقیدنافی المسلمین بدیلا
وأ تَی النَعیُّ بهِ ونحن شعوبنا	تجترقالاً فی الَحیَاةِ وقِیلا
والخافقان اللّیل خیَّمَ فیھما	وتبدّلت سَاحَ الھدی تبدیلاَ
وعقیدةُ التَّوحید تمخر لجّة	وتواجه التزویر والتحویلا
والمسلمون عدوّھم یلھو بھم	وتراہ یمعن فیھمو تنکیلا

ان عظیم شخصیات کی تربتوں کو اللہ کی رحمت صبح و شام سیراب کرے اور جب بھی باد نسیم چلے شیخ ابوالحسن پر اللہ کا کرم ہو۔ اللہ تعالی اس مصیبت پر مسلمانوں کی جمعیت کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ یہ بہت بڑی مصیبت ہے اس لیے کہ ہم مسلمانوں میں مرحوم کا کوئی بدل نہیں پاتے۔ ان کی وفات کی خبر ایسے وقت میں آئی ہے جب مسلمان قیل و قال میں مصروف ہیں۔ پوری کائنات پر رات نے اپنے خیمے گاڑ لیے ہیں اور ہدایت کی راہ تبدیل ہو گئی ہے۔ توحید کا عقیدہ تھپیڑوں کی زد میں اور مسخ و تزویر سے دوچار ہے۔ مسلمانوں کے دشمن ان سے اٹکھیلیاں کر رہے ہیں اور انھیں مصائب سے دوچار کر رہے ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

في القدس في الشيشان في كل البلاد المسلمون يواجهون دخيلا
يغتالهم ويعيث في أ وطانهم عرضاً .بكل وقاحة أ و طولا
وهموبلاحول وليسَ لهم سوى أ ن يملئوا هذا الفضاء عويلا

قدس چیچنیااور دیگر تمام ممالک میں مسلمان جارحیت کا شکار ہیں، ان کے دشمن ان کی جانوں کے درپے ہیں اور ان کے ممالک کے طول و عرض میں بڑی ڈھٹائی سے فساد مچارہے ہیں، وہ بے یارومددگار ہیں، چیخ و پکار کے علاوہ ان کے بس میں اور کچھ نہیں

یاأ مّةَ الإسلام فانتفضي على هذا الخمول فقد شبعت خمولا
رصّي الّصفوف وجدّدي عهدَ الجدود محبةً وتنا فساً ووصولا
فجدودنا التّاريخُ يشهد أنَّهُمْ كانوا كراماً في الانام عدولا
ملئوا الحياةَ بعِلمهم ، وخيولهم ملأت ربوع الخافقين صهيلا
واليومَ مالكِ غير هدى المصطفى هدياً وإلاً جهدَك الموصولا
تجدين نصر الله فوقَ ربوعنا ورضا الإله منزلا تنزيلا

اے امت مسلمہ۔ بہت ہو چکا۔ اب گمنامی کے پردہ سے باہر نکل آ، اپنی صفوں کو درست کر اور محبت، راہ حق میں سبقت اور منزل تک رسائی کے معاملہ میں اپنے آباء واجداد کے عہد کو تازہ کر تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے آباء واجداد لوگوں میں عزت و شرف کے مالک اور عدل پرور تھے۔ انھوں نے اپنے علم سے پوری دنیا کو فیض پہنچایا اور انکے گھوڑوں کی ہنہناہٹ بھی پوری دنیا میں گونج گئی۔ آج بھی تیرے لیے محمد مصطفیٰ ﷺ کے راستے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ مسلسل جدو جہد جاری رکھ ضرور اللہ کی مدد اور اس کی رضا سے بہرہ مند ہو گی۔

(ترجمہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی)

www.abulhasanalinadwi.org

رپورٹ مولانا علی میاں سیمنار

منعقدہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ ۲۵/۲۶/ مارچ ۲۰۰۰ء

مولانا عبید اقبال عاصم
دفتر ناظم دینیات، اے ایم، یو علی گڑھ

مولانا سید ابوالحسن کے انتقال سے صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں رنج و غم کی کیفیت محسوس کی گئی، غم کا اظہار تعزیتی جلسوں مضامین اور مراسلوں کی شکل میں ہوا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی یہی کیفیت رہی، پہلا تعزیتی جلسہ یکم جنوری ۲۰۰۰ء دفتر ناظم دینیات جامع مسجد میں مولانا علی میاں کے دیرینہ رفیق پروفیسر ابرار مصطفی خاں صاحب کی صدارت میں ہوا۔ وہاں جو تعزیتی قرارداد منظور کی گئی اس میں علی میاں چیر کے قیام اور ایک پر وقار سیمینار کی تجویز خصوصیت کے ساتھ شامل تھی، علی میاں چیر کی تجویز وائس چانسلر صاحب نے منظور کی اور اسے عملی شکل دینے کی کوشش شروع کردی مولانا علی میاں سینار کی تجویز جب ناظم دینیات ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی صاحب نے ان کے سامنے رکھی تو وہ خوشی سیمینار کے مہمانوں کی میزبانی اور اخراجات سفر کی فراہمی پر آمادہ ہوگئے ان کی حوصلہ افزائی سے فائدہ اٹھا کر محترم ناظم دینیات نے اپنے آفس میں ۱۱/ جنوری ۲۰۰۰ء کو اہل علم کی مجلس بلائی جس میں نظامت کے کارکنان کے علاوہ شعبہ دینیات، شعبہ اسلامیات شعبہ عربی کے سربراہان اور دیگر اہل علم شامل تھے، وہاں سیمینار کے رہنما

www.abulhasanalinadwi.org

خطوط مرتب کیے گئے۔اور سیمینار کی تیاری شروع کردی گئی۔

ناظم دینیات صاحب نے مولانا علی میاں کی خودنوشت سوانح حیات کاروان زندگی اور دیگر کتابوں کو سامنے رکھ سمینار کا علمی خاکہ موضوعات کی تفصیلات اور مولانا علی میاں کی فکر اور شخصیت سے مناسبت رکھنے والے علماء اور دانشوروں کی فہرست مرتب کی۔

ناظم صاحب کا احساس تھا کہ اگر علماء کو بغیر کسی موضوع کے بلالیا جائے تو یہ جلسہ تعزیت یا جلسہ میلاد ہوکر رہ جائے گا سیمنیار کا مقصد حاصل نہ ہوسکے گا۔ چنانچہ انھوں نے ہر اہل علم کو ان کی فنی معاسبت سے مولانا علی میاں کی علمی خدمات سے متعلق ایک ایک عنوان سپرد کیا بعض اہل علم نے مصروفیت کے باعث معذرت کی تو اکثر اہل علم نے اس دعوت کو لبیک کہا اور اپنے مقررہ عنوان پر تیاری شروع کردی۔ جب سیمینار کا پورا خاکہ سامنے آیا، جو موضوعات اور شخصیات کے انتخاب کے لحاظ سے بڑا جامع اور موقر تھا تو اہل علم نے اسے بے حد پسند کیا۔اور جب وہ عملی شکل میں سامنے آیا تو لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی بلکہ خود سیمینار کے داعی ناظم صاحب کے بقول ان کی توقعات سے زیادہ کامیابی ملی۔ مقالہ نگار حضرات، سامعین اور یونیورسٹی انتظامیہ سب نے اسے یونیورسٹی کی تاریخ میں سنگ میل قرار دیا۔ سیمینار کے مندوبین کو جو فائل دی گئی اس میں ایک یادگار البم بھی رکھا گیا جو مولانا علی میاں کی علی گڑھ میں آخری آمد ۷ ۲/اپریل ۱۹۹۸ء کی یادگار لمحوں پر مشتمل تھا دوروزہ سیمینار کی ترتیب اس طرح رکھی گئی کہ علمی اجلاس مقالات اور مباحث کے لئے دو عمومی اجلاس عام مسلمانوں کی دینی وعلمی رہنمائی کے لئے تھے۔دو استقبالیے مندوبین سینار کی پذیرائی کے لئے اور مولانا علی میاں کی کتابوں کی نمائش عام معلومات کے لئے مقرر کئے گئے۔

www.abulhasanalinadwi.org

نمائش کتب :

سیمینار کا افتتاحی اجلاس صبح دس بجے تھا صبح ۹ بجے، مولانا آزاد لائبریری اے ،ایم ،یو کے وسیع ہال میں مولانا علی میاں کی کتابوں اور مضامین کی نمائش کا افتتاح، حضرت مولانا نظام الدین صاحب، جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ نے اور وائس چانسلر محمود الرحمٰن صاحب نے سرخ ربن کر کیا۔ اس نمائش میں ایک بھیڑ تھی جو دیکھنے کے لئے امنڈ آئی تھی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری ڈپٹی لائبریرین نے اپنے رفقا کے تعاون سے ذوق اور ترتیب کا اچھا نمونہ پیش کیا تھا۔ مندوبین اور حاضرین اس نمائش سے بہت محظوظ ہوئے۔ لائبریرین پروفیسر نوار الحسن خاں نے اپنے آفس میں چائے کی ضیافت کی اور لائبریری سے متعلق ضروری معلومات فراہم کیں۔

افتتاحی اجلاس :

مولانا علی میاں سیمینار کا افتتاحی اجلاس آرٹس فیکلٹی لاؤنج اے ایم یو میں مولانا سید نظام الدین صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ وامیر شریعت بہار واڑیسہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس کا آغاز قاری محمد عبداللہ صاحب امام جامع مسجد اے ایم یو تلاوت کلام پاک سے کیا سیمینار کے داعی و منتظم ڈاکٹر مولانا سعود عالم قاسمی صاحب ناظم دینیات نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا جس میں انہوں نے مہمانان وشرکاء سیمینار کا استقبال کرتے ہوئے اس سیمینار کی ضرورت اور اس کی علمی اور ثقافتی جہات پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے فرمایا کہ مولانا علی میاں کی ہمہ جہت شخصیت کے اٹھ جانے سے دینی وملی قیادت میں ایک خلاء سا پیدا ہوگیا ہے مگر مولانا علی میاں اپنی دینی علمی خدمات کے حوالے سے زندہ رہیں گے اور ان کے علمی ورثہ سے ہم فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ مولانا علی میاں کے انتقال پر یونیورسٹی کے پہلے تعزیتی اجلاس (یکم جنوری ۲۰۰۰ء مین جس سیمینار کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا اللہ کے فضل وکرم سے آج عملی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ مولانا علی میاں کا پیغام ایک آفاقی پیغام تھا جسے عام

www.abulhasanalinadwi.org

لرنے کی ضرورت ہے تاکہ پوری انسانی برادری ان کے پیغام سے فلاح ویاب ہو سکے اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اے ایم یو کے وائس چانسر صاحب سے بھی اپیل کی کہ مولانا علی میاںؒ کے نام سے سیرت اکاڈیمی قائم کی جائے اور لائبریری میں تصنیفات علی میاں کا گوشہ قائم کیا جائے :

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمود الرحمٰن صاحب نے اپنے افتتاحی خطبہ میں مولانا علی میاںؒ کی شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان سے اپنے نجی وخاندانی تعلقات کا تذکرہ فرمایا، نیز شرکاء کو خوشخبری دی کہ علی میاںؒ کی نگارشات اوران کی شاہکار تصانیف کو یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ کردیا گیا ہے۔ اور جلد ہی لائبریری میں ایک گوشہ قائم کیا جارہا ہے تاکہ طلباء کو اسلامیات سے قریب تر کیا جاسکے۔ اسی کے ساتھ آپ نے علماء کرام سے اپیل کی کہ وہ اس ادارے کے ساتھ اپنے رابطے کو مزید مضبوط کریں اور دائمی رشتہ قائم کریں تاکہ مسلم یونیورسٹی سے نور کی نئی بارش ہو سکے اور اس سے پوری امت مسلمہ سیراب ہو سکے اس افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرنے کے لئے قدیم وجدید اور علم نافع وعمل صالح کے امین دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے استاذ اور سہ ماہی "السلام" کے ایڈیٹر ڈاکٹر محسن عثمانی کو زحمت دی گئی انہوں نے فرمایا کی علی میاں کی مقبولیت اور شہرت کا راز صرف علم کی وسعت، تصانیف کی کثرت، عربی اور اردو دونوں زبانوں پر قدرت اور اسلوب کے جمال میں پوشیدہ ہے وہ بہت سے علمی، عالمی اداروں کے روح رواں اور نفس ناطقہ تھے۔ ان کے کاموں اور کارناموں کا دائرہ آفاق گیر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مولانا علی میاںؒ بیسویں صدی کے اسلامی احیاء کے معماروں میں ایک درخشاں مقام رکھتے تھے۔ خطبہ میں جو خوبصورت زبان استعمال کی گئی۔ اس کی لذت سے سامعین بہت محظوظ ہوئے۔ یہ خطبہ زبانی اور تحریری دونوں اجزا پر مشتمل تھا۔

حسن اتفاق انہی ایام میں ڈاکٹر کرنل محسن جلیل شمسی صاحب کے علی گڑھ میں آمد کا پروگرام بنا شمسی صاحب مولانا علی میاں کے معالج بھی رہے ہیں ۵۲ء سے

مولانا سے ان کا تعلق رہا ہے مولانا علی میاںؒ کے امراض و عوارض میں صبر و تحمل، کار کردگی اور استقامت کے واقعات بیان کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ مولانا بیماری میں بھی اسلامی ہدایات واحکامات پر کاربند رہتے تھے۔ اس سیمینار میں شرکت اگر ان کے لئے باعث سعادت تھی تو منتظمین کے لئے بھی۔

صدر جلسہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے جنرل سیکریٹری جناب مولانا سید نظام الدین صاحب نے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ علی میاںؒ ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے اور انہوں نے نئی نسل کی کردار سازی کے کام کو بہت تیزی سے آگے بڑھایا۔ وہ آئندہ نسلوں کی حفاظت کے لئے فکر مند تھے اور چاہتے تھے کہ مسلم نوجوان اس ملک میں توحید کو زندہ رکھیں اور اپنے مذہب کو رحمت سمجھیں انہوں نے کہا کہ علی میاں کی تعلیمات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں ایسی جماعت تیار کرنی چاہیئے جو کہ نئی نسل کو اپنے دین پر قائم رکھنے میں معاون ہو سکے۔ نئی نسل کو جوش کے ساتھ ہوش سے کام لینے کی تلقین کرتے ہوئے مولانا علی میاں کی مثال دیتے ہوئے بتلایا کہ وہ کبھی بھی جذباتی نہیں تھے اور مسلمانوں کے مذہبی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہتے تھے۔ وہ اس ملک کو اخلاقی انحطاط سے نکالنے کے لئے کوشاں رہے۔ انہوں نے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ تاقیامت زندہ جاوید رہیں گے۔

پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے مولانا اشہد جمال ندوی نے حاضرین کی کثرت اور ہال کی تنگ دامانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سیمینار کا تعلق مولانا علی میاں کی شخصیت سے ہے۔ اگر اس سے بڑے ہال میں بھی یہ پروگرام رکھا جاتا تو ناکافی ثابت ہوتا۔ حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر زین اساجدین صدیقی نے کہا کہ جو انسان کا شکر گذار نہیں وہ اللہ کا شکر گذار نہیں۔ آپ تمام حضرات علماء دانشور، مقررین، مقالہ نگار اور سامعین ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ افتتاحی اجلاس کے بعد چائے کا وقفہ رکھا گیا جس میں طلباء اساتذہ اور اہل علم نے باہر سے آئے ہوئے علماء اور مہمانوں سے ملاقات اور استفادہ کیا۔ اس اجلاس کو حاضرین اور خود وائس چانسلر

www.abulhasanalinadwi.org

صاحب نے کامیاب ترین اجلاس قرار دیا۔

علمی اجلاس :

دوسرا اجلاس مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتی دار العلوم دیوبند کی زیر صدارت منعقد ہوا اس اجلاس میں رہنما مقالہ محترم قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کا "مولانا علی میاںؒ کا علمی و فکری مقام" کے عنوان سے تھا۔ قاضی صاحب علالت کے باعث سیمینار میں خود شریک نہیں ہو سکے مگر اپنا نمائندہ بھیجا، آپ کا مقالہ مولانا ڈاکٹر عبید اللہ قاسمی صاحب لیکچرار طبیہ کالج اے، ایم، یو علی گڑھ نے پیش کیا۔ مقالہ میں مولانا علی میاںؒ کے حوالہ سے اسلامی فکر کا احاطہ کیا گیا۔ قاضی صاحب نے بتلایا کہ گذشتہ صدی میں مولانا علی میاں نے اپنے علم و فکر کے باعث جو مقام حاصل کیا ہے۔ وہ بہت کم لوگوں کو ملا ہے ان کی فکر اسلام کے آفاقی پیغام کی طرح زندہ ہے دوسرا مقالہ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی صاحب کا "مولانا علی میاںؒ کی قرآن فہمی" پر تھا جس میں انہوں نے متقدمین و متاخرین مفسرین کی قرآن فہمی کی روشنی میں مولانا علی میاںؒ کی قرآن فہمی کا تفصیلی جائزہ لیا اور ان کے تفسیری افادات، جزئیات اور مثالوں کے ذریعہ وضاحت کی۔

"مولانا علی میاں کا فقہی ذوق و مسلک" پر دار العلوم ندوۃ العلماء کے استاد مولانا عتیق احمد بستوی نے پر مغز مقالہ پیش کیا اور ثابت کیا کہ اگرچہ مولانا نے اپنی دیگر موضوعات سے دل چسپی کے باعث اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی تاہم فقہ پر ان نگاہ بہت وسیع تھی جس سے وہ بہت سے اختلافی مسئلوں میں مصالحانہ راہ نکال لیتے تھے۔ انہوں نے اجتہاد و تقلید کے معاملے میں شاہ ولی اللہ صاحب کے مسلک کی پیروی کی۔

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو کے استاذ حدیث مولانا ابو سحبان روح القدس صاحب نے "مولانا علی میاںؒ اور علم حدیث" پر اپنا مبسوط مقالہ پڑھا، مولانا کی حدیث

www.abulhasanalinadwi.org

سے وابستگی اور شغف پر روشنی ڈالی اور حدیث پر ان کی تدریس و تصنیف کی طرف اشارے کئے۔

شعبہ اردو اے ایم یو میں ریڈر ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی صاحب نے "مولانا علی میاں کی سیرت سے دل چسپی اور عشق محمدیؐ کے جذبہ کو اجاگر کیا سیرت سے متعلق مولانا علی میاںؒ کے مضامین، تحریری اور تصانیف کا احاطہ اس مقالہ میں بہت خوبصورت انداز میں کیا گیا۔ کالی کٹ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے سابق صدر پروفیسر سید احتشام احمد ندوی صاحب نے "مقدمات مولانا علی میاں" پر اپنا مقالہ پیش کی جس میں مولانا کے ذریعہ دوسری کی تصانیف پر لکھے ہوئے مقدمات اور ان مقدمات کی اہمیت وحیثیت کو اجاگر کیا گیا۔ مقالات کا یہ سیشن ۲ بجے تک چلا، اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر مولانا سعود عالم قاسمی صاحب نے کی، آخیر میں صدر اجلاس محترم مولانا محمد ظفیر الدین صاحب نے تمام مقالات کے علمی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے مولانا علی میاں کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا انہوں نے فرمایا کہ اتنے قیمتی مقالات کم ہی سیمیناروں میں سننے کو ملتے ہیں۔

تیسرا اجلاس:

۲۵/ مارچ کی شام ساڑھے تین بجے تیسرا علی اجلاس شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے استاد محترم ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی صاحب، کی زیر صدرات منعقد ہوا اور نظامت کے فرائض جناب منصور آغا صاحب، چیف سب ایڈیٹر روزنامہ قومی آواز دہلی نے انجام دیئے پہلا مقالہ شعبۂ دینیات اے ایم یو علی گڑھ، میں لیکچرار ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی صاحب، نے "مولانا علی میاںؒ کا نظریہ تزکیہ وسلوک" پر پیش کیا، جس میں انہوں نے مولانا کی تحریروں سے نتائج اخذ کر کے بتایا کہ مولانا تزکیہ اور جہاد دونوں کو متوازن اسلامی زندگی کے لئے لازم قرار دیتے تھے، ان کا نظریۂ سلوک مروجہ تصوف سے اسی لحاظ سے مختلف تھا۔ اسی موضوع پر مسلم پرسنل لا بورڈ کے خازن مولانا عبدالکریم

www.abulhasanalinadwi.org

پاریکھ صاحب کا بھی مقالہ تھا مگر ٹرین کے ناقص نظام کی وجہ سے وہ شریک سیمینار نہ ہو سکے۔

کلکتہ سے تشریف لائے ہوئے مولانا لئیق ندوی صاحب نے "عالم عرب پر مولانا علی میاں کے اثرات" پر مقالہ پیش کیا، مولانا لئیق صاحب نے مولانا کی عربی کتابوں اور رسالوں کے حوالے سے اس ماحول پر گفتگو کی جو عالم عرب میں مصلحین و مخلصین کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

"مولانا علی میاں کی اتحاد امت کی کوششیں" اس عنوان پر مولانا محمد رضوان قاسمی صاحب، ناظم جامعہ سبیل السلام حیدر آباد کا مقالہ تھا جو طبیعت کی خرابی کی وجہ سے خود حاضر نہیں ہو سکے لیکن مولانا محمد ثوبان قاسمی استاذ دار العلوم سبیل السلام کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ اس کو مقالہ میں مولانا علی میاں کی تحریروں کے حوالے سے ان کوششوں کا تذکرہ کیا گیا تھا جو مولانا نے اپنی حیات میں امت کے مختلف فرقوں اور مسلکوں کو متحد کرنے کے لئے کی تھیں۔

"سیرت سید احمد شہید" مولانا علی میاں اور غلام رسول مہر دونوں حضرات نے اپنے اپنے طور پر تصنیف کی ہیں، ان دونوں کتابوں کا تقابلی مطالعہ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری ڈپٹی لائبریرین مولانا آزاد لائبریری نے اپنے مقالہ میں کیا۔ انہوں نے بتایا کہ مولانا علی میاںؒ کے یہاں لذت و کیف اور دینی رنگ غالب ہے جبکہ غلام رسول مہر کے یہاں زبان و بیان اور تحقیق و تجزیہ کا پہلو ابھرا ہوا ہے۔

آخیر میں صدر اجلاس ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی صاحب نے اس سیشن میں پڑھے گئے مقالات کا تجزیہ کیا اور مقالہ نگار حضرات کی علمی کوششوں کی تعریف کی جنہوں نے مختصر وقت میں مولانا مرحوم کے تعلق سے کافی مواد فراہم کر دیا تھا۔

عصر کی نماز فیکلٹی دینیات کی مسجد میں ادا کی گئی۔ اور دینیات کی لائبریری میں عصرانہ کا انتظام کیا گیا۔ سیمینار میں بیرونی علماء اور مقامی دانشوروں کا حسن اجتماع تھا لہذا چائے کی یہ محفل بھی علمی و ادبی نکتوں، عصری اور دینی مسئلوں اور سنجیدہ چٹکلوں سے

www.abulhasanalinadwi.org

کشت زعفران کی سیر کا لطف دے رہی تھی۔

عمومی اجلاس ۲۵ مارچ :

اس سیمینار کا اہم حصہ عمومی اجلاس تھا جو مسلمانوں کے دینی و تعلیمی مسائل پر مولانا علی میاں کے حوالے سے منعقد کیا گیا تھا۔

یہ اجلاس بعد نماز مغرب یونیورسٹی کے کشادہ . . کینیڈی ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا سید نظام الدین صاحب نے فرمائی۔ جلسہ کا آغاز قاری عتیق الرحمٰن صاحب استاد شعبۂ قرآت اے، ایم، یو کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا اور ڈاکٹر محبّ الحق نے نظامت فرمائی۔

جناب مولانا ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی صاحب نے مولانا علی میاں کی ان کی کوششوں کا حوالے دیتے ہوئے جو انہوں نے مسلمانوں کے دینی و تعلیمی مسائل سے متعلق کی تھیں، ہندوستانی مسلمانوں کو ایمان ویقین، عزم وولولہ اور اعتدال پسندی کے ساتھ اپنا لائحہ عمل مرتب کرنے پر زور دیا انہوں نے کہا کہ مولانا کو سب سے بہتر خراج عقیدت اسی انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں بالخصوص نوجوانوں کو جوارہِ اعتدال دکھلائی ہے اس کو اختیار کیا جائے اور گوناگوں مسائل میں الجھی ہوئی ملت کے لئے صحیح شاہراہ عمل کا انتخاب کیا جائے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ قرآن اور سیرت کی تعلیم لئے مینارۂ نور ہے جس سے ہم کو اپنی نجی و قومی زندگی کو راستہ دکھانے میں تعاون ملیگا اور اور یہی ہماری ملی زندگی کی اساس بھی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے مفتی محمد ظفیر الدین صاحب، نے قدرے اپنے جذب وکیف سے بھرے لہجہ میں حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ موجودہ حالات سے نہ تو گھبرانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی حوصلہ شکنی کی۔ آپ نے ماضی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جب جب مسلمانوں پر مصایب و آلام آئے ہیں تبھی ان کے لئے اس ملک میں نئی راہیں کھلی ہیں اس لئے موجودہ وقت میں جو حالات درپیش ہیں یہ

www.abulhasanalinadwi.org

انشاء اللہ ہمارے لئے مفید ہی ہوں گے۔ بس ہم کو ایمان باللہ، ایمان بالآخرہ اور یقین کامل کی ضرورت ہے۔ جب تک ہمارا اعتماد اور یقین خدائے واحد پر رہیگا دنیا کی کوئی طاقت ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ آپ نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وقت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے کو خرافات وبدعات سے بچا کر ملی وقومی ترقی کے متعلق غور وفکر اور سنجیدہ کوشش کرتے ہوئے ہر سطح پر اتحاد کا مظاہرہ کریں تاکہ ملک وملت کی صحیح خدمت انجام دی جا سکے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے استاذ مولانا سلمان حسنی ندوی صاحب نے مولانا علی میاںؒ کی سیرت اور ان کی نوجوانوں کی فکری تربیت کی کوششوں کے حوالے سے گفتگو فرماتے ہوئے مسلم نوجوانوں کو رہنما مشورے دئے اور نوجوانوں سے علمائے امت اور دانشوران ملت نے جو امیدیں وابستہ کئی تھیں ان کی یاددہانی کرائی تاکہ نئی نسل اچھے مستقبل کی ضامن بن کر مسلمانوں کی فلاح وبہبود کا ذریعہ بن سکے اور بہتر مستقبل کی تعمیر کر سکے۔

صدر جلسہ مولانا سید نظام الدین صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مناسبت سے حاضرین کی توجہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کی قانونی، شرعی اور اخلاقی ضرورت اور اس کے تحفظ پر دلائی آپ نے تفصیل سے مسلم پرسنل لابورڈ کی خدمات کو اجاگر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بقاء وتحفظ کے لئے ضروری ہیکہ اس ادارے سے اپنی وابستگی قائم رکھیں اور اسے مضبوط کریں۔ علماء دین پر اعتماد کریں تاکہ ان کے سماجی، اقتصادی دینی وتعلیمی مسائل حل ہو سکیں پروفیسر رحیم اللہ خاں صاحب پروسٹ ایس ایس ہال ساؤتھ وکنوینر سیرت کمیٹی اے، ایم یو نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور اس اجلاس کی کامیابی پر اللہ کا شکر بجالائے۔

اقراء ایجوکیشنل فاونڈیشن میں عشائیہ :

اسی شب بعد نماز عشاء اقراء ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کی طرف سے اقراء پبلک اسکول میں عشائیہ کا اہتمام کیا گیا تھا جہاں پرنسپل، منیجر اور ذمہ داران نے علی میاں

www.abulhasanalinadwi.org

سیمینار کے مندوبین کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس اسکول کے قیام میں مولانا علی میاں کا جو تعاون اور ان کی دعائیں ذمہ داران ادارہ کو حاصل رہیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے منیجر پروفیسر امان اللہ خاں صاحب، نے اس سیمینار کے انعقاد اور علماء کی آمد کو نیک فال بتایا۔ مہمانوں کی طرف سے مولانا سلمان ندوی صاحب نے میزبان کا شکریہ ادا کیا اور اسکول کی ترقی و کامیابی پر ذمہ داران کو مبارکباد پیش کی کھانے کے دوران اسکول کے بچے اپنے ہلکے پھلکے پروگرام پیش کرتے رہے جو مہمانوں کی ضیافت کے لئے مرتب کے گئے تھے۔

چوتھا علمی اجلاس:

۲۶؍ مارچ کی صبح ساڑھے نو بجے آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں چوتھا علمی اجلاس منعقد ہوا، اس میں پہلا مقالہ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی صاحب نے "مولانا علی میاں اور مغربی ممالک" کے عنوان سے پڑھا، جس میں انہوں نے مولانا علی میاںؒ کے مغربی ممالک کے اسفار اور وہاں ان کی دعوتی کوششوں کا مفصل جائزہ لیا۔

"مولانا علی میاںؒ اور اسلامی تحریکات" کے عنوان سے ڈاکٹر عبدالمجید خاں صاحب لکچرر شعبۂ اسلامیات اے، ایم، یو نے پر از معلومات مقالہ پیش کیا جس میں انہوں نے تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی کے تعلق سے مولانا علی میاںؒ کے خیالات اور رویہ کا جائزہ لیا۔

"مولانا علی میاں اور دارالعلوم دیوبند" پر مفتی محمد ظفیر الدین صاحب نے اپنا مقالہ پیش کیا، انہوں نے مولانا علی میاںؒ کے دارالعلوم دیوبند سے تعلق و وابستگی پر روشنی ڈالی۔ دینی تعلیمی کونسل کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے "مولانا علی میاں اور دینی تعلیمی کونسل" اپنا مقالہ پیش فرمایا۔

علاوہ ازیں پروفیسر نفیس احمد صدیقی صاحب نے "مولانا علی میاں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" کے عنوان پر اور "مولانا علی میاںؒ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء

www.abulhasanalinadwi.org

لکھنؤ" کے عنوان سے مولانا رابع ندوی صاحب کا مقالہ ان کے نمائندے مولانا محمود الحسن حسنی ندوی نے پیش کیا۔

باغ علی کا افتتاح :

اس سیمینار کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اسی موقع پر شعبۂ عربی اور یونین ہال کے درمیان ایک پارک کا افتتاح مندوبین سیمینار کے ہاتھوں کیا گیا اور اس پارک کا نام "باغ علی" رکھا گیا، اس باغ کا افتتاح مسجد اقصیٰ کے امام شیخ محمد الصیام اور دیگر مندوبین نے پودے لگا کر کیا۔ اس موقع پر شیخ الجامعہ ڈاکٹر محمود الرحمٰن صاحب نے اس پارک کو مولانا علی میاں صاحبؒ سے منسوب کرنے پر اپنی اور یونیورسٹی برادری کی خوشی کا اظہار کیا۔

پانچواں علمی اجلاس :

آدھ گھنٹہ کے وقفہ کے بعد سیمینار کا پانچواں اجلاس ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کی زیر صدارت شروع ہوا۔ اس اجلاس میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب نے علامہ اقبال سے متعلق مولانا علی میاںؒ صاحب کے مطالعہ اور تحریروں کا جائزہ لیا۔

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی صاحب نے "مولانا علی میاںؒ اور تدریسی ادب' پر مقالہ پڑھا مولانا عبید اقبال عاصم نے "مولانا علی میاںؒ کی وسیع المشربی ڈاکٹر مولانا سعود عالم قاسمی صاحب نے "مولانا علی میاں کی فکر میں مؤثر علماء" اور مولنا ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی صاحب نے "مولانا علی میاںؒ، کاروان زندگی کی روشنی میں" جیسے عنوانات پر مقالات پیش کئے مولانا ولی رحمانی صاحب، نائب صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت نے مولانا علی میاں کی دینی و ملی قیادت پر ایک خوبصورت مقالہ پیش کیا جو اردو نثر نگاری کا خوبصورت نمونہ تھا جو آخری نشست میں پیش کیا گیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

چھٹا علمی اجلاس :

شام ساڑھے چار بجے مولانا ولی رحمانی صاحب کی زیر صدارت تجاویز و تاثراتی اجلاس ہوا۔ مولانا محمد ثوبان قاسمی صاحب حیدر آباد، اور جناب منصور آغا صاحب (دہلی) نے سیمینار سے متعلق اپنے تاثرات بیان فرمائے مولانا ثوبان قاسمی صاحب نے کہا کہ علی گڑھ میں پہلی مرتبہ حاضر ہوا یہاں جو علمی ماحول دیکھا، سیمینار میں جو علمی اسلوب، مزاج اور مباحث سامنے آئے اس نے مجھے بہت متأثر کیا اور یہ سیمینار ہر لحاظ سے کامیاب ہے میں اس سیمینار کے انعقاد پر یونیورسٹی کے ذمہ داران اور خاص طور پر داعی سیمنار ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

روزانہ قومی اواز کے چیف سب ایڈیٹر جناب سید منصور آغا صاحب نے مولانا علی میاںؒ کی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس سیمینار کو یونیورسٹی کی طرف سے ایک معقول خراج تحسین سے تعبیر کیا اس کے انعقاد اور کامیابی بر ناظم دینیات صاحب کو مبارکباد دی اور مقالہ نگار حضرات کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ علمی سیمینار میں تحقیق و تجزیہ کی وہ روایت قائم کرنی چاہئے جو یونیورسٹی کے مزاج و معیار کی طرف رہنمائی کرے۔

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی نے سیمینار کی تجاویز پڑھکر سنائیں جسے حاضرین نے منظور کیا

اختتامی اجلاس :

اس اجلاس کو مہمان خصوصی مسجد اقصی کے امام شیخ محمد الصیام نے خطاب فرمایا آپ نے مولانا علی میاں ندویؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ علی میاںؒ کے ذریعہ عرب دنیا ہندوستان کو جانتی تھی۔ علی میاںؒ عرب اور ہندوستان کے درمیان رابطہ کی مضبوط ترین کڑی تھے۔ آپ نے فلسطین کے مسئلہ پر سامعین کو توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ علی میاںؒ کو اس مسئلہ نے ہمیشہ بے چین رکھا۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ مسجد اقصی کے سلسلہ میں یہودیوں کی سازشوں کو پامال کریں اور ہر ممکنہ طور پر

www.abulhasanalinadwi.org

مسجد اقصیٰ کو آزاد کرانے میں متحدہ کوشش کریں۔ آپ کی تقریر عربی زبان میں ہوئی جس کی اردو ترجمانی مولانا محمد اویس قاسمی نے کی۔

رسم اجرا ''اسلام اکیسویں صدی میں''

اس موقع پر شیخ محمد الصیام نے ڈاکٹر مولانا محمد سعود عالم قاسمی صاحب ناظم دینیات اے ،ایم یو کی نئی کتاب ''اسلام اکیسویں صدی میں'' کا اجراء فرماتے ہوئے مولانا قاسمی صاحب کی اس کوشش پر مبارکبادودی جنہوں نے اس کتاب میں اکیسویں صدی میں مسلمانوں کودر پیش چیلنج اوران کا حل سلیس وبلیغ انداز میں پیش کیا، شیخ صیام نے اس کتاب کووقت کی اہم ضرورت اوراس کے مطالعہ کو مفید ترین قرار دیاانہوں نے فرمایاکہ بیسویں صدی میں اسلام بڑی مشکلات سے گذرا ہے ،دعاکریں اور کوشش کریں کہ اکیسویں صدی باعث خیر ہو

عمومی اجلاس :

مغرب کی نماز کے فوراًبعد جامع مسجد ایس ایس ہال میں شیخ صیام کا خطاب عام رکھاگیااس خطاب کی اردو ترجمانی ڈاکٹر سعود عالم قاسمی صاحب نے فرمائی اس خطاب میں یونیورسٹی کے طلباء ،اساتذہ اور عام مصلیوں کے علاوہ یونیورسٹی کے اعلی حکام بھی موجود تھے ، شیخ صیام نے اپنے بلیغ خطبہ میں امت مسلمہ میں رشتہ اخوت واتحاد کو قائم رکھنے کی ضرورت پرزور دیتے ہوئے کہاکہ علم اور ایمان یہی دوبنیادیں ہیں جن پر امت مسلمہ میں اتحاد پیدا کیاجاسکتاہے۔ یہی وہ چیز ہے جو مجھے کھینچ کر آپ کے درمیان لائی ہے اور یہی چیز آپ سب کی زندگی میں دیکھنا چاہتاہوں۔

اسی دن بعد نماز عشاء مدینۃ العلوم اسکول جمال پور میں عشائیہ کا اہتمام کیا گیا۔ جس کے منتظم سماجی کارکن ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب تھے جواس سیمینار میں ناظم دینیات صاحب کو ہر طرح کا عملی تعاون دیتے رہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تجاویز

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی سیمینار

منعقدہ ۲۵-۲۶ مارچ ۲۰۰۰ باہتمام ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مختلف مقالات اور تقاریر کی روشنی میں درج ذیل تجاویز جلسہ عام میں پیش کرتا ہے

(۱) یہ سیمینار حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ حضرت مولانا نے اس دور میں عالمی پیمانے پر تجدید و اصلاح کا کام انجام دیا۔ یہ سیمینار بارگاہ ایزدی میں یہ دعا کرتا ہے کہ مولانا کے تمام اعمال صالحہ کو قبولیت سے نوازے اور انکی تمام کاوشوں اور کوششوں کو ہمیشہ کے لئے صدقہ جاریہ بنادے اور ساری دنیا میں پھیلی ہوئی اس وسیع امت اسلامیہ کو اپنے رحم و کرم سے مولانا کا نعم البدل عطا فرمائے اور فرزندان ملت کو مولانا کے اسوہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(۲) یہ سیمینار اس بات پر مسرت کا اظہار کرتا ہے کہ شیخ الجامعہ نے مولانا ابو الحسن علی ندوی کے نام سے موسوم اس یونیورسٹی میں ایک چیر قائم کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔

(۳) یہ سیمینار شیخ الجامعہ سے یہ بھی درخواست کرتا ہے کہ اس چیر کے

www.abulhasanalinadwi.org

ماتحت چند اسکالر شپ کا بھی اہتمام کیا جائے تاکہ مولانا کی شخصیت اور کارناموں پر تحقیقی کاموں کی رفتار تیز ہوسکے۔

(۴) یہ سیمینار مولانا ابوالحسن علی ندوی کی فکری بصیرت کو عام کرنے کے لئے اور ان کے پیغام کی عمومی اشاعت کے لئے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اور بین الاقوامی زبانوں میں بھی ترجمے کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے اور ہندوستان کے علمی اداروں کی توجہ اس جانب مبذول کرتا ہے۔

(۵) یہ سیمینار ہندوستان کے علمی اور اشاعتی اداروں سے یہ درخواست کرتا ہے کہ وہ مولانا کی (اردو۔ عربی) تقریروں کے مجموعے موضوعات کے اعتبار سے شائع کریں۔

(۶) یہ سیمینار ارباب حل وعقد سے یہ التماس کرتا ہے کہ یہاں مولانا آزاد لائبریری میں ایک مستقل گوشہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نام پر قائم کردیں جس میں نہ صرف مولانا کی تمام تصانیف اور ان کے ترجمے اور ان کے جدید وقدیم ایڈیشن جمع کردئے جائیں بلکہ مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے تمام مضامین مقالات اور خطوط کو بھی جمع کردیا جائے اور خود حضرت مولانا کی شخصیت پر جو مضامین اور کتابیں شائع ہوں ان کو بھی یکجا کردیا جائے اور مولانا کے سلسلے میں تصاویر کا البم بھی یہاں موجود ہو اور مولانا کی تقریروں کے آڈیو اور ویڈیو کیسیٹ بھی اس گوشے میں لوگوں کے استفادہ کے لئے موجود ہوں۔

(۷) یہ سیمینار تجویز کرتا ہے کہ مولانا کے کارناموں پر سالانہ بین الجامعاتی تحریری اور تقریری انعامی مقابلوں کا اہتمام کیا جائے۔

(۸) یہ سیمینار تجویز کرتا ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سیرت و شخصیت اور کارناموں سے متعلق سالانہ توسیعی خطبات کا اہتمام کیا جائے اور ملک کی کسی مناسب شخصیت کو خطبہ دینے کے لئے مدعو کیا جائے۔

(۹) یہ سیمینار محسوس کرتا ہے کہ ملک کے مختلف طبقات کے درمیان

www.abulhasanalinadwi.org

مفاہمت اور یگانگت پیدا کرنے کے لئے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے مولانا کی پیام انسانیت تحریک کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے کے مناسب کسیٹ اور لیٹریچر کو بھی پھیلانے اور عام کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

(۱۰) اس سیمینار کی تجویز یہ ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے فکر کی اشاعت کے لئے ایک مستقل سہ ماہی انگلش اور اردو بلٹین کا اجراء کیا جائے

(۱۱) سیمینار یہ محسوس کرتا ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی مسلمانوں کے مختلف فکری اور نظریاتی گروہوں اور جماعتوں کے درمیان اتحاد اور اعتماد پیدا کرنا چاہتے تھے اس لئے یہ سیمینار مسلمانوں کی تمام جماعتوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ آپس میں ہمیشہ خوشگوار تعلقات قائم رکھیں اور باہمی معاملات میں بریشم کی طرح نرم ہوں اس لئے کہ اتحاد کا حکم ایک منصوص حکم ہے اور زبان و قلم سے دل آزاری ناجائز ہے۔

(۱۲) یہ سیمینار یوپی اسمبلی کے مذہبی مقامات بل کے اوپر اپنے شدید جذبات کا اظہار کرتا ہے اس بل میں مسجدوں مدرسوں خانقاہوں قبرستانوں کا تعین کر کے ان کی توسیع اور مرمت اور تعمیر پر جو قانونی پابندی لگائی گئی ہے وہ دستور میں دئے گئے بنیادی حقوق کے خلاف ہے اور اس سے فرقہ وارانہ کشیدگی کے بیدار ہونے کا امکان ہے اور قومی یک جہتی کو خطرہ لاحق ہے اس لئے یہ سیمینار صدر جمہوریہ سے خصوصی طور پر گذارش کرتا ہے کہ وہ اس بل کی ہرگز توثیق نہ کریں۔

(۱۳) یہ سیمینار شیخ الجامعہ صاحب ڈاکٹر محمود الرحمٰن اور ناظم دینیات ڈاکٹر سعود عالم قاسمی صاحب اور باہر سے تشریف لانے والے تمام معزز مہمانوں اور یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ اور دوسرے اسٹاف کا شکریہ ادا کرتا ہے جس کی وجہ سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت پر مذاکرہ کامیاب ہوا اور اختتام تک پہنچا۔

www.abulhasanalinadwi.org

تاریخ وفات

جناب مجیب احمد صدیقی، کرنیل گنج، گونڈہ

چہ خوب آں ساقی گلفام بودہ — مئے حب نبیؐ در جام بودہ
علی نامش و اولاد علی ہم — سراپا نکہت اسلام بودہ
مفکر ہم مفسر ہم مورخ — کثیر العلم آں علام بودہ
منور کرد عالم را علومش — ضیائے ہند و مصر و شام بودہ
ز فضل رب شدہ مخدوم عالم — و لیکن خادم اسلام بودہ
او در علم و عمل مہر جہاں تاب — کہ از وے رونق اسلام بودہ
برو نازد نجابت و سیادت — فیوضش بہر خاص و عام بودہ
کلید کعبہ زیب دست پاکش — برائے او ہمہ اکرام بودہ
دلاں می یافتند آرام از وے — چہ خوب آں روئے دل آرام بودہ
شنیدم آنکہ از دار فنا رفت — بہ چشم اشک لالہ فام بودہ
یکم و سی دسمبر روز جمعہ — چوں صبح زندگی راشام بودہ

دلم پرسید از من سال وصلش
بگفتم ضیغم اسلام بودہ

(۱۸۵۰ + ۱۴۹ = ۱۹۹۹ء)

www.abulhasanalinadwi.org

وَقَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ

+۳۱۹

بَلیٰ مَنْ اَوْفیٰ بِعَهْدِهٖ وَا تَّقیٰ

+۸۳۲

فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (آل عِمْرَانَ)

=۴۴۸

۱۹۹۹ء

www.abulhasanalinadwi.org

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی کی دیگر کتب

(۱) اسلامی تہذیب کی تفہیم جدید	ہندوستان پبلیکیشنز، دہلی
(۲) فتنہ وضع حدیث اور موضوع احادیث کی پہچان (پانچواں ایڈیشن)	مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی
(۳) اسلامی معاشرہ میں مساجد کا کردار	انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی
(۴) خواتین اور اسلامی بیداری	قاضی پبلیشرز، نئی دہلی
(۵) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قرآنی فکر کا مطالعہ	اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی
(۶) قرآن کی دعوت فکر (دوسرا ایڈیشن)	دفتر ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
(۷) اسلام کا تصور عیدین (دوسرا ایڈیشن)	دفتر ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ہندی ایڈیشن	(زیر طبع)
(۸) اعتدال اسلامی شریعت کا مزاج	مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی
(۹) مطالعۂ دینیات (اردو، ہندی)	یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ
(۱۰) ذرائع ابلاغ اور مسلمان	یوپی رابطہ کمیٹی، علی گڑھ
(۱۱) انوار سیرۃ النبیؐ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ
(۱۲) اسلام اکیسویں صدی میں	یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ
(۱۳) اسلامی تہذیب اور ہندوستانی سماج	زیر طبع
(۱۴) اسلامی تہذیب اور اس کا مزاج	؍
(۱۵) مناہج تفسیر	؍

www.abulhasanalinadwi.org